Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ



Marfat.com

Marfat.com

تاریخ ادب اُردو

۱۷۰۰ء تک

جلد دوم

از

پروفیسر سیّدہ جعفر ——— پروفیسر گیان چند جین





قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 6179657, 6103381, 6103938

Marfat.com

Tareekh Adab-e-Urdu (Vol. II)

By : Prof. Syeda Jafer, Prof. Gian Chand Jain

138857

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت: جولائی، ستمبر 1998ء شک 1920ء

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت :-/170

سلسلۂ مطبوعات : 807

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

Marfat.com

دیباچہ

زبان کا تعلق علاقے سے ہوتا ہے۔ یہ علاقہ پھیل بھی سکتا ہے، سمٹ بھی سکتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک زبان بولنے والے بڑی تعداد میں ہجرت کر کے نئے علاقے میں جاتے ہیں، تو ان کی زبان وہاں بھی پھلتی پھولتی ہے۔ زبان کی ذیلی بولیاں ہوتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یوں بھی ہوتا ہے بولی ارتقا کی منزلیں طے کر کے زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اردو کے سلسلے میں تو یہ بھی ہوا ہے کہ دو کھڑی بولیاں (کھڑی اور ہریانوی) اور تین پڑی بولیاں (برج، بندیلی اور قنوجی) کے ارتقا کا سنگم وہ زبان ہے، جو مختلف عہدوں میں مختلف ناموں سے موسوم ہوئی، اور ان ناموں میں ہندی اور ہندوستانی یا زبانِ ہندوستان بھی ہیں اور آج اسے اردو کہتے ہیں۔

بعض دریاؤں کے منبعے کئی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دریائے جہلم کا سرچشمہ ویری ناگ مشہور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنکر ناگ، جھیل، مارسل، تارسل۔ اور بھی کئی چشمے ہیں جن کے پانی سے پہاڑی نالے بنتے ہیں اور سب کا پانی جہلم میں جاتا ہے۔ اسی طرح اردو کے سرچشمے بھی کئی بولیوں میں ہیں۔ دکنی کی انفرادی حیثیت بھی ہے اور محی الدین قادری زور کے مرتبے کے عالم زبان، دکنی کو اردو کی بنیاد سمجھتے ہیں اور محمود خاں شیرانی جیسے بحر العلوم پنجابی کو اردو کی اصل بتاتے ہیں۔

Marfat.com

اردو کتنی بولیوں کی نکھری ہوئی شکل ہے یا اردو کے دائرے میں کتنی بولیاں ہیں، یہ بھی ایک اہم موضوع ہے، لیکن اس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آریہ قبائل جو زبان بولتے ہوئے برِ صغیر میں آئے تھے، اور جس میں وید مقدس ہیں، اسی کی ادبی شکل سنسکرت کہلائی اور سنسکرت کی اہم پراکرتیں ملک کے مختلف حصوں میں نمو پزیر ہوئیں۔ موجودہ انبالہ سے موجودہ الہ آباد تک کے علاقے میں سب سے اہم پراکرت پالی کا فروغ ہوا اور یہی ارتقائی مرحلوں سے گزرتی ہوئی ہمیں ورثے کی صورت میں ملی اور یہی عام بول چال کی اردو، ہندی اور ادبی اردو بھی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زبان ہندوستانی تشخص کی ایک علامت بن گئی اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ قومی کونسل سرگرمی سے اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ اس زبان کا رشتہ اپنی جڑوں سے گہرا ہو اور یہ ہندوستان کے متنوع لسانی منظر نامے میں فروغ پاتی رہے۔

پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر نے آغاز و ارتقا سے ۱۷۰۰ء تک کی تاریخِ اردو ادب خاص توجہ سے لکھی۔ اس موضوع پر حامد حسین قادری کا داستانِ تاریخِ اردو، نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو، جمیل جالبی کی تاریخ ادبِ اردو جیسی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر جین اور پروفیسر جعفر نے نہ صرف ان کتابوں کے اندراجات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے، بلکہ دوسرے مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے اور کچھ اہم نکات واضح کیے ہیں۔

یقین ہے کہ اس کتاب سے ایک اہم تعلیمی ضرورت پوری ہو گی۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ)
ڈائریکٹر

Marfat.com

فہرست

چوتھا باب:۔ (سیدہ جعفر)

دکن میں اُردو شاعری ۔۔ ۱۶۰۰ء تک 9
شاہ راجو قتال 26
خواجہ بندہ نواز 32
سید محمد اکبر حسینی 61
فیروز شاہ بہمنی۔ 69
فخر دین نظامی 82
نظیری 95
آذری 〃
عبداللہ حسینی 97
میراں جی شمس العشاق 98،
اشرف بیابانی 115
محمود 128
فیروز بیدری 134
ملا خیالی 142
مشتاق 146
لطفی 152
خواجہ محمد دَہلار فانی 154
عاشق دکنی 159
برہان الدین جانم 164

پانچواں باب:۔ (گیان چند جین)

گجرات میں اُردو شاعری ۔۔ ۱۶۰۰ء تک 199
شیخ بہاء الدین باجن 204
قاضی محمود دریائی 211
قاضی محمود کے پس ماندگان 213
شاہ علی محمد جیو گام دھنی 220
میاں مصطفٰے گجراتی 226
شیخ خوب محمد چشتی 228
سیّد اسحاق سرمست 240
خان محمد 241

چھٹا باب:۔ (گیان چند جین)

اردو نثر ۔۔ ۱۶۰۰ء تک 243
شیخ قطب الدین بختیار کاکی 244
شیخ فرید الدین مسعود شکر گنج 〃
شیخ حمید الدین ناگوری 〃
شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی 247
تاریخ فیروز شاہی مولفہ شمس سراج
علی مولا بدایونی 248
سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں 249
شاہ راجو قتال 250
شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی 〃

Marfat.com

زین الدین خلد آبادی 252
شرف الدین یحییٰ منیری 252
سید اشرف جہانگیر سمنانی 254
مولانا کریم الدین 254
شیخ راجا 255
شاہ کوچک ولی 255
خواجہ بندہ نواز گیسو دراز 255
حضرت قطب عالم 256
شاہ عالم 258
سلطان سکندر 261
سلطان محمود بیگڑہ 265
حضرت سید محمد جونپوری 266
میاں دلاور 269
شاہ محمد غوث گوالیری 269
شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی 271
رسالے اور کتابیں :- 273
اُردو رسالے :- 274
سید اشرف جہانگیر سمنانی 279
شیخ عین الدین گنج العلم 281
رسالۂ جنونیہ یا جنونیت 322
رسالۂ شاہ راجو 324
خواجہ بندہ نواز 325
سید اکبر حسینی 326
سید عبداللہ حسینی 352
" رسالۂ شاہ قادر 374
خیر البیان (اردو کی پہلی مستند نثری کتاب) 376
شاہ میراں جی شمس العشاق 390
" شاہ برہان الدین جانم 411
" شاہ وجیہ الدین علوی 420
ساتواں باب :- (سیدہ جعفر) 423
بیجاپور اور بیدر میں اردو شاعری سترھویں صدی میں 434
ابراہیم عادل شاہ ثانی 452
" عبدل 467
" شہباز حسینی 473
پیار محمد بن عیسیٰ خاں 493
مقیم اور مقیمی 507
شاہ ابوالحسن 517
شیخ محمد شریف عاجز
صنعتی
ملک خوشنود
رستمی
شیخ محسن شوقی

Marfat.com

چوتھا باب

دکن میں اُردو شاعری ۱۶۰۰ء تک

بارھویں صدی میں چالوکیہ خاندان کو زوال ہوا تو دکن کا علاقہ مختلف حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔ مہاراشٹر میں یادو، کرناٹک میں بلال اور تلنگانہ میں کیتیا حکومتوں کا قیام عمل میں آیا[1]۔ جب تغلق خلجیوں کے جانشین ہوئے تو انھوں نے ۱۳۲۳ء/۷۲۳ھ میں ورنگل کی کیتیا حکومت کا خاتمہ کرکے دیوگیری کی طرح اس کو بھی حکومت دہلی کا ایک صوبہ بنادیا۔ کرناٹک کی ریاست ۱۳۲۷ء/۷۲۸ھ میں سلطان محمد تغلق کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔

علاء الدین خلجی نے گجرات فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا اس دور دراز مقام پر بھی خلجی پرچم لہرانے لگا تھا۔ اور گجرات براہ راست طور پر سلطنت دہلی کے زیر اثر آگیا تھا۔ اس فتح نے علاء الدین خلجی کے حوصلے بڑھا دیئے اور اب اس کی نظریں مغربی ہندوستان سے ہٹ کر جنوب کے علاقے پر جم گئیں۔ اس نے ملک نائب کو ایک فوج کے ساتھ دکن کی مہم پر روانہ کردیا۔ ۱۳۱۰ء/۷۱۰ھ میں دکن اور مالوہ کے علاقے تسخیر کرلئے گئے اور انھیں قلمرو دہلی میں ضم کردیا گیا۔ جب دکن اور مالوہ حکومت دہلی کا جزو بن گئے تو انتظاماتِ سلطنت کے سلسلے میں مکانی بُعد کی وجہ سے گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دکن دہلی سے بہت دور واقع تھا اور اس نو مقبوضہ علاقے پر بطور خاص نظر رکھنی تھی اس لئے انتظامات کو زیادہ موثر بنانے کے لئے گجرات سے لے کر دکن تک کے وسیع علاقے کو سو سو مواضعات میں تقسیم کردیا گیا۔ اور ہر حلقے پر حکومت کا نمائندہ ایک

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ گولکنڈہ۔ صفحہ ۱۱۔

Marfat.com

ترک افسر متعین کر دیا گیا جو مالگذاری وصول کرتا تھا۔ اُسے اپنے علاقے کے تمام امور کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا چونکہ ہر حلقہ سو مواضعات پر مشتمل تھا اس لئے حکومت دہلی کے مقرر کئے ہوئے یہ نگراں کا رامیراں صدہ کہلاتے تھے۔ ان امیراں صدہ کے ساتھ ان کے افرادِ خاندان اور متوسلین بھی دکن پہنچے اور ان ترکوں کا مقامی باشندوں سے ربط قائم ہوا۔ یہ امیر جو پہلے دہلی میں رہ بس چکے تھے اپنے ساتھ وہ ذخیرۂ الفاظ لائے تھے جو دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں سے انھوں نے اکٹھا کیا تھا ترک مقامی باشندوں سے فارسی میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے اور معاشرتی سطح پر ربط قائم رکھنا بہر حال ضروری تھا اس لئے ان ترکوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان میں مقامی الفاظ شامل کر لئے اور اس طرح ابلاغ و ترسیل کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی۔

سلطان محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء/۷۲۸ھ میں جب دیوگری کا نام دولت آباد تجویز کر کے اسے ہندوستان کا پایۂ تخت بنایا تو دہلی کے علماء، صناع شعراء اور اہل علم دہلی سے دولت آباد روانہ ہونے لگے۔ سلطان کے حکم پر جب دہلی خالی ہو گئی تو کہتے ہیں کہ یہاں صرف ایک اندھا باقی رہ گیا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس کو بھی بادشاہ کے حکم سے گھسیٹتے ہوئے دولت آباد لے گئے[1] مشہور ہے کہ زہاد کی چودہ پالکیاں دولت آباد پہنچی تھیں۔ ان میں شاہ برہان الدین غریب، سید یوسف حسینی یعنی خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو، امیر خسرو کے دوست میر حسن سنجری، اور شیخ زین العابدین وغیرہ شامل تھے۔ یہ صوفیاء اور علماء زبان کا سرمایہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ لسانی سطح پر مقامی زبانوں کے میل نے اُس زبان و ادب کو جنم دیا جسے ہم ادب کا قدیم اثاثہ تصور کرتے ہیں۔ محمد تغلق دولت آباد میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔ یہاں اس نے ایک خوبصورت اور بارونق شہر آباد کر دیا تھا لیکن دو برس کے اندر اندر ملتان میں کشلو خاں نے علم بغاوت بلند کر دیا اور اسے شمال کا رخ کرنا پڑا۔ ۱۳۵۱ء میں محمد تغلق نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

محمد تغلق کے حکم سے جو اولیاء، صوفیاء، دولت آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ان میں سے اکثر خلد آباد میں رہ بس گئے اور یہاں انھوں نے تبلیغ و اشاعت

---

[1] عبدالقادر سروری، اردو کی ادبی تاریخ ص ۶۵

Marfat.com

کا کام جاری رکھا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۳۴۷ء میں امیران صدہ نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ظفر خاں نے علاءالدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے دکن میں ایک جدید سلطنت کی بنا ڈالی جو بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہوئی۔ پچھلے صفحات میں اس کی تفصیلات درج ہیں۔ فیروز شاہ کا عہد بہمنی سلطنت کا دورِ زریں تھا۔ اس کے جانشین احمد شاہ ولی بہمنی نے راج دھانی کو جو دولت آباد سے گلبرگہ منتقل ہو گئی تھی بیدر میں مستقل طور پر منتقل کر دیا۔ بہمنی سلطنت کی کمزوری کی وجہ سے صوبہ دار باغی ہو گئے اور بیدر پر ایک ترخاندان برید نے قبضہ کر لیا تھا۔ آخری بہمنی بادشاہ بریدیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن کے رہ گئے تھے۔

بہمنی سلاطین علم و ادب کے دلدادہ تھے ان کی سرپرستی میں مقامی زبان نے ترقی کے مدارج طے کئے بہمنی سلطنت کا آٹھواں بادشاہ فیروز شاہ بہمنی خود شاعر تھا اور عروجی فیروزی تخلص کرتا تھا۔ بانیِ سلطنت سلطان حسن گنگو بہمنی نے صدرالشریف سمرقندی، رضی الدین جگا جوت، ملا اسحٰق سرہندی اور حکیم نصیرالدین شیرازی کو اپنے دارالسلطنت میں بلوا کر انھیں انعام و اکرام سے سرفراز کیا تھا۔ بہمنی عہد کی تاریخ "فتوح السلاطین" (منظوم) مولانا عصامی کی کاوش ہے۔ بہمنی سلاطین نے سیاسی معاملات کے علاوہ تعلیمی، ادبی اور تہذیبی امور کی طرف بھی توجہ کی ان کے دربار کی سجاوٹ و تزئین دوسری ریاستوں میں مشہور تھی۔ بہمنی دربار میں عمدہ ایرانی قالینوں کا فرش کیا جاتا، زربفت کے شامیانے سجائے جاتے اور دیواروں پر ریشم اور زردوزی کے پردے آویزاں ہوتے تھے۔ دربار میں خدّاموں، حاجبوں امراء، وزراء اور دیگر عمائدین کے مقامات مقرر تھے اور آدابِ نشست و برخاست کی بڑی پابندی کی جاتی تھی۔ حضرت عین الدین گنج العلم حسن گنگو کے دورِ حکومت میں دکن آئے تھے اور یہاں رشد و ہدایت کا کام جاری رکھا تھا۔ بہمنی بادشاہوں نے ہمیشہ علماء کی قدردانی کی۔ محمد شاہ ثانی کے زمانے میں فضل اللہ انجو اور شیخ سراج جنیدی جیسے عالم دکن میں سکونت پذیر تھے۔ فیروز شاہ کئی زبانوں پر عبور کلیہ رکھتا تھا اور بلند پایہ عالم تھا۔

Marfat.com

کیا جاتا تھا۔ اسی کے عہد میں سیّد محمد گیسو دراز ؒ گلبرگہ تشریف لائے تھے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں خواجہ بندہ نواز ؒ کو مقامی باشندوں سے ربط پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو بقول عبدالقادر سروری انھوں نے "فارسی اور اُردو" میں رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیے[1] "منتخب اللباب" میں خافی خان نے بہمنی سلطنت میں مقامی زبان کے سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے " بدستور سابق ہندی مقرر نمودہ"[2] مقامی زبان کی سیاسی اور سماجی اہمیت اُس کی نشوونما اور ترقی کے لیے اہم محرک ثابت ہوئی بہمنی سلاطین نے تہذیبی، علمی اور ادبی امور سے شخصی دلچسپی لی۔ احمد شاہ اور علاءالدین ثانی کے عہدِ حکومت میں تہذیبی و علمی ترقی جاری رہی۔ ہمایوں ظالم بادشاہ کہلاتا تھا مگر اس کا عہد بھی سربرآوردہ اہلِ علم، صوفیاء اور شعراء سے خالی نہیں رہا۔ شاہ طاہر استرآبادی اور ملا محمد تقی نظیری اس کے عہدِ حکومت کے مشہور فارسی شعراء تھے۔ نظیری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ "اُردو" میں شعر کہتا تھا[3] بہمنی وزیر محمود گاوان نے بیدر میں اپنا مشہور مدرسہ قائم کیا تھا۔ بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں فخر دین نظامی نے "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" لکھی تھی جو دکنی کی سب سے قدیم دستیاب شدہ مثنوی تصور کی جاتی ہے۔ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں بہمنی پایہ تخت شعر و ادب کے چرچوں سے گونج رہا تھا اس پس منظر میں نظامی کا مثنوی پیش کرنا ماحول کا تقاضہ معلوم ہوتا ہے۔ خود بہمنی سلطان نے شعر گوئی کی روایت قائم کر دی تھی۔ ہارون خان شیروانی نے فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ فیروزی عربی فارسی اور ترکی کے علاوہ کنڑی، تلگو، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور بعض دوسری زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔[4] "دکنی کلچر" میں نصیرالدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ فیروز شاہ بہمنی کے زمانہ حکومت میں اگر ایک طرف سیاسی تدبر سے ملک کو "بلند منزل" پر پہنچایا گیا تو دوسری طرف پاکیزہ تمدن اور "بہترین کلچر" سے ملک کو زینت دی گئی۔[5] عبدالجبار ملکاپوری فیروز

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اُردو کی ادبی تاریخ۔ صفحہ ۷۲۔
[2] " " " " صفحہ ۷۴۔
[3] خافی خان۔ منتخب اللباب۔ صفحہ ۳۰۷۔

Marfat.com

شاہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ وہ شعر و شاعری کا "شیفتہ" تھا اور آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ اس نے اولاً اپنا تخلص عروجی قرار دیا تھا اور پھر فیروزی تجویز کیا۔[۲] "کلام الملوک" اور "تذکرہ محبوب الزمن" حصہ دوم میں فیروز شاہ بہمنی کا فارسی کلام محفوظ ہے لیکن اس کا دکھنی کلام بہت کم دستیاب ہوا ہے فیروز کی ایک رباعی راقمۃ الحروف نے اپنی کتاب "دکنی رباعیاں" میں شائع کی ہے مزید کلام ہنوز دستیاب نہیں ہوا ہے۔ غلام صمدانی گوہر نے "دربار آصف" میں فیروزی کی شاعری کی تعریف کی ہے۔[۳] سید علی اصغر بلگرامی نے بھی "تاریخ دکن" میں فیروزی کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔[۴] عبدالمجید صدیقی بھی فیروز شاہ بہمنی کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔[۵] اس کی ایک غزل بھی ہم دست ہوئی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی فیروز شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "رسم ورواج، رہنے سہنے کے طریقے ہندوؤں سے لئے ایک مخلوط دکھنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز کا نام تاریخ دکن" میں نمایاں ہے"۔[۶] "دکھنی کلچر کے بانی" کا ایک ایسی زبان میں طبع آزمائی کرنا جو اس کلچر کی نمائندگی کرتی ہو کوئی تعجب خیز امر نہیں معلوم ہوتا۔ بہمنی سلاطین نے اس زبان کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے بہمنی دور کی واحد مثنوی جس سے ہم واقف ہیں فخر دین نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ محمد کنج منیر "کدم راؤ پدم راؤ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نظامی نے اس کے قصے کی بنیاد "بھارتیہ پرانک اکھیان" یعنی پرانک داستانوں

---

[۱] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکنی کلچر۔ صفحہ ۷۲۔
[۲] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن حصہ دوم۔ صفحہ ۸۶۔
[۳] ۔ غلام صمدانی گوہر۔ دربار آصف۔ صفحہ ۳۶۔
[۴] ۔ سید علی اصغر بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ صفحہ ۹۳ تا ۹۵
[۵] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ صفحہ ۱۰۷۔
[۶] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۲۴۔

Marfat.com

اور قصّوں پر رکھی ہے اور اس میں ہندوستانی طرزِ فکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس مثنوی میں نظامی نے اپنے عہد کے تہذیبی رجحانات کی مصوّری کی ہے کدم راؤ پدم راؤ میں اس دور کی ملی جلی گنگا جمنی اور ہندوانی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے "نظامی کی مثنوی کے مطالعے سے لسانی ارتقاء کی اس منزل کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں زبان ترقی کے زینے طے کر رہی تھی اور ادبی زبان کے معیار کی طرف گامزن ہو چکی تھی اور اپنے لفظی سرمایہ کو وسیع تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی نظامی نے اپنے اسلوب اور پیرایۂ ترسیل کو موثر بنانے اور اس کی معنویت میں اضافہ کرنے کے لئے کہاوتوں اور محاوروں سے بھی مدد لی ہے۔" کدم راؤ پدم راؤ" بہمنی دور کے لسانی اور ادبی مزاج کی مظہر ہے اور اس دور کی ادبی کاوشوں کی اچھی ترجمانی کرتی ہے۔ "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" کے قصّے اُس کی پیشکشی اور بلوری فضاء پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے اور زبان میں بھی خاصی اجنبیت اور غرابت محسوس ہوتی ہے۔ بہمنی دور کے شاعر نظامی نے وہی زبان استعمال کی ہے جسکا خمیر دو قوموں کے باہمی اشتراک اور ان کی مخلوط تہذیب سے تیار ہو رہا تھا۔ نظامی نے جو محاورے اور کہاوتیں استعمال کی ہیں وہ آج بھی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ دکن کے دیہاتوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس مثنوی پر پنجابی، سندھی اور گجراتی وغیرہ کے اثرات کا جمیل جالبی نے تجزیہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک اس نوخیز زبان کے اصل خدوخال پوری طرح نمایاں نہیں ہوئے تھے اور اس کے ادبی معیار کی مکمل صورت گری کا کام ابھی باقی تھا۔ نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہمنی دور کی پہلی مثنوی نہیں، اس سے قبل مثنویاں لکھی گئی ہوں گی لیکن وہ دستبردِ زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچ نہیں سکیں۔ جس سلطنت میں دکھنی کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت حاصل تھی اور جہاں سلاطین خود اسی زبان میں طبع آزمائی کرتے اور اس کی سرپرستی میں مصروف تھے، وہاں شعراء کا اس مخصوص زبان سے دلچسپی لینا اور اس میں "عرض ہنر" کرنا ایک

۱۔ محمد کنج منیر۔ ہندی کاویہ روت نیا چنتن۔ (ہندی) صفحہ ۲۴۔

Marfat.com

فطری امر معلوم ہوتا ہے۔

مقامی باشندوں اور نو وارد نسلوں کے باہمی میل ملاپ کے نتیجے میں اس تہذیب اور زبان نے جنم لیا تھا جس کی روح اور جس کا جسد ہندوستانی تھا لیکن اس کے لباس پر بدیسی اثرات کی پیوند کاری تھی۔ اس زبان و ادب کی صورت گری میں صوفیاء کا بہت اہم حصہ رہا ہے۔ صوفیاء احترام آدمیت اور انسانی اقدار پر ایقان رکھتے تھے انھوں نے محبت اور اخوت کا پرچار کیا اور رام و رحیم کے اختلافات سے قطعِ نظر انسان کو اخلاقی و روحانی عظمت کا درس دیا۔ یہ صوفیاء اپنے ماحول کے اسی دھوپ چھاؤں تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے ان کے اسماء گرامی سے بھی اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ دکن میں ایک ہند لمانی کلچر کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس عہد کے عالم بدرالدین کے نام کے ساتھ "نو لکھی" لکھا جاتا ہے سید یوسف حسینی کا لقب راجا تھا اور سید نصیرالدین کے نام کا جزو کھڑک پھوڑا سی تہذیب اور ماحول کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اس رجحان نے اقبال کے الفاظ میں "غیرت کے پردے" اٹھا دیئے تھے۔ مولانا مسعود چھجو کے نام سے مشہور تھے برہان الدین غریب کے معاصر "پیر پالک" "پیر میٹھے" اور "پیر جمنا" تھے[1] ان تمام بزرگوں کو تبلیغ و اشاعت کے لئے مقامی زبان کی مدد لئے بغیر چارہ نہیں تھا۔

خواجہ بندہ نواز سے ایک عرصے تک معراج العاشقین منسوب کی جاتی رہی ہے لیکن ڈاکٹر محفوظ قتیل نے "معراج العاشقین کا مصنف" میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تصنیف خواجہ بندہ نواز کی کاوش نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی کی "تلاوت الوجود" کا خلاصہ ہے۔ خواجہ بندہ نواز سے جو نثری رسائل اور کلام منسوب کیا جاتا رہا ہے اس میں شبہ کی گنجائش ہے لیکن جس کلام میں خواجہ بندہ نواز اور ان کے پیرِ طریقت دونوں کے نام موجود ہیں اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس زمانے میں قوالی بہت مقبول تھی اور سماج کے سب ہی طبقات کے افراد اس کے دلدادہ تھے اور اس سے حظ و سرور حاصل کرتے تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں نے

---

[1] عبدالقادر سروری۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو تیسرا باب۔ صفحہ ۱۴۱، ۱۴۲۔

Marfat.com

قوالی سے بطور خاص دلچسپی لی تھی اس لئے بھی یہ قیاس غلط نہیں معلوم ہوتا کہ خواجہ بندہ نواز نے بھی گیت کہے ہوں گے۔

خواجہ بندہ نواز کے صاحبزادے اکبر حسینی کے بارے میں عمر یافعی رقمطراز ہیں کہ انہیں نثر اور نظم دونوں میں مہارت حاصل تھی[1] ان بزرگوں کی قدیم نثر و نظم کے تشکیلی مراحل میں علم و ادب سے وابستگی نے زبان کو پروان چڑھانے، اس کے خدوخال متعین کرنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے میں اہم حصہ لیا ان صوفیاء اور اہلِ طریقت کی مساعی کو نظر انداز کر کے ہم زبان و ادب کی ابتدائی منزلوں کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس دَور میں بالعموم ہندی بحریں اپنائی گئیں۔ ہندی پنگل سے اثر پذیری کا عکس ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ فارسی کی ایسی بحریں جو ہندی بحور سے مشابہت رکھتی تھیں ان کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ گجرات اور دکن میں سولھویں صدی کے اختتام تک یہی عروضی ہیئتیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ ہندی بحروں کا مقام فارسی کے عروضی سانچوں نے چھین لیا۔ بیجاپور اور گولکنڈے کے شعرائے قدیم کے شعری اکتسابات میں یہی رجحان کارفرما نظر آتا ہے لیکن سترھویں صدی کے سخن گو اپنے مذاق و معیار میں ایرانی شاعری کے مزاج اور اس کے عروض سے قریب ہوتے گئے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کا فیض روحانی و علمی دکن میں سالہا سال جاری رہا۔ انھوں نے عوام کی "بھلائی اور بہبودی کے لئے درس و تدریس کا سلسلہ بھی قائم کیا تھا۔[2] ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان کی ہدایت و تلقین کے لئے شاہ میراں جی شمس العشاق وہی زبان استعمال کرتے تھے جو یہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔" مغزِ مرغوب" اور "چہار شہادت"

---

[1] ۔ عمر یافعی ۔" آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ شہباز ۔ اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۰ ۔

[2] ۔ نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو ۔ صفحہ ۶۸ ۔ آٹھواں ایڈیشن ترقی اردو بیورو ۔

Marfat.com

کی زبان ہمارے ادب کی لسانی تاریخ میں ایک اہم منزل کی نشان دہی کرتی ہے۔
شمس العشاق نے ہندی بحروں سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے جو ان کے دور کا ایک عام میلان تھا۔

شمس العشاق کے کلام میں ادبیت کی چاشنی موجود نہیں اور وہ مقصدیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے مخاطب چونکہ عوام تھے اس لئے بھی انھوں نے اپنے صوفیانہ افکار و خیالات کی توضیح و تشریح کے لئے سادہ اور براہ راست انداز بیان اختیار کیا ہے۔

بہمنی دور کے شعراء میں لطفی اور مشتاق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

لطفی مشتاق کا ہمعصر تھا۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ لطفی ابوالعطا محمد بن علی خواجہ کرمانی کی قصیدہ گوئی سے متاثر تھا۔[1] لطفی کی ریختی اور قصائد کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ لطفی نے اپنے قصائد میں فارسی الفاظ و تراکیب سے کام لیا ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قصیدے کی صنف لب و لہجے کا طمطراق، بلند آہنگ الفاظ اور پرشکوہ اسلوب کی مقتضی ہے۔ لطفی کو مقامی الفاظ و لغات کے بجائے عجمی اظہار کے پیکروں سے مدد لینی پڑی جو زیادہ مرعوب کن اور پرشکوہ تھے۔ مشتاق اور لطفی کے کلام کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان میں وہ زور، قوتِ ابلاغ اور توانائی پیدا ہو چکی تھی جو قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی پر اکساتی۔ ان شعراء کے قصائد اس دور کے شعری مزاج کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔

مشتاق کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ وہ سلطان محمد شاہ بہمنی (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء) کے دور میں موجود تھا۔[2] سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ مشتاق نے بہمنی بادشاہوں کے تزک و احتشام اور ان کے دربار کی عظمت کو اپنے قصائد میں بہت سراہا ہے۔[3] مشتاق کے کلام میں تشبیہات و استعارات کی لطافت

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ صفحہ ۱۶ ۔ [2] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۴۴ ۔ ۱۷۹
[3] ۔ سخاوت مرزا۔ کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا (مضمون) مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی سہ ماہی جنوری اپریل ۱۹۵۹ء

Marfat.com

اور دلفریبی موجود ہے اس نے انہیں گرد و پیش کے مقامی ماحول سے مستعار لیا ہے اور اس کی شاعری کی اصل روح ہندوستانی ہے۔ مشتاق کی قصیدہ گوئی کے بارے میں الف و نسیم رقمطراز ہیں کہ "شاعرانہ نازک خیالوں" اور "لطافتوں" کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے[1]۔ بہمنی دور میں زبان ترقی کی جو منزلیں طے کر رہی تھی اس کا اندازہ اس دور کے شعرا بر کی کاوشوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

شمالی ہند سے گوناگوں وجوہات کی بناء پر آبادی کی گجرات اور دکن کی طرف ہجرت کو محض سیاسی تناظر میں دیکھنے سے جنوب میں دکنی زبان و ادب کی ترویج و تشکیل کا صحیح تجزیہ ممکن نہیں۔ ہم اسکے تہذیبی عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ گجرات اور دکن کی سلطنتیں دراصل شمالی ہند کے مرکز سے سیاسی ربط منقطع کر کے وجود میں آئی تھیں۔ یہاں ایک نئی بساط سیاست بچھی تھی اس لیے نفسیاتی طور پر وہ تہذیبی سطح پر بھی اپنی انفرادیت تسلیم کروانے کے خواہاں تھے جس کے نتیجے میں زبان کلچر اور پورے طریقۂ بود و باش میں نئے انداز اور نئے رجحانات ابھرنے لگے۔ یہ ریاستیں سیاسی اعتبار سے ایک علیحدہ اکائی کی حیثیت سے وجود میں آئی تھیں اس لیے ان کی ثقافتی اور تہذیبی شناخت بھی ضروری تھی۔ لباس، زیورات طرزِ تعمیر، فنون لطیفہ، آداب نشست و برخاست اور پوری معاشرتی زندگی میں ایک نیا میلان کارفرما نظر آتا ہے جو شمالی ہند سے مختلف اور ممیز ہے۔ یہ رویہ محض سیاسی اور تہذیبی اقتدار کی اہمیت تسلیم کروانے کا وسیلہ نہیں تھا بلکہ وقت کا ایک تقاضہ بھی تھا کیونکہ ان علاقوں میں بدیسی افراد اور مقامی باشندوں کے درمیان ربط و ضبط ضروری تھا۔ تہذیبی لین دین بھی یک طرفہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات ہمہ جہتی ہوتے ہیں چنانچہ اسی کے دُور رس نتائج کی صورت میں زبان و ادب بھی نشو و نما کی منزلیں طے کرتے اور اپنی شناخت کروانے پر مُصر نظر آتے ہیں۔ اس طرح دیسی عناصر کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی ایک ناگزیر حقیقت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ شمالی ہند میں فارسی دربار اور

---

[1] ۔ الف و نسیم ۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد۔ پانچواں باب صفحہ ۲۷۶ ۔

Marfat.com

دفاتر کی زبان تھی اور اس سے واقفیت معتبر ہونے کی دلیل تھی لیکن جنوبی ہند میں مقامی عناصر سے ترتیب پانے والی زبان نے تشکیل و تعمیر کی منزلیں طے کر کے اپنے لسانی وجود کو تسلیم کروالیا۔ بہمنی اور پھر عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے اس کی سرپرستی کی۔ ان ریاستوں کے اکثر سلاطین شعر و ادب کے دلدادہ اور خود شاعر تھے اس لئے اس زبان سے ان کی دلچسپی اور اس کی قدر دانی نے اس نوخیز لسانی وحدت کو تیزی سے پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا۔

بہمنی دور کے جو ادبی نمونے اس وقت ہماری دسترس میں ہیں ان کے مطالعے اور تجزیئے سے ہم چند نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ تصوف و اخلاق شعراء اور ادیبوں کا ایک پسندیدہ موضوع تھا۔ بہمنی دور کی غزل گوئی کے جو چند نمونے محفوظ رہ سکے ہیں ان کے تجزیئے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالعموم ہندی اوزان مستعمل تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ فارسی بحریں بھی استعمال کی جانے لگی تھیں اور اس عہد میں فارسی کی وہی بحریں مقبول تھیں جو ہندوی اوزان سے مشابہت رکھتی تھیں دوسرے یہ کہ طویل نظمیں اور مثنویاں لکھنے کی روایت ابتدا ہی سے موجود تھی۔ مثنوی میں بھی اخلاق آموزی کا عنصر اپنی جھلک دکھاتا رہتا تھا۔ قدیم دکنی میں شاگردوں اور مریدوں کی رہبری اور رہنمائی کے لئے متصوفانہ اور اخلاقی نکات کی تشریحیں کی جاتی تھیں اور عموماً براہ راست انداز اپنایا جاتا تھا لیکن اس سلسلے میں کہیں کہیں مکالمے کے انداز سے بھی مدد لی گئی ہے اس عہد کی نظموں پر بھجنوں اور گیتوں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اور ان قدیم نظموں کا لب و لہجہ اور آہنگ گیتوں کی یاد دلاتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ پر غور کریں تو ان میں سنسکرت کے تت سم اور تت بھو الفاظ اور پراکرت کی لغات کا تناسب زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

"مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں ان کی جیسی بہتات ہے وہ بعد کی ادبی کاوشوں میں نظر نہیں آتی یہاں تک کہ اشرف کی "نوسرہار" (۹۰۹ھ) کے بعض اشعار کی زبان میں بھی ان کی تعداد خاصی گھٹ گئی ہے۔ اس دور کے شعراء نے اپنی زبان کو "گجری" یا "ہندوی" اور "ہندی" سے تعبیر کیا ہے۔ "بھوگ بل" میں پہلی بار قریشی نے اپنی زبان کو "دکھنی" سے موسوم کیا۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ بہمنی دور اور اس کے خاتمے کے بعد وجود میں آنے والی سلطنتوں بالخصوص بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ میں یہ زبان جو عوامی ابلاغ و ترسیل کا ایک اہم اور موثر وسیلہ تھی مسلسل نشو و نما پاتی گئی اور اس کی حرارت و توانائی اور قوتِ اظہار میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی ترویج و ترقی میں سیاسی، مذہبی اور تہذیبی عوامل کارفرما رہے۔ بہمنی دور میں ہندوی اثرات اور ہندوی روایات کی توسیع ہوئی لیکن رفتہ رفتہ گوناگوں محرکات کے زیرِ اثر ہندوی روایت کمزور ہوتی گئی اور عجمی اثرات نے اس کی جگہ اس طرح لے لی کہ اس کی بنیادی خصوصیات اور اس کے مزاج کا اثر پوری طرح زائل نہیں ہو سکا۔

دکن میں تین بڑی زبانیں تین مختلف علاقوں میں رائج تھیں، تلگو، کنڑی اور مراہٹی لیکن ان میں سے کوئی بھی زبان پورے دکن میں دوسری زبانوں کو زیر کر کے رابطہ کی زبان نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے برخلاف سماج کے مختلف طبقات کے باہمی ربط اور ملاپ کا واحد ذریعہ وہ نوزائیدہ زبان تھی جو تلگو، مراہٹی اور کنڑی کی طرح ایک علاقے کی مخصوص زبان نہیں بلکہ تمام دکن کے عوام کی مشترکہ زبان تھی اور تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ تلگو، کنڑی یا مراہٹی کا کوئی اپنا علاقہ نہیں تھا۔ یہ زبانیں علیحدہ علیحدہ خطوں میں ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھیں لیکن ان کے علاقوں میں ان کے متوازی نشو و نما پانے والی زبان کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا اور وہ عوام کی کثیر تعداد کی تعلیم و تلقین کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

علاء الدین خلجی کے سرزمینِ دکن پر قدم رکھنے سے پہلے بھی یہاں ایسے بزرگ اور صوفیاء موجود تھے جن کی زندگی کا مقصد روحانی اور اخلاقی اقدار کا پرچار تھا یہ صوفیاء بڑے خلوص اور خاموشی کے ساتھ اپنی خدمت میں مصروف تھے اس سلسلے میں حاجی رومی، سید شاہ مومن، سید مظہر عالم، جلال الدین گنج ردان، سید احمد کبیر اور بابا شرف الدین کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ عالمگیر کی فتح دکن تک یہ زبان و ادب جو صوفیاء اور اولیاء اللہ کی کاوشوں کا بھی ثمرہ تھا تعمیر و تشکیل اور صورت گری کے مختلف مراحل سے گذرتی رہی یہاں تک کہ جب

Marfat.com

"ریختہ" کا نیا معیار قائم ہوا تو یہی معیار تمام ہندوستان کی لسانی کسوٹی بن گیا۔
جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو پانچ خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔ بیدر پر جو بہمنوں کا پایۂ تخت تھا بریدشاہیوں کا قبضہ رہا۔ بریدشاہی سلاطین تہذیب و ثقافت اور علم و ادب میں بہمنی روایات کے پیرو تھے۔ بریدیوں نے بیدر میں تقریباً سو برس حکومت کی۔ بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہ نے ۱۶۱۹ء میں اسے اپنی حکومت میں ضم کرکے اس کا خاتمہ کر دیا۔ بیدر بہمنی دور میں علماء و فضلاء کا مسکن تھا۔ وہ یہیں رہ بس گئے تھے۔ ان کی اولاد بھی مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہی۔

برار کی عماد شاہی اور احمد نگر کی نظام شاہی سلطنتیں بھی بہمنی حکومت کے کھنڈر پر تعمیر ہوئی تھیں۔ نظام شاہی سلطنت کا بانی نظام الملک بحری کا بیٹا ملک احمد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محمود گاواں کے قتل کی سازش میں نظام الملک بحری بھی ملوث تھا۔ ملک احمد دولت آباد کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتا تھا۔ احمد کے بعد برہان نظام شاہ، حسین نظام شاہ اور مرتضیٰ نظام شاہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ حسین نظام کا سیاسی تدبر قابل ستائش تھا اس نے دکن میں سیاسی توازن برقرار رکھنے قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی مدد سے وجیانگر کے راجا کو پسپا کر دیا تھا اس جنگ کا حال حسن شوقی نے "جنگ نامہ نظام شاہ" میں نظم کیا ہے۔ چاند بی بی اس ریاست کی شہزادی تھی اور اس نے اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے مغلوں سے خود جنگ کی تھی۔ چاند بی بی نے مغل شہزادہ مراد کا مقابلہ کرکے اپنی شجاعت و دلیری کی دھاک بٹھادی تھی اس سلطنت کا خاتمہ ۱۶۰۰ء میں ہوا۔

اشرف کی "نوسرہار" اس عہد کی رثائیہ شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے اشرف نے واقعات کربلا کی جو تفصیلات نظم کی ہیں وہ تاریخی اعتبار سے درست نہیں دوسرے یہ کہ "نوسرہار" میں واقعات کربلا کے بہت سے اہم گوشوں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اور تاریخ اسلام کے اس عظیم واقعے کو شاعر نے اپنے تخیل کے بل بوتے پر من مانے انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود "نوسرہار" کی تاریخی اور لسانی اہمیت مسلمہ ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زبان کی ارتقائی منزلیں کیا تھیں۔ جب ہم زبان کے ارتقائی

Marfat.com

تناظر میں "نوسرہار" کا جائزہ لیتے ہیں تو اس شعری کاوش میں کہیں کہیں عجزِ بیان کا احساس ہوتا ہے اور زبان کے لفظی خزانے کے محدود ہونے اور قوتِ ابلاغ کی کوتاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "نوسرہار" اپنے عہد کی لسانی، عروضی اور فنی خصوصیات کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی اکھڑی اکھڑی اور بعض جگہ بے ربط زبان اور عروض و قواعد کے اصولوں کی لچکداری سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کو مانجھنے اور اور جلا بخشنے کی کوشش کا آغاز ہو چکا تھا اور زبان کو ایک مخصوص معیار سے قریب کرنے کی جد و جہد جاری تھی۔ اس دور کا ایک اور شاعر زہدار فانی تھا۔ زہدار فانی کے سنتیس (۳۷) رسالوں کا پتہ چلتا ہے وہ بقول نذیر احمد ایک صاحبِ دیوان شاعر تھا[1] لیکن اس کی صرف چند غزلیں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ زہدار فانی غزل کی ہیئت سے آشنا اور اس صنف کے مزاج سے واقف تھا۔ غزل کی روایات کو متعین کرنے اور انہیں ایک سمت عطا کرنے والوں میں زہدار فانی کا نام بھی شامل ہے۔

احمد نگر میں دکنی زبان و ادب نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں ہم ان کی تفصیل سے واقف نہیں۔ احمد نگر بھی ایرانی علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ جب شاہ اسماعیل نے شاہ طاہر کی غیر معمولی شہرت اور عوام میں ان کے درس کی مقبولیت کا حال دیکھا تو انہیں قتل کر دینے کا حکم دیا۔ شاہ طاہر اپنی جان بچا کے نکلے اور بیجاپور پہونچ گئے جہاں اس وقت اسماعیل عادل شاہ کی حکومت تھی۔ ۱۵۲۲ء/۹۴۰ھ میں برہان نظام شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی جہاں علم و فضل کی وجہ سے وہ اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ نظام شاہی دور کے ایک شاعر آفتابی کا ذکر "دکن میں اردو" میں موجود ہے جسے حسین نظام شاہ کے عہد (۱۵۵۴ء تا ۱۵۶۵ء) کا شاعر بتایا گیا ہے اس نے "شاہ نامہ" کی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی جو تین سو ستر اشعار پر مشتمل تھی اور اس دور کا دوسرا شاعر اشرف بیابانی ہے جس کا شعری کارنامہ "نوسرہار" تاریخِ ادب اردو کی ایک

---

[1] نذیر احمد علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ الف۔ صفحہ ۲۴۸۔

13885

Marfat.com

اہم کڑی تصور کیا جاتا ہے۔" نوسرہار"(۹۰۹ھ) مثنوی کی ہیئت میں ہے اور اس میں واقعاتِ کربلا نظم کئے گئے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے بعد قائم ہونیوالی ایک اہم سلطنت بیجاپور کی عادل شاہی حکومت تھی۔ اس کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ عادل شاہی سلاطین نے علماء وفضلاء کی بڑی سرپرستی کی۔ ایران، عراق، عرب، آذربائیجان اور دوسرے ملکوں کے علماء بیجاپور میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بیجاپور میں علم وادب کی شمعیں روشن کر دیں اور یہاں کے علمی وادبی معیار کو بلند کیا یہ علماء درس وتدریس میں مصروف رہتے یا تبلیغ واشاعت میں۔ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم اُن بلند پایہ صوفیاء میں سے تھے جن کے سلسلے کے بزرگوں نے رشد وہدایت اور تعلیم وتدریس کے ذریعے سے خلقِ خدا کی بے مثل خدمت انجام دی۔

عاشق دکنی دور ابراہیم عادل شاہ ثانی کا سخن گو ہے۔ اس کی تین مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ اس کی یادگار ایک قصیدہ بھی ہے جو اس نے اپنے مرشد صبغۃ اللہ کی مدح میں لکھا تھا۔ اس قصیدے میں لب ولہجے کی وہ گونج، وہ شان وشوکت اور طنطنہ نہیں جو صنفِ قصیدہ کی پہچان ہے لیکن اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سولھویں صدی میں مختلف اصناف ادب نے کس حد تک ترقی کی تھی اور ان کا ذخیرۂ الفاظ اور اسلوب کیا تھا۔

بہمنی سلطنت کے خاتمے پر وجود میں آنے والی ایک اور سلطنت قطب شاہی مملکت تھی اس کا پایۂ تخت گولکنڈہ تھا۔ بانیِ سلطنت گولکنڈہ سلطان محمد قلی تھا جو سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود مختار بن گیا تھا۔ سلطان محمد قلی کے بعد اس کا بیٹا جمشید قلی تخت نشین ہوا جو ظالم اور سفاک ہونے کے باوجود شعروادب کا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں شعراء اور علماء کی سرپرستی کی تھی اس کے دربار کا ملک الشعراء محمد شریف وقوعی تھا۔ جمشید کے بعد اس کا کمسن لڑکا چھ مہینے کے لئے تخت پر بٹھایا گیا لیکن اس کے عہدِ حکومت میں گولکنڈے کی سلطنت سیاسی افراتفری کا

Marfat.com

شکار ہو گئی۔ ابراہیم قطب شاہ کے سیاسی تدبر اور دانشمندی نے اسے عوام میں بہت مقبول بنا دیا تھا اس لئے حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اسے وجیا نگر سے گولکنڈہ آنے کی دعوت دی گئی اور وہ ابوالمظفر ابراہیم قطب شاہ کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ابراہیم کی تخت نشینی قطب شاہی سلطنت کے لئے فالِ نیک ثابت ہوئی اور تہذیبی و علمی ترقی کے کام شروع ہو گئے ابراہیم قطب شاہ کی علم دوستی اور سخن پروری کی وجہ سے گولکنڈے میں بلند پایہ شاعر اور فنکار جمع ہو گئے تھے۔ فیروز، محمود اور ملا خیالی اس عہد کے بلند پایہ شاعر تھے۔ فیروز بیدر کا باشندہ تھا۔ اس نے "پیرت نامہ" اپنی یادگار چھوڑا ہے جس سے اس کے جذباتِ عقیدت و احترام کا پتہ چلتا ہے۔ محمود اور ملا خیالی دور ابراہیم کے سربرآوردہ شاعر تھے۔ ہم ان کے مفصل حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہیں۔ داستانِ فتح جنگ میں سید اعظم نے ملا خیالی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے اور ان سے اپنی خوشہ چینی کا اعتراف کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا خیالی کی شاعری اس دور میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی تھی اور بعد کی نسلیں بھی ان کی پیروی پر ناز کرتی تھیں چنانچہ "پھول بن" میں ابنِ نشاطی ملا خیالی سے داد کا طالب نظر آتا ہے۔ دور مابعد کے شعراء نے محمود اور فیروز کے ساتھ ملا خیالی کا نام بھی لیا ہے جس سے ان کی ممتاز ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جمیل جالبی نے ملا خیالی کی ایک طویل غزل کا نمونہ درج کیا ہے[1] ملا خیالی کی غزل اس حقیقت کی غماز ہے کہ اس کا خالق بندش، تراکیب، لب و لہجے اور پیرایۂ ابلاغ کے سلسلے میں فارسی کے شعری پیکروں کو اپنے انداز میں ڈھال کر نئی روایات کی تشکیل کی طرف مائل ہے۔ دکنی غزل کی نوک پلک درست کرنے میں ملا خیالی کا بھی اہم حصہ معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] ۔ جمیل جالبی ۔ تاریخ اردو ادب ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۳۹۵

[2] ۔ " " " " " ۔ صفحہ ۴۰۷، ۴۰۸ ۔

Marfat.com

استادالاساتذہ فیروز کا وطن بیدر تھا اس نے بقول مسعود حسین خاں سلطنت بہمنیہ کا چراغ ٹمٹماتے دیکھ کر سولھویں صدی کے وسط میں بیدر کی سکونت ترک کر کے گولکنڈے کے نئے علمی وادبی مرکز کا رخ کیا تھا۔ فیروز نے "پرت نامہ" میں اپنے مرشد مخدوم جی کی ستائش کی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے "پرت نامہ" اور اس قسم کی دوسری ادبی کاوشوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن یہ تخلیقات زبان وادب کے لسانی مطالعے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیں اور زبان کے مختلف مدارج کا اندازہ لگانے کے لئے ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دیوی سنگھ چوہان لکھتے ہیں:۔

"لسانی پہلو سے پرت نامہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی روشنی میں کئی پیچیدہ مسائلِ لسانیات پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے"[1]

فیروز اور قریشی کی زبان میں جو مماثلت نظر آتی ہے اس سے مسعود حسین خاں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "دکنی اردو ارتقاء کے تمام مدارج بیدر میں طے کر چکی تھی اور فیروز ایک پختہ زبان اور اسلوب کے ساتھ گولکنڈہ پہنچے تھے"[2]

محمود کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھا بلکہ شاعروں کی قدر دانی اور شعر گوئی کو مقبول عام بنانے میں سرگرم بھی رہتا تھا محمود کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غزل میں نیا اسلوب اور نیا طرز اپنی جگہ بنا رہا تھا اور قدیم دکنی غزل میں فارسی روایات اور عجمی لب ولہجہ جذب ہونے لگا تھا[3]۔ محمود کا کلام ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ فارسی لب

---

[1] ۔ دیوی سنگھ چوہان۔ پرت نامہ کا لسانی پہلو (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۵۔

[2] ۔ مسعود حسین خان۔ پرت نامہ۔ قدیم اردو جلد اول۔ ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۴۲۔

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ پانچواں باب صفحہ ۳۵۶۔

Marfat.com

دلہجے اور اسالیب سے اردو غزل کا خمیر تیار ہو رہا تھا۔ جمیل جالبی رقمطراز ہیں:۔

"محمود کے کلام کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہندوی اثرات اردو شاعری سے بھاپ بن کر اُڑ رہے ہیں اور ان کی جگہ فارسی اثرات لے رہے ہیں[1]"

محمود غزل کے فن سے آشنا تھا اور اُسے غزل کی ہیئت اور اس کے اجزاء کا شعور بھی تھا۔ محمود دو غزلہ لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا اظہار کرتا ہے۔ اگر ہم محمود کو اپنے عہد کی غزل گوئی کا مجدد کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

شاہ راجو قتّال

سید یوسف حسینی جو شاہ راجو قتّال کے نام سے مشہور ہوئے ان بزرگوں میں سے تھے جو دہلی سے دولت آباد چلے آئے تھے۔ شاہ راجو قتّال، خواجہ بندہ نواز کے والد ماجد تھے۔ اسی تخلّص کے ایک اور بزرگ شاہ ضیاء الدین قتّال تھے ان کے حالاتِ زندگی گلبرگہ گزیٹیر میں درج ہیں۔ گلبرگہ کے راجا رائے بہیرن نے انہیں ۷۳۹ھ میں قتل کروادیا تھا[2] وہ فرید الدین گنج شکر کے پوتے اور اخوند میر صدر الدین جوہری کے مرید تھے "جوامع الکلم" کے مرتب نے تحریر کیا ہے کہ "قتّال" سے مراد قتال نفس ہے[3] ڈاکٹر ٹی این دیورائے لکھتے ہیں کہ جب سلطان محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء میں سید محمد المعروف بہ سید راجا اور ان کے عزیز و اقارب اس قافلے کے ساتھ جس میں مشہور بزرگ شیخ برہان الدین غریب اور بعض دوسرے مشائخ و صوفیاء بھی تھے دولت آباد آگئے تھے[4] بقول مصنف "تاریخ حبیبی" شاہ راجو قتّال کے اجداد خراسان سے وارد ہندوستان ہوئے تھے[5]۔ "واقعات مملکت بیجاپور" میں بشیر الدین احمد لکھتے ہیں کہ سید یوسف اور ان کے والد سید علی، نظام الدین اولیاء کے مرید تھے[6]

---

[1] ۔ محمد سلطان۔ ارمغانِ سلطانی۔ المعروف بہ سیر گلبرگہ صفحہ ۱۷۸۔

[2] ۔ حامد صدیقی۔ مقدمہ جوامع الکلم۔ صفحہ ۷۔

[3] ۔ ٹی این دیورائے۔ اے شارٹ ہسٹری آف پرشین لٹریچر ایٹ بہمنی۔ دی عادل شاہی اینڈ دی قطب شاہی کورٹس۔۔۔۔۔۔۔ دکن۔ صفحہ ۲۰۔

[4] ۔ معشوق یار جنگ (مترجم) تاریخ حبیبی۔ صفحہ ۸۔

[5] ۔ بشیر الدین احمد۔ واقعات مملکت بیجاپور حصّہ سوم صفحہ ۲۰۹

Marfat.com

اس نام کے بعض اور بزرگ بھی گذرے ہیں۔ عبدالجبار ملکاپوری نے "تذکرہ اولیائے دکن" میں تین صوفیاء، شیخ یوسف چشتی، شاہ یوسف، اور شاہ یوسف بیجاپوری کا ذکر کیا ہے لیکن یہ تینوں سید یوسف حسینی شاہ راجو قتّال سے مختلف شخصیتیں ہیں۔

شاہ راجو کی ولادت دہلی میں ہوئی اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین سے بیعت ہوئے اور نصیر الدین چراغ دہلی سے خلافت پائی۔ آپ کے والد سید علی اور دادا سید محمد نامور اہلِ باطن گذرے ہیں۔ اقبال الدین احمد لکھتے ہیں کہ سید یوسف حسینی شاہ راجو فتّال قلعہ دلّی کے خاص ملازم تھے[1] عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ شاہ راجو اپنے والد کی طرح، شیخ المشایخ کے مرید تھے اور انہیں کے حکم پر دولت آباد میں سکونت پذیر ہوئے تھے[2] نصیر الدین شاہ چراغ سے شاہ راجو کو والہانہ عقیدت تھی اور انھوں نے اپنی کتاب "تحفۃ النصائح" میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

بقول مصنف "تذکرہ خواجہ گیسو دراز" شاہ راجو قتّال ۲۰ رمضان ۷۲۵ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے تھے اور سات سو کوس کا فاصلہ چار ماہ میں طے کرتے ہوئے ۱۷ محرم ۷۲۵ھ کو دولت آباد پہنچے اور یہیں قیام کیا تھا[3] اس وقت شاہ راجو کے صاحبزادے سید محمد حسینی ان کے ہمراہ تھے اور ان کی عمر چار برس تھی[4] عبدالحق نے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاء کرام کا کام" میں سید یوسف حسینی کو جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے چھوٹے بھائی بتایا ہے[5] شاہ راجو کے دو صاحبزادے تھے سید حسن چندن اور سید محمد حسینی گیسو دراز۔ شاہ راجو کے دونوں صاحبزادوں نے نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے بیعت حاصل کی تھی۔ دولت آباد

---

[1] ۔ اقبال الدین احمد۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۲۸۔

[2] ۔ عبدالقادر سروری۔ اُردو کی ادبی تاریخ صفحہ ۶۶۔

[3] ۔ اقبال الدین احمد۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز صفحہ ۲۹۔

[4] ۔ عبدالقادر سروری۔ ملی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ صفحہ ۱۴۵۔

[5] ۔ عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ صفحہ ۲۴۔

Marfat.com

کے ایک مشہور بزرگ اور صاحبِ کشف و کرامات ولی شیخ بابو نے ان دونوں لڑکوں کو دیکھ کر شاہ راجو قتال سے ان کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی۔ "تاریخ حبیبی" کے مترجم نے شیخ بابو کی گفتگو اس طرح نقل کی ہے:۔

سید صاحب آپ کا بڑا لڑکا ایک سوداگر آدمی ہے تاہم نیک روش اور صلاحیت شاملِ حال ہے لیکن چھوٹے لڑکے میں دیکھ رہا ہوں کہ دانشمند وہ ہے، عارف وہ ہے، محب وہ ہے، ولی وہ ہے، مرشد وہ ہے"۔[1] محمد عبد المجید نے "روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء" میں شاہ راجو کے دو اور صاحبزادوں سید احمد اور سید علی حسینی کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ اول الذکر کم سنی میں فوت ہو گئے تھے اور مؤخر الذکر لاولد تھے[2] جیسا کہ کہا جا چکا ہے شاہ راجو قتال جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت کے چھوٹے بھائی تھے ان کے برادر نسبتی سید ابراہیم متوفی کو حکومت دہلی نے دولت آباد کا صوبہ دار مقرر کیا تھا[3] "رونق علی روضۃ الاقطاب" میں لکھتے ہیں کہ انہیں گلبرگہ سے چار سو روپیے سالانہ ملا کرتے تھے اور زمین بھی نذر کی گئی تھی[4] سید یوسف حسینی فارسی کے اچھے شاعر تھے اور راجا تخلص کرتے تھے[5] غالباً اسی مناسبت سے ان کی شریکِ حیات "رانی بزرگ" کہلاتی تھیں۔ "ارمغانِ سلطانی" کے مصنف خواجہ بندہ نواز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شاہ راجو کو سماع سے خاص شغف تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے یہہ واقعہ بیان کیا ہے۔

"میرے والد کو سماع کا بہت شوق تھا۔ دہلی میں ایک روز سماع تھا۔ بعض لوگ اپنے تلووں کو کچھ دوا لگا کر آگ پر ناچتے تھے۔ میرے والد کو سماع سن کر بے خودی طاری ہو گئی۔ ضبط نہ کر سکے۔ آگ میں کودے اور لوٹنے لگے۔ لوگ حیرت میں رہے کہ ہم تو دوا کے اثر سے آگ میں کود کر محفوظ رہتے ہیں مگر یہ تو بے ساختہ گر کر لوٹ رہے ہیں۔ دیکھیں کہیں جل تو نہیں گئے۔ اچھی طرح دیکھا مگر آپ کو کہیں جلا ہوا نہیں پایا"[6]

---

[1] معشوق یار جنگ (مترجم) تاریخ حبیبی۔ صفحہ ۹۔

[2] محمد عبد المجید۔ روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء۔ صفحہ ۷۴۔

[3] عبد القادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ صفحہ ۱۴۵۔

[4] رونق علی۔ روضۃ الاقطاب۔ صفحہ ۷۵۔

[5] رونق علی۔ روضۃ الاقطاب۔ صفحہ ۷۵۔ [6] محمد سلطان۔ ارمغان سلطانی المعروف بہ سیر گلبرگہ صفحہ ۱۷۸

Marfat.com

محمد علی سامانی "سیر محمدی" میں لکھتے ہیں کہ شاہ راجو کا انتقال ۱۳ ذیقعدہ کو ہوا تھا۔[1] اقبال الدین احمد "تذکرہ خواجہ گیسو دراز" میں رقمطراز ہیں کہ بندہ نواز کی عمر گیارہ سال تھی کہ آپ کے والد بزرگوار سید یوسف حسینی راجا نے بتاریخ ۵ شوال ۷۳۱ھ داعی اجل کو لبیک کہا۔[2] شاہ راجو کا انتقال دولت آباد میں ہوا اور وہ یہیں سپرد خاک ہوئے۔ "ارمغانِ سلطانی" میں لکھا ہے کہ شاہ راجو نے دولت آباد میں ۷۳۲ھ میں رحلت کی تھی اور خلد آباد میں آسودہ ہیں۔[3] رونق علی، بشیر الدین احمد اور آزاد بلگرامی نے شاہ راجو کا سن وفات ۵ شوال ۷۳۱ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۳۳۱ء بتایا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ "تاریخ قندھار دکن" کے مصنف منشی امیر حمزہ نے شاہ راجو کا سنہ وفات ۵ شوال ۷۳۲ھ تحریر کیا ہے۔[4] لیکن شیخ عبدالقادر سرفراز کا بیان ہے کہ شاہ راجو کا وصال ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۹۲ء میں ہوا تھا ان کا استدلال یہ ہے کہ "تحفۃ النصائح" اسی سال لکھی گئی تھی۔ اقبال الدین احمد نے تحریر کیا ہے کہ قلعہ دولت آباد سے تین کوس کے فاصلے پر خطیرہ بزرگان دین میں بیرون حصار روضہ شاہ راجو کو سپرد خاک کیا گیا تھا۔ ہر نوچندی جمعرات کو ان کے مزار پر عقیدت مندوں کا میلہ سا لگتا تھا۔[5] "سیر محمدی" میں محمد علی سامانی کا بیان کسی قدر مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سید راجا کا وصال دولت آباد میں ہوا تھا اور یہیں لری کے قریب وہ مدفون ہیں انھوں نے خواجہ بندہ نواز کے یہ الفاظ تحریر کئے ہیں:۔

"درخانہ ما صحن بسیار بود و والد را ہما اینجا دفن کردیم"[6]

شاہ راجو فتاح کے فارسی کلام کا مجموعہ "دیوان راجا" ان کی یادگار ہے۔ شاہ راجو

---

[1] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۱۰۳۔

[2] ۔ اقبال الدین احمد۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۳۱۔

[3] ۔ محمد سلطان۔ ارمغانی سلطانی المعروف بہ سیر گلبرگہ۔ صفحہ ۳۱۔

[4] ۔ منشی محمد امیر حمزہ۔ تاریخ قندھار دکن۔ صفحہ ۴۵۔

[5] ۔ اقبال الدین احمد۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۳۱۔ [6] محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۔

Marfat.com

فتاؔل کی مشہور فارسی نظم "تحفۃ النصائح" ہے جو انھوں نے اپنے فرزند سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز کی ہدایت و رہنمائی کے لئے لکھی تھی ؎

گویا ہمی یوسف گدا در وعظ سخنے چند را
از بہر خلف خوش لقا بوالفتح آن نورالبصر

اس نظم کا قطب زاری نے اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کی فرمائش پر دکنی میں ترجمہ کیا تھا[1]۔ وہ کہتا ہے ؎

تحفہ ہے اصل یو فارسی سب ترجمہ دکنی کیا
صاحب سو دنیا دین کے شہہ بوالحسن فرمائے پر

شاہ راجو سے ایک منظوم رسالہ "سہاگن نامہ" بھی منسوب کیا جاتا ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے[2]۔ عبدالقادر سروری نے اسے شاہ راجو فتاؔل کی شعری کاوش قرار دیا ہے[3]۔ لیکن کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست کے مرتب نصیرالدین ہاشمی اس کو ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد شاہ راجو فتاؔل ابن صفی اللہ کی نظم بتاتے ہیں[4]۔ زبان اور طرز ادا کے اعتبار سے "سہاگن نامہ" شاہ راجو فتاؔل کے عہد کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ سہاگن نامہ کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے ؎

سن ری سہاگن سن ری سن
اک اک بول تو چت دھر سن

اس مسلسل نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مت دیوا کہیں بھیں گے — بت دیوا کہیں پوجیں گے
جانے جو سے پوچ نکو — سُک اور سہرا کوچ نکو
کہیں صدقہ کیسر کاری کی — یا کہیں سر یر واری کی

---

[1] ۔ سیدہ جعفر ۔ سکھ انجن ۔ صفحہ ۲ ۔
[2] ۔ مخطوطہ نمبر ۱۹ ۔ فقہ و عقائد ۔ کتب خانہ سالار جنگ ۔ حیدرآباد ۔
[3] ۔ عبدالقادر سروری ۔ اردو کی ادبی تاریخ ۔ صفحہ ۶۷ ۔
[4] ۔ نصیرالدین ہاشمی ۔ کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ۔ صفحہ ۔ ۱۲۵ ۔

Marfat.com

دیوی ملے جن لاویں　　بے شک دوزخ میں جاویں
ناری گھریاں باندے نا　　ماٹ اور مٹکیاں مانڈے نا

"رسالہ حضرت شاہ راجو" کتب خانہ روضتین گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز کے بعض فارسی رسالوں کے ساتھ منسلک ہے [1]

اس رسالے میں اسلامی عقائد کی توضیح اور متصوفانہ نکات کی تشریح کی گئی ہے۔ مصنف نے سوال وجواب کی شکل میں اسے قلمبند کیا ہے اس رسالے کی نظم کا نمونہ درج ذیل ہے ؎

"جان اے عزیز اول کچھ نہ تھا۔ آسمان تھا نہ زمین عرش نہ کرسی چاند تارے نہ کچھ تھا اور ذات حق تعالیٰ اپنے میں ایسا تھا اس حد تک کہ صفتوں کا بھی ظہور نہ تھا۔ نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی۔

سوال:۔ کس واسطے خبر نہیں رکھتا تھا۔

جواب:۔ کہ خبر رکھنا صفتوں سے تعلق رکھتا ہے ہور ذات سوں ایسا مشغول تھا جو کسی صفاتاں کا گنجائش نہ تھا جس وقت صفاتاں کا گنجائش نہ تھا تو خبر رکھنا بھی ممکن نہیں۔

سوال:۔ صفتاں قدیم یا جدید۔

جواب:۔ قدیم میں ظہور اس کا ذات مربی میں مخفی حبوں کی شراب ذات میں عطر پھول میں۔ [2]

اس رسالے میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ ہمیں کوئی ایسی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ رسالہ سید یوسف حسینی شاہ راجو قتال ہی کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ شاہ راجو قتال کی تصنیف نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی زبان خاصی صاف اور نسبتاً جدید ہے۔ نثر کے لسانی رنگ و خال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ دور مابعد کی تصنیف ہے اور اس کو کسی طرح شاہ راجو کے عہد کی نثر کا نمونہ

---

[1] رفیعہ سلطانہ۔ اردو نثر کا آغاز و ارتقا ۱۵ سویں صدی کے اوائل تک۔ صفحہ ۶۷۔
[2] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفحہ ۶۳۔

Marfat.com

نہیں کہا جا سکتا۔ جب ہم برہان الدین جانم کی نثر سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس کی لسانی خصوصیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ زیرِ بحث رسالے کی زبان پر قدامت کی چھاپ گہری نظر نہیں آتی۔ بہرحال اس رسالے کو خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتّال سے کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ گولکنڈے کے آخری بادشاہ تانا شاہ کے مرشد کا نام بھی شاہ راجو قتّال تھا۔ وہ انہی شاہ راجو قتّال کی نویں پشت میں تھے اور ۱۰۹۳ھ میں وفات پائی تھی۔ انھوں نے ایک چکی نامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ اس کا مفصل ذکر اگلے صفحات میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ یہ رسالہ خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتّال کی نہیں بلکہ ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد شاہ راجو قتّال کی تصنیف ہو۔

بشیر الدین احمد شاہ راجو قتّال کے نام اور عہد کے تعلق سے زبردست غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں[1] انھوں نے شاہ راجو قتّال کو خواجہ بندہ نواز کے والد اور ابوالحسن تانا شاہ کا مرشد تحریر کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز آٹھویں بہمنی حکمراں فیروز شاہ بہمنی اور اس کے جانشین احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد کے صوفی ہیں اور ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈے کا آخری تاجدار ہے۔ ان دونوں میں دو صدی سے زیادہ عرصے کا فرق ہے۔

"روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء" کے مصنف محمد عبدالمجید نے شاہ راجو قتّال کی ایک مثنوی "مثنوی راجا" کی بھی نشان دہی کی ہے[2]

خواجہ بندہ نواز

شہباز بلند پرواز خواجہ بندہ نواز کا سنِ پیدائش محمد علی سامانی نے ۴ رجب ۷۲۱ھ (مطابق ۳ ستمبر ۱۳۲۱ء) بتایا ہے[3] ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔

---

[1] ۔ مخطوطہ چکی نامہ۔ نمبر ۳۷۷۔ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] ۔ بشیر الدین احمد۔ واقعات مملکت بیجاپور حصہ سوم صفحہ ۲۸۱۔ [3] محمد عبدالمجید۔ روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء صفحہ ۷۳۔ [4] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی صفحہ ۳۔ اقبال الدین احمد نے گیسو دراز کی تاریخ ولادت ۷۲۰ھ بتائی ہے جو بیاض خواجہ اولیاء سے نکلتی ہے اس کے علاوہ انھوں نے دو منظوم تاریخیں بھی درج کی ہیں۔ "تذکرہ گیسو دراز۔ صفحہ ۲۷۔

Marfat.com

اسمِ گرامی سید محمد اور کنیت ابوالفتح تھی۔ بندہ نواز کا لقب صدرالدین الولیٰ الاکبر اور الصادق تھا۔" تبصرہ الخوارقات" کے مصنف سید من اللہ حسینی بن علی اللہ لکھتے ہیں کہ ایک روز لوگوں نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کا لقب صدرالدین کیوں ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا۔

"ایک روز میرے شیخ اور میرے مرشد شیخ نصیرالدین محمود اودھی سے ان کے چند مریدوں نے جو کاملوں، عالموں، عاشقوں اور صادقوں میں سے تھے ..... عرضداشت کی صورت میں پوچھا کہ آپ سید محمد ابن سید یوسف کو ہم سب سے اوپر بٹھاتے ہیں اس کے کیا معنیٰ ہیں؟ ..... حضرت شیخ نے فرمایا تم سب مراقبہ کرو تمام نے مراقبہ کیا فرمایا کہ سید محمد کا مرتبہ دیکھو انھوں نے دیکھا کہ سید محمد عرش کے کنگورے کا طواف کرتا ہے اور تیزی سے گھوم رہا ہے۔"[1] محمد عبدالحکیم صدیقی لکھتے ہیں کہ گیسو دراز کے ننانوے (۹۹) اسمائے گرامی تھے جن کو اکبر حسینی نے مرتب کیا تھا ان میں ابوالمشائخ، سلطان العاشقین، گوہر دریائے قدم، میر جید اور مرشد مشید بھی شامل ہیں[2] شاہ چراغ دہلی کی بارگاہ سے جو خواجہ بندہ نواز کے شیخ تھے "گیسو دراز" لقب عطا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک مصرع میں اپنے نام کنیت اور لقب کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

اے ابوالفتح محمد صدر دیں گیسو دراز

خواجہ بندہ نواز کے لقب گیسو دراز کے بارے میں "سیر محمدی" میں لکھا ہے کہ جب علاءالدین الندی کو ان کے خالہ زاد بھائی ملک حاجی نے شیخ الاسلام کی خدمت میں بغرض بیعت پیش کیا تو شیخ نے حلقۂ ارادت میں شامل کر کے فرمایا۔ ملک زادہ آپ کی صحبت میرے پاس ممکن نہیں پس ہمارے احباب طریقت میں سے کسی کی صحبت پسند کر لو۔ مولانا علاءالدین سوچ میں پڑ گئے دوسری مرتبہ

---

[1] مبارزالدین (مترجم) رسالہ شہباز۔ ماہ ندارد ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۲۵۔

[2] محمد عبدالحکیم صدیقی۔ سیدنا بندہ نواز کا روحانی فیضان (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز مارچ اپریل ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۰ ۔ ۳۳۔ خواجہ بندہ نواز۔ دیوان حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ۔ صفحہ ۷۸۔

Marfat.com

شیخ الاسلام نے ارشاد فرمایا کسی کو پسند کیا ؟ مولانا علاء الدین نے عرض کیا کہ جی ہاں اس سید کو پسند کیا جو لمبے لمبے بال رکھے ہوئے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا سید محمد گیسو درازؒ ملک زادہ کو اپنی صحبت میں رکھو[1] اس طرح وہ گیسو دراز مشہور ہو گئے " اخبار الاخیار " میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور بزمِ صوفیاء کے مصنف نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی ایک دن پالکی میں تشریف لے جا رہے تھے دوسرے مریدوں کے ساتھ سید محمد حسینی بھی پالکی اُٹھائے ہوئے تھے چونکہ ان کے گیسو دراز تھے اس لئے پالکی کے ایک حصے سے الجھ گئے لیکن شدید تکلیف کے باوجود انھوں نے پالکی نہیں روکی۔ جب چراغ دہلی کو اس کا علم ہوا تو وہ اس عقیدت مند مرید کی سپردگی اور خلوص سے بے حد متاثر ہوئے اور فی البدیہہ شعر کہا[2]

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

خواجہ بندہ نواز سادات حسینیؑ سے تھے ان کے جد اعلیٰ ابوالحسن جنیدی ہرات سے دہلی چلے آئے تھے۔ بندہ نواز کا شجرۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ سید محمد گیسو درازؒ ابن سید یوسف حسینی راجا المشہور راجو قتال ابن علی بن محمد بن یوسف بن حسین بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن الجنیدی بن حسین ابوعبداللہ بن امام زید شہید بن زین العابدین بن سید الشہداء امام حسین بن علیؓ[3] سیر محمدی میں ـــــ لکھا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب بائیس واسطوں سے خاتم المرسلین سے جا ملتا ہے۔ ان کے شجرے میں محمد بن عمر بن یحییٰ بن حسین کے نام بھی شامل ہیں[4]

---

[1] ۔ سید شاہ نذیر احمد قادری (مترجم) سیر محمدی۔ صفحہ ۱۸ ۔
[2] ۔ اخبار الاخیار۔ صفحہ ۱۲۳ ۔ بحوالہ معراج العاشقین مرتبہ خلیق انجم۔ صفحہ ۲۶ ۔
[3] ۔ اقبال الدین ۔ تذکرہ گیسو دراز ۔ صفحہ ۲۸ ۔
[4] ۔ محمد علی سامانی ۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۹ ۔

Marfat.com

اقبال الدین احمد "تذکرہ خواجہ گیسو دراز" میں تحریر کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد علاء الدین مسعود شاہ کے زمانے میں عرب سے ہندوستان چلے آئے تھے اور دہلی میں قیام کیا تھا وہ شاہی منصب سے سرفراز ہوئے تھے[1] خواجہ بندہ نواز کے والد سید یوسف حسینی تھے جو شاہ راجو قتال کے نام سے مشہور تھے۔ جب آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں سلطان محمد تغلق نے دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے دولت آباد کے نام سے آباد کیا تو دہلی کے علماء، عمائدین اور مشائخین کو بھی وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا شاہ راجو اسی جماعت کے ہمراہ ۱۷ محرم ۷۱۹ھ کو وارد دولت آباد ہوئے تھے[2] تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند میں الف۔ د۔ نسیم رقمطراز ہیں کہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں حضرت برہان الدین کے قافلے کے ساتھ سید یوسف راجو قتال بھی دیوگیر (دولت آباد) چلے گئے تھے[3] اس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر چار سال تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ دکن پہنچے تھے۔ بچپن ہی سے آثار ولایت ہویدا تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ابتدائی تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کئے وہ اپنے والد اور نانا سلطان الاولیاء سے ارادت رکھتے تھے[4] ڈاکٹر میر ولی الدین "خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک" میں تحریر کرتے ہیں کہ دولت آباد کے قیام کے زمانے میں سید محمد حسینی نے اپنے والد اور ان کی وفات کے بعد نانا سے جو سلطان المشائخ کے مرید تھے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی[5] عبدالمجید صدیقی اپنے مضمون "حضرت بندہ نواز رحمۃ اللہ کی سیاسی و سماجی خدمات" میں لکھتے ہیں کہ ان کی ابتدائی تعلیم خلد آباد میں ہوئی اور شیخ بابو نامی ایک بزرگ نے انہیں اپنے مکتب میں پڑھایا تھا اور حدیث و فقہ

---

[1] ۔ اقبال الدین۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۲۸۔

[2] ۔ معشوق یار جنگ۔ (مترجم) تاریخ حبیبی۔ صـ ۸

[3] ۔ الف۔ د۔ نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد۔ صفحہ ۲۵۴۔

[4] ۔ احمد حسین۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوف و سلوک صفحہ ۱۔

[5] ۔ میر ولی الدین۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ صفحہ ۱۱۹۔

Marfat.com

کے ابتدائی درس رہیے تھے[1] سیرت بندہ نواز وسیلہ کائنات" میں نورالحسینی سید غلام مصطفیٰ قادری چشتی رقمطراز ہیں کہ خواجہ بندہ نواز نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی اور روزے کے پابند ہوگئے تھے، سات برس میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کرلی۔[2]

سلطان الاولیاء کا وصال ہوگیا تو ان کی خانقاہ نصیرالدین اودھی چراغ دہلی سے منوّر ہوگئی۔ ان کے فضائل علمی تبحر اور کمالات کا ذکر سن کر سید محمد حسینی شرف بیعت کے لئے بے قرار ہوگئے۔ خدا کی طرف سے کچھ ایسے اسباب ہوئے کہ دولت آباد جیسے دور دراز مقام سے دہلی پہنچنا ناممکن نہ رہا۔ شاہ راجو قتال کی وفات کے بعد سید محمد حسینی کی والدہ اپنے بھائی سید ابراہیم مستوفی کے گھر چلی آئیں۔ وہ دولت آباد ہی میں سکونت پذیر تھے۔ باہمی رنجش کے باعث دل برداشتہ ہو کر وہ اپنے لڑکوں کے ہمراہ دہلی روانہ ہوگئیں اور ۴ رجب ۷۲۶ھ کو دہلی پہنچ گئیں[3] اس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر پندرہ سال تھی۔ عبدالقادر سروری آزاد بلگرامی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سید محمد حسینی کی والدہ کو کسی تقریب میں شرکت کے لئے ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں دہلی جانا پڑا تھا[4] دہلی آکر انھوں نے اپنے بھائی سید حسین چندن کے ساتھ ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو چراغ دہلی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ مجاہدہ، ریاضت، ذکر، مراقبہ اور دوسرے مشاغل میں مصروف رہے اور علوم ظاہری کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ سید شرف الدین کیتھلی کے آگے زانوے ادب تہہ کیا اور مولانا تاج الدین بہادر اور قاضی عبدالمقتدر رکن الدین الشرعی الکندری سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا۔ شیخ سے بیعت کے بعد سید محمد حسینی نے اپنی زندگی سلوک و معرفت کے منازل طے کرنے اور علوم ظاہری کے حصول کے لئے وقف کردی اور ریاضت، مجاہدہ اور

---

[1] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ حضرت بندہ نواز رح کی سیاسی و سماجی خدمات (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز ۱۹۶۴ء صفحہ ۸۔

[2] ۔ نورالحسینی سید غلام مصطفیٰ قادری چشتی۔ سیرت بندہ نواز وسیلہ کائنات۔ صفحہ ۱۳۔

[3] ۔ میر ولی الدین۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف اور سلوک صفحہ ۱۱۹۔

[4] ۔ عبدالقادر سروری علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ اردو ادب بہمنی دور میں تیسرا باب۔ صفحہ ۱۵۴۔

Marfat.com

اشغالِ باطنیہ میں مصروف ہوکر ہمہ تن متوجہ الی اللہ ہو گئے اور فیوض روحانی اور اعلیٰ مراتب حاصل کیے۔ سید محمد حسینی پیر شاہ چراغ دہلی کی خاص نظر التفات تھی اور وہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ راہ طریقت اور شجرۂ شیخت کی محمد علی سامانی نے اس طرح نشان دہی کی ہے:۔ (۱) شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (۲) نظام الدین اولیاء (۳) شیخ الاسلام فرید الدین مسعود (۴) قطب الدین بختیار کاکی (۵) معین الدین سنجری (۶) عثمان ہارونی (۷) حاجی شریف زندانی (۸) قطب الدین مودود چشتی (۹) ناصر الدین ابو یوسف (۱۰) خواجہ رکن الدین (۱۱) خواجہ احمد چشتی (۱۲) خواجہ ابو اسحاق چشتی (۱۳) خواجہ علوی (۱۴) خواجہ ابو ہبیرۃ البصری (۱۵) خواجہ حذیفۃ المرعشی (۱۶) ابراہیم ادھم (۱۷) خواجہ فضیل ابن عیاض (۱۸) خواجہ عبد الواحد (۱۹) حسن بصری (۲۰) علی ابن ابی طالب (۲۱) سید المرسلین [1] اقبال الدین احمد نے خواجہ بندہ نواز کا جو شجرۂ طریقت قلمبند کیا ہے اس میں اس سلسلے کے بعض بزرگوں کے نام درمیان میں زائد ہیں مثلاً ابو یوسف چشتی کے بعد ابو محمد حسینی ان کے بعد خواجہ سدید الدین اور خواجہ ابو الفیض [2]

سید محمد چشتی نے طلب صادق، مسلسل ریاضت، فطری مناسبت اور شاہ چراغ دہلی کی خاص توجہ کے باعث بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔ گھر کی سکونت ترک کر دی اور خطیرہ شیر خاں میں قیام کیا [3] لیکن جب بھی وقت ملتا قاضی عبد المقتدر کی خدمت میں حاضر ہوکر درس لیا کرتے تھے اور شیخ کی قدم بوسی و ہدایات سے مشرف ہوتے تھے رفتہ رفتہ تجلیات و مکاشفات اور وارفتگی و سرمستی کے آگے ان کی نظر میں علوم ظاہری درخور اعتنا نہیں رہے اور شیخ کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ اگر اجازت ہو تو تحصیلِ علم ترک کر کے یہی وقت علم باطنی کے لئے صرف کروں۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی اجازت سے انھوں نے

---

[1] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۱۰۰۹۔

[2] ۔ اقبال الدین۔ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۱۹۴۔

[3] ۔ معشوق یار جنگ۔ تاریخ حبیبی۔ صفحہ ۱۵۔

Marfat.com

سلسلہ درس ترک کر دیا۔ نصیرالدین محمود نے ارشاد فرمایا تھا:۔

"خیر ہدایہ و بزدوی و رسالہ شمسیہ و کشاف و مفتاح و صحایف ایں ہمہ مرتب کن مرا با تو کار یست"[1]

سید محمد حسینی نے شیخ کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد علومِ ظاہری ترک کر کے علوم باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

جس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر سینتیس (۳۷) سال تھی، دہلی میں وبا پھیلی اور وہ بھی مرضِ "خلہ" میں مبتلا ہوئے۔ شاہ چراغ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے مولانا صدرالدین کو علاج کے لئے مامور کیا جب اس مرض میں افاقہ ہوا تو بروز چہار شنبہ ۷۵۷ھ کو شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نماز اشراق کے بعد تنہائی میں ان سے ملاقات کی اور اپنی واردات و مکاشفات کا ذکر کیا شاہ چراغ دہلی بہت خوش ہوئے اور خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ جب بندگی شیخ کی علالت نے طول کھینچا تو ۱۵ رمضان المبارک ۷۵۸ھ کو انھوں نے اپنے ان نیاز مندوں کی فہرست طلب فرمائی جو صاحبِ کشف و تجلی تھے اور مرتبۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ شاہ نصیر نے اپنی جانشینی کے لئے سید محمد حسینی کو منتخب فرمایا۔ شیخ محمد اکرام "آبِ کوثر" میں لکھتے ہیں کہ چراغ دہلی نے وفات سے تین دن قبل گیسو دراز کو خلافت عطا کی تھی[2]۔ ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ کو شیخ نے دار فانی سے کوچ کیا تو تیسرے دن سید محمد حسینی، شاہ نصیر چراغ دہلی کے سجادۂ ولایت پر رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے بندگانِ خدا کی رہنمائی و ہدایت میں چوالیس (۴۴) برس گذار دیئے اور مشایخ چشت کے مسلک کے مطابق خدمت خلق کی اور تشنگانِ علم معرفت کی پیاس بجھائی۔ وہ چاشت کے بعد یا نماز ظہر ادا کرنے کے بعد تفسیر، حدیث اور سلوک کے موضوع پر درس دیا کرتے تھے[3]۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن خواجہ بندہ نواز کے متصوفانہ تصورات

---

[1] ۔ محمد علی ساماني۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۱۶۔

[2] ۔ شیخ محمد اکرام۔ آبِ کوثر۔ صفحہ ۲۶۷۔ طبع ہفتم۔

[3] ۔ عبدالقادر سروری علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ اردو ادب بہمنی دور میں تیسرا باب صفحہ ۱۵۸۔

Marfat.com

کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض دوسرے صوفیاء کے برخلاف انھوں نے "شریعت" کی پابندی پر زور دیا۔ فریدالدین عطار، جلال الدین رومی اور ابن العربی کے بعض خیالات سے انھوں نے اختلاف بھی کیا ہے [1]

سید محمد حسینی کاسن شریف جب چالیس سال سے متجاوز ہوا تو والدہ کے اصرار پر سنتِ تزویج کی تکمیل کی۔ آپ کا نکاح جمال الدین مغربی کے صاحبزادے سید احمد کی بیٹی سے جن کا نام بی بی رضا خاتون تھا ہوا اِن کے بطن سے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں آپ کے فرزند سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی عالم متبحر اور برگزیدہ سالک تھے، دوسرے صاحبزادے سید یوسف عرف سیّد محمد اصغر حسینی بھی عالم و فاضل اور اپنے والد کے خلیفہ تھے۔ وصیت کے مطابق والد کے انتقال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے تھے۔ بڑی صاحبزادی بی بی فاطمہ عرف ستی بی بی تھیں جو سید چندن کے صاحبزادے سے بیاہی گئی تھیں دوسری صاحبزادی بی بی بتول تھیں اور چھوٹی بیٹی کا نام بی بی ام الدین تھا وہ بھی سید چندن کے ایک صاحبزادے سے بیاہی گئی تھیں [2]

جب ۸۰۱ھ میں تیمور لنگ نے دہلی پر حملہ کیا تو خواجہ بندہ نواز نے اپنے افراد خاندان اور متوسلین کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ ۷ ربیع الاول ۸۰۱ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۳۹۸ء کو سفر کا آغاز کیا۔ "سیر محمدی" کے مصنف، محمد علی ساماتی بھی ان کے ہمرکاب تھے۔ اس سفر کی پہلی منزل بہادر پور تھی جہاں انھوں نے نو دن قیام کیا [3] اس کے بعد گوالیر کا عزم کیا اور یہاں ان کے معتقد خاص مولانا علاء الدین گوالیری کے یہاں قیام کیا جنھوں نے ان کی خدمت میں نذر پیش کی اسی طرح بھاندیر، ایرچہ، جیتھرہ، چندیری، بڑودھا اور پھر کھمبائت میں سکونت پذیر ہوئے اور ہر جگہ میں چشتیہ سلوک کی شمع سے کئی چراغ روشن کئے "تذکرۂ خواجہ گیسو دراز" کے مصنف

---

[1] ۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ سوفیز آف بیجاپور۔ صفحہ ۵۲۔

[2] ۔ محمد حامد صدیقی ۔ مقدمہ جوامع الکلم۔ صفحہ ۲۵۔
[3] ۔ خلیق انجم۔ مقدمہ معراج العاشقین ۔ صفحہ ۴۳۔

Marfat.com

لکھتے ہیں کہ سید محمد حسینی اجمیر، ناگور، احمد آباد، کاٹھیوار، گرناتھ پہاڑ، ٹھٹہ، حیدر آباد، سندھ، بلوچستان، افغانستان، لاہور، پاک پٹن، ملتان، کشمیر، ہردوار، اور لکھنؤ سے ہوتے ہوئے بالآخر دولت آباد پہونچے تھے[1] اس وقت ان کی عمر (۹۰) نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی سید محمد حسینی نے دولت آباد پہونچکر اپنے والد شاہ راجو قتال کے مزار کی زیارت کی۔ یہاں حاکم شہر عضد الملک نے سلطان فیروز شاہ بہمنی کی طرف سے ہدیئے نذر کئے۔ ہارون خاں شیروانی نے "دکن کے بہمنی سلاطین" میں ان کے ورودِ دکن کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے (۹۰) سال سے زیادہ تھی یہاں ۸۱۶ھ ۱۴۱۳ء میں وہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے کئی مریدوں کے ساتھ ایک خوبصورت خانقاہ میں فروکش ہوئے۔ اس وقت فیروز شاہ دار السلطنت سے باہر تھا لیکن واپسی پر جب اس نے ان کی آمد کی خبر سنی تو امراء اور اعلیٰ حکام کو ساتھ لے کر انہیں سلامی دینے حاضر ہوا[2] عبد المجید صدیقی نے خواجہ بندہ نواز کے دولت آباد آنے کی تاریخ ذیقعدہ ۸۰۲ھ ۱۴۰۰ء بتائی ہے جس کی دوسری شہادتوں سے تصدیق نہیں ہوتی[3] "محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن" کے مصنف کا بیان ہے کہ ۸۱۵ھ میں وقائع نگاروں کی تحریر سے فیروز شاہ بہمنی کو معلوم ہوا کہ دہلی سے ایک بزرگ "سید عالی مقام عرش احترام" دکن تشریف لانے والے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو وہ فیروز آباد سے حسن آباد گلبرگہ آگیا اور امرائے سلطنت وارکان دولت اور اپنی "اولاد" کو حضرت کے استقبال کے لئے بھیجا۔ رچرڈ میکس ویل اٹین لکھتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز جب وارد گلبرگہ ہوئے تو فیروز شاہ بہمنی نے انہیں خوش آمدید کہا اور بطور "انعام" کئی گاؤں پیش کئے۔ خواجہ بندہ نواز نوازشات شاہی سے اس وقت تک بہرور ہوتے رہے جب تک کہ انھوں نے بادشاہ کے بھائی احمد کی تائید نہیں کی۔ احمد شاہ بہمنی سماع کی

---

[1] ۔ اقبال الدین احمد۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز۔ صفحہ ۵۱ تا ۵۳ ۔

[2] ۔ ہارون خاں شیروانی۔ رحم علی الہاشمی (مترجم) دکن کے بہمنی سلاطین صفحہ ۱۲۲ ۔

[3] ۔ عبد المجید صدیقی حضرت بندہ نوازؒ کی سیاسی و سماجی خدمات (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز ماہ ندارد ۱۹۶۳ء ص ۹

[4] ۔ عبد الجبار ملکاپوری محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن جلد اول ص ۴۵۸ ۔

Marfat.com

محفلوں میں اکثر شریک رہا کرتا تھا اور خواجہ بندہ نواز کی خانقاہ کے لئے رقمیں دیا کرتا تھا[1] سلطان فیروز شاہ بہمنی کی درخواست پر خواجہ بندہ نواز گلبرگہ تشریف لائے تھے اور قیام کے لئے جگہ پسند فرمائی تھی۔ سلطان فیروز سید محمد حسینی گیسو دراز کی عظمت و جلالت سے متاثر ہو کر آپ کے حلقۂ معتقدین میں شامل ہو گیا تھا عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں کہ سلاطین بہمنیہ پہلے سراج جنیدی کے مرید ہوا کرتے تھے[2] لیکن جب بندہ نواز گلبرگہ تشریف لائے تو فیروز شاہ بہمنی اپنے نئے پایۂ تخت فیروز آباد سے معہ عمائدین و امراء گلبرگہ حاضر ہوا اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ان کا شایانِ شان استقبال کیا تھا۔ "تاریخ مشائخِ چشت" میں خلیق احمد نظامی نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بادشاہ علماء، مشائخ اور لشکر شاہی کے ساتھ خواجہ بندہ نواز کے خیر مقدم کے لئے گیا تھا[3] اور ان سے استدعا کی تھی کہ وہ گلبرگہ میں قیام فرمائیں تاکہ بہمنی سلطنت ان کے فیوض و برکات سے مستفید ہو سکے۔ جوامع الکلم سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ "خواجہ کی پابوسی" کے لئے حاضر ہوا تھا وہ قیلولہ کر رہے تھے اس لئے اسے خانقاہ کے صحن میں بارش میں کھڑا ہونا پڑا تھا[4] سخاوت مرزا رقم طراز ہیں کہ خواجہ بندہ نواز جب دکن تشریف لائے تو بڑے بڑے جید علماء و فضلاء ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی تمنا کرنے لگے۔ حضرت میراشرف جہانگیر سمنانی ان ہی سے ملاقات کے لئے گلبرگہ تشریف لائے تھے[5]۔ بندہ نواز قلعہ کے قریب فروکش ہوئے تھے۔ میکس ویل ایٹن لکھتا ہے کہ بہمنی سلاطین نے خواجہ بندہ نواز سے عقیدت کی بنا پر انہیں جاگیرات سے ایسا سرفراز کیا کہ وہ خود ایک بڑے زمیندار بن گئے[6] شمس اللہ قادری نے گلبرگہ میں بندہ نواز

---

[1] ۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور۔ صفحہ ۵۰، ۵۱، ۵۲۔

[2] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الاولیٰ تذکرہ سلاطین دکن جلد اول۔ صفحہ ۴۹۴۔

[3] ۔ خلیق نظامی۔ تاریخ مشائخ چشتیت۔ صفحہ ۲۰۷۔

[4] ۔ سید رحیم الدین حسینی بندہ نوازی (مترجم) جوامع الکلم ص ۱۳۔ [5] ۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور۔ ص ۔

[6] ۔ سخاوت مرزا۔ خواجہ گیسو دراز کے چند ہندی نعت (مضمون) مشمولہ رسالہ خاتون دکن۔ جنوری ۱۹۳۵ء۔ ص ۔

Marfat.com

کی آمد کا سنہ ۸۱۵ھ بتایا ہے[1] نصیر الدین ہاشمی[2] اور عبدالحق[3] نے بھی یہی سنہ تحریر کیا ہے اس سنہ کو درست تصور کریں تو گلبرگہ میں ان کا بائیس سالہ قیام غلط ثابت ہوتا ہے اس لئے گلبرگہ میں ان کی آمد کا سنہ ۸۰۳ھ ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ عبدالقادر سروری[4] نے سید محمد حسینی کے وارد گلبرگہ ہونے کا یہی سنہ تحریر کیا ہے اور مقدمہ "جوامع الکلم" میں بھی یہی سنہ درج ہے[5]

۸۱۸ھ مطابق ۱۴۱۵ء میں جب فیروز شاہ بہمنی نے اپنے بیٹے حسن خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا تو اسے بندہ نواز کی قدم بوسی کے لئے بھیجا کہ ان کی دعاؤں کی برکت سے حسن کا مستقبل درخشاں ہو لیکن بندہ نواز نے حسن خاں کو دعا سے سرفراز نہیں فرمایا اور فقیر کے تکیے سے ولیعہد سلطنت بے نیل و مرام واپس ہوا۔ عبدالجبار ملکاپوری نے حسن خاں کو عیاش اور خفیف العقل لکھا ہے[6] دوسری مرتبہ جب حسن خاں کو گیسو دراز کی خدمت میں بھیجا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ بہمنی سلطنت کے لئے فیروز شاہ کے بھائی احمد خاں کو قدرت نے منتخب کر لیا ہے اور کوئی قوت اسے تخت سے محروم نہیں کر سکتی۔ خواجہ بندہ نواز کی صاف گوئی سے بادشاہ مکدر ہو گیا اور اس نے کہلا بھیجا کہ آپ کی خانقاہ قلعہ سے قریب ہے اور دن رات یہاں معتقدین کا اژدھام رہتا ہے جو باعث زحمت ہے اس لئے آپ شہر سے باہر سکونت کے لئے کوئی مقام منتخب فرمائیں خواجہ بندہ نواز نے اپنے اقربا اور ارباب طریقت کے ساتھ فوراً ترک مقام کیا اور شہر سے

---

[1] ۔ شمس اللہ قادری ۔ اُردو سے قدیم ۔ صفحہ ۱۴۱ ۔

[2] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ صفحہ ۳۶ ۔

[3] ۔ عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔ صفحہ ۱۹ ۔

[4] ۔ عبدالقادر سروری ۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ۔ تیسرا باب ۔ اردو ادب بہمنی دور میں ۔ صفحہ ۱۵۶ ۔

[5] ۔ حامد صدیقی ۔ مقدمہ جوامع الکلم ۔ صفحہ ۱۹ ۔

[6] ۔ عبدالجبار ملکاپوری ۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن جلد اول صفحہ ۴۵۹ ۔

Marfat.com

دور وہاں سکونت اختیار کی جہاں اب مدفون ہیں" حضرت خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوّف وسلوک" کے مصنف لکھتے ہیں کہ بعض سیاسی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے سلطان فیروز شاہ بہمنی نے بندہ نواز کی شان میں گستاخی کی اور ان کی دعاؤں سے محروم ہو گیا لیکن اس کا چھوٹا بھائی احمد خاں ان سے فیض حاصل کرتا رہا اسے سلطنت بھی حاصل ہوئی اور" احمد شاہ ولی" بھی کہلایا[1] فیروز شاہ بہمنی اور گیسو دراز میں جو رنجش پیدا ہو گئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے "دکن کے بہمنی سلاطین" میں ہارون خاں شیروانی رقمطراز ہیں کہ جب ۸۱۸ھ/۱۴۱۵ء میں حسن کو باضابطہ ولیعہد مقرر کیا گیا اور رسوم سے فراغت ہوئی تو بندہ نواز سے شہزادے کے لئے دعائے خیر کرنے کی استدعا کی گئی انھوں نے جواب دیا کہ تمام شاہی نشانات شہزادے کو عطا کئے جا چکے ہیں تو اب دعا کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب شاہی سفیر نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی خان خانان احمد خاں کو فیروز کا جانشین بنا دیا ہے۔ یہ سن کر فیروز شاہ بہت برہم ہوا اور گیسو دراز کو شہر سے باہر خانقاہ منتقل کرنے کی صلاح دی[2] عبدالجبار ملکاپوری نے" محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ" فیروز شاہ حکیم طبیعت وفلسفی سیرت" تھا اکثر اوقات مسائل "طبعی ونظری" میں علماء کے ساتھ بحث وتکرار کرتا تھا تصوف وصوفیت کا مدعی تھا اس لئے گیسو دراز سے ان بن ہو گئی[3] فرشتہ نے لکھا ہے کہ فیروز نے انہیں" علم ظاہری" خصوصاً" معقولات" سے بے بہرہ پایا تھا اس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی تھی[4] عبدالمجید صدیقی کا بیان ہے کہ جب سلطان فیروز نے حسن خاں کی جانشینی کا اعلان کر دیا اور اس عوض میں خواجہ بندہ نواز سے نیک تمنائیں طلب کی گئیں تو انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اس فیصلے کی مخالفت کی۔ فیروز نے

---

[1] ۔ احمد حسین۔ خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوف وسلوک۔ صفحہ ۱۷۔

[2] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین (مترجم) رحیم علی الہاشمی۔ صفحہ ۱۳۱۔

[3] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الوطن تذکرۂ سلاطین دکن جلد اول صفحہ ۴۵۹۔

[4] ۔ محمد قاسم فرشتہ۔ فدا علی طالب (مترجم) تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم صفحہ ۱۱۰۔

Marfat.com

احمد خاں اور اس کے بیٹے علاءالدین کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ ایک شام بندہ نواز نماز مغرب ادا کر کے دسترخوان پر بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ یہ دونوں وہاں پہنچے اور اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ خواجہ بندہ نواز نے انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اس کے بعد سر کا شملہ اتار کر اس کے دو حصے کئے ایک احمد خاں کے سر پر اور دوسرا علاءالدین کے سر پر باندھ دیا۔ مورخ دکن عبدالمجید صدیقی لکھتے ہیں کہ یہ "صحبت" بہت "معنی خیز" تھی اور اس کو تاریخ دکن کا ایک اہم واقعہ سمجھنا چاہیئے[1]

گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز رشد و ہدایت تعلیم و تلقین اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ مبارزالدین رفعت کا خیال ہے کہ خواجہ بندہ نواز نے گلبرگہ میں اکیس سال بسر فرمائے[2] گیسو دراز نے ایک سو چار سال چار ماہ بارہ دن کی عمر پائی تھی ۱۶ ذیقعدہ ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۲ء کو وہ بروز دوشنبہ نماز اشراق و چاشت کے درمیان واصل بحق ہوئے[3] غلام حسین خاں طباطبائی کی "سیر المتاخرین" کے حوالے سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" میں خواجہ بندہ نواز کی تاریخ وفات ۸۲۶ھ مطابق ۱۴۲۲ء بتائی گئی ہے جو درست نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مرید خاص اور رفیق و ہمدم محمد علی سامانی کا بیان زیادہ مستند اور قابل قبول ہے۔ سلطان احمد جس کی تخت نشینی کی بندہ نواز نے بہت پہلے پیشین گوئی کی تھی ان کا بندۂ بے دام بن چکا تھا۔ چند قریئے ان کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے ان کے انتقال کے بعد سلطان احمد شاہ۔ نے مزار پر شاندار گنبد تعمیر کروایا۔ "ارمغانِ سلطانی المعروف سیر گلبرگہ" کے مصنف محمد سلمان اس گنبد کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابراہیم قطب شاہ "بادشاہ تلنگ" نے بیرونی "گلابہ" کروایا اور سلطان محمد عادل شاہ نے قدیم کلس نکال کر نیا

---

[1] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ حضرت بندہ نواز رحمتہ اللہ علیہ کی سیاسی و سماجی خدمات (مضمون) مشمولہ۔ رسالہ شہباز۔ ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۲

[2] ۔ مبارزالدین رفعت۔ شکارنامہ (مضمون) مشمولہ شہباز جنوری فروری صفحہ ۱۳، ۱۹۶۲ء۔

[3] ۔ محمد سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۴۴۔

Marfat.com

کلس گنبد پر چڑھایا تھا[1]۔ "کلچرل ٹرنڈس اِن میڈیویل انڈیا" میں ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں کہ خواجہ بندہ نواز کے مزار پر جو گنبد تعمیر کیا گیا ہے وہ ہند ایرانی طرزِ تعمیر کا اچھا نمونہ ہے اس کے ہندوستانی طرز کے پاکھے اور محرابی کمانیں ہمیں فیروز شاہ بہمنی کے گنبد کی یاد دلاتی ہیں لیکن یہاں طمطراق کی جگہ سادگی نے لے لی ہے[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خواجہ بندہ نواز کا مزار عالیشان اور مرعوب کن ہے اسی طرح ان کی زندگی بھی بڑی باوقار اور شاندار رہی اور انھوں نے نہایت اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ گلبرگہ میں زندگی گذاری۔ نیل کنٹھ شاستری لکھتے ہیں کہ احمد شاہ نے اس ولیِ کامل کو جس نے اس کے درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی اور اس کی مشکلات میں مدد کی تھی بڑی فراخ دلی کے ساتھ نوازا تھا[3]۔

اقبال الدین احمد نے یہ تحریر کرتے ہوئے کہ خواجہ بندہ نواز نے ایک سو پچاس سال کی عمر پائی تھی ایک شعر نقل کیا ہے جس سے ان کی تاریخ پیدائش، سن شریف اور تاریخ وفات نکالی گئی ہے[4]۔

سنش عادل تولد وارث خود

۱۰۵ ۷۲۰

وفاتش وان کہ تاج المرسلین بود

۸۲۵

محمد علی سامانی نے "سیر محمدی" میں مخدوم دین و دنیا" سے خواجہ بندہ نواز کی تاریخ وفات اخذ کی ہے[5]۔

۸۲۵

خواجہ بندہ نواز خدا رسیدہ بزرگ اور ولی کامل تھے ان کے منازل سلوک

---

[1] ۔ محمد سلمان۔ ارمغان سلطان المعروف بہ سیر گلبرگہ۔ صفحہ ۹۷ ۔

[2] ۔ ہارون خان شیروانی۔ کلچر ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا۔ صفحہ ۱۵ ۔

[3] ۔ نیل کنٹھ شاستری۔ دی ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ صفحہ ۲۴۸ ۔

[4] ۔ اقبال الدین احمد ۔ تذکرہ خواجہ گیسو دراز صفحہ ۲۰۱

[5] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۴۴ ۔

Marfat.com

میں حیرت انگیز ترقی سے متاثر ہوکر شاہ چراغ ان کی بڑی قدر کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ وہ اپنے خاص مریدوں کے ساتھ خطیرہ شیر خاں پہنچے اور کچھ رقم سید محمد حسینی کے سامنے رکھ کر فرمایا۔

"این نذر ماست برائے سید محمد"۔[1]

سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مریدِ خاص نظام حاجی غریب یمنی نے اپنے پیر طریقت کے ملفوظات "لطائف اشرفی" کے نام سے مرتب کئے ہیں اس میں وہ اپنے مرشد کی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ خواجہ بندہ نواز کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایسے دقائق و معارف سے انہیں روشناس کروایا جو دوسرے علماران پر منکشف نہیں کر سکے تھے۔[2]

خواجہ بندہ نواز ایک عالم متبحر ہی نہیں ایک خدا رسیدہ بزرگ اور صاحب کشف و کرامات صوفی تھے۔ سید ابوالحسن من سمنی اللہ حسینی بن علی اللہ محمد الحسینی (بندگی میاں) نے گیسو دراز کے خوارق عالیہ اور کرامات پر ایک مفصل تصنیف "تبصرۃ الخوارقات" لکھی ہے جس کا ترجمہ مبارزالدین رفعت نے شائع کر دیا ہے۔[3]

خواجہ بندہ نواز کی شخصیت بڑی جامع الصفات تھی وہ ایک برگزیدہ صوفی ہونے کے علاوہ ایک باشعور انسان تھے اور اپنے مخاطب کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق اس کو مناسب ہدایت دیا کرتے تھے۔ عبدالمجید صدیقی رقمطراز ہیں کہ انھوں نے جو اہم سماجی اور تہذیبی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں اس موضوع پر خواجہ بندہ نواز نے "آداب المریدین" بھی سپردِ قلم کی تھی۔ وہ عبادت الٰہی کے علاوہ تہذیبی اقدار و آداب کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ مختلف محفلوں کی نشست و برخاست کے طریقوں، گفتگو اور طریقہ ماند و بود کی پوری پابندی کرتے تھے۔[4]

---

[1] میر ولی الدین۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ صفحہ ۱۲۱۔ [2] نظام حاجی غریب۔ لطائف اشرفی۔ صفحہ ۲۶۵

[3] مبارزالدین رفعت۔ رسالہ شہباز ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۱ تا ۳۶۔ [4] عبدالمجید صدیقی حضرت خواجہ بندہ نواز رح کی سیاسی و سماجی خدمات" (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز ۱۹۶۴ء۔ صفحہ ۱۰۔

Marfat.com

سیّد محمّد اپنے مضمون "خواجہ بندہ نواز کا دستورِ حیات اور مسلک" میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بندگانِ خُدا کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے دوسروں کی غلطیوں کو درگذر کرنے کی تعلیم دیتے اور سرکاری عہدیدار بادشاہ اور امراء وغیرہ اگر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں عدل وانصاف کی ہدایت فرماتے اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر زور دیتے تھے [1]

ایس کے سہا" ہسٹری آف میڈیوِیل دکن" میں رقمطراز ہیں کہ خواجہ بندہ نواز کے معتقدین میں ہندو مسلم دونوں شامل تھے کیونکہ ان کا مسلک انسان دوستی، ایثار اور اخوت تھا آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"خواجہ بندہ نواز نے دکن والوں کو ایک مشترک نصب العین دیا۔ ایک مشترک زبان دی اور ایک مشترک کلچر عطا کیا جس پر کہ وہ فخر کر سکتے ہیں۔ سماج کو ان کی سب سے بڑی دین دو متضاد عناصر کو متحد کرنے کی سعی ہے جو بہمنی دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے" [2]

"جوامع الکلم" مجلس ماہ رجب ۸۰۲ھ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز مسلک حنفیہ کے پیرو تھے ان کا بیان ہے کہ وہ فقہ حنفی کے پابند ہیں اور اپنے مسلک کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"اما مذہب حق ایں ست امیر المومنین ابو بکر افضل صحابہ و بعد از عمر و بعد از عثمان و بعد از علی و کل صحابہ اولیاء خدا بر حق اند" [3]

خواجہ بندہ نواز کی فارسی تصانیف بہت بلند پایہ اور وقیع ہیں خواجگان چشت میں انہیں یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایک کثیر التصانیف نثر نگار تھے اسی وجہ سے انھیں "سلطان القلم" کا لقب عطا کیا گیا تھا [4] غالباً یہی وجہ تھی

---

[1] ۔ سید محمد۔ خواجہ بندہ نواز کا دستورِ حیات اور مسلک (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز ۱۹۶۴ء۔ ص ۳۶۔

[2] ۔ اکبر حسینی۔ جوامع الکلم۔ ص ۱۲۔ [3] ۔ ایس کے سنہا۔ ہسٹری آف میڈیوِیل دکن۔ ص ۱۸۹۔

[4] ۔ احمد حسین۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کا نظام تصوف و سلوک ص ۱۹۔

Marfat.com

کہ چراغ دہلی نے آپ کو تصنیف و تالیف کی ہدایت کی تھی اور فرمایا تھا "مرا با تو کار یست"[1] سیر محمدی کے مصنف جو آپ کے خاص مرید و خادم تھے اور جنھوں نے ایک طویل مدت آپ کی محبت میں گذار دی تھی اپنی تصنیف "سیر محمدی" کے پانچویں باب میں جو گیسو دراز کی تصانیف سے متعلق ہے آپ کی چھتیس[26] تصانیف کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں سے چند شرح صادق معارف، شرح فصوص، شرح تمہیدات قاضی عین القضاۃ، خطائر القدس، ترجمہ رسالہ شیخ محی الدین ابن عربی، حواشی قوت القلوب، اسماء الاسرار حدیق الانس رسالہ در بیان آداب سلوک، رسالہ در بیان معرفت اور تین خلافت نامے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب میں گیسو دراز کی کسی دکنی تصانیف کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ "تاریخ حبیبی" کے مصنف نے آپ کی تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے :-

(۱) وہ تصنیفات جو دہلی یا اثنائے سفر میں خواجہ صاحب نے لکھی تھیں ان کی تعداد سترہ بتائی گئی ہے۔

(۲) وہ کتابیں جو قیام گلبرگہ کے زمانے میں لکھی گئی تھیں ۲۶ ہیں۔ اس طرح تاریخ حبیبی کے بیان کے مطابق گیسو دراز کی تصانیف کی تعداد جملہ (۴۳) قرار پاتی ہے لیکن یہ بیان درست نہیں "سیر محمدی" کے پانچویں باب میں خواجہ بندہ نواز کی چھتیس[26] تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے میر ولی الدین سیر محمدی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"خواجہ صاحب کے حالات میں سب تذکروں میں مقدم اور سب سے زیادہ مستند ہے"[2] خواجہ بندہ نواز نے اپنے مریدوں اور حلقۂ درس سے نسبت رکھنے والوں کو اسلامی تعلیمات اور صحیح عقائد سے آگاہ کرنے کے لئے دکنی میں اگر بعض کتابیں، رسالے تصنیف بھی کئے تھے تو وہ اب ناپید ہیں اور ہمارے لئے ان کا وجود غیر متحقق ہے۔ عبدالحق نے گیسو دراز کے بارے میں لکھا ہے :-

---

[1] پچھلے صفحات میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

[2] میر ولی الدین۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ صفحہ ۱۲۳۔

Marfat.com

"جو لوگ عربی فارسی سے واقف نہ تھے ان کے سمجھانے کے لئے ہندی زبان میں تقریر فرماتے تھے"۔[1]

عبدالحق نے سید محمد حسینی گیسو دراز کی تصانیف میں معراج العاشقین، تلاوت الوجود، درالاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ اور "ہشت مسائل" کے نام گنائے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے اپنی ایک قدیم بیاض سے ایک مثلث اور ایک قدیم غزل بھی نقل کی ہے۔

عبدالقادر سروری نے "اُردو ادب بہمنی دَور میں" میں گیسو دراز کے دکنی رسالوں کے یہ نام بتائے ہیں:۔

(۱) معراج العاشقین۔ (۲) رسالہ شرح کلمہ طیبہ۔ (۳) خلاصۂ توحید۔ (۴) شکار نامہ (۵) درالاسرار (۶) رسالہ سہ بارہ (۷) ہدایت نامہ (۸) ہشت مسائل (۹) تلاوت الوجود (۱۰) تمثیل نامہ (۱۱) ہفت اسرار۔

"خواجہ بندہ نواز کی جواہر العشاق" المعروف بہ شرح رسالہ غوث الاعظم کو "تصحیح" کے بعد حافظ سید عطا حسین نے برقی پریس حیدرآباد سے شعبان ۱۳۶۲ھ میں شائع کر دیا ہے۔ سید عطا حسین نے "شرح الفقہ الاکبر" کو بھی "تصحیح" کے بعد سلطنتِ برقی پریس حیدرآباد سے ذالحجہ ۱۳۶۷ھ میں طبع یہ کر دیا ہے۔

ابو حنیفہ نعمان بن ثابت تابعی کوفی کی مشہور و معروف کتاب "الفقہ الاکبر" کی فارسی شرح ہے جو خواجہ بندہ نواز نے گلبرگہ آنے کے بعد لکھی تھی۔[2]

خواجہ بندہ نواز کے تخلص کے بارے میں قطعیّت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کا تخلّص بندہ تھا یا شہباز یا وہ اپنا نام سیّد محمّد حسینی بطور تخلّص استعمال کرتے تھے۔ یہ تینوں تخلّص مختلف قدیم ابیات میں موجود ہیں بقول نصیر الدین ہاشمی "یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ آپ کا دراصل تخلّص کیا تھا"۔[3]

---

[1] عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا بہم ص ۱۹، ۲۰۔ [2] عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ اردو ادب بہمنی دور میں ص ۱۵۹، ۱۶۰۔ [3] سید عطا حسین۔ شرح الفقہ الاکبر۔ مقدمہ صفحہ الف۔ [4] نصیر الدین ہاشمی۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری (مضمون) مشمولہ مقالات ہاشمی ص ۱۶

Marfat.com

نصیرالدین ہاشمی کو آقا حیدر حسن کے کتب خانے سے ایک بیاض دستیاب ہوئی تھی جسے ابوالقاسم نصیرالدین نے مرتب کیا ہے یہ ۱۱۱۳ھ کا مرتبہ کلام ہے ابوالقاسم عالمگیر کی فوج میں ملازم تھا۔ اسے تصوف سے شغف تھا۔ فوج کے ساتھ وہ جہاں بھی جاتا وہاں کا متصوفانہ کلام نقل کر لیتا تھا۔ اس بیاض میں اس نے گیسو دراز کی تین نظمیں نقل کی ہیں جن میں سے دو میں شہباز تخلص اور ایک میں سید محمد حسینی تخلص موجود ہے۔ قدیم زمانے میں متصوفانہ نظموں کو "حقیقت" کے زیر عنوان بھی نقل کیا جاتا تھا۔ چنانچہ نصیرالدین ہاشمی کو جو نظمیں ملی ہیں وہ اسی سرخی سے مزین ہیں اور بقول نصیرالدین ہاشمی انھیں موسیقی کی راگنیوں میں نظم کیا گیا ہے[1] تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند میں الف، د، نسیم لکھتے ہیں کہ خواجہ بندہ نواز نے سنسکرت بھی سیکھی تھی اور ہندی موسیقی میں بھی مہارت پیدا کی تھی[2] خواجہ بندہ نواز کی زیادہ تر شاعری راگ راگنیوں کے تابع ہے جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موسیقی سے ناواقف نہیں تھے۔ شیخ محمد اکرام "آبِ کوثر" میں موسیقی کے متعلق خواجہ بندہ نواز کی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہندی موسیقی کو ایک نرم، لچکدار اور دل میں رقت پیدا کرنے والی موسیقی تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس قسم کے راگ قلب انسانی میں عاجزی اور گداز پیدا کرتے ہیں[3]

حقیقت اس گیت کو کہتے ہیں جو مختلف راگ راگنیوں میں کہا جاتا ہے اور اس کا موضوع متصوفانہ مسائل ہوتے ہیں قدیم بیاضوں میں حقیقت کے زیرِ عنوان جو گیت تحریر کئے گئے ہیں ان میں اکثر راگ راگنی کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے جیسے "حقیقت دھنا سری"، "حقیقت رام کلی" اور "حقیقت ملار" وغیرہ تصوف اور موسیقی سے صوفیا چشت کو بڑی دلچسپی رہی ہے۔

---

[1] ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری "(مضمون) مشمولہ ۔ مقالات ہاشمی ص۱۶ ۔ [2] الف د نسیم تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ص۲۵۸ ۔
[3] ۔ محمد اکرام ۔ آبِ کوثر ۔ ص۳۷۲ ۔

Marfat.com

خواجہ بندہ نواز سے جو نثری رسائل اور کلام منسوب کیا جاتا ہے اس میں شبہ کی گنجائش موجود ہے لیکن حقیقت کے عنوان کے تحت ان کا جو کلام ملتا ہے اور جس میں شاعر اور ان کے شیخِ طریقت دونوں کا نام موجود ہے آسانی سے رد نہیں کئے جا سکتے۔ قدیم تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں قوالی عام و خواص دونوں میں مقبول تھی اور یہ ہندوی زبان میں ہوتی تھی تاکہ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اس سے کیف و سرور حاصل کر سکیں۔ سلسلہ چشتیہ کے صوفیاء کو اس سے طبعی مناسبت رہی ہے اس لئے بھی یہ امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے گیت کہے ہونگے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے
او میرے جیو کا برتا لیا ہے
او معشوق بے مثال ہے بے نور بنی نپایا
نور تی رسول کا او میرے جیو میں بہایا
آپ کوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا[1]

کھڑ کھڑے جیو میں آپسیں آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کیوں دیکھنے پاوے
جنہہ دیکھے آرسی کوں اسے ادا نہ بہاوے
کل شئ محیط ہے اسے کون پچھانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت گم ہو رہے جیسے ہیں دیوانے

خواجہ نصیر الدین جنے سائباں پیو مائی
جیو کا کھٹ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائی
آکمی سید محمد حسینی پیو سنگھ کیا نہ جائی

---

[1] ۔ عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (ص ۲۰) میں اس نظم کو "مثلث" کہا ہے۔ پوری نظم نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری، مشمولہ مقالات ہاشمی میں نقل کی ہے۔

Marfat.com

حقیقت

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہویگی سیس سپورنہ سہرا
واحد اپنی آپ تھا آپیں آپ نجھایا
پرکٹہ جلوہ کاڑ کے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دیئے کر کاف نون بسایا

لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے
فاضل افضل جیتی مرسل ساجد سجود ہوائے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے
مخفی نانوں معشوق رکھ ظاہر شہباز کہلائے
عشق کے جیتی چند بنہ اپنی آپ دکھائے
الان کما کان پھر آپس میں آپ سمائے[1]

ان دونوں نظموں میں ہیئت کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ پہلے دو مصرعے پھر تین تین مصرعوں کے بند کہے گئے ہیں ایک اور نظم جو ہیئت میں مذکورہ بالا نظموں سے مختلف ہے یہ ہے ۔

اونچا مندر عشق کا کوئی کیوں کر پاوے
چاروں سیر ہاں چڑھ کر تو بی ہار تا آوے
جسے سیس دیوے پانوں تل تو بھی نہ پاوے

دوی دوی تائی دور کریکٹ واحد ہونا
چاروں کپڑے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہوئے تو اسے کھیل چت لانا

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری (مضمون) مشمولہ مقالات ہاشمی ۔ صفحہ ۱۶، ۱۷ ۔

Marfat.com

سوئے عاشق شہباز ہے دو ہوں جگ کہلارا
خواجہ نصیرالدین سائیاں نپٹ راکھے ہمارا
نسنکہ کھیل توں پندرِ عشق کا تھاڑا[1]

ان نظموں کے علاوہ نصیرالدین ہاشمی نے محمد غوث کی بیاض سے ایک طویل مخمس جس میں "بندہ" تخلص ہے نقل کیا ہے تمکین کاظمی کے توسط سے بھی انہیں کسی سید اکبر کے مملوکہ مخطوطے سے بھی ایک نظم دستیاب ہوئی ہے جس میں دواؤں کے بعض نسخے نظم کئے گئے ہیں لیکن خود مضمون نگار کی دانست میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب یہ سارا کلام مشتبہ ہے وہ آخر میں لکھتے ہیں:۔

"ایسا کوئی قطعی ثبوت نہیں کہ کلام مندرجہ کو خواجہ صاحب کا ہی قرار دیا جائے بہت ممکن ہے کہ یہ کلام یا اس میں سے بعض آپ ہی کا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمانہ مابعد میں لوگوں نے آپ سے منسوب کر دیا ہو چونکہ سردست کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا ہے اس لئے ہم اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن خیال ظاہر نہیں کر سکتے"[2]

سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں "سماع" یعنی "ہند حجرے" کی قوالی کے اشعار نقل کئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ بعض گیت صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں[3] انھوں نے مندرجہ ذیل گیت نقل کئے ہیں

اللہ میں تجو باج کیوں رھوں یک تلاّ
شاہ کا برھا بھید یا میرے کیّا
خواجہ نصیرالدین تن میں تھڑے رُچن
ہاں تن میں ٹھیر کے رچن وہ

---

[1] ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری (مضمون) مشمولہ مقالات ہاشمی ص ۱۸ ۔
[2] ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری (مضمون) مشمولہ مقالات ہاشمی ص ۲۳
[3] ۔ سخاوت مرزا۔ خواجہ گیسو دراز کے چند ہندی گیت (مضمون) مشمولہ خاتون دکن۔ جنوری ۱۹۶۵ء ص ۶ ۔

Marfat.com

اٹھنا سہاگن سیجا تے تیرا لالہ نہ جاگے

نس دین شو تیرا جاگا تھا میرے اللہ
نس دین شو تیرا جاگا تھا
تجے کو نیداری لائے تجے کوں ان کاڑی لائے
اٹھنا سہاگن سیجا تے تیرا لالہ نہ جاگے [1]
غفلت نیند اں تج لاگی ہے دیتار تھا کب
درد بکھ دلوں کی سیجا تے
اٹھنا سہاگن سیجا تے تیرا لالہ نہ جاگے
مخفی جاگا تھا سیجا تے ظاہر جاگا انوار ظاہر جاگا انوار
موتی تھی ہیں نیندوں میں اللہ۔ سوتی تھی ہیں بھر نیندوں
حسینی توں جاگائے شہباز توں جاگا ے حسینی توں جاگائے
اٹھنا سہاگن سیجا تے تیرا لالہ نہ جاگے [2]

لیکن ان گیتوں کے متعلق خود مضمون نگار کا خیال ہے کہ "تاریخی اعتبار سے مستند ہونے کا فتویٰ دینے میں تامل ہو سکتا ہے" [3] یہ بات مسلمہ ہے کہ اس طرح کی محفلوں میں متصوفانہ نوعیت کے گیت گائے جاتے تھے اور دوسری بات یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز کو سماع سے خاص دلچسپی اور شغف تھا۔ برہان الدین راز الہی

---

[1] ۔ سخاوت مرزا۔ حضرت خواجہ گیسو دراز کے چند ہندی گیت (مضمون) مشمولہ خاتون دکن۔ جنوری ۱۹۶۵ء۔ ص ۶۔

[2] ۔ سخاوت مرزا نے اس کے مطالب کی اس طرح تشریح کی ہے:۔ میں مرتبہ غیب الغیب میں ایک گنج مخفی کی شہادت رکھتا تھا جہاں امتیاز علی و عینی بھی نہ تھا اور اس کے بعد امتیاز علی و عینی پیدا ہوا تو نے مجھے عالم شہود میں جلوہ گر کر دیا ورنہ میں تو علم الٰہی میں محو خواب تھا۔ تیرے اشتیاق ظہور نے مجھے جگا دیا۔

[3] ۔ سخاوت مرزا۔ حضرت خواجہ گیسو دراز کے چند ہندی گیت (مضمون) مشمولہ رسالہ خاتون دکن۔ جنوری ۱۹۶۵ء۔ ص ۶۔

Marfat.com

(وصال ۱۰۸۳ھ) کے فارسی ملفوظات کا اشرف چشتی نظامی نے ترجمہ کیا ہے ان ملفوظات کو شیخ ابراہیم بن احمد بن محمد گنج شکری نے جمع کیا تھا اور ان کے مرید عبدالحی الحسنی والحسینی نے ۱۰۸۷ھ میں انہیں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں اکثر جگہ خواجہ بندہ نواز کے اقوال نقل کئے گئے ہیں اور ان کا ذکر موجود ہے اس کتاب کے مترجم محمد اشرف چشتی نظامی لکھتے ہیں کہ سماع کے دوران جب خواجہ بندہ نواز پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی تو وہ مسجد کے حوض میں گر جاتے تھے اور حوض کا پانی اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ کوئی شخص اس سے وضو نہیں کر سکتا تھا [1]

خواجہ بندہ نواز کی سوانح حیات "تاریخ جیبی" کا نواں باب "سماع" سے متعلق ہے اس میں لکھا ہے کہ ایک مقام جو "محفوظ و مرغوب" ہوتا اُسے وہ آراستہ کرتے اور ہر جانب طاقوں میں مٹی کی پیالیاں سجا کر ان میں بکثرت عود جلاتے اور ایک پاکیزہ لطیف فرش بچھاتے اور "شوقین دل" والوں کو روک لیا کرتے ۔ ۔ ۔ ان ہی کو مجلس سماع میں شرکت کی اجازت تھی گانے میں صرف "بول" اور تالیوں سے کام لیا جاتا اور مطربوں کے پاس سوائے دف (چنگ) کے اور کچھ نہ ہوتا اگر مزمار (باجے) لاتے تو وہ منع کرتے اس لئے کہ مرشد المشایخین نصیر الدین کی مجلس سماع میں بھی مزامیر نہ ہوا کرتے تھے [2] سماع سننے کا معمول یہ تھا کہ کوئی عربی قول (شعر) یا عربی غزل و ابیات نیز فارسی ابیات سنتے کبھی کبھی چرخ یا گردش بھی کرتے لیکن اکثر بیٹھ کر سنتے اور واردات کا غلبہ اس قدر ہوتا کہ برداشت کی حد سے گزر جاتا تو وجد و اضطراب ظاہر ہوتا۔

خواجہ بندہ نواز سماع کو پسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میہ کی جو یہ "راہ نکلی ہے" وہ کلام اللہ کی بہت تلاوت کرنے اور سماع سننے سے ہے [3] نور الحسینی سید غلام مصطفیٰ قادری چشتی "سیرت بندہ نواز وسیلہ کائنات" میں لکھتے ہیں کہ راجہ صاحب

۱۔ محمد اشرف چشتی نظامی۔ رسالہ شہباز ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۴۔

۲۔ معشوق یار جنگ۔ تاریخ جیبی۔ ص ۸۰۔

۳۔ " " " " ص ۸۱۔

Marfat.com

جو قاضی شہر پناہ تھے دو امور کے باعث خواجہ بندہ نواز سے شاکی تھے۔ایک تو یہ کہ سید محمد حسینی کو عوام جوشِ عقیدت میں سجدہ کیا کرتے تھے دوسرے یہ کہ وہ راگ سے دلچسپی لیتے تھے اور راگ بڑے شوق سے سنتے تھے[1]

اکبرالدین صدیقی "بجھتے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ خواجہ بندہ نواز نے سُہیلا میں بھی طبع آزمائی کی ہے جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"جب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکن تشریف لائے تو آپ نے نہ صرف دکن کی عام زبان دکنی میں وعظ بیان فرمایا اور رسائل املا کرائے بلکہ "سہیلا" یعنی خوشی کے گیت لکھے جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے یہ گیت اور ان کے بعد کے بزرگوں کے گیت جو دکنی زبان میں لکھے گئے ہیں آج بھی روضہ حضرت بندہ نواز میں "بند سماع" میں گائے جاتے ہیں"[2] انھوں نے اس کے تین نمونے درج کئے ہیں ؎

اللہ میں تج باج کیوں رہوں یک تلا
شاہ کا برہا بھیدیا میری کیا
منّتاں کرتے جنم سب گیا
بیگی ملا لیو کرو ہم پر میا

اِی سینے میانے درد ہے کاری سینے
بیدل ہو رہوں تو مشکل ہے بھاری
منجہ دوکھیا کیوں دیونا دلدار کی

خواجہ نصیرالدین میرے چھندا
سید محمد مرید تیرا ہوں بندا
مری بندگی قبولے تو کروں میں آنندا

---

[1] ۔ نورالحسینی سید غلام مصطفیٰ قادری چشتی۔ سیرت بندہ نواز و سیدالکائنات۔ ص۲۵۔
[2] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ بجھتے چراغ۔ ص۱۱۔

Marfat.com

درمقام رام کلی

کھول کھول گھونگھٹ وارنے۔ تیر برہا لگیا منجے مارنے
میں = پیا منجہ ابلا سون کیا روسنا۔ گھر آو رے ڈھولن، ساجنا
کرے لاورے کسی سوں کیا لاجنا
میں = پیا میں تو جھک سے ہوئی پیو تجہ کارنے
تو میرا سائیں آ منجے میلنے
تب دھوائی ایلاخی ہوئی سب جگ منے
میں = توں میر روشن بخش سارے عالم کا
میں امیدوار ہوں تیرے نور کا
سید محمد بندا تیرے پیار کا
مکھ دکھلاؤ سجن نک چار کا

درمقام رام کلی

کیوں روخ راکھوں شاہ سوں منج سنگلہ بھاری
شہہ کے تیزی ٹاپنے پیادے ہیں خوں کاری
میں = ادمن سو بے شہہ کے کینے بوجھا نہ جاوے
جو سٹ گھر پھراے کر اونا روندی نھائی
شہہ سنگھ شطرنج کھیلنے چھند بند سب ہاری

بدبلوں سیتی اپنے سودھن کھیلیا لوڑی
ماتے جائے چھوڑ کر شہہ نے فرضی بند توڑی
جب کری فیل مہات سودھن مکنا موڑی
میں = دان دیئو منج کوں شہہ میں چیری تیری
بھات ہوا روخ دیکتی ابکیا دتیری گھڑی

Marfat.com

آ کھے سید محمد حسینی شاہ ایں اپنا پاوں
تن من کالے کر بازی قائم لیا اون
منجے ملے شیخ نصیر الدین شاہ پرایں کیو بل بل جاؤن [1]

اس گیت میں شطرنج کی اصطلاحوں سے متصوفانہ تصورات کی تشریح کی گئی ہے۔

یہ زبان کدم راؤ پدم راؤ کی زبان سے قریب نظر آتی ہے اور اس کے مقابلے میں در الاسرار، معراج العاشقین یا تلاوت الوجود کی زبان نسبتاً جدید معلوم ہوتی ہے۔ راقمۃ الحروف نے برٹش میوزیم کے ایک مخطوطے [2] سے جس میں یہ گیت خواجہ بندہ نواز کے رہبر طریقت نصیر الدین چراغ دہلی کے ذکر کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، تصحیح کر کے یہاں نقل کیا ہے۔ اکبر الدین صدیقی نے غالباً اسے دو رما بعد کے کسی مخطوطے سے نقل کیا ہے اس لئے بعض قدیم الفاظ بدلی ہوئی شکل میں تحریر کئے گئے ہیں۔

بندہ نواز اس تصور کے حامل تھے کہ سماع سے گداز قلب، رقت اور سپردگی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے ان کی زندگی کا معتد بہ حصہ دہلی میں بسر ہوا تھا۔ خواجہ بندہ نواز نے سماع کے لئے جو گیت لکھے ہیں ان کی زبان وہی ہے جو اس دور کے صوفی سنتوں کے یہاں ملتی ہے۔ ان کی لفظیات اُس دور کے ہندو صوفیاء کی لفظیات سے زیادہ مختلف نہیں۔ گیسو دراز گیتوں کے لئے اسی زبان کو زیادہ موثر اور موزوں تصور کرتے تھے اور اپنے لئے انھوں نے اس زبان کو گیتوں سے مخصوص کر دیا تھا۔ اب تک خواجہ بندہ نواز کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس میں وہی اشعار شک و شبہ سے بالاتر سمجھے جا سکتے ہیں جن میں شاعر نے اپنا اور اپنے مرشد کا ذکر کیا ہے اور جن کی زبان عہد بندہ نواز کی زبان ہونے کی شاہد ہے۔ گیسو دراز کی زبان جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس عہد کے صوفیاء اور سنتوں کی لفظیات اور اظہارِ ترسیل کی آئینہ دار ہے۔ مولوی عبد الحق نے اپنی ایک بیاض مکتوبہ ۱۰۶۸ھ کے بارے میں تحریر کیا ہے

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی ۔ بجھتے چراغ ۔ ص ۱۵۱۔
[2] مخطوطہ نمبر ۔ ۱۱۴۹۰ ص ۱۸

Marfat.com

کہ اس میں خواجہ بندہ نواز کی بھی ایک غزل درج کی گئی ہے جس میں شاعر نے نفسِ انسانی کو ایک گھوڑے سے تشبیہہ دی ہے جسے ایمان کا چارہ کھلانا ضروری ہے، اس کے دو رکاب ہیں خیر و شر اور اس کا چابک توبہ ہے۔ اس غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

توں تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
نہ ہوئے نرم او تجہ چڑے پس کہائیگا آزار توں

شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ کی جانب ہوے کر تب پاے گا دیدار توں

لیکن خود عبدالحق نے اس غزل کے بارے میں اپنے شبہہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں کی ہے"[1]

ڈاکٹر زور "دکنی ادب کی تاریخ" میں رقمطراز ہیں کہ یہ سید شہباز حسینی کی شعری تخلیق ہے جو خواجہ صاحب کی اولاد میں سے تھے وہ لکھتے ہیں "ان کی بعض غزلیں بعد میں خواجہ بندہ نواز کی طرف منسوب کر دی گئیں ہے"[2]

سخاوت مرزا اس غزل کو خواجہ بندہ نواز کی غزل تسلیم کرتے ہوئے تامل کرتے ہیں[3] اور نذیر احمد نے بھی اس کو شہباز حسینی کی غزل بتایا ہے[4]

"دکن میں اردو" میں نصیرالدین ہاشمی نے تمکین کاظمی کے مضمون مشمولہ رسالہ "النساء" حیدرآباد ۱۳۴۷ھ کے حوالے سے خواجہ بندہ نواز سے موسوم بعض بیماریوں کے منظوم نسخے بھی تحریر کئے ہیں مثلاً آنتو ہلیلہ دانتوں لون
بیتن کے گھر جائے کون[5]

---

[1] ۔ عبدالحق ۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔ ص ۲۱

[2] ۔ ڈاکٹر زور ۔ دکنی کی تاریخ ۔ ص ۲۳ ۔

[3] ۔ سخاوت مرزا ۔ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء

[4] ۔ نذیر احمد ۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۲۶۸ ۔ [5] ۔ نصیرالدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ صفحہ

Marfat.com

مختلف کتب خانوں میں بہت سے ایسے رسائل اور ایسا کلام موجود ہے جسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا گیا ہے لیکن ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ گیسو دراز ہی کی نگارشات یا شعری کاوشیں ہیں۔ "معراج العاشقین" میں خلیق انجم نے گیسو دراز کے دکنی کلام کے زیرِ عنوان چکی نامہ سبلیاں (پہلیاں) اور جو دوسرے اشعار پیش کئے ہیں وہ مشتبہ ہیں۔ انہیں خواجہ بندہ نواز کی تخلیق تسلیم کرنے کا جواز نہیں ہے۔

ڈاکٹر زور نے اپنے "تذکرہ اردو مخطوطات" میں بندہ نواز کے چکی نامہ کا تعارف کروایا ہے اس میں بارہ بند ہیں اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

دیکھو واجب تن کی چکی　　پیو چاتر ہو کے سکی
موکن ابلیس کھینچے کھینچے تھکی　　کہے باسمہ اللہ اللہ
الف اللہ کا دستا　　میاں محمد ہو کے بستا
پہنچی طب یوں کو دستا　　کہے یا بسمہ اللہ ھو ھو اللہ

اس چکی نامے کی زبان بہت صاف ہے اور لسانی اعتبار سے یہ عہد بندہ نواز کی نہیں بلکہ دور ما بعد کی شاعرانہ کاوش معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ بندہ نواز سے منسوب ایک رباعی بھی دستیاب ہوئی ہے اس کو راقمۃ الحروف نے اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری کی ایک قدیم بیاض سے نقل کر کے پیش کیا ہے ؎

مشہود بہ حیرت ہو، مگر ہیچ ہے واللہ
مرنے کے انگے مر کے ہو فانی فی اللہ
خناس کے وسواس سوں توں ہو پامال
لاحول ولا قوۃ الا باللہ [1]

گیسو دراز کے زمانۂ حیات ہی میں دکن میں ان کے معتقدین کی کمی نہیں تھی وہ ہر طبقہ میں مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ اور ان کی عظمت کا نقش شاہ و گدا دونوں

---

[1] ۔ سیدہ جعفر۔ دکنی رباعیاں۔ ص ۸۶

Marfat.com

کے دل پر بیٹھ گیا تھا" کتابِ نورس" میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بڑی عقیدت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے ؎

مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز عاشق شہباز سر فراز
تمہاری قبر سپنی سید محمد آچھے موتی

مثمن در مدح سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز میں بھی دکن کے شہنشاہ تصوف کو سلطان ابراہیم عادل شاہ تاجدار بیجاپور نے اس طرح خراجِ عقیدت ادا کیا ہے ؎

اک قدم اس باٹ میں توں سب عمل زیبا کیا
تو ندا ہاتف کے تج آیا کہ عاشق شہباز

اسی طرح علی عادل شاہ ثانی نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

سب دکن کے اولیاء میں شاہ توں دستا ہے آج
اس دھرت کے سر اُپر گنبد سو تیرا جیوں ہے تاج
ہور کلس کے چاند کوں گنبد سوں مل کر ایک ساج
شرم سوں آپس میں گل ہر نس چندر جاتا ہے لاج

اکثر دکنی شعراء نے جن میں نصرتی، محمد مختار، اولیاء اور فراقی وغیرہ شامل ہیں خواجہ بندہ نواز کی مدح بڑی عقیدت اور خلوص کے ساتھ کی ہے۔

سید محمد اکبر حسینی

"تذکرہ اولیائے دکن" میں ان کا نام سید حسین اور عرف محمد اکبر بتایا گیا ہے[1] سید محمد اکبر حسینی خواجہ بندہ نواز کے خلفِ اکبر تھے۔ "سیر محمدی" میں محمد علی سامانی نے ان کا نام سید حسین بتایا ہے اور نام کے ساتھ "خلاصہ اصحاب شریعت پیشوائے ارباب طریقت، حقیقت تاج الدولہ والدین سید حسین رضی اللہ عنہ معروف بہ سید محمد اکبر تحریر کیا ہے[2] جس سے ان کی فضیلت و بزرگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "تاریخ مشائخ چشت" میں خلیق احمد نظامی نے انہیں

---

[1] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ تذکرہ اولیائے دکن۔ حصہ دوم۔ ص ۹۷۵
[2] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ ص ۱۲۱

Marfat.com

خواجہ بندہ نواز کے خاص خلفاء میں شمار کیا ہے [1] عمر یافعی نے تذکرہ اولیائے دکن کے حوالے سے ان کا سنہ ولادت ۸۱۲ھ تحریر کیا ہے [2] لیکن ابوالحسن سید عظمت اللہ حسینی ۷۶۲ھ یا ۷۶۳ھ لکھتے ہیں اور ان کا مولد دہلی بتایا ہے [3] "جوامع الکلم" کے مرتب لکھتے ہیں کہ دہلی کے زمانۂ قیام میں انھوں نے نصیر الدین قاسم عمرانی، مولانا خواجگی نحوی اور مولانا عبدالمقتدر کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا [4] اور جب خواجہ بندہ نواز نے تیموری حملے کی خبر سن کر جنوب کا رخ کیا تو وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ دکن چلے آئے تھے۔ بچپن ہی سے تحصیلِ علم کا شوق تھا۔ اکبر حسینی اپنے عہد کے عالم متبحر اور فاضل کامل سمجھے جاتے تھے۔ سات سال کی عمر میں وہ علم باطنی سے روشناس ہوئے اور خواجہ بندہ نواز اُنھیں سیر و سلوک کا درس دینے لگے [5]

اکبر حسینی خواجہ بندہ نواز کے بڑے چہیتے فرزند تھے اور وہ انہیں "میاں بڑھ" یا "سیّد بڑھ" کہا کرتے تھے [6]

اکبر حسینی کی تعلیم و تربیت گیسو دراز کی خاص توجہ اور لطف کی مرہونِ منّت تھی۔ علوم ظاہری و باطنی میں انھوں نے اپنے والد سے فیض حاصل کیا تھا "جوامع الکلم" میں اکبر حسینی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔

شائد کہ یہ حال این ضعیف گہ وابستہ ترین تلمذان حضرت مخدوم جہانیاں است و کمترین خدمت گاران آن جناب عالی ماب است" [7]

اکبر حسینی کی کتاب "کتاب العقائد" سے آپ کے اہل سنت والجماعت

---

[1] ۔ خلیق احمد نظامی۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۲۰۷

[2] ۔ عمر یافعی۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز۔ اپریل ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۵ ۔ [3] ۔ ابوالحسن سید عظمت اللہ حسینی تذکرۂ مخدوم زادہ بزرگ۔ ص ۸

[4] ۔ حامد صدیقی۔ (مترجم) جوامع الکلم۔ ص ۵

[5] ۔ محمد سلطان۔ ارمغان سلطانی۔ ص ۹

[6] ۔ ابوالحسن سید عظمت اللہ حسینی۔ تذکرہ مخدوم زادہ بزرگ۔ ص ۶

[7] ۔ حامد صدیقی۔ جوامع الکلم۔ ص ۵

Marfat.com

ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ ان کی شادی علاءالدین خلجی کے بھائی خانم خاں کی نواسی سے ہوئی تھی۔ اکبر حسینی کے خسر ملک چھجو کہلاتے تھے [1]

اکبر حسینی کے علمی اکتسابات اور روحانی مراتب کی وجہ سے خواجہ بندہ نواز کو ان سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ محض فرزند ہونے کی وجہ سے انہیں عزیز نہیں رکھتے تھے سلوک و معرفت میں وہ جن اعلیٰ درجات پر فائز تھے اور انہیں جو ولایت و بزرگی حاصل تھی اسے ملحوظ رکھتے ہوئے بندہ نواز نے کہا تھا" یہ بھی ان عظیم الشان بزرگوں میں سے ہیں جو اپنے پیر سے برتر ہو گئے تھے اگر یہ میرے فرزند نہ ہوتے تو میں ان کی خدمت کرتا اور بہ لحاظ بزرگی درحقیقت وہ اس کے مستحق تھے [2]" سیر محمدی" میں اکبر حسینی کے کمالات و فضائل پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد علی سامانی نے خواجہ بندہ نواز کا یہ قول نقل کیا ہے۔" فرماتے تھے کہ کوئی مرید پیر سے بہتر نہیں ہوا مگر دو شخص ایک حضرت قطب الدین حضرت مخدوم معین الدین سجزی سے اور دوسرے محمد اکبر مجھ سے" [3]

خواجہ بندہ نواز نے ۸۱۱ھ میں اکبر حسینی کو خلافت عطا فرمائی اور اپنی مسند ارشاد پر بٹھایا تھا لیکن اکبر حسینی کی عمر نے وفا نہ کی اور سات ماہ بعد چہار شنبہ ۱۵ ربیع الثانی ۸۱۲ھ کو انھوں نے والد کے زمانۂ حیات میں وفات پائی [4] نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اُردو" میں اکبر حسینی کا سنہ وفات عبدالجبار ملکاپوری مصنف " محبوب ذی المنن تذکرہ اولیائے دکن" کے حوالے سے ۸۲۳ھ تحریر کیا ہے [5] لیکن ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مضمون" معراج العاشقین" میں اکبر حسینی کا سنہ وفات ۸۲۳ھ بتلاتے ہیں [6] اس سلسلے میں سب سے مستند بیان محمد علی سامانی کا ہے جو

---

[1] ۔ عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب اردو ادب بہمنی دور میں ص ۱۸۱۔

[2] ۔ حامد صدیقی۔ جواہر الکلام۔ ص ۲۴۔ [3] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ ص ۱۲۸۔

[4] ۔ محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ ص ۱۳۰۔

[5] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۳۶۔

[6] ۔ نذیر احمد۔ معراج العاشقین (مضمون) مشمولہ رسالہ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۶ء ص ۸۔

Marfat.com

اکبر حسینی کے سانحہ ارتحال کے وقت خواجہ بندہ نواز کی خدمت میں موجود تھے اور جو اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہیں گیسو دراز کے ہمرکاب ہونے کا شرف حاصل تھا۔ محمد علی ساماني لکھتے ہیں:۔

" روز چہار شنبہ پانزدہم ماہ ربیع الآخر ۸۱۲ھ اثنا عشر و ثمان ازیں جہاں در آن جہاں رحلت فرمودند ایشاں را حضرت مخدوم رضی اللہ عنہ غسل دارند "[1]

خواجہ بندہ نواز کی ایک کرامت کے سلسلے میں ارمغان سلطانی کے مصنف نے اکبر حسینی کے مرض الموت کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ان کی وفات دردِ شکم کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اکبر حسینی کا سنہ وفات ۱۵ ربیع الآخر ۸۱۲ھ بتایا گیا ہے۔[2] وہ گیسو دراز کے مقبرے کے قریب مدفون ہیں۔ عمر یافعی لکھتے ہیں کہ بندہ نواز ہر چہار شنبہ کو زیارت کی غرض سے ان کے مزار پر جاتے تھے[3] خواجہ بندہ نواز جب تک بقیدِ حیات رہے بڑے اہتمام سے اکبر حسینی کا عرس کیا کرتے تھے۔ جوامع الکلم میں سید یوسف حسینی شاہ راجو قتال کا جو شجرہ درج کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر حسینی کے فرزند میاں سفیر اللہ حسینی تھے۔ انہوں نے احمد شاہ بہمنی کی صاحبزادی بی بی رانی صاحبہ سے بھی عقد کیا تھا وہ ان کی دوسری زوجہ تھیں۔ اکبر حسینی کی بیٹی بی بی رقیہ میاں کلمۃ اللہ حسینی سے بیاہی گئی تھیں[4] عمر یافعی لکھتے ہیں کہ حضرت حسین شاہ ولی اور شاہ راجو قتال حیدرآبادی آپ کی ولایت کے قائل تھے۔ تاریخ حبیبی میں اکبر حسینی کی کرامات کا مفصل ذکر موجود ہے۔[5]

---

[1] ۔ محمد علی ساماني۔ سیر محمدی۔ ص ۱۳۰۔

[2] ۔ محمد سلطان ۔ ارمغانِ سلطان ۔ ص ۹۱

[3] ۔ عمر یافعی۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز اپریل ۱۹۶۳ء ص

[4] ۔ حامد صدیقی۔ جوامع الکلم۔ ص ۲۷۔

[5] ۔ عمر یافعی۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز اپریل ۱۹۶۳ء ص

[6] ۔ معشوق یار جنگ۔ تاریخ حبیبی۔ صفحہ ۵۴، ۵۵، ۵۷ تا ۵۹

Marfat.com

سیر محمدی میں اکبر حسینی کی فارسی اور عربی تصنیفات کی تعداد گیارہ بتائی گئی ہے جن میں ایک ملفوظاتِ حضرت مخدوم بھی ہے جس کے بارے میں محمد علی ساماني لکھتے ہیں کہ اس کے دو نسخے ہیں ایک دہلی میں لکھا گیا تھا اور دوسرا گجرات میں[1] اکبر حسینی کی تصانیف میں معارف (عربی) ملتقط عقیدہ (فارسی) مقاماتِ صوفیان (عربی) تعریف مالکی۔ اور رسالہ اباحت سماع میں سماع کے جائز اور درست ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے[2]

سیر محمدی کے باب ہفتم میں خواجہ بندہ نواز کے خلفاء کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز کے پہلے خلیفہ مولانا علاءالدین گوالیری تھے دوسرے شیخ صدرالدین خوندمیری، تیسرے قاضی علیم الدین بن شرف اور چوتھے خلیفہ خود ان کے بڑے صاحبزادے اکبر حسینی تھے[3] ۸۱۱ھ کے آخر میں ان کے والد خواجہ بندہ نواز نے انہیں خلافت مرحمت فرمائی تھی[4] اکبر حسینی کے بچپن کے دوست شاہ ید اللہ حسینی گنج بخش تھے جنھیں آپ سے بڑی محبت تھی[5] دکنی میں ان کے ایک رسالے کا تذکرہ عمر یافعی نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے[6] جسے قندر مکرر کے طور پر رسالہ شہباز میں بھی شائع کیا گیا ہے[7] عمر یافعی لکھتے ہیں کہ حسینی کو نثر لکھنے اور نظم کہنے میں مہارت حاصل تھی ان کی ایک تصنیف کا پتہ چلتا ہے جس میں نظم اور نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں. اس کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں اس کا

---

[1] ۔ محمد علی ساماني ۔ سیر محمدی ۔ ص ۱۳۱

[2] ۔ ابوالحسن سید عظمت اللہ حسینی ۔ تذکرہ مخدوم زادہ بزرگ ص ۲

[3] ۔ محمد علی ساماني ۔ سیر محمدی ۔ باب ہفتم ۔ ص ۱۴۳

[4] ۔ ابوالحسن سید عظمت اللہ حسینی ۔ تذکرہ مخدوم زادہ بزرگ ۔ ص ۱۱

[5] ۔ " " " " " ... ص ۱۳

[6] ۔ عمر یافعی ۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ مجلہ مکتبہ نمبر ایک اپریل ۱۹۲۸ء.

[7] ۔ " " " " " " (مضمون) مشمولہ شہباز ۔ اپریل ۱۹۶۳ء ۔ ص ۱۰

Marfat.com

حوالہ دیا ہے[1] نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"سنو! اے مسلمانوں طالب خدا کے. بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیون کا بھروسہ نہیں موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت عجلو بالتوبۃ قبل الموت۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہوا کفر وضلالت سوں آپس کو پاک کرنا ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی میں عاقبت کی راہ سنوارنا۔ اس باب میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے قرآن مجید میں، کہا ہے اپنے حبیب کوں خبر فرما رہے ہیں انا ارسلنک ۔ ۔ ۔ جس کوں پیر نہیں اس کو دین نہیں جسے دین نہیں اسے بوج نہیں ہور جسے بوج نہیں اسے عشق نہیں ہور جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں یسے بے پیر ہو کر رہنا عین کفر ہے" [2]

نثر کی مندرجہ بالا عبارت کی طرح ذیل میں لکھے ہوئے اشعار کا موضوع بھی شیخ کی اہمیت سے متعلق ہے۔ ان اشعار میں پیر کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

دھو کر زبان کوں اپنی پہلے پیر سوں بیان پر
بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زبان پر
ہے خدا بے صفت اس کوں نہیں نہایت
کرنے کوں تس صفت کو نئیں مجھ زباں میں طاقت
بعد از ثنا خدا کی بھیجوں درود نبی پر بھی آل پر اس کے اصحاب میں
بعد اس کے نام لے کر قادر محی الدین کا بوبو بیاں سنو یو حاصل مراد دین کا
بے پیر کے جو ہیں گے دارو جو کھا جیا کر بے شک جیا تو جانو اس کو ہوا و دکافر
بے پیر ہیں گے دارو کھا کر اگر موا تو ایماں سلب ہو تس پر مرتا ہے بے ایماں ہو
بے پیر کے جو ہت کا پانی طعام کھاوے ہو گوشت جوں سور کا اس کوں حرام پاوے

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۳۶

[2] ۔ عمر یاقتی۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز۔ اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۱،۱۰۔

Marfat.com

تاکید سب کیے ہیں امر خدا رسول سے بے پیر دو جہاں میں مردود نا قبول ہے
بے پیر جو موا تو نئیں ہے درست اسپر پڑنا نماز جنازہ تو ہوئے گناہ اکبر
بالغ ہوا نئیں لگ نئیں حکم اس پوجانو بالغ ہوئے کے بعد از ہوا مر ہے سو مانو
بیٹے کو باپ بولے بیٹا کہے پدر تئیں ہونا مرید جلدی لے کر بجا امر تئیں
بیٹے نے ماں سو کہنا اے مہربان مادر ہونا مرید شتابی یک لحظہ نا درنگ کر[1]

کوئی پیر پر فنا ہو کیتا اپس فنا ہو پاوے مراد حق سوں جو کچھ طلب کرے سو
مورک ستی جو کہنا تو یو سخن عبث ہے عاقل کے تئیں اشارت انتاچ یو سو بس ہے
ناکر بیاں زیادہ انیچھ یو سو رک کر کیتا تمام اس کوں آخر ختم شکر کر[2]

اکبر حسینی کی نثر کا جو نمونہ درج کیا گیا ہے اس کی زبان خواجہ بندہ نواز کے عہد کی نہیں معلوم ہوتی۔ نثر میں علامت فاعل "نے" کے استعمال سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نثر عہد مابعد سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح عمر یافعی نے اکبر حسینی سے منسوب جس کلام کو نقل کیا ہے اس کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں :- یہ نظم و نثر بہت صاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ مابعد میں اس کے الفاظ شاید تبدیل ہو گئے "[3]

محمد عبدالحکیم صدیقی "سیدنا بندہ نواز کا روحانی فیضان" میں لکھتے ہیں کہ گیسو دراز کے ننانوے (۹۹) اسمائے گرامی ہیں جن کو اکبر حسینی نے مرتب کیا ہے۔ ان میں ابو المشائخ، سلطان العاشقین گوہر دریائے قدم، میر مجید اور مرشد مشید بھی شامل ہیں[4]

عمر یافعی نے اپنے مضمون " آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ" میں جس رسالے کی نشان دہی کی ہے اس پر کوئی نام درج نہیں ہے۔ کاتب کا نام قاسم بیگ

---

[1] ۔ عمر یافعی ۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز اپریل ۱۹۶۳ء ۔ ص ۱۱-۱۳

[2] " " " " " " " " " ص ۱۴

[3] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ ص ۳۸ ۔

[4] ۔ محمد عبدالحکیم صدیقی ۔ سیدنا بندہ نواز کا روحانی فیضان (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز مارچ اپریل ۱۹۶۲ء ص ۳

Marfat.com

ہے اس رسالے کی ابتداء نثر کی ایک عبارت سے ہوتی ہے جس کی حیثیت تمہیدی ہے اور اس کے بعد" ابیات کے زیرِ عنوان سینتس (۳۷) شعر نقل کئے گئے ہیں۔ رسالہ پر اگر ابتداء میں " ہذا رسالہ بندہ نواز گیسو دراز" کی عبارت موجود ہے تو اختتام پر" من تصنیف سید محمد اکبر حسینی فرزند بندہ نواز" تحریر کیا گیا ہے ایک مختصر سے رسالے پر دو شخصیتوں کے نام بحیثیت مصنّف درج کئے گئے ہیں اس رسالے کی زبان بھی عہد مابعد کے دور سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس کا اصلی مصنف کون ہے؟

اس رسالے میں رہبرِ کامل کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ پیر کی دستگیری کے بغیر سالک ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور صراطِ مستقیم کو نہیں پا سکتا۔ اس کا خلاصہ مصنف رسالہ کے الفاظ میں "بے پیر رہنا کفر ہے"

" ہور اس باب میں عام لوگ ناخوانندیاں کے سمجھنے بدل دکھنی زبان سوں کتیاں یک بیتال کہتا ہوں۔ تا عام لوگوں پر معلوم ہووے ہور خدائے تعالیٰ کرم فضل کر کے اپنے بندیاں کوں جو گمراہ ہیں ان کو توفیق ہدایت کی دیوے جو ضلالت سوں نکلے"[1]

ان ہی مطالب کی تشریح اشعار میں بھی کی گئی ہے۔ عبارت اور اشعار دونوں عہد خواجہ بندہ نواز کے محاورے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں اور ان کا تعلق دور مابعد سے معلوم ہوتا ہے غالباً اسی لئے عمر یافعی نے واضح طور پر اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا ہے کہ" اس کے مصنّف کے تعیّن میں بڑی مشکل ہے"[2] آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"آٹھویں صدی یا نویں صدی کی نظم و نثر کے جو نمونے سمجھے جاتے ہیں ان کے مقابلے میں اس کی زبان ذرا صاف معلوم ہوتی ہے"[3]

اکبر حسینی کے مصنف ہونے میں کوئی شبہ نہیں انہوں نے فارسی اور عربی میں

---

[1] عمر یافعی۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز اپریل ۱۹۶۳ء ص ۱۱

[2] " " " " " " " " " " " " ص ۱۰

[3] " " " " " " " " " " " " ص ۱۵

Marfat.com

اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ کتاب العقائد جیسا کہ کہا جا چکا ہے اکبر حسینی کی تصنیف ہے اس میں اہلِ سنت کے عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب سوال وجواب کی صورت میں لکھی گئی ہے اور اس کو عطا حسین نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۳۶۶ھ میں شائع کر دیا ہے اکبر حسینی کی تیسری تصنیف "تبصرۃ الاصطلاحات الصوفیہ" ہے اس میں صوفیائے سلف کے بعض اسرار و رموز کی تشریح کی گئی ہے یہ کتاب بھی عطا حسین کے مقدمے کے ساتھ سلسلۂ مطبوعات روضین گلبرگہ سے شائع ہو چکی ہے "مراۃ التحقیق" میں نفس کی معرفت کے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔ اکبر حسینی کے دو اور مختصر رسالے اباحت پوشیدن کفش در مسجد" اور "تصرف مالکی" ہیں آخر الذکر کا موضوع علم صرف ہے [1]

فیروز شاہ بہمنی

فیروز شاہ بہمنی، سلطنت بہمنیہ کا آٹھواں حکمران تھا [2] نیل کنٹھ شاستری شمس اللہ قادری اور ہارون خاں شیروانی نے اس بادشاہ کا لقب تاج الدین بتایا ہے [3] "دکن کے بہمنی سلاطین" میں ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں جو چاندی کے سکے رائج تھے ان پر اس کا لقب تاج الدین کندہ کیا ہوا ملتا ہے [4] اس کا عہدِ حکومت (۲۴ صفر ۸۰۰ھ مطابق ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء) بہمنی سلطنت کے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخِ دکن میں فیروز اپنے سیاسی تدبر اور دانشمندانہ حکمت عملی اور اعلیٰ نظم و نسق کی وجہ سے خانوادۂ بہمنیہ کا ایک عظیم المرتبت تاجدار تصور کیا جاتا ہے اس نے اپنے دار السلطنت میں صالح تہذیبی روایات اور طرز تمدن کو پروان چڑھایا تھا [5] فیروز شاہ بہمنی علوم اسلامی کا ماہر تھا

---

[1] ۔ عمر یافعی ۔ آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ (مضمون) مشمولہ رسالہ شہباز اپریل ۱۹۶۳ء ص ۲۵

[2] ۔ عبد المجید صدیقی ۔ تاریخ دکن عہد وسطیٰ ۔ بہمنی سلطنت ۔ ص ۹۲ ۔

[3] ۔ الف) ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا چوتھا ایڈیشن ص ۲۲۶ ۔

[4] ۔ ب) اردوئے قدیم ص ۱۳۴ (ج) دکن کے بہمنی سلاطین ص ۱۳۴ مترجم رحم علی الہاشمی ۔ ص ۱۳۴ ۔

[5] ۔ عبد المجید صدیقی ۔ تاریخ دکن عہد وسطیٰ بہمنی سلطنت ۔ ص ۹۹ ۔

Marfat.com

اس نے تفسیر، حدیث فقہ اور تصوف کے علاوہ فلسفہ، علم ہیئت قانون اور خوشنویسی میں مہارت تامہ حاصل کی تھی" حدایق السلاطین" میں علی بن طیفور بسطامی نے فیروز کے علم وفضل کی بڑی تعریف کی ہے [1]

فیروز شاہ بہمنی علامہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا جو سعد اللہ تفتازانی کے شاگرد تھے اور شیراز سے آکر دکن میں مقیم ہو گئے تھے۔ تاریخ رشید الدین خوافی کا مورخ لکھتا ہے کہ فیروز نے علامہ انجو کو وکیل سلطنت مقرر کر کے انہیں ملک نائب کے خطاب سے سرفراز کیا تھا [2] عبدالجبار ملکاپوری کے الفاظ میں " مولانا فضل اللہ انجو کی خدمت میں کتب درسیہ معقول ومنقول بیس برس کی عمر میں پڑھ کے فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ فضائل علم وفن سے مزین ہو گیا تھا۔ علم طبیعات والہیات وریاض میں علامہ عصر تھا" [3] یہی مصنف اپنی دوسری کتاب " محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن " [4] میں لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ کو اس کے چچا محمود بہمنی نے عمدہ تعلیم دلوائی تھی اور اس نے علامہ سعد اللہ تفتازانی کے شاگرد رشید ملا فضل اللہ انجو کو خاص عربی تعلیم کے لئے مقرر کیا تھا اور سولہ سال کی عمر میں تمام علوم پر فیروز شاہ نے دسترس حاصل کر لی تھی عبدالرحیم خان " گلبرگہ گزٹیر" میں رقمطراز ہیں کہ فضل اللہ انجو کی قبر ہفت گنبد کے چبوترے پر موجود ہے [5] ہندوستان کی تاریخ میں دو ایسے بادشاہ گزرے ہیں جو عالم متبحر کہے جا سکتے ہیں ایک سلطان محمد تغلق اور دوسرے فیروز شاہ بہمنی۔ فیروز لاطینی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ طبیعی علوم اور ہندسہ وریاضی میں عالم بے بدل سمجھا جاتا تھا [6] فیروز ادیب ہونے کے علاوہ اچھا شاعر بھی تھا۔ عروجی اور فیروزی تخلص

---

[1] ۔ علی بن طیفور بسطامی۔ مخطوطہ حدائق السلاطین۔ مخطوطہ نمبر ۵۲۷ تذکرہ کتب خانہ سالار جنگ ص ۱۰۵

[2] غلام امام خان ترمین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۱۷۴۔

[3] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن۔ ص ۴۲۹

[4] ۔ " " " " ۔ محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن ص ۸۵۶

[5] ۔ عبدالرحیم خان۔ گلبرگہ گزیٹر۔ ص ۱۹

[6] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ دکن عہد وسطی بہمنی سلطنت۔ ص ۹۷

Marfat.com

کرتا تھا۔[1] وہ ہر سال ایران و عرب کے ساحلوں پر اپنے جہاز روانہ کرتا تھا اور عالم، انتہائی عزت و احترام کے ساتھ دکن لائے جاتے تھے۔ فیروز شاہ کہتا تھا کہ صرف علماء ہی غیر ممالک کے بہترین تحفے ہیں۔[2] فیروز شاہ بہمنی عالم اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی بھی تھا۔ عبدالمجید صدیقی نے "برہان مآثر" کے حوالے سے لکھا ہے کہ دکن کے مورخ اس کو "سلطان غازیان" کہتے تھے اس علم دوست بادشاہ کے دربار میں علماء اور فضلاء کی بڑی قدر افزائی کی جاتی تھی۔ "کلام الملوک" میں میر سعادت علی رضوی لکھتے ہیں کہ فیروز کو مذہب سے بھی خاص شغف تھا تفسیر، حدیث اور فلسفے میں وہ اپنے دور کے علماء کا ہم پایہ تھا۔[3] فیروز کو جب امور سلطنت سے فرصت ملتی تو وہ اہلِ علم کو اپنی ہم نشینی کا شرف عطا کرتا۔ فیروز کو علم ریاضی اور علم ہیئت سے ایسا لگاؤ تھا کہ اس نے ان علوم کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے لئے بالا گھاٹ[4] پر ایک رصد گاہ تعمیر کرنے کا منصوبہ مکمل کر لیا تھا مگر سید محمود گرزونی اور کلیم حسن گیلانی کی غیر متوقع وفات کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ سلاطین دکن میں فیروز شاہ جیسے علم پرور بادشاہ کم نظر آتے ہیں۔ ہارون خان شیروانی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں فیروز شاہ کا شمار فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ مورخ دکن محمد قاسم فرشتہ نے بھی فیروز شاہ کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔[5] فیروز شاہ کے علمی شغف کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بادشاہ خود بہ نفس نفیس ہفتے میں تین دن درس و تدریس کا کام انجام دیتا اور تشنگانِ علم کو سیراب کرتا تھا۔[6] محبوب الوطن

---

[1] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ تاریخ دکن عہد وسطیٰ بہمنی سلطنت۔ ص ۹۷

[2] ۔ " " " " " " ص ۹۸

[3] ۔ میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۹

[4] ۔ بالا گھاٹ اس پہاڑی سلسلہ کا ایک حصہ ہے جو اورنگ آباد، دولت آباد سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا ہے۔

[5] ۔ محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔ ص ۲۰۸

[6] ۔ (ا) سید اصغر علی بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول ص ۱۳۱۔ (ب) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص ۲۳

Marfat.com

"تذکرہ سلاطینِ دکن" میں عبدالجبار ملکاپوری نے "ملحقات" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "فیروز شاہ بہمنی جو عالم فاضل اور علامۂ کامل تھا جب تخت نشین ہوا تب سے عجائب و غرائب کتب کے جمع ہونے سے اس کا کتب خانہ عجائب خانہ بن گیا تھا۔ ۔ ۔ عرب و عجم سے نفائس و نوادر کتب منگوا کر کتب خانے میں داخل کیے جاتے تھے" [1]

فیروز شاہ کئی زبانوں سے بخوبی واقف تھا۔ ہارون خان شیروانی نے فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ عربی فارسی اور ترکی کے علاوہ کنڑی، تلگو، مراہٹی، گجراتی، بنگالی اور بعض دوسری زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔ فیروز بہمنی تہذیبی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ نیل کنٹھ شاستری نے "اے ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا" میں لکھا ہے کہ فیروز ایک وسیع النظر حکمران تھا اس کے دورِ حکومت میں برہمن کئی اہم عہدوں پر فائز تھے [2] اسی طرح "دکنی کلچر" میں نصیرالدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ فیروز کے زمانہ حکومت میں سیاسی تدبر سے ملک کو "بلند منزل" پر پہنچایا گیا اور دوسری طرف "پاکیزہ تمدن اور بہترین کلچر" سے ملک کو زینت دی گئی [3] یہی مصنف "دکن میں اردو" میں لکھتے ہیں کہ فیروز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی قلمرو کے تلگو، کنڑی اور مراہٹی بولنے والوں کو "ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ نظم و نسق کے انصرام کے لئے ان تینوں علاقوں کے قابل اشخاص کو حکومت کے عہدے دیئے۔ رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقے ہندوؤں سے لیے۔ ایک مخلوط دکھنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز شاہ کا نام تاریخ دکن میں نمایاں ہے" [4] فیروز شاہ کا عہد ملک میں خوشحالی اور تہذیبی روایات کے فروغ کا زمانہ تھا بہمنی دربار کے آداب اور طور طریق کی پرداخت اور اسلامی و مقامی تہذیب کے عناصر کے امتزاج سے ایک گنگا جمنی ثقافت کی

---

[1] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن۔ ص ۴۲۹۔
[2] ۔ نیل کنٹھ شاستری۔ اے ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۶
[3] ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ دکنی کلچر۔ ص ۷۲۔
[4] ۔ " " " " ۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۴۔

Marfat.com

تشکیل فیروز کے دور کا ایک یادگار تہذیبی کارنامہ ہے۔ فیروز نے اپنا مرصع تاج پگڑی کی شکل کا تیار کروایا تھا جس سے قومی یگانگت کے جذبے اور وسیع النظری کا اظہار ہوتا ہے۔ ہارون خان شیروانی فیروز شاہ کی وسیع النظری اور مذہبی رواداری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسی نے سب سے پہلے برہمنوں کو بڑے عہدوں پر مقرر کیا کمبرلا کے فرسنگھ نے جب ہتھیار ڈال دیئے تو فیروز نے اسے بہمنی سلطنت کا امیر بنا دیا۔ فیروز ہی کے عہد میں "دکن کی تہذیب اور فنِ تعمیر میں ہندو اثرات کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہوئی"۔ ہندوستانی عنصر کے اثر و نفوذ کو اس کے عہد کے طرزِ تعمیر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے" یہ ایرانی ہندو اور دہلوی اسلوبوں کا امتزاج تھا جس نے فیروز کے مقبرے کو گلبرگہ کی شاندار ترین یادگار بنا دیا"۔[۲] بقول پی ایم جوشی فیروز نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ربع صدی تک حکومت کی"۔[۳]

فیروز شاہ صوم و صلوٰۃ اور مذہبی اصولوں پر سختی سے عمل پیرا تھا اس کے محل کا عملہ بہت وسیع تھا اور انتظامات کی ذمہ داری محمد دوم کی بیٹی "ملکۂ دکھن" کے سپرد کی گئی تھی۔ فیروز کے محل میں ہر مذہب و قوم کی عورتیں موجود تھیں۔ ہارون شیروانی لکھتے ہیں کہ اس نے اثنا عشری اصول کے مطابق متعہ کے طریقے کو اپنایا تھا تاکہ قانون شریعت کی روگردانی کا مرتکب نہ ہو۔ فیروز نے اپنی بیگمات کے لئے دریائے بھیما پر ایک بڑا شہر تعمیر کیا تھا جس میں خوبصورت عمارات، سجے ہوئے بازار، بارونق دوکانیں اور کشادہ سڑکیں تھیں۔[۴] یہی شہر فیروزآباد بادشاہ کا پایہ تخت بنا اور دریا سے نہر کاٹ کر اسے سیراب کیا گیا۔[۵] "آثار سلف" میں نواب فرامرز جنگ

۱۔ سید علی اصغر بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ ص ۱۳۲۔

۲۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین مترجم رحیم علی الہاشمی ص ۱۳۵۔

۳۔ پی ایم جوشی۔ دی بہمنی کنگڈم۔ ص ۲۴۹

۴۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین مترجم رحیم علی الہاشمی ص ۱۲۱۔

۵۔ سید علی اصغر بلگرامی۔ تاریخ دکن حصہ اول۔ ص ۱۳۰۔

Marfat.com

تحریر کرتے ہیں کہ جب فیروز شاہ بہمنی نے فیروزآباد بسایا تو گلبرگہ کی آبادی گھٹنے لگی۔ بڑے بڑے علماء جیسے حسن گیلانی اور لطف اللہ سمرواری وغیرہ نے نئے پایتخت کا رخ کیا[1] فیروزآباد میں بادشاہ نے ایک نہایت دیدہ زیب اور عالی شان محل قصرِ فیروزہ تعمیر کروایا تھا جو اپنی مثال آپ تھا[2] نیل کنٹھ شاستری لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ کے حرم میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی آٹھ سو بیگمات موجود تھیں اور وہ چونکہ مختلف زبانوں پر عبور رکھتا تھا اس لئے ہر بیگم سے اس کی مادری زبان میں گفتگو کرتا تھا[3] عصامی فیروز شاہ کی ذہانت اور اس کی زباں دانی کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور اس کے دماغ کو آسمانِ فرہنگ سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے[4]

دماغ طبع عروجی چہ دلکشا چمن است
چمن مگوئے کہ آں آسمانِ فرہنگ است

فیروز شاہ کا دلکش اور بارونق دارالسلطنت فیروزآباد ایک بے نظیر شہر تھا اس کے چار بڑے باب الداخلہ، دیوان خاص اور کنجنی محل بہمنی طرزِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے تھے[5] ثقافتی امور کے علاوہ اسے محاربات سے دلچسپی تھی۔ تاریخ فرشتہ کے حوالے سے عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں کہ "فیروز شاہ بہمنی میدان دلاوری وبہادری میں سرافراز تھا، ملک کشائی وجہاں گیری میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ مخالفین سے جدال وقتال میں کوتاہی نہیں کرتا تھا اپنے عہد میں مخالفین سے چوبیس مرتبہ جدال وقتال کیا"[6] نیل کنٹھ شاستری تحریر کرتے ہیں کہ ۱۳۹۸ء میں جب

---

[1] ۔ فرامرز جنگ۔ آثار سلف۔ ص۔

[2] ۔ عبدالرحیم خاں۔ گلبرگہ گزیٹر۔ ص۱۹۔

[3] ۔ نیل کنٹھ شاستری۔ اے ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص۲۴۶۔

[4] ۔ بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص۱۵۳۔

[5] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین مترجم رحم علی الہاشمی ص۱۲۱۔

[6] ۔ " " " " " " " "

Marfat.com

ہری ہلر اور دوآبہ رائچور پر حملہ کر دیا تو بہمنی فوجوں کو دریا پار کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی اور قاضی سراج الدین نے ایک منصوبہ تیار کیا اور اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ بھیس بدل کر دشمن کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ یہ لوگ ننگی تلواروں کے ساتھ رقص کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور ایک دن جب انہیں ہری ہر کے راجکمار کے سامنے اپنا رقص پیش کرنے کی اجازت ملی تو وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا کیمپ میں ایسی ہراسانی پھیل گئی کہ کسی نے دریا کی طرف توجہ نہیں کی اور فیروز شاہ نے دریا پار کر لیا۔ ہری ہر اپنے بدنصیب بیٹے کی لاش کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا اور وجیا نگر میں پناہ لی۔ فولاد خاں کو فیروز نے یہاں کا پہلا ملٹری گورنر مقرر کر دیا۔[1] اسکے بعد کھیرلا کے نرسنگھ سے سلطان کی لڑائی ٹھن گئی کیونکہ اس نے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ فضل اللہ انجو نے میسرہ کی کمان سنبھالی اور خان خاناں نے میمنہ کی۔ اس جنگ میں شجاعت خاں، بہادر خاں، دلاور خان اور رستم خان جیسے بہمنی جانباز مارے گئے۔ دو ماہ کے محاصرہ کے بعد مجبور ہو کر نرسنگھ نے خراج دینا منظور کر لیا اور فیروز شاہ کے دربار میں حاضری دی۔ ۸۰۹ھ مطابق ۱۴۰۷ء میں وجے نگر سے دوسری بار جنگ چھڑ گئی جس میں فیروز کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ فیروز شاہ بہمنی کی فتوحات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نے دوآبہ اور بنکاپور میں اپنا تسلط قائم کیا ماہور کو باج گذار بنایا اور علاقہ تلنگانہ سے فوج کشی کرتا ہوا راجہ مندری تک پہنچ گیا[2] "پی ایم جوشی" "دی بہمنی کنگ ڈم" میں لکھتے ہیں کہ وجیا نگر پر فیروز نے تین مرتبہ یعنی ۱۳۹۸ء، ۱۴۰۶ء اور ۱۴۱۷ء میں چڑھائی کی تھی[3] ۱۴۲۲ء کے آخر میں وجے نگر کے دیوراج اور فیروز دونوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ دیوراج کا جانشین بکا سوم مقرر ہوا اور فیروز کا جانشین اس کا بھائی شہاب الدین احمد اول۔ لیکن فیروز شاہ نے ۸۱۸ھ مطابق ۱۴۱۶ء میں اپنے لڑکے حسن خان کو ولی عہد بنا دیا تھا اور اسے شاہی نشانات

---

[1] ۔ نیل کنٹھ شاستری۔ اے ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۷۔

[2] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین مترجم رحیم علی الہاشمی۔ ص ۱۳۳۔

[3] ۔ پی ایم جوشی۔ دی بہمنی کنگ ڈم۔ ص ۲۵۲۔

Marfat.com

یعنی تاج پیٹی، چھتری، سیاہ مخملی پردہ، ہاتھی اور تخت بھی عطا کر دیئے تھے اور حسن شاہ کے خطاب سے سرفراز کر دیا تھا۔ ولی عہدی کی مزید توثیق کے لئے فیروز شاہ نے بہمنی امراء سے باقاعدہ طور پر شاہی سلامی بھی دلوائی تھی [1] خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ان دنوں گلبرگہ میں مقیم تھے "برہان ماثر" میں سید علی طباطبائی نے گیسو دراز کی گلبرگہ میں آمد کا مفصل حال درج کیا ہے [2] خواجہ بندہ نواز سے فیروز شاہ ناراض ہو گیا تھا۔ ہارون خاں شیروانی لکھتے ہیں:۔ "سلطان چونکہ خود ذی علم تھا اس لئے ان کی خالص ادبی استعداد پر شبہ کرنے لگا کھنچا و بڑھتا رہتا یہاں تک کہ بادشاہ نے انہیں پیام بھیجا کہ چونکہ ان کی قیام گاہ محل کے بہت قریب ہے اور ان کے یہاں قوالیوں اور مریدوں کی بلند آواز سے تعلیم کا شور و غل ہوتا ہے اس لئے وہ کہیں اور چلے جائیں چنانچہ آپ وہاں سے اٹھ کر اس مقام پر چلے آئے جہاں اب آپ کا مزار ہے" [3] فیروز کا بھائی احمد خان گیسو دراز سے عقیدت رکھتا تھا اور اسے اس کا بھی اندازہ تھا کہ اگر مملکت میں فیروز کی بادشاہت ہے تو عوام کے دلوں پر بندہ نواز حکومت کرتے ہیں جب فیروز شاہ نے ۸۱۸ھ مطابق ۱۴۱۵ء میں باضابطہ طور پر حسن خان کی ولی عہدی کا اعلان کیا اور خواجہ بندہ نواز سے دعا کرنے کی خواہش کی تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خان خاناں احمد خاں کو فیروز کا جانشین مقرر کر دیا ہے اس لئے اب حسن کے واسطے دعا کرنا بیکار ہے [4] نیل کنٹھ شاستری نے خواجہ بندہ نواز کا نام جمال الدین حسینی بتایا ہے جو درست نہیں [5] عین الملک اور نظام الملک، احمد کے سخت مخالف تھے "برہان ماثر" میں لکھا ہے کہ جب احمد نے فیروز کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تو وہ سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ

---

[1] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ مترجم رحیم علی الہاشمی ص ۱۳۰۔

[2] ۔ سید علی طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۴۳، ۴۴۔

[3] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ مترجم رحیم علی الہاشمی۔ ص ۱۲۲۔

[4] ۔ عبدالرحیم خاں۔ گلبرگہ گزیٹر۔ ص ۲۵۔

[5] ۔ نیل کنٹھ شاستری۔ اے ہسٹری آف ساؤتھ انڈیا۔ ص ۲۴۸۔

Marfat.com

میدانِ جنگ میں آیا لیکن فوج کے رسالے احمد شاہ سے جا ملے اور یہ حال دیکھ کر فیروز گلبرگہ چلا گیا[1]۔ ۵ رشوال ۸۲۵ھ مطابق ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء کو احمد کے لئے شہر کا دروازہ کھول دیا گیا اور اسے فیروز شاہ بہمنی کے پاس جو بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا پہنچا دیا گیا "برہان ماثر" میں فیروز شاہ بہمنی اور احمد خاں کی ملاقات کا مفصل حال درج ہے[2]

فیروز شاہ بہمنی کی مدت حکومت پچیس (۲۵) سال سات ماہ اور گیارہ دن بتائی گئی ہے[3] "مقدمہ تاریخ دکن" میں عبدالمجید صدیقی نے اس کا عہد حکومت ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء تا ۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء بتایا ہے[4] فیروز شاہ نے ۱۱ رشوال ۸۲۵ھ مطابق ستمبر ۱۴۲۲ء کو رحلت کی اور اپنے تعمیر کردہ مقبرے میں دفن ہوا۔ عبدالرحیم خاں "گلبرگہ گزٹیر" میں رقمطراز ہیں کہ احمد شاہ بہمنی نے سلطان فیروز شاہ کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا[5]

عبدالجبار ملکاپوری فیروز شاہ بہمنی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ شعر و شاعری کا "شیفتہ" تھا اور آگے چل کر تحریر کرتے ہیں "اولاً اپنا تخلص عروجی قرار دیا پھر شاہی زمانے میں فیروزی رکھا۔ صاحب دیوان تھا اب دیوان نادرالوجود ہے۔ مورخین نے چیدہ چیدہ اشعار تمثیلاً لکھے ہیں"[6] "سخنوران بلند فکر" میں بھی فیروز شاہ کا تخلص "فیروزی" تحریر کیا گیا ہے[7] "کلام الملوک" اور "تذکرۂ محبوب الزمن" حصہ دوم میں فیروز کے فارسی کلام کا نمونہ درج ہے لیکن اس کا دکنی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ فیروز شاہ کے تخلص کے بارے میں شمس اللہ قادری لکھتے ہیں "فیروز شاہ بہمنی عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا[8] "کلام الملوک" کے مصنف میر عادت علی

---

[1] ۔ سید علی طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص۵۱

[2] ۔ " " " ص۵۱

[3] ۔ ہارون خان شیروانی۔ دکن کے بہمنی سلاطین۔ مترجم رحیم علی الہاشمی۔ ص۱۴۱

[4] ۔ عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص۵۶

[5] ۔ عبدالرحیم خاں۔ گلبرگہ گزٹیر۔ ص۲۰

[6] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن حصہ دوم ص۱۶

[7] ۔ محمد مخدوم صاحب بہادر گوہر۔ سخنوران بلند فکر۔ ص۵۔ شمس اللہ قادری۔ اردو قدیم۔ ص۳۸

Marfat.com

رضوی عبدالجبار ملکاپوری کے ہم خیال ہیں اور لکھتے ہیں کہ فیروزشاہ بہمنی نے ابتداء عروجی اور تخت نشین ہونے کے بعد فیروزی تخلص اختیار کیا تھا[1] حدائق السلاطین میں علی بن طیفور بسطامی لکھتا ہے "چندگاہ عروجی تخلص میکرد وچندگاہ فیروزی" "مقدمہ تاریخ دکن" میں عبدالمجید صدیقی نے تحریر کیا ہے کہ فیروزشاہ بہمنی اپنے اشعار میں بھی فیروزی اور کبھی عروجی تخلص کیا کرتا تھا[2] غلام صمدانی گوہر "دربار آصف" میں لکھتے ہیں کہ "سلطان کو تمام علوم میں دخل تھا شعر بھی کہتا تھا اور عروجی اور فیروزی تخلص کرتا تھا"[3] پہلی غزل کا مقطع ہے ؎

عروجی قامت و رخسار آن خورشید تاباں را
بہ سرو ولالہ می سنجد بہ بیند امتیازش را

اس مقطع میں جو عروجی تخلص اختیار کیا گیا ہے اس پر نشان لگا کر فٹ نوٹ میں "فیروزی تحریر کیا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایک نسخے میں عروجی اور دوسرے میں فیروزی لکھا گیا ہے۔ عبدالمجید صدیقی اور سید علی اصغر بلگرامی نے اپنی تاریخوں میں جہاں فیروزشاہ بہمنی کا نمونہ کلام دیا ہے وہاں یہی تخلص تحریر کیا ہے[4] نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں فیروزشاہ کا تخلص عروجی اور فیروز بتاتے ہیں[5] دکن کے ایک اور شاعر قطب الدین کا تخلص بھی فیروز ہے۔ مسعود حسین خان نے فیروز کے "پرت نامہ" یا "توصیف نامہ" کو ایڈٹ کر کے ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا ہے اب تک "پرت نامہ" کے شاعر فیروز کا جو کلام دستیاب ہوا ہے اس میں کہیں فیروزی تخلص نہیں ملتا[6] صرف ایک ہی نسخہ ایسا ہے جس میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک جگہ فیروزی ہوگا۔

۱۔ میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص۱

۲۔ عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص۹۷، ۹۸

۳۔ غلام صمدانی گوہر۔ دربار آصف۔ ص۳۶

۴۔ سید علی اصغر بلگرامی تاریخ دکن حصہ اول ص۹۳، ۹۵

۵۔ نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص۲۳

۶۔ سیدہ جعفر۔ دکنی رباعیاں۔ ص۳۱

Marfat.com

اس کے برخلاف فیروز شاہ بہمنی کے فارسی کلام میں فیروزی تخلص کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں اور محققین و مورخین نے فیروز شاہ کے عروجی اور فیروزی دو تخلص بتائے ہیں دکن کی کسی ادبی تاریخ میں قطب الدین کا تخلص فیروزی نہیں بتایا گیا ہے وجہی نے بھی "قطب مشتری" میں قطب الدین کا تخلص فیروز ہی بتایا ہے وہ کہتے ہیں ؎

کہ فیروز آخواب میں رات کوں
دعا دے کے چومے مرے ہاتھ کوں

یا ایک اور جگہ وجہی کہتا ہے ؎

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج
تو اس شعر کوں بہت ہوتا رواج

ابن نشاطی نے بھی فیروز کو اپنی مثنوی "پھول بن" میں فیروز ہی کہہ کر یاد کیا ہے نہ کہ فیروزی ؎

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچ مرے داد

ابن نشاطی اور وجہی کے بیانات دوسروں کے بیانات کے مقابلے میں زیادہ مستند اور قابلِ اعتماد معلوم ہوتے ہیں ان دونوں قدیم شعراء نے کہیں پرت نامہ کے شاعر کو فیروزی کہہ کر یاد نہیں کیا ہے اور نہ مندرجہ بالا اشعار کے وزن ہی میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ لفظ فیروز کو فیروزی پڑھا جا سکے۔ یہاں مندرجہ ذیل امور بطورِ خاص غور طلب ہیں :۔

(۱) اکثر دکنی شعراء کا تخلص یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے جیسے وجہی، نصرتی، غواصی، ابن نشاطی، اور ہاشمی وغیرہ۔

(۲) فیروز شاہ کا شعر کہنا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے تاریخوں سے ثابت ہے۔

(۳) فیروز شاہ بہمنی کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ اسے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا اور یہ کہ وہ فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ بہت سی ہندوستانی زبانوں سے بھی واقف تھا۔ ایک ایسی زبان جو عوام میں رائج ہو چکی تھی اور

Marfat.com

جو اس کے گرد و پیش بولی اور سمجھی جاتی تھی اس کو کیوں نہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی؟ جب کہ رعایا کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کی زبان دکنی ہی تھی۔

(۴) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو" میں فیروز شاہ بہمنی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"رسم ورواج، رہنے سہنے کے طریقے ہندوؤں سے لئے، ایک مخلوط دکھنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز شاہ کا نام تاریخ دکن میں نمایاں ہے"۔[1]

"دکھنی کلچر کے بانی" کے لئے ایک ایسی زبان میں شعر کہنا تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا ہے جو اس کلچر کی بھرپور ترجمانی کرتی تھی اور اسی کلچر کی آفریدہ تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس بہمنی تاجدار نے اسی دکنی کلچر کو فروغ دینے کے لئے دکنی میں شعر کہے ہوں۔

فیروز شاہ بہمنی کے دکنی کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہوا تھا۔ فارسی میں البتہ اس کا کلام مل جاتا ہے جس میں اس نے جیسا کہ کہا جا چکا ہے فیروزی اور فیروزی تخلص اختیار کیا ہے۔ دکنی میں بھی فیروز شاہ بہمنی نے فیروزی تخلص استعمال کیا ہے۔ "دکنی رباعیاں" میں راقمۃ الحروف نے فیروز شاہ بہمنی کی مندرجہ ذیل دکنی رباعی بطور نمونہ پیش کی ہے جو اس کے دکنی کلام کا نایاب اثاثہ ہے یہ رباعی اس کتاب کے ذریعے سے پہلی مرتبہ روشناس ہوئی ہے ؎

تجھ مکھ چند اجوت دِسے سارا جیوں
تجھ کان پہ موتی جھمکے تارا جیوں
فیروزی عاشق کوں ٹُک یک چاکن دے
تجھ شوخ ادھر لب رہے شکر پارہ جیوں

فیروز شاہ بہمنی کے فارسی کلام کا جو مختصر سا سرمایہ دستیاب ہوا ہے اس میں صنفِ رباعی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ بادشاہ کو رباعی کی صنف سے دلچسپی تھی۔ بہر حال فیروز شاہ بہمنی کا رباعی گو ہونا متحقق ہے۔

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صـ۲۴

Marfat.com

ڈاکٹر جمال شریف کو ایک قدیم بیاض میں فیروزی کی ایک غزل جو پانچ اشعار پر مشتمل ہے دستیاب ہوئی ہے۔ اس پر "فیروزی راست" تحریر کیا گیا ہے۔ اس غزل سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ بہمنی نے دکنی زبان میں مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ وہ ایک نازک خیال اور خوش فکر شاعر معلوم ہوتا ہے جس کے کلام میں پختگی بھی ہے اور سادگی، روانی و بیساختگی بھی۔ فیروزی کی غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے قبل دکن میں کئی غزل گو شعراء گذر چکے تھے اور فیروزی تک پہنچتے پہنچتے یہ صنف ایک خاص حد تک منجھ گئی تھی۔ یہ غزل نادر اور اچھوتی تشبیہات سے مزین ہے اس غزل کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو غزل کے ان اوّلین نمونوں میں سے ایک ہے جن تک ہماری رسائی ہو سکی ہے۔ اس غزل میں مطلع اور مقطع دونوں موجود ہیں ردیف بھی ہے لیکن قافیہ کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ ذیل میں غزل درج کی جاتی ہے جس سے فیروزی کے طرزِ ادا کی شگفتگی و روانی اور اس کے استعارات و تشبیہات کی برجستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے یہ دکنی تہذیب اور دکنی معاشرت سے ماخوذ ہیں محبوبہ کی چال کو ہنس کی چال سے اور اس کے چہرے پر لہرائی ہوئی زلف کو ناگ سے تشبیہ دینا آج اسلئے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی کہ اردو شاعری کی سینکڑوں سال کی تاریخ میں دور ما بعد کے کئی شاعروں نے انہیں استعمال کر لیا ہے اس لئے ان تشبیہات کی دھار اب کند پڑ گئی ہے لیکن جس وقت فیروزی نے انہیں اپنی غزل میں برتا تھا ان میں تازگی اور طراوت و لطافت کی کمی نہ تھی۔ فیروزی نے فارسی غزل میں طبع آزمائی کر کے یہ بتا دیا تھا کہ وہ ایک فطری شاعر ہے اس نے دکنی میں فارسی غزل کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ عجمی غزل کے سانچے میں ہندوستانی معاشرت اور طرزِ فکر کے عناصر سمو کر اُسے ایک نئی تابندگی عطا کی ہے۔ فیروزی کی غزل درج ذیل ہے ؎

" فیروزی راست "

لٹکتی شہہ پری سو ہتی سو ہا دا سر و ساڑولتا
توں ایسی سُرک پر ہوتی فرشتہ دیک تج بھولتا

Marfat.com

مہکتی بال سیس کالی چہکتی گال گل لالی
تھمکتی نین تو خالی نینوں میں کاجلا گھو لتا
چنچل اَت چال سوں لٹکی چلنت میں ہنس کوں شکی
کہ مکھ پر لٹ یوں لٹکی جو دھن پر ناگ چلبو تا
توں ہر دم یاد مجہ آکھی نہ بسریں رین دن جاگی
سو ڈوری ذکر کی لاگی دولا رامن منی جھولتا
سو مج انک دل بدل سر سے سو شعلی آگ کے برسے
بھوت فیروزی اب ترسے سو کاہی میکہ نئیں کھولتا [1]

فخر دین نظامی

فخر دین نظامی کے حالاتِ زندگی کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں۔ بیدر میں فخر الدین نام کے دو بزرگ مدفون ہیں۔ ایک فخر الدین حضرت ملتانی بیدری کے فرزند تھے وہ ملتانی شاہ صاحب کی درگاہ کے صحن میں سپردِ خاک ہوئے تھے۔ دوسرے فخر الدین کا مزار بمقام چلرگی مریم پور واقع ہے۔ یہ مقام بیدر سے تقریباً ۱۶ کلو میٹر دور ہے۔ یہ کوئی قدیم گڈھ معلوم ہوتا ہے جس کی سنگ بستہ اونچی دیواریں اور دیگر آثار اب تک موجود ہیں۔ سطح زمین سے کسی قدر اونچے مقام پر ایک چھوٹی سی درگاہ بنی ہوئی ہے اس میں نقارہ اور شرزہ بھی موجود ہیں۔ یہ عمارت بہمنی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ دالان کے پیچھے ایک کمرہ ہے جس میں فخر الدین کا مزار ہے۔ اس قبر پر لوح مزار موجود نہیں البتہ دروازے کے اوپر "حضرت خواجہ سید شاہ مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہٗ" تحریر کیا گیا ہے اس درگاہ کے پیچھے دریائے مانجرا بہتا ہے اس سے کچھ دور شاہ نظام الدین کی درگاہ نظر آتی ہے اس مقام کو گڈور کہتے ہیں۔ بیدر کی ذی علم اور بزرگ شخصیت محمد عبدالغفار صاحب معتمد کتب خانہ ودارالمطالعہ عام نزد مسجد عثمانیہ بیدر شریف

---

[1] ۔ جمال شریف ۔ ابتدائی اردو (دکنی) کی ایک نایاب بیاض (مضمون) مشمولہ ماہنامہ سب رس حیدرآباد مارچ ۱۹۶۸ء ص ۱۲ ۔

Marfat.com

سے راقمۃ الحروف کو یہ بتایا کہ یہ مخدوم نظامی کی قبر ہے۔ چونکہ وہ شاہ نظام الدین کے مرید تھے اس لئے انھوں نے اسی نسبت سے اپنا تخلص نظامی تجویز کیا تھا[1]

نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" کو سب سے پہلے نصیرالدین ہاشمی نے رسالہ "معارف" اکتوبر ۱۹۳۲ء میں متعارف کروایا تھا۔ اس مثنوی کے اصل نام کا پتہ نہیں چلتا اور چونکہ اس میں کدم راؤ اور پدم راؤ کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس لئے مثنوی کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" مان لیا گیا ہے۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو[2] اور "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" میں اس مثنوی کا ذکر ملتا ہے لیکن اس پر کسی قدر تفصیلی تبصرہ سخاوت مرزا نے اپنے مضمون میں کیا ہے[3]

گوپی چند نارنگ، نصیرالدین ہاشمی کے اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے کہ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اردو کی قدیم ترین مثنوی ہے لکھتے ہیں:-

"جدید تحقیق کے مطابق اردو کی ایک اور مثنوی اشرف کی نوسرہار ہے"[4]

نصیرالدین ہاشمی اور عبدالحق نے اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کا درمیانی عرصہ قرار دیا ہے اور افسر امروہوی، ۸۲۵ھ اور ۸۳۸ھ کے درمیان کا زمانہ بتاتے ہیں۔ افسر امروہوی لکھتے ہیں کہ شاعر نے اس مثنوی میں اس عہد کی اہم شخصیتوں ملکہ مخدومۂ جہاں اور خواجہ محمود گاواں کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور صرف بادشاہ کا ذکر

---

[1] ۔ راقمۃ نے فخرالدین نظامی کے مزار سے متعلق معلومات حاصل کرنے ۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء کو بیدر سے مریم پور کا سفر کیا تھا۔ وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مزار فخرالدین نظامی شاعر مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہی کی ابدی خواب گاہ ہے دروازے پر فخرالدین ضرور تحریر کیا ہوا ملتا ہے لیکن تخلص نظامی موجود نہیں ہے۔

[2] ۔ عبدالقادر سروری۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ ص ۱۸۴، ۱۸۵۔

[3] ۔ گوپی چند نارنگ۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" ص ۵۰، ۵۱۔

[4] ۔ سخاوت مرزا۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ رسالہ اردو ادب شمارہ ۲ ۱۹۶۶ء۔ ص ۴۱ تا ۵۶۔

[5] ۔ گوپی چند نارنگ۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں"، ص ۵۱۔

Marfat.com

کرتا ہے جو قرین قیاس نہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ بہمنی سلطنت کے گیارھویں حکمراں علاء الدین ہمایوں شاہ کے علاوہ اس سلسلۂ سلاطین میں کوئی ایسا حکمراں نہیں جس کا لقب علاء الدین ہو اور جس کے ولی عہد کا نام احمد شاہ ہو لیکن انھوں نے تاریخ فرشتہ کے حوالے سے خود اپنی دلیل کو کمزور کر دیا ہے۔

کسی قدیم ادبی تاریخ یا تذکرے میں فخر دین نظامی کی سوانح درج نہیں ہے مثنوی کی داخلی شہادتوں کی روشنی میں ہم اس کے عہد کا تعین کر سکتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ وہ احمد شاہ ولی بہمنی کے دورِ حکومت بیدر میں مقیم تھا۔ مثنوی سے کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ بہمنی دربار میں اس کی رسائی تھی۔ نصیرالدین ہاشمی اس مثنوی کے زمانۂ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور ۔ ۔ ۔ احمد شہزادہ تھا اُ آگے چل کر انھوں نے تحریر کیا ہے ا۔

"ہم کو مثنوی سے نہ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ ۔ ۔ احمد شاہ ثالث ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک حکمراں رہا اس لئے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانے میں قرار دینی چاہیئے"۔[2]

افسر امروہوی نے "مخطوطاتِ انجمنِ ترقی اُردو" میں مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے زمانہ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے عبدالحق اور نصیرالدین ہاشمی کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور لکھتے ہیں ا۔

"ہاشمی صاحب کو علاء الدین کی سرخی کے تحت احمد شاہ کا نام آجانے سے یہ شبہہ ہوا کہ احمد شاہ علاء الدین کا لڑکا اور ولی عہد ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں جس سلطان علاء الدین کا نام عنوان میں لکھا گیا ہے ۔ ۔ ۔ وہ نظام شاہ کا باپ سلطان علاء الدین نہیں بلکہ وہ سلطان

ا۔ نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۳۹

۲۔ " " " " ۔ ص ۳۹

Marfat.com

علاءالدین ہے جس نے اپنی شجاعت اور قابلیت کی بنا پر سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھی اور سلطان اوّل کی حیثیت سے ۷۴۸ھ میں تخت نشین ہوا ،، [1]

افسر امروہوی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سلاطین بہمنیہ میں ایک ہی سلطان احمد شاہ خلف داؤد شاہ ہے جو سلطان علاءالدین حسن بانی سلطنت کا پوتا تھا اور جو رعایا میں ولی مشہور تھا وہ خاندان بہمنیہ کا نواں حکمران تھا اور اس نے ۸۲۵ھ سے ۸۳۸ھ تک حکومت کی تھی [2] جمیل جالبی ان تمام بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مثنوی کے مدحیہ اشعار میں "دو احمد بیان ہوئے ہیں ایک وہ احمد شاہ جسے بڑا شہنشہ ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرا احمد جسے بادشاہ کا کنور ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا لقب احمد شاہ ولی بہمنی ہے اس لحاظ سے تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی احمد شاہ بہمنی ہے جو احمد خان کا بیٹا اور علاءالدین حسن بہمنی بانی سلطنت کا پوتا ہے ،، [3] جمیل جالبی نے ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علاءالدین شاہ کے دور حکومت (۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء) میں مثنوی "کدم راو پدم راو" لکھی گئی ہے [4]

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے زمانہ تصنیف کے بارے میں جمیل جالبی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ (۱) " اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مثنوی بیدر میں لکھی گئی ہو اس لئے کہ احمد شاہ ولی نے ۸۳۴ھ/۱۴۳۰ء میں اپنا دارالسلطنت گلبرگہ کے بجائے بیدر کو بنایا ،، (۲) " نظامی نے اسے ۸۳۴ھ/۱۴۳۰ء اور ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء کے درمیانی عرصے میں تصنیف کیا ،، [6]

---

[1] ۔ افسر امروہوی ۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو ۔ جلد اول ص ۳

[2] ۔ " " " " " " " "

[3] ۔ جمیل جالبی ۔ مقدمہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ۔ ص ۱۵

[4] ۔ " " " " " " ۔ ص ۱۶

[5] ۔ " " " " " " ۔ ص ۱۶

[6] ۔ " " " " " " ۔ ص ۱۶

Marfat.com

جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ اس میں نظامی نے دو بادشاہوں کا ذکر کیا ہے اور ان دونوں کے نام احمد ہیں ایک کو وہ "شہنشہ" بتاتا ہے اور دوسرے کو اس کا کنور یعنی شہزادہ۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کو جمیل جالبی عہد احمد شاہ ولی بہمنی کی تصنیف قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ احمد شاہ ولی کے والد کا نام احمد خان تھا جو بانیِ سلطنت علاؤالدین حسن کا فرزند تھا۔ نظامی نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے کنور یعنی شہزادے احمد شاہ ولی بہمنی کی تعریف و توصیف کی ہے۔ اپنے بیان کے ثبوت میں جمیل جالبی نے مثنوی کے یہ اشعار پیش کئے ہیں ؎

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال سنسار کرتار آدھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ
کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ
لقب شہہ علی آل بہمن ولی
ولی تھی بہت بدھ تد آگلی

ان اشعار سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شہنشاہ کا کنور احمد ہے۔ وہ کرتار آدھار اور پرت پال ہے۔ تاج کا مالک ہوشیار راجا ہے۔ بادشاہ کا شہزادہ احمد ہے جو قوی ہے احمد آل بہمن سے ہے اور ولی ہے۔ ولی سے اس کی عقل بہت زیادہ ہے۔

اگر جمیل جالبی کے بیان کے مطابق ہم یہ تسلیم کرلیں کہ نظامی نے احمد شاہ بہمنی کو اس کے والد احمد کا کنور کہا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کی ہے تو پھر نظامی کا یہ کہنا کہ ولی سے احمد کی فہم و فراست زیادہ ہے تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہِ وقت کی تعریف کرتے ہوئے گویا شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ وہ دانشمندی میں اپنے والد سے کم ہے اور اس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے جو بادشاہِ وقت کے لئے قطعاً مناسب نہیں اور مدح و ستائش کے درمیان یہ بیان بے محل بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کا یہ بیان آداب تعظیم کے یقیناً مغائر ہے۔ نظامی اگر ایک مطلق العنان بادشاہِ وقت سے ایسی جسارت کرتا

Marfat.com

تو سزا کا مستحق قرار پاتا۔

ہم مندرجہ بالا اشعار کا تجزیہ کریں تو حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

(۱) نظامی نے علاء الدین احمد شاہ ثانی کی تعریف و توصیف کی ہے اور اس کو اس کے والد احمد شاہ بہمنی کا کنور یا شہزادہ بتایا ہے۔

(۲) احمد شاہ بہمنی کے بارے میں نظامی کہتا ہے کہ وہ بڑا شہنشاہ اور ولی تھا۔

(۳) بادشاہِ وقت اور اپنے ممدوح علاء الدین احمد کی ستائش کرتے ہوئے نظامی کہتا ہے کہ احمد شاہ ولی آلِ بہمن سے ہے اور اس کا لقب ولی ہے اور علاء الدین احمد اس کا فرزند اور کنور ہے جو بڑا عقلمند ہے وہ فہم و ذکاوت میں احمد شاہ ولی بہمنی سے بہت آگے ہے۔ اشعار کے الفاظ یہ ہیں:۔

لقب شہہ علی آل بہمن ولی
ولی تھی بہت بُدھ تد آگلی

خود جمیل جالبی نے فرہنگ میں اس شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کے جو معنیٰ بتائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

تھی ۔ سے (صفحہ ۲۵۰)
بُدھ ۔ عقل (صفحہ ۲۴۶)
تد ۔ تب بھی۔ پھر بھی (صفحہ ۲۵۰)
آگلی ۔ زیادہ (صفحہ ۲۴۲)

اس شعر سے یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ احمد، احمد شاہ ولی بہمنی سے عقل اور فہم و فراست میں آگے ہے۔ یہ مدح کا ایک پیرایہ ہے۔

سا قصۃ الحروف کا خیال ہے کہ مثنوی "کدم راو پدم راو" علاء الدین احمد شاہ ثانی (۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء تا ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء) کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی جیسا کہ مثنوی کی داخلی شہادت اور اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے: نہ کہ احمد شاہ ولی بہمنی کے دور (۸۲۵ھ/۱۴۲۲ء تا ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء) میں۔

جمیل جالبی نے مثنوی "کدم راو پدم راو" کے آخر میں "تعارف سلاطین بہمنی" ضمیمہ نمبر ایک میں سلاطین بہمنی کے اٹھارہ بادشاہوں کے نام گنائے ہیں ان میں علاء الدین

Marfat.com

حسن بہمنی بانی سلطنت کے بیٹے احمد خان کا نام بادشاہ کی حیثیت سے کہیں تحریر نہیں کیا کیونکہ تخت نشین ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ احمد خان حسن کا تیسرا بیٹا تھا[1] اور باپ کی وفات کے بعد حسب قاعدہ اس کے بڑے بھائی محمد خان کو تخت نشین کیا گیا تھا۔ احمد خان بہمنی سلطنت کے تخت و تاج کا وارث کبھی قرار نہیں دیا گیا تھا اس کی حیثیت بانی سلطنت کے فرزند اور محمد شاہ کے بھائی سے زیادہ نہیں تھی تو پھر شاعر نظامی اسے "شہنشہ" کہہ کر کیوں یاد کرتا ہے

شہنشاہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال سنسار کرتار آدھار

بیدر کے ترکش محل کے سامنے آرکیالوجیل سروے آف انڈیا کا میوزیم ہے۔ یہاں ترکش محل کے حمام تھے اب ان حماموں میں میوزیم ہے۔ نصیر الدین علا خان بہمنی دور کا کوئی مخیر اور نیک انسان تھا اس نے ایک کنواں رفاہ عام کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ میوزیم میں ایک پتھر کی سل موجود ہے جس پر اس باولی اور اس کے معمار کے بارے میں بطور یادگار سات اشعار فارسی میں کندہ کئے گئے ہیں۔ یہ کنواں علاء الدین احمد شاہ (۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء تا ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء) ابن احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا جس کا ذکر شاعر نے کیا ہے اور علاء الدین کو شہنشاہ احمد ابن شاہ احمد کہا ہے۔ بہمنی سلطنت کے تاجداروں کو "شاہ" اور "شہنشاہ" کہنا بے محل نہیں معلوم ہوتا اشعار یہ ہیں ؎

بعہد بادشاہ بو المظفر — علاء الدین شاہ ربع مسکوں
شہنشاہ احمد ابن شاہ احمد — کہ ہست از شاہ بہمن وز فریدوں

محولہ بالا اشعار میں نظامی نے بھی احمد شاہ ولی بہمنی کو "شہنشہ" اور اس کے بیٹے علاء الدین احمد شاہ کو "شاہ" کہا ہے۔

اس مثنوی کو ایڈٹ کر کے جمیل جالبی نے انجمن ترقی اردو پاکستان سے ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا ہے۔

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تعارف سلاطین بہمنی ضمیمہ نمبر ایک۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ صفحہ ۲۶۶۔

Marfat.com

مثنوی کے دو اشعار سے شاعر کے نام اور تخلص کا پتہ چلتا ہے ؎

نہیں فخر دین دیکھ انیا درا و کہ بن دوس دھن پر ہری دکھ لاؤ
نظامی دھرم دکھ کیوں راؤ دئے کہ پت ورت گن بات دھن سو کئے

مندرجہ بالا شعر میں وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فخر الدین کے بجائے فخر دین لایا گیا ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے اشعار کی تعداد بتاتے ہوئے افسر امروہوی لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں کل ایک ہزار انتالیس (۱۰۳۹) اشعار موجود ہیں۔ "مقالات ہاشمی" میں نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون "بہمنی حکومت کا ایک دکنی شاعر" میں لکھا تھا کہ یہ جملہ آٹھ سو پچیس (۸۲۵) اشعار پر مشتمل ہے۔ سخاوت مرزا نے تعداد اشعار سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ نظامی کی مثنوی میں ۹۹۴ اشعار دستیاب ہوئے ہیں لیکن جمیل جالبی کی مرتب کردہ مثنوی میں ایک ہزار تیس (۱۰۳۰) مکمل اشعار موجود اور ایک شعر نامکمل حالت میں موجود ہے۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا تا حال صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے جو انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانہ خاص کا مخزونہ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی ناقص ہے اور درمیان میں بھی بعض اوراق غائب ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہم مثنوی کے اصلی نام سے بھی ناواقف ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ انھوں نے لطیف الدین ادریسی تاجر کتب حیدرآباد کے پاس اس مثنوی کا نسخہ دیکھا تھا۔[1] جمیل جالبی رقمطراز ہیں :۔

> "ہاشمی صاحب کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود تاجر کتب نے اس مثنوی کا نام "کدم راؤ پدم راؤ" رکھ دیا تھا اور یہی نام ہاشمی صاحب نے قبول کر لیا اس کا بھی امکان ہے کہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا یہ نسخہ وہی ہے جسے نصیر الدین ہاشمی نے ادریسی کے پاس دیکھا تھا"[2]

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ ص ۳۸۔
[2] ۔ جمیل جالبی ۔ مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ ۔ ص ۱۶ ۔

Marfat.com

اس مثنوی میں کدم راؤ اور پدم راؤ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ کدم راؤ ناگ راجہ تھا اور پدم راو اس کا وزیر۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ بھی فروعی تبدیلی کے ساتھ ہندوستان اور ملایا کے ان ہی قصوں سے مماثل ہے اور مزاجاً اسی دور کے تصورات کا حامل ہے جب انسان جادو اور سحر پر ایمان رکھتا تھا" دھنور بید" اور "امر بید" جوجوگی نے کدم راؤ کو سکھائے ہیں جادو کے انتہائی مدارج ہیں اور نقل روح اسی کا ایک حصہ ہے[1]۔ افسر امروہوی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مثنوی کی فارسی سرخیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر "اس زبان کے اچھے عالم تھے"۔ افسر امروہوی لکھتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں ایک بیاض ہے جس میں نظامی تخلص کے ایک شاعر کی فارسی غزل درج ہے اور چونکہ تا حال دکن میں اس تخلص کے کسی اور شاعر کا پتہ نہیں چل سکا ہے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ غزل فخر الدین نظامی کی ہوگی۔

نظامی تخلص کے ایک اور شاعر کی مثنوی انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص کی ایک قلمی بیاض میں محفوظ ہے۔ اس مثنوی کا نام "خوف نامہ" ہے جس میں پانچ سو چالیس[2] ابیات ہیں۔ مثنوی "خوف نامہ" کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

"قدیم شعراء میں بھی کسی اور شاعر کا نام نظامی نہیں ملتا سوائے ایک نظامی کے جس نے خوف نامہ تصنیف کیا تھا جس میں روز قیامت اور میدان حشر کے حالات کو بیان کر کے درس اخلاق دیا گیا ہے[1]۔ خوف نامہ کے زبان و بیان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ خوف نامہ اس نظامی کا نہیں ہے جس نے کدم راؤ پدم راؤ لکھی ہے خوف نامہ اس دور کی تصنیف ہے جب اردو، ہندی روایات کے سارے امکانات جذب کر کے

---

[1]۔ جمیل جالبی۔ مقدمہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۲۶

[2]۔ افسر امروہوی۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان۔ جلد اول ص ۳۷۳۔

Marfat.com

فارسی روایات کے راستے پر چل چکی تھی"۔ [1]

عبدالقادر سروری نے نظامی کو" دور بہمنی کی سب سے قابلِ توجہ شخصیت" قرار دیا ہے۔ مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا قصہ سنسکرت ادب سے خوشہ چینی کا غماز ہے اس قصے میں تبدیلِ قالب سے پیدا ہونے والے واقعات سے مثنوی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ اکھرنا تھ نامی ایک جوگی کے مکر و فریب کی داستان ہے۔ راجہ کدم راؤ کو اس جوگی نے قالب تبدیل کرنے کا راز بتا دیا تھا ایک دن جب راجہ طوطے کے قالب میں تھا اکھرنا تھ نے راجہ بن کر عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گذارنے کے لالچ میں، راجہ کا قالب اختیار کر لیا اور خود راجہ بن بیٹھا۔ وزیر پدم راؤ طوطے کی مدد سے جو دراصل خود کدم راؤ راجہ تھا حقیقت دریافت کر لی تھی۔ بالآخر پدم راؤ کی مدد سے کدم راؤ نے دوبارہ اپنا اصلی قالب اختیار کیا۔ سنسکرت کی قدیم کتھاؤں میں اس قبیل کی داستانوں کا یہی انجام بتایا جاتا ہے۔ تبدیلِ قالب سنسکرت ادب میں بہت سے قصوں کی بنیاد بنا ہے "یوگ سوتر" میں اسے "پر شریر آویش" ہندی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پرکاش مونس لکھتے ہیں کہ "کتھا سرت ساگر" "پارشن ناتھ چرتر" اور "بے تال پنچ وشتی" "وکرم چرتر" "پر بندھ چنتا منی" وغیرہ تصانیف میں "پر پر ویش" "دیہانترا ویش" "देहान्तरावेश" اور "پر کائے پر ویش" "पर पुरवेश" کے ناموں سے یہی تصور پیش کیا گیا ہے۔ [2]

سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ اس قصے کا ماخذ "سنسکرت کا کوئی قصہ" معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظامی نے ایک جگہ لفظ "سنگھاسن" استعمال کیا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ قصہ "سنگھاسن" "بتیسی" سے ماخوذ ہے۔ جسے راجہ بھوج دھارا نگر کے حاکم کے ایک درباری شاعر نے لکھا تھا جس میں بتیس (۳۲) پتلیاں علیحدہ علیحدہ کہانیاں سناتی ہیں ممکن ہے کہ یہ قصہ انہیں قصوں میں سے ایک ہو۔ [3]

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ مقدمہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ ص ۱۵ ۔ [2] ۔ عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ ص ۱۸۷۔ [3] پرکاش مونس۔ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ص ۱۶۵۔

[4] ۔ سخاوت۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ۔ اردو ادب۔ شمارہ ۲۔ ۱۹۶۶ء ص ۲۵۔

Marfat.com

سخاوت مرزا کو اس سلسلے میں جو تسامح ہوا ہے اس کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ "سنگھاسن بتیسی" نثری تصنیف ہے کسی شاعر کی شعری تخلیق نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ راجہ بھوج کے کسی درباری شاعر کا کارنامہ نہیں کیونکہ ہر پتلی کی کہانی راجہ بھوج کو راجہ بکرماجیت کی ایک ایک داستان سناتی ہے جس سے راجہ بھوج کو بکرماجیت کے عدل وانصاف، جود وسخا، رعایا پروری، شجاعت وعظمت اور اپنی بے مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کو اس کا درباری شاعر یا ادیب تازیانۂ عبرت لگانے کی کیسے جرأت کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ نظامیؔ نے اپنی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں "سنگھاسن بتیسی" کی کسی کہانی کا چربہ نہیں اتارا ہے بلکہ فورٹ سینٹ جارج ... کالج کے ایک نامعلوم مصنف نے اس کی طرف توجہ کی تھی اور "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے ۲۲ر صفر ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء سے قبل اسے مکمل کیا تھا[1] اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے۔

محمد کنج میترؔ نے "کدم راؤ پدم راؤ" میں اخلاقی عناصر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے وہ اس مثنوی کو پند ونصائح سے عاری نہیں سمجھتے اور لکھتے ہیں کہ اس میں گناہ کی برائی، سچائی کی عظمت، بتی ورتا کی اہمیت اور شراب سے پرہیز کرنے کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے[2]

"کدم راؤ پدم راؤ" کا قصہ ہندوستانی لوک قصوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اسی فکری اور تہذیبی مزاج کا غماز ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس پوری مثنوی میں ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی طرزِ فکر کا اثر نمایاں ہے مثلاً مندر کا کلس ٹوٹنا بڑی بدشگونی تصور کی جاتی ہے جب اکھرناتھ جوگی کدم راؤ کو تبدیلِ قالب کا منتر سکھا رہا تھا عین اسی وقت مندر کا ایک کلس ٹوٹ کر گر پڑا جو یقیناً ایک برا شگون تھا۔

---

[1] ۔ سیدہ جعفر۔ دکنی نثر کا انتخاب ۔ ص ۱۲۱

[2] ۔ وی پی محمد کنج میترؔ۔ ہندی کا سرودت نیا چنتن ۔ ص ۱۲

Marfat.com

اکھر ناتھ منتر سکھا ہار ہس　　یکایک پڑیا ٹوٹ مندر کلس
تائی بہت اوسگن راؤ کوں　　نہ پوچھیا کیے راؤ اس بھاؤ کوں

"کدم راؤ پدم راؤ" میں اسلامی تلمیحات کے ساتھ ساتھ ہندو دیومالا کی معنویت سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ؎

کہ جے رام کے یار نہونت تھا　　نہ تجہ سار کا اودھ نونت تھا
دھرم بھیم سہ یوار جن چگل　　اکنکی کروں پانچ پانڈو کھکل
روں بن کٹک ہوں سو کچ تج کام　　نہ نہونت سکے نہ لکھن نہ رام

مثنوی میں نہیں محض قصہ گوئی سے سروکار رکھا گیا ہے کہیں جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اور کہیں اخلاقی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نظامی نے بصیرت افروز باتیں بیان کی ہیں ؎

کہ جے بول سُتے تس کہوں　　کہ جو نا سنے تل کھڑے نہ رہوں
کہ جوں تو بولے منجے دک نا　　جو بولیا کرے بھئی مجے سک نا

"کدم راؤ پدم راؤ" ہماری زبان کی قدیم ترین مثنوی ہے اس لئے اس کی زبان پر قدامت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اس وقت تک اردو کا ایک اہم علاقائی روپ یعنی دکنی اپنا معیاری رنگ اور اسلوب پوری طرح قائم نہیں کر سکی تھی "کدم راؤ پدم راؤ" میں بیک وقت بہت سی زبانوں کے اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ پنجابی، سندھی، کھڑی، راجستھانی برج بھاشا، گجراتی اور مراہٹی کے بہت سے الفاظ اس مثنوی میں موجود ہیں۔

وی پی محمد کنج میتر اپنی کتاب "ہندی کا سردت نیا چنتن" میں رقمطراز ہیں کہ "کدم راؤ پدم راؤ" میں استعمال ہونے والے بارہ ہزار الفاظ میں سے دس ہزار الفاظ سنسکرت اصل کے ہیں اور عربی و فارسی لغات کی تعداد لگ بھگ دو سو ہے [1]

"کدم راؤ پدم راؤ" کے بعض روزمرہ اور محاورے آج بھی دکن کے مواضعات میں بولے جاتے ہیں جیسے آنکھ بھر دیکھنا، باسی تواسی، کل کل ہونا اور سب کو ایک

---

[1] ۔ وی پی محمد کنج میتر۔ ہندی کا سردت نیا چنتن۔ ص ۱۳۔

Marfat.com

لکڑی سے ہانکنا وغیرہ۔ جمیل جالبی نے "کدم راؤ پدم راؤ" پر پنجابی، سندھی اور گجراتی کے اثرات کا تجزیہ کر کے مثنوی کی لسانی خصوصیات اجاگر کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک اردو زبان کے اصل خد وخال پوری طرح نمایاں ہونے نہ پائے تھے اور ادبی معیار کی صورت گری ہنوز مکمل نہیں ہوئی تھی اس لئے "کدم راؤ پدم راؤ" کی زبان میں ایک طرح کی اجنبیت کا احساس ہوتا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پدم کہیا کہ بنتی دھروں　　کہے چک سنے راؤ سیوا کروں
جگتر بھوندانہ ہنکار پاس　　کہ ترت اس دے بھوند کر جائے نہاس
بھوندا دھرے من بہت دِشٹ بھاؤ　　پسارے اگر پیٹ میں بیس بھاؤ
بھوندا جو پاوے سلک چکدائے　　لگے سانپ کوں جان دو پنکھ دھائے
دساور پرکھ من دھرے بہت سہل　　کہ مکھ پھول دے جیولے باہ ہول

نظامی کی زبان کے بارے میں سری رام شرما لکھتے ہیں کہ اس وقت تک دکنی زبان جذبات ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہیں ہوئی تھی۔ نظامی نے چھوٹی چھوٹی آسان ترکیبوں کے ذریعے سے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ کہاوتوں اور محاوروں کے ذریعے سے زبان کی بیانیہ صلاحیت میں اضافہ کیا ہے [1]

محمد کنج منیر لکھتے ہیں کہ "کدم راؤ پدم راؤ" کے قصے کے بنیاد بھارتیہ پرانک اکھیان یعنی پرانک داستانوں اور قصوں پر رکھی گئی ہے اس میں ہندوستانی طرز فکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے [2] اس میں نظامی نے بہت سے عوامی رجحانات کو سمو دیا ہے اور اس سے اُس دور کے سماجی تصورات کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس شعری کاوش میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے یہ مثنوی ملی جلی ہندوستانی تہذیب کی مظہر ہے اور نظامی نے جہاں حضرت ایوب، نوح، حضرت محمد کے چہار یار اور حاتم طائی کا ذکر کیا ہے وہیں لکشمن، ہنومان، پنچ پانڈو اور سری رام کے نام بھی لئے ہیں۔ [3]

---

[1] ۔ سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۶۹۔
[2] ۔ وی پی محمد کنج میتر۔ ہندی کا سروت نیا چنتن۔ ص ۲۴۔
[3] ۔ " " " " " ص ۲۴۔

Marfat.com

نظیری

نظیری فارسی کا ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا نام ملا محمد تقی تھا جب بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت حسن آباد گلبرگہ سے بیدر (احمد آباد) منتقل ہوا تو نظیری یہاں موجود تھا۔ وہ وزیر سلطنت محمود گاواں کے دربار سے متوسل تھا۔[1] شمس اللہ قادری لکھتے ہیں "نظیری اردو میں بھی شعر کہتا تھا"[2] ملا محمود نے جو ابراہیم بیدر کا فرزند تھا "معدن الذہب" تصنیف کی تھی اس میں اس عہد کے باکمال فنکاروں اور شعراء و ادیبوں کے لطائف اور ملفوظات وغیرہ جمع کر دیئے گئے تھے ان میں ایک لطیفے کے ضمن میں ملا نظیری کا یہ شعر بھی نقل کیا گیا ہے[3]

دیں شیخ و برہمن نے کیتا یار فراموش
بن تسبی فراموش بن زنار فراموش

آذری

آذری سلطنت بہمنیہ کے تاجدار احمد شاہ (۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ) کے عہدِ حکومت میں اپنے وطن ایران سے وارد بیدر ہوا تھا۔ سلطان نے اسے ملک الشعراء کا خطاب بھی عطا کیا تھا[4] وہ اپنے عہد کے بلند پایہ شاعروں میں تھا اور آذری تخلص کرتا تھا[5] فرشتہ نے اسکے زہد و تقویٰ کی تعریف کی ہے[6] "تاریخِ فرشتہ" سے پتہ چلتا ہے کہ آذری قصیدہ گو بھی تھا اور اس نے بادشاہ کی مدح میں بہت سے قصیدے کہے تھے۔ بادشاہ نے آذری کو سلطنتِ بہمنیہ کی منظوم تاریخ مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ نصیر الدین ہاشمی[7] اور نذیر احمد[8] لکھتے ہیں کہ "بہمن نامہ"

---

[1] ۔ عبدالقادر سروری ۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ باب تیسرا باب۔ ص ۱۸۳

[2] ۔ شمس اللہ قادری۔ اردو ے قدیم ۔ ص ۴۲ ۔

[3] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو ۔ ص ۵۳ ۔

[4] ۔ " " " " " " " " " " " "

[5] ۔ محمد قاسم فرشتہ ۔ تاریخ فرشتہ ۔ جلد سوم۔ ص ۱۳۴ ۔ مترجم خدا علی طالب ۔

[6] ۔ " " " " " " " " ص ۱۳۵ ۔ " " " " " "

[7] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۵۵ ۔ [8] ۔ نذیر احمد ۔ اردو کی ابتدائی منثور نما میں علماء و فضلاء کی خدمات (مضمون) مشمولہ رسالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۹ء ص ۲۱ تا ۲۶ ۔

Marfat.com

"دکھنی" یا "قدیم اردو" میں نظم کیا گیا تھا۔

تاریخ فرشتہ میں مورخ نے اُسے "بہمن نامہ دکھنی" کہہ کر یاد کیا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ دکھنی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن "بہمن نامہ" کے جو اشعار فرشتہ نے نقل کیے ہیں وہ فارسی میں ہیں دکنی میں نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ "بہمن نامہ" فارسی میں نظم کیا گیا تھا۔ فرشتہ کی عبارت میں لفظ دکنی سے مراد دکنی زبان نہیں اس کا مقصد ایران کے بہمنی خاندان سے دکن کے بہمنی سلاطین کو ممیز کرنا تھا۔[1] بہرحال "بہمن نامہ" کے ناپید ہونے کی وجہ سے کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ شیخ آذری نے یہ منظوم تاریخ بادشاہِ وقت کی خدمت میں پیش کی تھی اور گرانقدر انعام و تحائف حاصل کیے تھے۔[2] اس تاریخ کو احمد شاہ بہمنی کے عہد تک منظوم کرنے کے بعد آذری نے وطن واپس جانے کی اجازت چاہی تھی لیکن احمد شاہ نے جو خواجہ بندہ نواز سے خاص عقیدت رکھتا تھا اُسے اجازت نہیں دی تھی اور کہا تھا وہ پہلے ہی سے خواجہ بندہ نواز کے وصال کی وجہ سے دل گرفتہ اور آزردہ تھا آذری کی جدائی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ یہ سن کر شیخ آذری نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔[3] اس زمانے میں بہمنی پایۂ تخت بیدر میں قصر دارالامارۃ تیار ہوا تو شیخ آذری نے اس کی تعریف میں دو شعر کہے تھے۔ ان ابیات کو خوبصورت خط میں لکھوا کر سنگ تراشوں سے کتبہ بنوایا گیا تھا اور اس کتبے کو باب الداخلہ پر جگہ دی گئی تھی۔ احمد شاہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور شاعر کا نام دریافت کیا تو شہزادے علاء الدین نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیخ آذری کی سفارش کی اور بتایا کہ شاعر اپنے وطن واپس جانے کے لئے بیقرار ہے۔ بادشاہ نے خلعت خاص کے علاوہ پانچ ہندی غلام اور مال و زر دے کر رخصت کیا تھا۔[4] آذری خراسان پہنچنے کے بعد بھی بہمن نامہ لکھنے میں مشغول رہا۔

۱۔ الف۔ د۔ نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ پانچواں باب ص ۲۹۱۔

۲۔ محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ۔ جلد سوم۔ ص ۱۳۳۔ مترجم خدا علی طالب

۳۔ " " " " " " " " ص ۱۳۳۔ " " " "

۴۔ الف۔ د، نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ پانچواں باب۔ ص ۲۵۳۔

Marfat.com

سال بھر میں جو کچھ نظم کرتا خراسان سے بیدر روانہ کر دیتا۔ اس نامکمل تاریخ کو بعد میں ملا نظیری اور بعض دوسرے شعراء نے مکمل کیا۔ آذری کی تاریخ وفات ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء بتائی گئی ہے[1]۔

بادشاہ اور اکثر امراء آذری کے مداح تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ مشہد مقدس کو مرزا الغ بیگ سے ملاقات کی غرض سے گئے تھے تو وہاں الغ بیگ نے ان کے تخلص کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ آذری نے جواب دیا تھا کہ مرزا آذر کے مہینے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے اس نے یہ تخلص پسند کیا تھا[2]۔ وہ مرزا شاہ رخ کے دربار میں ملک الشعراء بھی رہے تھے[3]۔

عبداللہ حسینی

عبداللہ حسینی کو ڈاکٹر زور[4] اور نصیر الدین ہاشمی[5] نے خواجہ بندہ نواز کا پوتا تحریر کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ "سیر محمدی" سے جو خواجہ بندہ نواز کے خاص مرید محمد علی سامانی کی تصنیف ہے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی منجھلی صاحبزادی بی بی بتول سید سالار کی رفیقۂ حیات تھیں[6]۔ سید سالار کی تین لڑکیاں تھیں۔ ایک بیباں شمس الدین سے اور دوسری بیباں عبداللہ سے بیاہی گئی تھیں۔ عبداللہ سید ابوالمعالی کے فرزند تھے[7]۔

عبداللہ حسینی بہمنی سلطنت کے حکمران احمد شاہ ثانی (۸۳۸ھ/۱۴۳۴ء تا ۸۶۲ھ/۱۴۵۸ء) کے زمانۂ حکومت میں گلبرگہ میں قیام پذیر تھے[8]۔ اپنے فیض روحانی سے عوام کو اپنا

---

[1] الف، د، نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ پانچواں باب۔ صفحہ ۲۸۰

[2] محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۴۔ مترجم فدا علی طالب

[3] الف، د، نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ پانچواں باب۔ صفحہ ۲۰۹

[4] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ صفحہ ۲۰

[5] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۴۴

[6] محمد علی سامانی۔ سیر محمدی۔ صفحہ ۱۳۷

[7] عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب صفحہ ۱۸۴

[8] ایضاً ایضاً ایضاً

Marfat.com

گردیدہ بنالیا تھا اور اُن کے معتقدین خاصی تعداد میں موجود تھے۔ عبداللہ حسینی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کی تصنیف "نشاط العشق" کا دکنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح بھی کی تھی۔ اسٹوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کے کیٹلاگ میں اس تصنیف کی نشاندہی کی تھی[1] لیکن اب یہ ناپید ہے۔

میراں جی شمس العشاق کی شاعری

میراں جی شمس العشاق کے حالات زندگی اور ان کی نثر نگاری پر ڈاکٹر گیان چند چھٹے باب میں روشنی ڈالیں گے میراں جی شمس العشاق کے منظوم رسالوں میں "خوش نامہ"، شہادت الحقیقت یا شہادت التحقیق "خوش نفز" اور "بشارت الذکر" اور "نغز مرغوب" قابل ذکر ہیں۔ ان منظوم رسالوں میں سوائے "بشارت الذکر" کے تمام رسالے شمس العشاق ہی کے ہیں[2] بقول ہاشم علی "خوش نامہ" مثنوی کے طرز میں لکھا گیا ہے۔ لیکن جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ "نظم کا وزن ہندوی ہے"[3] یہاں یہ بات قابل غور ہے

---

[1] ڈاکٹر ایف۔ د۔ نسیم، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چوتھا باب، صـ ۲۷۵

[2] ہاشم علی۔ مغز مرغوب و چہار شہادت۔ صـ ۵۶

[3] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو۔ جلد اول۔ صـ ۱۶۹

Marfat.com

کہ خود شمس العشاق نے اس نظم کے اشعار کو دوہوں سے تعبیر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس میں ایک سو ستر (۱۷۰) دوہے موجود ہیں۔ "خوش نامہ" کے ایک شعر سے اس کے نام اور تعداد اشعار کا پتہ چلتا ہے ؎

اس خوش نامہ دھریا نام دوہا ایک سو ستر
دسّا زیادہ پڑھے سوئے تو ملے خوشی کا چھتر

اسی طرح نظم کے آخری شعر میں بھی اس کے نام کی وضاحت کی گئی ہے شمس العشاق کہتے ہیں ؎

کھنڈیا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام
خوش سب کوئی دائم قایم جتا خواص و عام

عبدالحق کے یہاں "خوش نامہ" کے دو نسخے موجود تھے۔ "خوش نامہ" میں ایک نوجوان اور نیک طینت لڑکی خوش یا خوشنودی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ چغتائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا باپ ترک افشاق ہے۔ خوشی اس نظم کا مرکزی کردار ہے۔ اور اسی کے گرد نظم کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ خوش یا خوشنودی کو اپنی ہم عمر لڑکیوں کے برخلاف بناؤ سنگھار اور لباس و زیورات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ عشق الٰہی سے سرشار ہے اور دنیوی رموز سے بالکل بے تعلق ہوگئی ہے۔ خوش میراں جی شمس العشاق کی مرید تھی اور اُسے اپنے مرشد سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ اپنے پیر کی خدمت کرنے میں اُسے روحانی سکون نصیب ہوتا تھا اور وہ اپنے شیخ سے وابستگی کو وسیلۂ نجات تصور کرتی تھی ؎

منج نا سوڑے الوان نعمت پھول پریمال پان
روکھی سوکھی اوپری خوشی کاہ بُرای مان
منج نہ سوڑے پاٹ پیتنبر زر زری سنگھار
بھائی بھائی کنبلی نیکی کلہ جپن ہار
نا منج سوڑے پلنگ نہالی صوفے باڑی باغ
حسرت راکھ جیونا مرنا یہ تو کسمل داغ

خوشی کہتی ہے کہ یہ سب ساز و سامان اور دنیوی آسائش و زیبائش بیکار ہے۔

Marfat.com

جو لوگ اپنے جسم پر دھول نہ ملیں ان کا عشق کیسے ظاہر ہو سکتا ہے اور جو عشق میں آنسو نہیں بہاتے انھیں اپنا مطلوب حاصل کیسے ہو سکتا ہے ؎

بے نہ کایا دھول ملاویں کیونہ پرگٹ شوق
بے نہ عشقوں انجھوڑھالے کیونہ پایا شوق

عبدالحق نے خوشی یا خوشنودی کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ یا تو کوئی فرضی لڑکی ہے یا حضرت کی کوئی عزیز یا بیٹی ہے [1] حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ شمس العشاق نے "بڑے پیار سے" اس لڑکی کا ذکر کیا ہے اور ان کے بیان میں خود ان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ خوشی صرف ان کی محبوب مرید ہی نہیں تھی بلکہ کوئی اور رشتہ بھی رکھتی تھی [2] آگے چل کر دل کی دھڑکنوں اور "کوئی اور رشتہ" کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ خوش میراں جی کی سالی تھی اور ان ہی کے گنبد میں دفن ہے۔ خوش دنیا کو ہیچ و پوچ سمجھتی ہے اس کا تصور یہ ہے کہ دنیا میں تمام انسان برابر نہیں کوئی امیر ہے تو کوئی غریب۔ خدا کسی کو حکومت عطا کرتا ہے تو کسی کو زندگی گزارنے کے لیے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو پیتمبر زیب تن کرتے ہیں اور جو سایئے میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ اس کے برخلاف کئی انسان ایسے ہیں جو دھوپ میں جل رہے ہیں اور ان کے سر پر "چھایا" نہیں کئی لوگ پلنگ کے اوپر نرم نہالی سے آرام پا رہے ہیں تو کئی ایسے ہیں جو نیچے فرش پر سو رہے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ عالم ہیں اور کچھ لوگ بالکل جاہل۔ خوش کہتی ہے کہ دنیا قدرت کے رنگا رنگی جلووں سے معمور ہے ؎

ایکس مائی مولی دیوے ایکس مائی باج
کیتوں بھیک منگادے کیتوں دیوے راج
کیتوں پاٹ پیتمبر دیتا کیتوں سر کی لایا
کیتوں اوپر دھوپ تلاوے کیتوں اوپر چھایا

---

[1] عبدالحق۔ میراں جی شمس العشاق (مضمون) رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۲۷ء صـ۱۶۳
[2] حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلا حیات اور کارنامے۔ صـ۸۲

Marfat.com

کیتے گیان بھگت بیراگی کیتے مورکھ گنوار
ایک جن ایک مانس کیتا ایک، پرس ایک نار

خوشی کہتی ہے کہ میں عاقبت کے خیال سے بہت گھبراتی ہوں لیکن کہاں جاؤں؟ ؎

فہمندیاں کوں کرے دیوانے مورکھاں یہ درکھ میں بھائے
کرکر بندگی جرم گنوادے پھر پڑتیج عجب رائے
میں اس کارن بھوت ڈروں ڈر کر جاؤں کہاں
جہاں جہاں میں پھیرن موڑوں توہی تہاں تہاں

خوشی یا خوشنودی کہتی ہے کہ اگر "ماتا" ہی اپنے بالک سے روٹھ جائے تو وہ کہاں جائے گا آخر میں کہتی ہے کہ جو راستہ میرے مرشد میراں جی تک پہنچائے میں اُسی پر گامزن ہوں گی ؎

ماتا جے بالک تھے رُوسے جانا اُنھیں کدھر
آپ جس مارگ لاسی میراں میں جاؤں تدھر

.....

تئیں بھی میرے لاڑ چلایا کبھوں نہ ہوا اداس
اپ سندیسا توڑ گسائیں تری منج کوں آس

"خوشنامہ" کا وہ حصہ جہاں خوشی کے وقت آخر اور اس کے انتقال کا حال نظم کیا گیا ہے بہت زیادہ پر اثر ہے۔ یہاں میراں جی کا لب ولہجہ جذباتی ہو گیا ہے۔ اور ان کا طرز ادا سوز و گداز میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ خوشنامہ کے ان اشعار سے شمس العشاق کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دورِ قدیم کی اُن چند نظموں میں سے ہے جن میں جاذبیت اور دلکشی موجود ہے۔ بقول جمیل جالبی اس نظم میں میراں جی خوشی کی موت سے اخلاقی نتائج اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ خوشی کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ عین عالم شباب یعنی سترہ سال ایک مہینہ اور نو دن کی عمر میں رحلت کر گئی۔

"خوشنامہ" میں بعض جگہ میراں جی کا نام آیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

Marfat.com

کیا میں چوکی کی یوں کہتے تم تو جیو جیون
کاہے کہتے سخت میراں جی مجھ غریب تے من
سنو میرا نجی اگن دھن میں جھل بل تلمل تیوں
میری آہ نہ آوے کسی جائے کید گھر میں چھپیوں

میراں جی کی یہ نظم بہت "سادہ" ہے لیکن بقول نذیر احمد "جذبات سے بھرپور ہے"[1]

عبدالحق لکھتے ہیں کہ ہندی شعراء بعض اوقات تصوف اور معرفت کی باتیں عورت سے خطاب کر کے بیان کرتے ہیں۔ جب خوشن کو اس کی سہیلیاں طعنہ دیتی ہیں کہ اسے لباس وزیورات اور بناؤ سنگھار سے کوئی دلچسپی نہیں تو وہ جواب دیتی ہے مجھے یہی انداز بھاتا ہے اور میں اسی رنگ میں ڈوب گئی ہوں۔ میراں جی نے یہاں خوشن کی زبانی معرفت کی باتیں اس طرح بیان کی ہیں ؎

کہے یہ سب حکم خدا کا، جے تم آنکھیں یوں ہم کو بھاوے یک اللہ سو کرے وہ بھاوے تیوں
ناہم اچھیں سو کھ سنسار ناہم اچھیں چاؤ ہم تو توڑیں اس سے جے ہے رلواں راؤ
جے نرگن گنوں کا سبن لگن کوں بوجھے اب پُن پاپ سٹ دیجیے اب شہہ سوں میلادے تب

میراں جی شمس العشاق نے سچے پیر طریقت کی یہ پہچان بتائی ہے کہ وہ اپنے مریدوں کے دل میں عشق حقیقی کی جوت جگا دے اور انھیں صراط مستقیم دکھا دے ؎

پیر وہی جو پریم لگا دے نور نشانی عین
منتر کی سدھ لکھا دے جہاں دسے نہ رین
جس مارگ بھیں جیو سنچرے سوہی مارگ سار،
مارگ چھوڑ چلے کو مارگ تن کا ہیں بچار

لیکن ایسے مرشد جو خود گمراہ ہیں اور تقدس کا لبادہ اوڑھ کر اپنے مریدوں کو گمراہ کرتے ہیں قابلِ مذمت ہیں اور ان سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ ان کے جال میں نہ پھنسنا چاہیئے۔ ایسے پیروں کے بارے میں شمس العشاق کہتے ہیں کہ نفسانی خواہشات انھیں اندھا بنا دیتی ہیں۔ میراں جی مثالوں سے اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے

---

[1] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ صفحہ ۲۱۳

Marfat.com

کہتے ہیں کہ اگر سوّر کے گلے میں مشک باندھ دیں تو وہ اس کی قدر و قیمت کیا جانے گا اور اگر گدھے پر قرآن شریف لادیں تو وہ اس کا ایک حرف بھی سمجھ نہیں سکے گا۔ یہی حال جاہل اور نفس پرست شیوخ کا ہے۔ میراں جی کہتے ہیں ؎

جن کو شہوت کیرا ہاوا ان کوں ویسے پیر
جن کے پیر شیاطیں وے تو نا آویں حق دھیر
سُوّر کے گل باندھیا مشک وہ کیا اس کوں جانے
اس کے تائیں سر جیا وہ سو ہی پچھان مانے
یا گدھڑے پر قراں لادیا یک نہ بوجھے بول
لایق اپنے کرے بیاں لیہ موکر اپنا کھول

"خوش نامہ" اور "خوش نغز" کا نسوانی کردار خوش بقول ایف، د۔ نسیم فنافی المرشد کی ایک علامت ہے۔ وہ رقمطراز ہیں :۔

"یہ عشقِ مرشد یا فنافی المرشد میرا بائی کے فنافی الکرشن سے مختلف عمل ہے۔ صوفیانہ نظام میں تصور شیخ کی جو ابتدائی منزل ہے۔ شاہ میراں جی شمس العشاق کی خوشنود یا خوش کا عشق صادق یا فنافی المرشد اس کا ایک تدریجی نقطہ ہے"[1]

"شہادت الحقیقت" یا "شہادۃ التحقیق" بھی میراں جی کی شعری کاوش ہے ہاشم علی نے اس نظم کا نام شہادت الحقیقت" تحریر کیا ہے[2] لیکن جمیل جالبی اس کا نام "شہادۃ التحقیق" لکھتے ہیں[3] شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں میراں جی کے اس رسالے کا نام "شہادت التحقیق" تحریر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ اس میں اخلاق و تصوف کے رموز و حقائق کا تذکرہ ہے[4] "شہادت الحقیقت" میں اشعار کی تعداد "خوش نامہ"

---

[1] ایف۔ د۔ نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد۔ پانچواں باب ص ۲۶۳

[2] ہاشم علی مغز مرعوب و چہار شہادت۔ ص ۶۲

[3] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۱۷۱

[4] شمس اللہ قادری۔ اُردوئے قدیم۔ ص ۸۱

Marfat.com

سے زیادہ ہے یہ نظم پانچ سو ترسٹھ (۵۶۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ عبدالحق نے اس کے دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ خود شاعر نے نظم کے نام کی وضاحت کر دی ہے ؎

اس نام ہے تحقیق　　سن شہادۃ التحقیق
اس کا معنز دریا　　جے دیکھنت رے بھریا
سب ہیروں کیری کھان
ناموتیوں کیری دان

نذیر احمد نے اس نظم کے دو ناموں کی نشاندہی کی ہے وہ اس کو "شہادت الحقیقت" یا "شہادت التحقیق" لکھتے ہیں۔ اور انھوں نے اس کے اشعار کی تعداد پانچ سو ترسٹھ (۵۶۳) بتاتے ہوئے اس کو میراں جی کی سب سے ضخیم نظم تحریر کیا ہے[1]۔ اس نظم میں میراں جی نے اپنے شیخ کمال الدین بیابانی کا ذکر کیا ہے ؎

اس کمالیت کے سنگ　　اس خانوادے کے رنگ
آن کمالے اپنا حال　　تو ہوے پیر کمال
کچھ تھے نصیب میرے　　پگ دیک تو ان کیرے

"شہادت الحقیقت" کی بحر چھوٹی لیکن رواں ہے یہ ہندی بحر پر اثر معلوم ہوتی ہے، اس کی زبان کے بارے میں "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں عبدالحق لکھتے ہیں اس نظم کی زبان میراں جی کی دوسری نظموں کی نسبت زیادہ صاف ہے[2] جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن　　الرحیم توں سبحان
یہ سب عالم تیرا　　رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوے　　نہ خالق دوجا ہوئے
جے تیرا ہوئے کرم　　تو ٹوٹے سب ہی بھرم
اس کا دن بھگوں دھاون　　اور تیرا نام لیون

---

[1] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ صـ۲۱۳

[2] عبدالحق۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ۔ صـ۱۱

Marfat.com

"شہادت الحقیقت" کی ابتداء حمد کے اشعار سے ہوتی ہے اور پھر نعت اور منقبت کہی گئی ہے۔ منقبت میں میراجی نے اپنے پیر کی مدح کی ہے اور اس کے بعد متصوفانہ تصورات کی وضاحت کی ہے۔ اس نظم میں میراں جی کہتے ہیں کہ میں نے "ہندی بولوں" کو اس لیے عربی اور فارسی زبان پر ترجیح دی ہے کہ اسے ہر کس و ناکس سمجھ سکتا ہے ؎

جے کوئی اچھیں خاصے　　اس بیان کیرے پیاسے
وے عربی بول نہ جانے　　نا فارسی پچھانے

شمس العشاق کہتے ہیں کہ شعر کے معنیٰ کو اولیت حاصل ہے اور زبان کی حیثیت ثانوی ہے جس طرح مٹی سے عقل مند سونا علاحدہ کر لیتے ہیں اسی طرح قاری کو الفاظ سے مطالب اخذ کرنا چاہیئے ؎

ہیں عربی بول کیرے　　اور فارسی بھوتیرے
یہ ہندی بولوں سب　　اس ارتوں کے سبب
یہ چان سونا لیوے　　اور بھوتے تاکہ دیوے
تیوں بھاکا ماٹی جانوں　　ز معنیٰ دل میں لاؤں

آخر میں میراں جی کہتے ہیں کہ "ہندوی بول" یا "گھر بھاکا" کو نظر انداز کر کے ان کے وسیلے سے ادا کیے ہوئے مطالب پر غور و خوض کرنا چاہیئے ؎

گھر بھاکا چھوڑ دیجیئے　　چن معنیٰ مانک لیجیئے

نظم "شہادت الحقیقت" میں میراں جی نے ایک عمدہ اور دلچسپ مثال کے ذریعے سے شاعری میں زبان و معنیٰ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کی مثال میراں جی نے دکن کے ایک پسندیدہ پھل پھنس (کٹھل) سے دی ہے وہ کہتے ہیں کہ پھنس کا اوپری حصہ خوشنما نہیں ہوتا۔ اگر ہم اس کو چکھیں تو وہ انتہائی بدمزہ محسوس ہوگا لیکن جب یہ پھل کاٹا جاتا ہے تو اندر سے بہت لذیذ اور خوش ذائقہ مغز دستیاب ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ پوست پھینک دیں اور مغز سے لطف اندوز ہوں ؎

کڑوے پن سو رس　　پھل پاکے جوں پھنس
نا دیکھت بورا لیکھو　　ے مغز چاک دیکھو

Marfat.com

جے مغز میٹھا لاگے　　تو کیوں من اس تھے بھاگے
وہ مغز معنیٰ لیو　　سب چھال جھاڑ دیو

اس نظم کے اوزان ہندی ہیں اور اس نظم کے اشعار پر دوہے کی روایت غالب ہے "شہادت الحقیقت" میں میراں جی نے شریعت و طریقت کے مسائل کی تشریح کرتے ہوئے احادیث و آیات کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔ ادبی اعتبار سے میراں جی کی یہ نظم ان کی بعض اور نظموں سے بہتر ہے اس میں کہیں کہیں تلمیحات کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور میراں جی کی مثالوں کے ذریعے سے ترسیلی قوت میں اضافہ کرنے کی کوشش بھی نمایاں ہے۔ بنسی یا مچھیرے کی جال کے کنایے با معنیٰ بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ دکنی ادب میں سی حرفی کی روایت ابتدا ہی سے موجود ہے۔ اس سلسلے میں معظم کی سی حرفی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سی حرفی میں معظم نے اس بات کا التزام رکھا ہے کہ ہر شعر کا بالترتیب حروف تہجی سے آغاز کیا جائے یعنی پہلے مصرعے کا پہلا حرف 'ا' ہو تو دوسرے مصرعے کا پہلا حرف 'ب' اور اسی طرح آخری شعر کا پہلا لفظ 'ی' سے شروع ہو۔ میراں جی نے اپنی اس نظم میں "ا" سے مصرعے کا آغاز کرنے کے بجائے "ی" یعنی حروف تہجی کے آخری حرف سے اس کی ابتدا کی ہے۔

سی حرفی اُن اصناف سخن میں سے ہے جو دکن سے مخصوص ہیں۔ یہ بالعموم مثنوی کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن دکنی شعرا نے سی حرفی کے لیے ترجیع بند اور ترکیب بند کی ہیئت سے بھی کام لیا ہے۔ افسر صدیقی نے شاہ برہان الدین کی ایک سی حرفی کا ذکر کیا ہے۔ جو ترجیع بند کی ہیئت میں کہی گئی ہے ان سے قبل علی جیو گام دھنی نے بھی اس میں طبع آزمائی کی تھی۔ تاحال سی حرفی کے جن نمونوں تک ہماری رسائی ہو سکی ہے۔ ان میں سب سے قدیم علی جیو گام دھنی کی سی حرفی ہے — گورنمنٹ اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں دھن کی ایک سی حرفی محفوظ ہے[1] اس کے ہر بند میں چھ مصرع ہیں۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے سی حرفی

---

[1] مخطوطہ نمبر ۵۳ - تصوف - شاملات - اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری - حیدرآباد -

Marfat.com

سے دلچسپی لی۔اس سلسلے کے دور آخر کے شاہ تراب چشتی شاعر "من سمجھادن" کی سی حرفی انجمن ترقی اردو دہلی میں موجود ہے۔ان سے قبل شیخ محمود خوش دہاں اور شاہ معظم نے بھی سی حرفی لکھی تھی۔ معظم کی سی حرفی کے چند شعر یہ ہیں جن سے اس مخصوص انداز کی نظم کی ہیئت اور اس کے مواد کی ترتیب کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

(ا) احد میں مخفی تھا سو شوقوں باہر آیا
حرف حرف میں روپ بدل کر میم کا گھونگھٹ لایا

(ب) باندیا رشتہ روز ازل سوں عشق محبت گل میں
جن کو حق کا پیم پیارا عاشق ہوتے پل میں

(ت) تعلیم جن کو آپیں دینا اُن کا شوق بندھاوا
من عرف کر حق کوں پاوے عارف عاشق سارا

(ث) ثانی اس کا کوئی نہیں ایک وہی ہے رازق
رحم کرم اس کا سب پر دو جگ کا ہے خالق [1]

معظم اور میراں جی کے اشعار میں یہ فرق نظر آتا ہے کہ معظم نے اپنی سی حرفی میں مختلف اشعار موزوں کرتے ہوئے حروف تہجی کی ترتیب ہر مصرعے میں ملحوظ رکھی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف میراں جی نے "ی" سے لے کر "ا" تک تمام حروف نظم کر دیے ہیں اور اس کے بعد ان حروف کی متصوفانہ تشریحیں پیش کی ہیں اس لیے میراں جی کی اس نظم کو سی حرفی کہنا مشکل ہے۔ میراں جی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ی ہے واؤ نوں میم لام کاف کوں
قاف، ف، غین، عیں ظ، ط، ضیاء معین
صاد شین بھی سین یہ حرف شغل کے تیں
بھی زر ذال دال یہ سا تو شغل سنبھال
ح، ح، جیم، ث ت، ب، الیف لیہ

میراں جی کہتے ہیں کہ تصوف کے مختلف نکات کی تفہیم کے لیے کسی مرشد کامل

---

[1] مخطوطہ نمبر ۶،، - ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد -

Marfat.com

کی ضرورت ہوتی ہے وہی ان اسرار و رموز پر سے پردہ اٹھا سکتا ہے۔

"شہات الحقیقت" کے بارے میں الف، د، نسیم رقمطراز ہیں کہ یہ نظم مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں سوال و جواب کے طرز میں "تصوف کی عام" باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اردو نظم میں مکالمہ نگاری کے ابتدائی نقوش میں سے ایک نقش ہے [1]

"خوش نغز" میں بھی میراں جی نے اپنے مخصوص متصوفانہ خیالات پیش کیے ہیں اس کے ایک نسخے کا عبدالحق نے ذکر کیا ہے۔ "خوش نغز" میں بھی "خوش نامہ" کی طرح خوشی یا خوشنودی کا کردار ابھرتا ہے۔ وہ اپنے پیر طریقت میراں جی سے مختلف سوالات کرتی جاتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ "خوش نغز" میں بقول جمیل جالبی بہتر (۷۲) شعر اور نو ابواب ہیں۔ "خوش نغز" میں ابتدا میں چند شعر بطور تمہید لکھے گئے ہیں۔ ہر باب کا موضوع مختلف ہے اور سوالات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ باب اول عرفان و روح سے متعلق ہے اور دوسرے باب میں تین عالموں کا ذکر ہے۔ باب سوم مراقبے سے متعلق ہے اور باب چہارم میں نور وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح دوسرے پانچ ابواب میں موت، عقل و عشق اور کرامات جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر باب میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ چونکہ یہ نظم سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے ترتیب وار پہلے سوال اور پھر جواب نظم کیا گیا ہے ہر شعر کے پہلے مصرعے کا آغاز "خوش پوچھی" یا "خوش کہی" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ زبان و بیان اور سوال و جواب کی ہیئت کے اعتبار سے "خوش نامہ" اور "خوش نغز" میں مماثلت نظر آتی ہے۔ میراں جی نے عشق اور عقل کا مقابلہ و موازنہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عشق کہے سن عقل پریشاں اگنت اچھے راج
عاروس کیرا ناز بکاوے باندی کیرا کاج
عقل کہے بن کریں سنگار زیبے گیسو ناز
عشق کہے بن پرم پیا کی تو اچھے ساز

---

[1] الف، د، نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد۔ پانچواں باب۔ ص ۲۶۲

Marfat.com

بودھ کہے تو پرم پیا کا جے تو اچھے سار
عشق کہے تو پرم پیا اُپسیر کھینچے ہار
بودھ کہے پچ کھیلا لوڑیں باچھیں اسی بات
عشق کہے یہ کھیل کھلانا سبھی اس کے ہات
بودھ کہے یوں تسلیم ہونا تو پچ پرت رہے
عشق کہے جیو دینا بہتر دوکھ یہ کون سہے

اس نظم کے بھی اوزاں ہندی ہیں۔ باسہ سفتم میں جہاں عشق اور عقل کا موازنہ کیا گیا ہے۔ خوش کا سوال اور میراں جی کا جواب یہ ہے اور اسی سے عشق اور عقل کے مقابلے کا آغاز ہوتا ہے ؎

خوش کہے کہو میراں جی عشق بڑا یا بودھ
پیر کہیں میں آکھوں بیاں اس میں دھرنا سودھ

میراں جی کی نظم "خوش نغز" کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے۔ لیکن وضاحتی فہرست میں نصیر الدین ہاشمی نے خوش کا ذکر دیکھ کر اس کا نام "خوش نامہ" تحریر کر دیا ہے[1] اس نظم میں اشعار کی تعداد ستر سے کم ہے۔ یہ نظم اگر مکالمے کے انداز میں نہ ہوتی تو بہت بے کیف اور بے رنگ ہو جاتی۔ میراں جی نے خوش سے اپنے مکالموں کی مدد سے "خوش نغز" کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر باب دوم میں خوش اور میراں جی کا مکالمہ ملاحظہ ہو ؎

خوش پوچھے کہے کہو پیر میراں جی عالم اچھے کیتے
پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عالم تیتے

"مغز مرغوب" میراں جی کی ایک مختصر سی نظم ہے اور صرف تیئیس[23] اشعار پر مشتمل ہے خود شاعر نے نظم کے نام اور اس کے اشعار کی تعداد کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

مغز مرغوب دھر یا جانو اس نسخے کا نام
مرشد موکھوں سمجھے تو ہوئے کشف تمام

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ ص ۱۸۴

Marfat.com

بیس نظم اور تین زیارت اس کا سب حساب
پرش پچھان کرے رہے تو ہر نعمے کا لاب

اس نظم میں میراں جی نے دو جگہ اپنے پیر طریقت شاہ کمال کا ذکر کیا ہے ؎

اللہ محمد علی امام دائم ان سوں حال
سب خاصوں سوں اللہ اللہ تو آکھوں گیان کمال
اس بوجھیں یہ نین بھی برتے تو نیئں تو نیئں
شاہ کمال کے پانوں لاگوں اس پرچو میں رہیں

نذیر احمد نے میراں جی کی اس نظم کا ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں رقمطراز ہیں :—

"مغز مرغوب یہ مختصر سی عارفانہ نظم صرف سالار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے"[1]

عبدالحق نے میراں جی کی اس نظم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ہاشم علی نے مغز مرغوب کے چھ نسخوں کا ذکر کیا ہے[2] اور اپنی تصنیف "مغز مرغوب و چہار شہادت" میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔[3] "مغز مرغوب" کی بحر میراں جی کی دوسری نظموں کے مقابلے میں طویل ہے۔ میراں جی کی نظموں کو زبان و بیان کا یکسر اپن، سپاٹ اور بے کیف بنا دیتا ہے ان کے یہاں بندھے ٹکے موضوعات ہیں جنھیں ایک مخصوص انداز میں دہرایا گیا ہے۔ مغز مرغوب کے موضوعات وہی ہیں۔ جو میراں جی کی دوسری نظموں میں اکھڑی اکھڑی زبان میں نظم ہوتے رہے ہیں۔ برہان الدین جانم نے انھیں بہتر اور زیادہ پر اثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی افکار و تصورات امین الدین اعلا کے یہاں پانچ عناصر پچیس گن کا فلسفہ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور انھیں امین الدین اعلا نے زیادہ مربوط اور مرتب انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظموں میں میراں جی اور برہان الدین جانم کی بہ نسبت ادبیت کا زیادہ احساس

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ ص ۱۸۴
[2] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۱۵
[3] ہاشم علی، مغز مرغوب و چہار شہادت۔ ص ۲

Marfat.com

ہوتا ہے۔

"چہار شہادت" کا ذکر ہاشم علی نے اپنی کتاب "مغز مرغوب وچہار شہادت" میں کیا ہے[1] اس نظم میں میراں جی نے اپنے پیرومرشد شاہ کمال بیابانی کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ڈاکٹر زور کو یہ تسامح ہوا ہے کہ یہ کمال گرم کنڈری متوفی ۱۲۲۴ھ کی شعری تخلیق ہے۔ چہار شہادت کے بارے میں ہاشم علی رقمطراز ہیں کہ چونکہ اس نظم میں شمس العشاق کے پیرومرشد کمال الدین بیابانی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ انھیں کی تصنیف ہے۔ "چہار شہادت" میں میراں جی نے اپنے مزاج اور دلچسپی کی مناسبت سے مسائل تصوف ہی سے سروکار رکھا ہے۔ باب اول چار "فصلوں" پر مشتمل ہے۔ باب اول کی پہلی فصل میں وجود کی قسموں سے بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں چار فرشتوں اور چار نفس کا بیان ہے "چہار شہادت" میں میراں جی نے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کا بیان کیا ہے اور اس طرح چہار شہادت مختلف متصوفانہ موضوعات سے متعلق آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں فصلوں کی تعداد یکساں نہیں ہے۔ شہادت کے چار مرتبے جن کی مناسبت سے اس نظم کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ شہادت مبدار، شہادت وجدا، شہادتِ عمدا اور شہادت شہدار ہیں۔ جن کے بارے میں میراں جی کہتے ہیں ؎

چوتھی جان شہادت شہدا — جن وہ چہار اے مایا مبدا
نرستی اجت آنند سمان — سنپ سروپ پرکھ پرمان
بن دوی اک اک نہ کرسار — جیت موجد پرم بچار
یہ مت پائے کمایت مکھ — تو ملے سب سکھوں کا سکھ

اور انہی اشعار پر اس نظم کا خاتمہ ہوتا ہے۔ میراں جی کی یہ نظم خاص رواں ہے اور بحر کی موسقیت نے نظم کو مترنم بنا دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

باب ہفتم در بیان ذکر ہائے پنج

ذکر جلی مکھ آکھیں یوں — اندریں برتن راکھیں جیوں

---

[1] ہاشم علی۔ مغز مرغوب دچہار شہادت۔ ص ۸۴

Marfat.com

اللہ اللہ ہردم اُچاؤ د اُچا سروں ایک ہی بھاؤ
بہتر ساندے ناریں بند سروپ کلا میں یہی آنند
قبلی انت کرن کی بودھ اب لے توں واں کی سدھ
یوں تو راکھیں من سمرن کھول دے کریں گر پرسن
ردی سدھ بدھ دیکھیں ہار گرمکھ گیانی گیان بچار

"بشارت الذکر" میراں جی سے منسوب ایک ایسی نظم ہے جس کے بارے میں محققین کے بیانات میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اشعار کی تعداد کے بارے میں شاعر کہتا ہے ؎

نظم دیکھ کیتا گنت ساٹھ یہ
یک یک آں موزوں کیا باٹ یہ

نذیر احمد نے اپنے مضمون "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں علماء و فضلاء کی خدمات" میں اس نظم کو میراں جی کی شعری تخلیق بتایا ہے[1] لیکن علی گڑھ تاریخ ادب اُردو میں اسی نظم کو اُنھوں نے جانم سے منسوب کر دیا ہے[2] نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالارِ جنگ کی وضاحتی فہرست میں "بشارت الذکر" کو شمس العشاق کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن برہان الدین جانم کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے اس نظم کو جانم کی شعری کاوش قرار دیا ہے جس سے ان کے پہلے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ ہاشم علی لکھتے ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی کے بیان سے نذیر احمد کو تسامح ہوا ہے اور نصیر الدین ہاشمی کو یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ کتب خانہ سالار جنگ میں "بشارت الذکر" کا جو مخطوطہ موجود ہے اس کے سرنامے پر "این کتاب بشارت الذکر" تصنیف شاہ میراں جی شمس العشاق" لکھا ہوا ہے[3] عبدالحق نے "قدیم اُردو" میں

---

[1] نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں علما و فضلا کی خدمات (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء ص ۲۳

[2] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ الف۔ ص ۲۲۹

[3] نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ ص ۱۶۲

[4] ہاشم علی۔ مغز مرغوب و چہار شہادت۔ ص ۱۷

Marfat.com

"بشارت الذکر" کا ذکر کیا ہے اور نمونتاً اس کے ابتدائی اور آخری حصّے سے چند اشعار نقل بھی کیے ہیں[1]۔ ذیل میں تین شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

اللہ اسم ذاتی دوہوں جگ — جلی ہم خفی در کیا ہے فضل
دوہوں جگ سمر یں اللہ یک نام — کہ مخلص عابد جیسے ہیں مدام
خلیل محب صادق ولی اتقیاء — اسی تام سیتی محطِ دل کیا

میراں جی کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر زور کا یہ بیان حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اُن کا موضوع عرفان و تصوّف ہے اور یہ نظمیں انھوں نے اپنے مریدوں اور طالبوں کی تلقین، اصلاح اور ہدایت کے لیے لکھی ہیں۔[2]

میراں جی شمس العشاق نے اپنی زبان کے لیے دکھنی یا گوجری کے بجائے "ہندی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میراں جی نے اسے "گھر بھاکا" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ ان کے فرزند جانم اپنی زبان کو گجری اور ہندی سے موسوم کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

عیب نہ راکھیں ہندی بول — معنیٰ تو چک دیکھین کھول
یہ سب بولوں ہندی بول — پر توں ایتھو سیتی گھول
ہندی بولوں کیا بکھان — جے گرو پرساد تھا مُنھ گیان

شمس العشاق اور جانم نے اپنے عہد کی وہ زبان استعمال کی ہے جو عوام میں وسیلہ ابلاغ بنی ہوئی تھی۔ میراں جی کا تعلق دکن کے اُن صوفیاء سے تھا جنھوں نے جنوبی ہند میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کیں۔ اُن بزرگوں کے پیش نظر ایک خاص مقصد تھا اور وہ اپنی تعلیمات کو عوام میں عام کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ جمیل جالبی میراں جی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں "انداز بیان میں ادبی سے زیادہ عامی سطح ملتی ہے۔ قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بات کو شعر میں بیان کرنے کی بس ایک کوشش کی جارہی ہے جو آج سرسری معلوم ہوتی ہے[3] اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ

---

[1] عبدالحق۔ قدیم اردو۔ ص ۲۱
[2] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۲۶
[3] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو۔ جلد اول۔ ص ۴۶۳

Marfat.com

میراں جی کے مخاطب وہ عوام تھے جو بقول ان کے عربی اور فارسی سے ناآشنا تھے. ان کی ذہنی استطاعت کے پیش نظر میراں جی نے سادہ اور براہِ راست انداز اختیار کیا تھا اور اپنے اشعار کو سریع الفہم اور سلیس بنانے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک خود زبان میں وہ قوت اظہار اور ترسیلی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو خود اُن کے پوتے امین الدین اعلا کے عہد کی تصانیف میں نظر آتی ہے ۔ ابلاغ کے پیکروں کو موثر بنانے کی میراں جی نے اپنے طور پر کوشش ضرور کی ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کو ضرورت شعری کے مطابق توڑ موڑ کر اپنا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں سکتے کو کھینچ کر پڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو کہیں مشدّد کا غیر مشدّد تلفظ ادا کرنا پڑتا ہے۔ وزن برقرار رکھنے بعض جگہ حروف کو گرا کر پڑھنا ضروری ہو گیا ہے ۔ ردیف و قوافی کو بھی اسی انداز میں برتا گیا۔ ہے ۔ یہ صوفیاء اور اولیاء اللہ اُردو زبان کے وہ کوہ کن تھے جنھوں نے سنگلاخ راستے ہموار کیے اور ایک ایسی ڈگر بنادی جو بعد میں ایک شاندار شاہراہ میں تبدیل ہوگی ۔ نظم و نثر کے ابتدائی مراحل میں ان کی ادبی مساعی، لسانی شعور اور زبان و بیان کے تجربات نے جو اہم حصّہ لیا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

شمس العشاق کی زبان میں سنسکرت کے تت بھو الفاظ قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں اور انھیں عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ بڑے بے ساختہ انداز میں استعمال کیا گیا ہے ۔ سنسکرت کے تت سم لفظ بھی میراں جی کی ادبی کاوشوں میں اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں مثلاً پرمان، سور، اندریں، پنچ بھوت، ایتت، یدھ، گیان، درشٹ اور ادھیکار وغیرہ ۔

میراں جی کا عام رجحان یہ ہے کہ وہ لفظ کو اس کے تلفظ کی صوتی شکل میں تحریر کرتے ہیں ۔ یہ رجحان ان کے بعد بھی باقی رہا اور دکنی کی ایک عام خصوصیت بن گیا۔ اسی طرح طویل حرف علت کو حفیف اور حفیف حروف علت کو طویل کر دینے کا میلان بھی موجود ہے ۔

Marfat.com

سید شاہ اشرف بیابانی

مہا پنڈت راہول سانکر تیاین نے "دکنی ہندی کا دیہ دھارا" میں اشرف کا نام شیخ شرف الدین بتایا ہے جو صحیح نہیں[1] سید شاہ اشرف بیابانی خانوادہ رفاعیہ انبڑا[2] کے گل سرسبد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے سلطان العارفین ابو العباس احمد کبیر رفاعی معشوق اللہ سے اور انتیس واسطوں سے حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ اشرف کے والد سید شاہ ضیاء الدین بیابانی تھے[3]۔ جو بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی پر شاہ محی الدین نے "تذکرہ ضیاء الدین بیابانی" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ضیاء الدین بیابانی نے اپنے فرزندِ اکبر اشرف کو "ضیاء الحق والدین کے" لقب سے سرفراز کیا تھا اسی طرح سید شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان اخوندِ میاں نے "مخدوم" کے لقب سے اشرف کی عزت افزائی کی تھی۔[4]

ڈاکٹر زور نے نوسرہار کے شاعر کا نام شیخ اشرف الدین[5] اور نصیر الدین ہاشمی نے شیخ محمد اشرف بتایا ہے[6] لیکن "ضیاء بیابانی" میں اشرف کے نام کے ساتھ "سید" کا سابقہ موجود ہے۔[7]

شاہ اشرف کے جد امجد سید عبد الکریم کا تعلق سندھ سے تھا اور چونکہ وہ آبادی سے دور جنگلوں میں قیام کیا کرتے تھے اس لئے "بیابانی" کہلاتے تھے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں کہ اشرف بیابانی قادر آباد جالنہ میں سکونت پذیر تھے

---

[1] ۔ راہول سانکر تیاین۔ دکنی ہندی کا دیہ دھارا۔ ص۶

[2] ۔ فقر آباد۔

[3] ۔ سخاوت مرزا۔ قدیم مثنوی نوسرہار (مضمون) مشمولہ ہماری زبان۔ شمارہ ۲۱، جلد ۱۸ جون ۱۹۵۹ء۔ ص۱

[4] ۔ میر منور علی۔ ضیائے بیابانی۔ ص۳۶۔

[5] ۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ اردو مخطوطات۔ جلد پنجم ص۲۲۴۔

[6] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص۲۸۰

[7] ۔ میر منور علی۔ ضیائے بیابانی۔ ص۴۴

Marfat.com

جو دولت آباد کے قریب واقع تھا اور یہی اشرف کا وطن تھا[1] ڈاکٹر نذیر احمد کا خیال ہے کہ چونکہ قادر آباد نظام شاہی سلطنت کا ابتداء ہی سے جزو تھا اس لئے اشرف کو بہمنی دور کا شاعر نہیں بلکہ نظام شاہی عہد کا سخن گو سمجھنا چاہیئے۔ اس کے برخلاف سخاوت مرزا انہیں سلطان نظام شاہ بہمنی ۸۶۴ھ، سلطان محمد شاہ ثانی اور سلطان محمد بہمنی اور کلیم اللہ بہمنی ۹۳۳ھ کا معاصر تحریر کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ احمد نگر کا بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ جب اشرف کے مقامِ سکونت کی طرف سے گزر رہا تھا تو ان سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کی غرض سے وہ خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ "پنج گنج" کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ ہو :-

"کہتے ہیں احمد نگر کا بادشاہ شکار کے ارادے سے اس طرف آنکلا اور مخدوم شاہ اشرف بیابانی قدس سرہٗ کی ملاقات سے مشرف ہوا شاہ نے اس کی سپاہ و خدام کے جو ہمرکاب تھے مہمان داری کی حالانکہ فقر و فاقہ کی حالت اور جنگل میں سکونت تھی اس کے بعد زباں زد خاص و عام ہو گیا ؎

شاہ اشرف بیابانی بھوکے کو بھوجن پیاسے کو پانی"[2]

اشرف کے والد سید ضیاء الدین بیابانی اپنے والد اور چچاؤں کے ساتھ ترکِ وطن کر کے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں قندھار (دکن) پہونچے تھے[3] قندھار اس زمانے میں سلطنتِ احمد نگر میں شامل تھا۔ سلطان حسن نظام شاہ احمد نگری نے قندھار کو ۹۵۵ھ/۱۵۴۸ء میں فتح کر لیا تھا۔ یہ پہلے سلطنتِ بریدیہ بیدر میں شامل تھا[4] مخدوم

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو چوتھا باب الف۔ ص ۲۰۱

[2] ۔ سید شاہ فاضل بیابانی۔ پنج گنج۔ ص ۱

[3] ۔ میر منور علی۔ ضیائے بیابانی۔ ص ۲۰۔

[4] ۔ سخاوت مرزا۔ قدیم مثنوی نوسرہار (مضمون) مشمولہ "ہماری زبان" شمارہ ۲۱، ۸ جون ۱۹۵۹ء ص ۱

Marfat.com

حضرت سیّد شاہ علی سانگڑے سلطان مشکل آسان کی وجہ سے اس زمانے میں قندھار مرکز رشد و ہدایت بنا ہوا تھا۔ اشرف کے جد عبدالکریم ان سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ سیّد شاہ ضیاء الدین بیابانی اس بارگاہ سے فیض اٹھائیں چنانچہ ضیاء الدین بیابانی اپنے والد کے ایماء پر سانگڑے سلطان کی خدمت میں پابندی کے ساتھ حاضری دینے لگے اور بالآخر شوال المکرم ۸۳۸ھ مطابق ۱۴۳۴ء کو جب ان کی عمر سینتیس ۳۷ سال تھی رفاعیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ طریق میں خلافتیں حاصل کیں چنانچہ منور علی "ضیائے بیابانی" میں رقمطراز ہیں:۔

"شوال المکرم ۸۴۸ھ کو عین رمضان شریف کے دن حضرت مشکل آسان سانگڑہ سلطان رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت بیابانی کو رفاعیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ خلافتیں سرفراز کیں"۔[1]

"مشاہیر قندھار" میں اکبرالدین صدیقی نے اور ڈاکٹر زور نے "فہرست اردو مخطوطات" میں شاہ ضیاء الدین بیابانی کو حضرت سانگڑے سلطان کا بھانجا بتایا ہے لیکن صاحب "پنج گنج" سید شاہ فاضل بیابانی لکھتے ہیں کہ ان کی بہن شاہ ضیاء الدین بیابانی سے منسوب تھیں[2] حقیقت یہ ہے کہ ضیاء الدین کی رفیقۂ حیات سلطان مشکل آسان کی حقیقی بہن تھیں۔

ضیاء الدین بیابانی کے والد نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ سلطان مشکل آسان کی خدمت میں حاضر ہوں انہوں نے اس پر عمل کیا تھا اور سانگڑے سلطان مشکل آسان نے انہیں تمام سلسلوں میں شرف خلافت عطا فرمایا تھا اور اپنی ہمشیرہ کا عقد ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں ان کے ساتھ کیا تھا اور اس طرح وہ قندھار میں رہ بس گئے تھے اور یہی ان کا وطن قرار پایا تھا اور یہیں اشرف بیابانی کی

---

[1] میر منور علی۔ ضیائے بیابانی۔ صفحہ ۳۲
[2] سید شاہ فاضل بیابانی۔ پنج گنج صفحہ ۸۹

Marfat.com

ولادت ہوئی تھی[1] وہ ۲۰ ذیقعدہ ۸۶۴ھ مطابق ۱۴۵۹ء کو دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت پیدا ہوئے تھے[2]

اشرف نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور حقائق و معارف سے آگہی حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ ضیاء الدین بیابانی بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے، اشرف ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہوئے، اکثر مجاہدات و مراقبات میں اوقات بسر کر کے سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ والد ماجد نے خوش ہو کر انہیں ۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء میں خلافت عطا فرمائی۔ ضیاء الدین بیابانی کے انتقال کے بعد اشرف ان کے جانشین مقرر ہوئے[3]

اشرف، حضرت سانگڑے سلطان کے بھانجے اور داماد تھے۔ بی بی مریم آپ سے منسوب تھیں۔ ان کا مزار فقر آباد میں ہے۔ یہیں اشرف بھی سپرد خاک ہوئے ان کے گنبد پر جو اشعار لکھے گئے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

دیکھو تا حد ایں گنبد کرے گفتار اسماں سوں
کہ پانچوں کلس کے اوپر چندر بستار اسماں سوں

یہ گنبد کمرخی گنبد کے نام سے مشہور ہے[4]

اشرف کی اولاد میں چار فرزند اور ایک صاحبزادی تھیں۔ دو لڑکے کم سنی میں فوت ہو گئے تھے اور تیسرے نے عین عالمِ شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ چوتھے صاحبزادے کا نام سید شاہ عبدالملک بیابانی تھا ان کی اولاد نے اس خاندان کا نام روشن رکھا ہے۔

---

[1] ۔ افسر امروہوی۔ مقدمہ نوسرہار۔ ص ۔

[2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۰۱

[3] ۔ افسر امروہوی۔ مقدمہ نوسرہار۔ ص ۔

[4] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ دکنی مثنویاں (مضمون) مشمولہ مجلہ عثمانیہ ۱۹۶۴ء۔ دکنی ادب نمبر ص ۸۸

Marfat.com

میر منور علی لکھتے ہیں کہ ضیاء الدین "رونا پڑا اڑا" کے مقام پر جو جنگل میں واقع ہے ندی کے کنارے عبادت وریاضت کیا کرتے تھے۔[1] اپنے والد کے انتقال کے بعد اشرف سجادہ نشین ہوئے۔

"ضیائے بیابانی" کے مصنف لکھتے ہیں کہ اشرف پابند صوم وصلوٰۃ تھے اور اپنے معتقدین ومتوسلین کو بھی احکام شریعت کی پابندی کی تاکید کیا کرتے تھے اور یہ ذہن نشین کروانا چاہتے تھے کہ :-

"شریعت کے عامل کو جنت ملتی ہے اور قرب الٰہی ودیدار الٰہی نصیب ہوتا ہے اور عدم پابندی سے قہر الٰہی وغضب الٰہی کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے عذابات میں مبتلاء ہونا پڑے گا"[2]

اشرف بیابانی نے کہتر سال کی عمر میں ۹۳۵ھ/۱۵۲۹ء میں وفات پائی اور رفقر آباد جالنہ میں سپرد خاک کئے گئے۔[3]

صاحب "پنج گنج" نے اشرف کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے:-

"حضرت مخدوم در زبان ہندی نوسرہار وقصہ آخر الزماں وغیرہ تصنیف نمودہ"[4] ڈاکٹر زور نے اشرف سے دو اور مثنویاں "واحد باری" اور "لازم المبتدی" بھی منسوب کی ہیں۔ انھوں نے "نوسرہار" اور "واحد باری" کے اشعار کا مقابلہ کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "واحد باری" اُسی شاعر کی تصنیف ہے جس نے "نوسرہار" لکھی تھی۔[5]

"نوسرہار" کے شاعر کا نام سید شاہ اشرف بیابانی تھا اور "واحد باری"

۱۔ سید شاہ فاضل بیابانی ضیائے بیابانی۔ ص۴۸

۲۔ میر منور علی۔ ضیائے بیابانی۔ ص۴۴-۴۵

۳۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص۲۰۱

۴۔ سید شاہ فاضل بیابانی۔ پنج گنج۔ ص۹۰

۵۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ اردو مخطوطات۔ جلد پنجم۔ ص۲۲۴

Marfat.com

کے مصنّف شیخ اشرف الدین تھے وہ "واحد باری" میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے منیر الملک کے صاحبزادے کے لئے یہ مثنوی لکھی ہے اور اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء ہے ؎

رئیس سردار سکندر جاہ
منیر روشن چند اماہ

"لازم المبتدی" کے پانچ نسخوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سے ایک ادارہ[1] ادبیات اردو میں اور دوسرا کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے[2] انجمن ترقی اردو دہلی میں بھی اس کے دو نسخے موجود ہیں[3]

ڈاکٹر زور اشرف کو "لازم المبتدی" کا مصنف بتاتے ہیں[4] اور افسر امروہوی نے ان کی پیروی کی ہے لیکن نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ یہ، سید اشرف مصنف جنگ نامہ حیدر (۱۱۲۵ھ) کی تصنیف ہے[5] نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ انھوں نے غزلیں اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ اشرف کی تصانیف کے بارے میں جمیل جالبی "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" میں رقمطراز ہیں:۔

> لازم المبتدی میں عام آدمی کے لئے مسائل بیان کئے گئے ہیں اور واحد باری نہ صرف عربی فارسی لغت ہے بلکہ اس میں عروض و قافیہ، موسیقی اور نجوم کی اصطلاحوں اور مطالب کو بھی سمجھایا گیا ہے ان کے علاوہ ایک اور تصنیف قصہ آخر الزماں کا بھی ذکر آتا ہے"[6]

۱۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۵۶۔ ادارہ ادبیات اُردو۔
۲۔ مخطوطہ نمبر ۶۹۔ فقہ۔ کتب خانہ سالار جنگ
۳۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۔ ۱۵۔ فقہ۔ انجمن ترقی اُردو دہلی۔
۴۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ اردو مخطوطات۔ جلد پنجم۔ ص ۲۲۵۔
۵۔ نصیر الدین ہاشمی۔ وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۶۸۔
۶۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ ساتواں باب ص ۳۸۵

Marfat.com

"نوسرہار" کا سنہ تصنیف ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء ہے۔ اشرف نے خود دو جگہ کہا ہے ؎

ہجرت بنی نو سو نو
کہیا اشرف نو سرپو

تاحال نوسرہار کے تین نسخوں کا پتہ چل سکا ہے ایک انجمنِ ترقی اردو ہند کے کتب خانے کا مخزونہ ہے، دوسرا ادارہ ادبیات اردو کی زینت ہے اور تیسرا انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان میں محفوظ ہے۔ غالباً اسی کے تتبع میں ایک بزرگ علی اکبر نے "چھ سرہار" لکھی تھی جس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ "نوسرہار" پاکستان سے شائع کر دی گئی ہے۔

نوسرہار سے قبل فارسی میں صرف ایک مثنوی اس موضوع پر لکھی گئی تھی۔ کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی کی "روضۃ الشہداء" عزائیہ کلام کا پہلا نقش ہے جو انھوں نے شہزادہ مرشد الدولہ کی فرمائش پر لکھی تھی "روضۃ الشہداء" کا ماخذ بڑی حد تک تاریخ اور مستند روایات ہیں لیکن نوسرہار کی بنیاد ضعیف اور غیر ثقہ روایتوں پر رکھی گئی ہے۔ اشرف نہ "روضۃ الشہداء" سے متاثر تھے اور نہ یہ کتاب ان کے پیش نظر تھی۔ نوسرہار کا سرچشمہ فیضان دراصل وہ مجالسِ عزا ہیں جو ہر عشرۂ محرم میں ان کے گھر میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ میر منور علی ضیائے بیابانی میں اشرف کے والد ضیاء الدین بیابانی کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان دنوں محرم کا مہینہ تھا اور حضرت قدس سرہٗ کے پاس ماہ محرم کے عشرۂ شریف میں مجلس ہوا کرتی تھیں چنانچہ اس وقت بھی آپ کے پاس مجلس گرم تھی اور اس وقت حضرت قدس سرہٗ اپنے وعظ میں فضائل حضرت شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حالات و واقعات کربلا بیان فرما رہے تھے اس وقت آپ کا وعظ نہایت پر اثر اور رقت آمیز تھا خود حضرت قدس سرہٗ پر رقت طاری تھی اور حاضرین آہ و زاری و نالہ و بکا میں مبتلا تھے"[1]

[1] میر منور علی، ضیائے بیابانی ص ۲۰

Marfat.com

یہ مجالس اشرف بچپن سے سنتے آئے تھے اس لئے واقعاتِ کربلا ان کے دل پر نقش ہو گئے تھے اور مصائبِ اہلِ بیت اُن کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے ۹۰۹ھ میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو رشد و ہدایت کے ساتھ عزاداری کا فرض بھی انہیں کو انجام دینا پڑا اور انھوں نے اسی سال "نوسرہار" لکھی چونکہ ان کے والد کی وفات اور "نوسرہار" کا سنہ تصنیف ایک ہی ہے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد جو پہلا محرم آیا اس میں اشرف نے اپنے والد کی عزاداری کی یاد میں اور اپنے عہدِ سجادگی کی پہلی مجلس کے لئے یہ مثنوی تصنیف کی ہو گی۔

امام حسین کی شہادت ایک سانحۂ عظیم تھی اس لئے انسان ہی نہیں ساری کائنات سوگ میں ڈوب گئی تھی اس کیفیت کے بیان میں اشرف کے تخیل کی جولانیاں ملاحظہ ہوں ؎

انبر گر جا لرزے بھُیں ۔ جانو قیامت ہوئیں
سورج دوکھوں پکڑے تاب چاند گھٹے نت چھر چھر آپ
ڈونگر بکسے سوکے گھاٹ پتھر ترقے سینا پھاٹ
دوکھوں سیتی پانت بھر دوکھوں ہووے دھس کھانگ
پھولوں باڑی کملائے سیوتی چنپا جوئی جائے
گھنگی سینہ لوہو بھر کالا ٹیکا مکھ پر دھر
دوکھوں لینا جنگل جائے باغ ملے تے بے پروائے
ڈونگر دوکھوں بنوا لاگ سٹے جیوں کی ہیسی آگ
پون پر ہوا حکم خدا روتے رہے ترلوک سدا

باب ہشتم میں اشرف نے حر، قاسم، علی اکبر اور امام حسین کی شہادت کے واقعات الگ الگ فصلوں میں بیان کئے ہیں لیکن ان میں سے ہر فصل ایک مرثیے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں چہرہ، سراپا، رخصت، رجز، شہادت اور بین کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ حضرت قاسم کی معرکہ آرائی ملاحظہ ہو ؎

بلوند گھوڑا بجلی باو اک لِ بیٹھا راوت راؤ

Marfat.com

حملہ کیتا جیوں اُن آغاز — گوٹ پڑیا جیوں بیری باز
بیروں باھیں کھول بجاؤ — برسن لاگا کھانڈے گھاؤ
جس کاٹن کر دھوند کا جیوں — پھوٹے کافر سینہ تیوں
جیواُن بیٹھا پہلی پھوڑ — کِتے بیری گھالے کوڑ
اتنے کافر سٹے مار — کرنا سکے کوئی شمار
بیردں کیری باٹ برو — زخموں بھیتر تکہ تکہ ہو
ہر ہر حملے ہر ہر گھاؤ — لوھوگیری کھال بھاؤ
بازاں جیوں آیا وقت — بے تاب ہوا قاسم سخت
پانی بن بھی رھیا اڑ — سینا کالج سوس پکڑ
ناگہ انپڑیا کاری گھاؤ — قاسم سب تن لوہو نہاؤ
بازاں حکم الٰہی کے — پڑیا قاسم جیوڑا دے

امام حسین کی شہادت پر حضرت شہر بانو کا بین اشرف نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

بانو ہوی اُو بھی باؤ — گھر تیں نیکل آنگن آؤ
جوڑا کھولیا جوڑا بھان — توڑن لاگی بالیاں کان
آنکوں کیرا کاجل پونچھ — بال پٹیاں سب لیتیاں گونچھ
گھابر گئی ڈانواں ڈول — سر کے بالوں جوڑا کھول
پیٹن لاگی باپا پھر — کوٹن لاگی سینہ سر
واہ رے میرے شاہ نامدار — اب مجھ ناہیں کوئی آدھار
تو گھر آؤ پیارے کنت — او بھی دیکھوں تیری تیٹ
تجھ بن مجھ پر جگ اوجاڑ — کس پر چلے دکھ سکھ لاڑ
ساھو رے پیو کے ناہیں کوئے — کیوں گھالوں جو مارا روئے
منجھ مرگ ناآئی تجھ آنگھیں — کیوں سکھ جیوں جیوٹا نکیں
سر تے چھتر گیا ڈھل — اب کیوں جیوں کس کے بل

نذیر احمد نوسرہار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مثنوی میں

Marfat.com

واقعہ کربلا کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ تاریخی اعتبار سے محلِ نظر ہیں۔ "واقعہ کربلا حق و باطل کی آویزش ہے" لیکن اشرف نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ امام حسین کی وجہ سے یزید کو عشق میں ناکامی ہوئی تھی جس کا ردِ عمل سانحۂ کربلا کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔[1] "نوسرہار" میں بعض واقعات ایسے بیان کئے گئے ہیں جن میں تاریخی صداقت کی کمی محسوس ہوتی ہے مثلاً حضرت زین العابدین کا اپنی چھوٹی بہن فاطمہ صغرا کے ساتھ وطن میں رہ جانا یا یزید کے لڑکے کا حسینی فوج میں شامل ہونا اور حضرت علی اصغر کا کربلا میں شہید نہ ہونا۔

"نوسرہار" میں واقعاتِ کربلا کے بہت سے اہم گوشوں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے مثلاً حضرت عباس اور عون و محمد کی جنگ ان کا جامِ شہادت نوش فرمانا اور حضرت قاسم کی شادی وغیرہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اشرف کا تاریخی مطالعہ سرسری تھا اور واقعات کربلا کے بیان میں بھی انھوں نے احتیاط نہیں برتی ہے۔ تاریخی واقعات پر مبنی مثنویاں نظم کرنے والے شاعر کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور وہ اصل واقعات سے انحراف نہیں کر سکتا۔ نوسرہار میں اس کی مثالیں موجود ہیں جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اشرف نے تاریخِ اسلام کے اس عظیم واقعے کو من مانے انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

بقول محمد حسن نوسرہار میں یوں تو واقعہ کربلا بیان کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں بالکل نئی روایت شامل کر لی گئی ہے اور بعض مشہور اور مقبول واقعات شامل نہیں کئے گئے ہیں اشرف واقعہ کربلا کو خیر و شر کا تصادم قرار دینے کے بجائے عشق و محبت سے پیدا شدہ رقابت کو اس واقعے کا باعث قرار دیتا ہے اور اس طرح پورا واقعہ مذہبی کے بجائے رومانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اس دور کی ادبی روایات کے عین مطابق تھا۔ رزمیہ نظموں کا انداز رومانی رہا ہے حتیٰ کہ پرتھوی راج اور محمد غوری کی لڑائی

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۰۳

Marfat.com

پرتھوی راج راسو میں اسی طرح بیان ہوئی ہے۔ یہ اسی ادبی روایت کا اثر ہے جس نے مصنف کو واقعہ کربلا کو بھی رومانی رنگ دینے پر آمادہ کیا ہے لیے

نذیر احمد نے نوسرہار کو ادبی اعتبار سے کوئی وقیع کارنامہ قرار نہیں دیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"ادبی لحاظ سے نوسرہار کا مرتبہ بلند قرار نہیں پا سکتا۔ اچھی مثنوی کی خصوصیات اس میں مفقود ہیں۔ نہ اس کے پلاٹ میں جان ہے نہ سیرت نگاری میں کوئی قابلِ ذکر بات ہے۔ ۔ ۔ تعجب ہے کہ فارسی مثنوی کے اعلیٰ نمونے سامنے ہونے کے باوجود اشرف فن کا کوئی کامیاب نمونہ نہیں پیش کر سکا۔" [2]

اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ادب میں نوسرہار کی لسانی اور تاریخی اہمیت ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ زبان کن ارتقائی منزلوں سے ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ اشرف نے اپنے عہد کی زبان کے محدود سرمائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ نوسرہار میں لفظوں کی تکرار زبان کی بے بضاعتی کی غماز ہے لیکن شاعر کو اپنے دور کی زبان پر عبور حاصل تھا اس نے روزمرہ اور محاورے بھی حسبِ ضرورت استعمال کئے ہیں۔ اشرف نے جذبات نگاری بھی کی ہے اور واقعات کی موثر تصویر کشی بھی کی ہے اشرف کی زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر مصرعوں میں اس نے فارسی حروف اضافت اور حروف عطف سے شعر کی بندش کو موثر بنانے کا کام لیا ہے۔ اشرف کے علاوہ دوسرے قدیم شعراء کے یہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن نوسرہار میں اشرف نے اس طریقۂ اظہار سے خاصی مدد لی ہے۔ قوافی کی تکرار یہ بتاتی ہے کہ زبان کا دامن زیادہ وسیع نہیں ہوا تھا۔

---

[1] ۔ محمد حسن ۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ۔ پانچواں باب ۔ ص ۱۰۸

[2] ۔ نذیر احمد ۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ۔ ص ۲۰۳

Marfat.com

"نوسرہار" میں وہ تمام لسانی عروض اور فنّی خصوصیات موجود ہیں جو عام طور پر اس عہد کے ادبی کارناموں میں ہمیں جا بجا نظر آتی ہیں مثلاً عربی اور فارسی الفاظ کو ہندی طرز پر ڈھال لینا یا متحرک حروف کو ساکن اور ساکن کو حسبِ ضرورت متحرک کر لینا یا الفاظ کی شکل بدلنا اور نون اعلان کو نون غنہ اور نون غنہ کو نون اعلان سے بدل دینا وغیرہ۔ یائے معروف اور یائے مجہول، س، ص، ج، ح، ت، ٹ، اور ت، تھ، ک اور گ جو قریب المخرج آوازیں ہیں شعر میں ردیف و قافیے کے لئے ایک ہی صوتیے کے طور پر برتی گئی ہیں ؎

دوگنہ لنگا پکڑی اگ　　جل جل کوئلہ ہوئی ہلاک
ساہورے پیو کی ناہیں کوئی　　کیوں گھالوں جو مارا کوئے

مثنوی میں شاعر کہتا ہے کہ موت ہر انسان کا مقدر ہے سکندر اور ذوالقرنین اور شہدائے کربلا جیسی ہستیوں نے بھی موت کا مزہ چکھا ہے۔ میں نے زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جو مستقبل میں میرے نام کو باقی رکھے گا عمر بیکاری میں بسر ہوئی۔ میں نے یہ مثنوی اس لئے کہی ہے کہ لوگ میرے نام کو یاد رکھیں اور واقعات کربلا سن کر متاثر ہوں اور عبرت حاصل کریں ؎

اے پچ کہتے اشرف تج　　مرنا حق ہے اتنا نج
ہم چوں سکندر ذوالقرنین　　شہداء کربلا شاہ حسین
کیسے کیسے مر مر گئے　　مج تج دسے کیتے سے

جیسا کہ شاعر نے بتایا ہے نوسرہار نو ابواب پر مشتمل ہے ؎

یہ نو باباں نوسرہار　　قیمت اس کی لاکھ ہزار

غالباً اسی بنا پر مثنوی کا نام "نوسرہار" رکھا گیا ہے۔

"نوسرہار" کی زبان اکثر جگہ اکھڑی اکھڑی اور بے ربط سی محسوس ہوتی ہے۔ اُردو کے اس ابتدائی دور میں عروض و قواعد کے اصولوں میں خاصی لچکداری نظر آتی ہے۔ تلفظ بھی موقعہ و محل کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ ابتدائی دور میں زبان اس مرحلے سے گذر کر صاف ہوتی رہی ہے اور اصلاح کا عمل اُسے جلا بخشتا رہا ہے اور ضروری ترک و اختیار یا حذف و اضافے کا

Marfat.com

عمل جاری رہا ہے جو زبان کو معیاری اور ٹکسالی بناتا جاتا ہے۔ لسانی تصرفات کی مثالیں احمدؔ کی "یوسف زلیخا" کی طرح "نوسرہار" میں بھی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔

اشرف کی "نوسرہار" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اشرفؔ کو ایک کمزور اور نوخیز زبان میں بھی اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ بات کہنے کا ڈھنگ اور مختلف جذبات وخیالات کی ترسیل کا انداز، اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ اشرف بیابانی اپنے عہد کے ایک اچھے شاعر تھے۔ زبان کے ابتدائی دور میں انہیں فنکاروں نے اپنے خونِ جگر سے اردو کی آبیاری کی ہے۔ اشرف اپنی زبان کو کہیں "ہندی" اور کہیں "ہندوی" کہتا ہے ؎

ایک ایک بول یہ موزوں آں　　تقریر ہندی سب لکھاں
بازراں کہتا ہندوی ہیں　　قصۂ مقتل شاہ حسین

"منتخب اللباب" حصہ سوم میں خافی خان نے بہمنی سلطنت میں جس مقامی زبان کے دفتری زبان بننے کا ذکر کیا ہے وہ یہی قدیم اردو ہے جو اس وقت تشکیلی مراحل سے گذر رہی تھی" بدستور سابق ہندی مقرر نمود"[1] کے الفاظ سے خافی خان کی مراد اسی زبان سے ہے۔ بقول سری رام شرما اشرف کی زبان پر "ہندوی" اثر نمایاں ہے اس کی زبان آج کی کھڑی بولی کے قریب ہے اس پر مراہٹی کا اثر کم ہے۔ سری رام شرما کا خیال ہے کہ اشرف راجستھانی سے واقف تھا انھوں نے اس کے ثبوت میں اشرف کے یہ اشعار پیش کئے ہیں ؎

مت جائیو مجھ تئیں دولت نھاس　　بات کی روئی منہ کا گھانس
تھانے کی یوں آس پکڑ　　راجستھانی لیئے پڑ[2]

[1] ۔ خافی خان۔ منتخب اللباب حصہ سوم۔ ص ۳۰۔
[2] ۔ سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۷۔

Marfat.com

محمود

محمود کا نام ادبی تاریخوں میں فیروز کے ساتھ آیا ہے کیونکہ وہ فیروز کا ہمعصر اور ہم پایہ شاعر تھا۔ "اردوے قدیم" میں شمس اللہ قادری نے ملا احمد (احمد گجراتی) کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اس کے (مثنوی لیلیٰ مجنوں) خاتمے میں شعر و سخن کے فضائل کو بیان کرتے ہوئے اپنے دو معاصر شعراء فیروز اور محمود کا تذکرہ کرتا ہے[1] ابنِ نشاطی نے "پھول بن" میں اپنے جن دو پیشرو اساتذائے سخن کا ذکر کیا ہے ان میں محمود کا نام بھی شامل ہے اور اس نے ان کے نام کے ساتھ "سید" کا سابقہ بھی استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ محمود سادات گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔" ابنِ نشاطی کہتا ہے ؎

اے صد حیف جو ئیں سید محمود
کتے پانی کوں پانی، دودھ کو دود

ڈاکٹر زور فیروز اور محمود کے بارے میں "اردو شہ پارے" میں رقمطراز ہیں "اگر ان کو ابراہیم کا ہمعصر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وجہی کے قول کے مطابق یہ دونوں اپنے زمانے کے بہترین شاعر ہیں اور ان کی شاعری قابلِ یادگار ہے"[2] وجہی نے "قطب مشتری" میں اساتذۂ سخن فیروز اور محمود کے کمالِ فن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج — تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونوں بھی اس کام میں — رکھیائیں کنے بول اجھون نام میں

ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ فیروز کی طرح محمود بھی نہ صرف اپنے وقت کا ایک بلند پایہ شاعر تھا بلکہ اپنی شعر فہمی اور سخن دانی کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت کا حامل بھی تھا۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو" میں ڈاکٹر زور محمود کے بارے میں لکھتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ محمود صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ

---

[1] ۔ شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ ص ۶۲۔
[2] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۸۲، ۸۳۔

Marfat.com

شاعروں کی قدر دانی اور اردو شعر گوئی کو مقبول عام بنانے میں سرگرم بھی رہتے تھے" ۱؎ جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ فیروز کی طرح محمود بھی شمال سے دکن پہنچا تھا اور وہ ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے فارسی، افغانی اور پنجابی میں بھی شاعری کی تھی لیکن اصل شہرت اردو کلام کی وجہ سے تھی ۲؎ محمود شہباز کا مرید تھا جس کی طرف اس نے اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

کہے شاہ شہباز محمود کوں　　قدم رکھ توں ہر فن میانے ثبوت
محمود کوں شہباز یوں بولے صریح　　تن خصلتاں کوں چھوڑ جو پاوے وصال کوں ۳؎

شاہ شہباز کا نام ملک شرف الدین تھا اور وہ ملک عبد القدوس کے فرزند اور احمد آباد کے باشندے تھے۔ انہیں شاہ علی خطیب سے ارادت حاصل تھی جو مخدوم قطب عالم بخاری کے مرید و خلیفہ تھے۔ جب احمد آباد کا حاکم کسی وجہ سے آپ سے ناراض ہو گیا تو آپ نے وطن کو خیر باد کہہ کر برہان پور کا رخ کیا برہان پور میں اس وقت عینا عادل خاں حکمران تھا اور خاندیس اسی کے زیر نگیں تھا۔ میراں عینا المخاطب عادل خاں مبارک خاں فاروقی کا فرزند تھا اور بقول محمد خلیل الرحمٰن مورخ تاریخ برہان پور خاندیس کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ نامور اور بہادر تھا ۴؎ اس نے قلعہ کے قریب شاہ شہباز کو سکونت کے لئے جگہ دی جہاں انھوں نے آخر وقت تک قیام کیا ان کی تاریخ وفات ۱۰ ربیع الآخر ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء ہے ۵؎ "تاریخ برہان پور" میں ان کا ذکر موجود ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے وجہی کے سلسلہ بیعت کی کڑیاں ملتی ہیں وجہی کے مرشد شاہ علی متقی ان کے خلیفہ اور ارادت مند تھے ۶؎

۱؎ ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ پانچواں باب ص ۳۵۶۔

۲؎ ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۴۱۰۔

۳؎ ۔ ۔ ۔ ص ۴۰۱۔ ۴؎ ۔ محمد قاسم فرشتہ ۔ برہان پور ص ۲۶

۵؎ ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۴۰۲۔

۶؎ ۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات اردو۔ جلد سوم ص ۲۳۰۔

Marfat.com

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی محمودؔ کے نوعمر معاصر تھے اور "سب رس" میں انھوں نے اُسی تکریم و احترام کے ساتھ محمود کا نام لیا ہے۔ جسے کوئی نسبتاً کم عمر شاعر اپنے عہد کے بزرگ استاد سخن کا ذکر کرتا ہے محمودؔ نے غزل کے علاوہ جھولنا، مرثیہ، "قصّہ" دوہرے اور کبت وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ایک غزل ہے ؎

جو کوئی تمہارے عشق کی حالت ستی ماہر ہوا
چھوڑیا سگل اسلام کوں تجہ زلف میں کافر ہوا
ظاہر گنگا کے جل سیتی نہانا سو کچھ نیں اے بہن
خون جگر کے نیر سوں نہایا سو او طاہر ہوا
گر کان ہیں ارے تجہ کوں بات میں غنچے سگل
کرتے ہیں سو جیباں ستی تلقین خاموشی مجے
مومن سبق اول ہے یو بے تاج کوں مفرد رکھ
یو طفل دل تج عشق کے مکتب منے پڑتا ہجے
ہے باٹ یو دو دوز کا توشا کمر کوں باند چل
مغرور ہو بیٹھا ہے کی اونچی طلا کاری تجھے
تیری برہ کی فوج نے دل شہر کا کیتا لوٹے
روکے تجے محمودؔ کا سینے اُپر کرتا بچھے

لکڑی ستی حیات ہے دنیا میں آگ کوں
منصور کوں ملاحظہ کچھ نئیں ہے دار کا
میں نقش تعلق کوں سٹیا نقش پا من
دیوانے کوں پروا نئیں خار زار کا
محمودؔ کی صفت ستی محمودؔ بے خبر
اس جگ میں نئیں دسیا مجھے محمود سار کا

ناکفر پچھانے دل حیراں و نہ دیں کوں
از نقش چپ و راست خبر نئیں ہے نگیں کوں
آسودہ رہے عشق زبیتابی عشاق
نئیں زلزلۂ خاک سوں غم چرخ بریں کوں
ہر چند ہوس ہے تجے اس جگ میں خوشالی
زنہار نکو کھول اپس چین جبیں کوں

Marfat.com

ڈرتا ہوں میں اس مست سیاہ چشم سوں آخر　　بے دیں کریں محمودؔ سے سجادہ نشیں کوں

محمودؔ کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غزل میں نئے اسالیب اور نیا طرز اپنی جگہ بنا رہا ہے اور فارسی روایات اور عجمی لب و لہجے کی پذیرائی غزل کے مزاج کا جزو بنتی جا رہی ہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوتا ہے کہ فارسی اسلوب و لہجے سے اردو شاعری کا خمیر اُٹھ رہا ہے۔ محمود کے کلام کے جو نمونے ہمیں دستیاب ہوئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شاعری میں رنگینی و شادابی کے عناصر موجود ہیں اور اپنی قدامت کے باوجود زبان رواں اور کلام بے ساختہ ہے۔ یہی خصوصیت ہمیں بعد کے دور کے دوسرے دکنی شعراء کے یہاں زیادہ نکھری ہوئی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ محمد قلی نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا محمودؔ اگر میرے یہ اشعار پڑھتا تو شائد فرطِ جذبات سے بے ہوش ہو جاتا۔ محمد قلی جیسے باشعور اور سخن فہم شاعر کا انوری اور ظہیر کے ساتھ محمودؔ کا ذکر کرنا اس کے ادبی مرتبے پر روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی نے کہا تھا ؎

اگر محمودؔ ہور فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے
ہوئے تج وصف ناکر سلطہور انوری بیہوش

جمیل جالبی نے محمودؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "محمودؔ کے کلام کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اب ہندوی اثرات اُردو شاعری سے بھاپ بن کر اڑ رہے ہیں اور ان کی جگہ فارسی اثرات لے رہے ہیں"[1] محمودؔ ان اولین شعراء میں سے ہے جنھیں غزل کی ہیئت کا شعور ہے اس کے کلام میں مطلع اور مقطع دونوں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور ایک مخصوص بحر کو پوری غزل میں نباہنے کا احساس اجاگر ہے یہی نہیں وہ دو غزلہ میں بھی اظہارِ خیال کرنے پر قادر ہے[2] اس سے قبل کے دکنی شعراء نے ایک تو بحر کے انتخاب میں فارسی کا تتبع کم کیا ہے۔ دوسرے انھوں نے اکثر صرف ردیف پر اکتفا کی ہے اور قافیہ کی پابندی کو اہمیت نہیں کرتے۔ غزل میں محمود کی لفظیات Diction بھی نئے رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ

[2] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفحہ

Marfat.com

خونِ جگر، نظر باز، تلقینِ خاموشی، چراغِ بے بہار، نقشِ پا، چرخِ بریں۔ چینِ جبیں اور سیہ چشم جیسے اظہار کے پیکر محمودؔ کی غزل میں اُس عہد کے نئے ترسیلی امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں اس نے کہیں کہیں نئے مضامین بھی باندھے ہیں اور غزل میں ہلکا سا تفکر کا عنصر بھی داخل کیا ہے مثلاً

کب تلک بھٹکے گا توں بے بود کا ماں کے پیچھے
دیکھ توں دنیا دنی کوں جگ میں مانند سراب
جو قدم راکھے سبک سادی کی رہ میں جیوں حباب
نئیں ہے لغزش پانو کوں اس کے اگر چلتا براب
حسن لیلیٰ کا تماشا دیکھ مجنوں مکھ منے
کیوں گزرتا سر بسر از آفتابِ عاشقاں

محمودؔ کے کلام میں عشقِ حقیقی یا اخلاقی اقدار سے متعلق موضوعات شاعرانہ حسن کے ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ محمد قلی اور محمودؔ دونوں کے کلام کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں شعراء نے زندگی کے رنگارنگ تجربات سے اپنی جھولیاں بھر لی ہیں لیکن محمد قلیؔ نے زندگی اور محبت کے حاوی پہلو کے متنوع احساسات کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے اور محمودؔ نے عشقِ مجازی کے ساتھ ساتھ مقصدیت اور ماورائیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ محمودؔ کے یہ اشعار جن میں طنز کی ہلکی سی جھلک بھی موجود ہے اور نصیحت آمیز نکات کی ترجمانی بھی کی گئی ہے ملاحظہ ہوں ؎

شیخ دین ہم مشربان میں ایک ہنگام بہار
دو چھپا پیوے سُرا ہو ویں پیوں پیدا شراب
جیو جد ہاں ہمراہ ہووے باغ سوں بہتر ہے دشت
یہاں بھرے بھر بھر پیالے وہاں بھرے مینا شراب
خلقتِ رنداں منیں محمودؔ نیناں کھول دیکھ
جیو شراب ہے دل شراب ہے سر شراب ہے پا شراب

اگر ہم محمودؔ کو اپنے عہد کی غزل گوئی کا مجدد کہیں تو بیجا نہ ہوگا اس کے کلام میں پہلی بار غزل اپنی ہیئتی حسن، معنوی وسعت اور نئی لے کے ساتھ ادب میں اپنے انفرادی مقام کا تعین کرتی نظر آتی ہے۔ محمودؔ کا یہ اجتہاد مستقبل میں غزل کے نئے امکانات کو روشن کرتا اور خود اپنے عہد میں صنف غزل کے مزاج، اس کے تیور اور لب و لہجے کی تشکیل

Marfat.com

یں اہم ردل ادا کرتا نظر آتا ہے اس نے غزل میں ہندوستانی طرزِ فکر اور ہندوی اثرات کو برقرار رکھتے ہوئے فارسی اثرات کی پذیرائی بھی کی ہے اور نئی راہیں بھی تراشی ہیں۔ اور یہی جدت و ندرت اور فارسی و ہندوی اسلوب کی دھوپ چھاؤں محمودؔ کے فن کی پہچان بن گئی ہے اور محمودؔ بعد کے دور سے تعلق رکھنے والے ان تمام متغزلین کا پیشرو بن گیا ہے جو غزل کی روایت کے علمبردار ہیں اور اس کی یہ شاعرانہ تعلّی خودستائی نہیں "گذارش احوال واقعی" معلوم ہوتی ہے ؎

محمودؔ کی صفت ستی محمود بے خبر　　اس جگ میں نئیں دسیا مجھے محمودؔ سار کا

محمودؔ کے چند شعر جو اس کے مخصوص رنگ سخن کی غمازی کرتے ہیں درج کئے جاتے ہیں ؎

دو جگ ستی فارغ ہوا چھے رند و نظر باز　　محمودؔ دیوانہ ہو پھرے تیرے درس کا

تیرے مست محمودؔ کوں لے منا　　تجھے نا ہوسی اس بیں تیری بڑائی

پرکھ محمودؔ دنیا میں توں رسم آمیز عالم کوں　　ایتا کھ موڑ کر بیٹھے جوتج جیو کا یاراں

سرد مہری بس کہ لوگاں کی دلاں میں جا کی
سکھ گرم کس کا دسا نئیں مجہ کوں نیر از آفتاب
دل تازگی اچھے گی فراح بخش روح کوں
محمودؔ کا جو شعر عزیزاں ادا کریں
میرا حال دیکھ یک دگر بولتے ہیں
عزیزاں انی سخت ہوتی جدائی

حسن شوقی کی غزل گوئی میں محمودؔ کے تغزل کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے اور مزاج کے اعتبار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسن شوقی کی غزلوں میں محمودؔ کا تغزل زیادہ نکھری ہوئی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ دراصل یہ قدیم اردو غزل کی روایت کا وہ چراغ ہے جس کو مشتاق، لطفی، محمودؔ، خیالی، فیروز، محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، شاہی، اور دوسرے شعرا نے روشن رکھا اور اس کو زمانے کی آندھیوں سے بچا کر ولی تک پہنچایا ہے۔

Marfat.com

قطب الدین قادری فیروز بیدری | گولکنڈے کے استاد الاساتذہ[1]

قطب الدین قادری فیروزؔ کا وطن بیدر تھا اور سلسلہ قادریہ سے ان کا تعلق تھا۔ فیروزؔ نے "پرت نامہ" میں اپنے نام اور وطن کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

مجے ناؤں ہے قطب دیں قادری　　تخلص سو فیروزؔ ہے بیدری

ڈاکٹر زورؔ "دکنی ادب کی تاریخ" میں لکھتے ہیں :۔

"فیروزؔ بھی مشتاقؔ اور لطفیؔ کی طرح بیدر کا شاعر تھا اور وہیں کے ایک مشہور صوفی اور صاحبِ تصانیف عالم مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم متوفی ۱۵۶۴ء کا معتقد اور مرید تھا۔"[2]

مخدوم جی اپنے عہد کے جید عالم اور برگزیدہ شخصیت تھے انھوں نے اپنے والد شیخ محمد ملتانی سے خلافت حاصل کی تھی اور ان کے جانشین مقرر ہوئے تھے "تذکرہ اولیائے دکن" کے مصنف نے ان کے علم و فضل اور ان کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے اُنہیں "جامع کمالات انسانی و فضائل روحانی" تحریر کیا ہے[3] مخدوم جی کے تقدّس و عظمت کا دور دور شہرہ تھا۔ جب ان کی شہرت گولکنڈہ پہنچی اور یہاں بھی انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تو ابراہیم قطب شاہ نے ان سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ کیا لیکن شیخ جی ایسے مستغنی اور اپنے حال میں مگن صوفی تھے کہ انھوں نے ملاقات سے انکار کر دیا جس پر ابراہیم نے درخواست کی کہ مخدوم جی بیدر سے تشریف نہ لانا چاہیں تو اپنے نعلین ہی بھیج دیں تاکہ میں نعلین بوسی سے مشرف ہوں" مخدوم جی نے کہلا بھیجا تھا "سلاطین درویشوں سے دعا چاہتے ہیں میں آپ کو تمام مسلمانوں کے ساتھ دعا میں شریک کرتا ہوں اور بس"[4] مختصر یہ کہ

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڑھ تاریخِ ادب اردو پانچواں ص ۳۵۶

[2] ۔ " " ۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۷

[3] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ تذکرۂ اولیائے دکن۔ جلد اول۔ ص ۴۱۸

[4] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو ص ۳۵۸۔

Marfat.com

مخدوم جی نے بیدر کی سکونت ترک نہیں کی اور وہیں قیام پذیر رہے لیکن اپنے چھوٹے بھائی شیخ بدرالدین اور مریدِ خاص قطب الدین فیروز کو گولکنڈہ روانہ کر دیا۔ "مشکوۃ النبوۃ" "تذکرہ اولیاء دکن" "اخبارالاخیار" اور "خزینۃ الاصفیاء" میں بیدر کے اس مغزز شیخ کے فضائل اور ان کی کرامات درج ہیں۔ نذیر احمد نے ان کا سنہ رحلت ۹۴۰ھ تحریر کیا ہے[1]

مسعود حسین خان فیروز کے وارد گولکنڈہ ہونے کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فیروز سلطنتِ بہمنیہ کا چراغ ٹمٹاتے دیکھ سولھویں صدی کے وسط میں بیدر کی سکونت ترک کر کے گولکنڈہ کے نئے علمی و ادبی مرکز میں آگیا ہوگا اور ابراہیم قطب شاہ کی سخن نوازی سے مستفید ہو کر بہت جلد دبستان گولکنڈہ کا استاد تسلیم کیا جانے لگا ہوگا۔"[2]

"علی گڑھ تاریخِ ادب اردو" میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ فیروز اپنے مرشد کے ایما پر گولکنڈہ چلے آئے تھے[3] اور بطور امتیاز خود کو فیروز بیدری لکھتے تھے جمیل جالبی نے فیروز کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد انھوں نے گولکنڈے کا رخ کیا تھا[4] بہر حال فیروز بیدر اور بیجاپور سے زیادہ گولکنڈے کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ وجہی اور ابنِ نشاطی کی شہادتیں اس کا ثبوت ہیں۔ مسعود حسین خان نے فیروز کے مرشد کا نام شیخ محمد ابراہیم بتایا ہے اور ان کے والد کا نام شیخ محمد ملتانی تحریر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سلاطین گولکنڈہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ ابراہیم قطب شاہ ان کا معتقد تھا۔ ان کا انتقال بیدر ہی میں ۹۷۳ھ مطابق ۱۵۶۴ء میں ہوا تھا[5] نصیرالدین ہاشمی رقمطراز ہیں کہ

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ مقدمہ پرت نامہ سہ ماہی اُردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۰ء ص ۹۶

[2] ۔ مسعود حسین خان مقدمہ پرت نامہ۔ قدیم اردو جلد اول۔ ص ۳۳۷

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص ۲۵۸۔ [4] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اُردو جلد اول۔ ص ۳۹۶

[5] ۔ مسعود حسین خان۔ مقدمہ پرت نامہ قدیم اردو۔ جلد اول۔ ص ۳۳۸

Marfat.com

شیخ ملتانی کا انتقال ۹۴۰ھ میں ہوا تھا[1] ڈاکٹر زور نے فیروز کے مرشد مخدوم جی کی تاریخ وفات ۲۲ شوال ۹۶۲ھ تحریر کی ہے[2]

نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ مخدوم جی نسلاً شیخ تھے اور فیروز نے انہیں "پرت نامہ" میں سادات کا دوست بتایا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا کہ غالباً فیروز سید تھے[3] "پرت نامہ" میں فیروز نے ایسے مشہور عالم کے مرید ہونے پر اظہار فخر و مسرت کیا ہے اور کہتے ہیں ؎

محی الدین تیرا تو میرا میاں　　تو میرے محی الدین کے درمیاں
کہیا توں کہ فیروز میرا مرید　　بڑے بخت میرے جو تیرا مرید

"پرت نامہ" میں فیروز نے اپنے روحانی رہبر سے اپنی والہانہ عقیدت اور جذباتی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک رات انھوں نے خواب میں شیخ عبدالقادر جیلانی کو دیکھا اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو مخدوم جی کا ہم شبیہہ پایا۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنی مثنوی میں اکثر جگہ اپنے مرشد کے لئے "محی الدین دوجے" (محی الدین ثانی) کا لقب استعمال کیا ہے اور ان کے علم باطن اور ولایت و عظمت کو سراہا ہے وہ کہتے ہیں ؎

بڑا میر مخدوم جی جگ سنے　　منگیں نعمتیں معتقد اُس کنے
پیا جیو نے تو ہمن باس ہے　　تو ہم جیو کے پھول کی باس ہے
کریماں کی مجلس کرامت تجے　　امیناں کی صف میں امامت تجے
تو سلطان جگ کا دو جگ میں فقیر　　کہ سب بادشاہاں کوں توں دستگیر

انصار اللہ لکھتے ہیں کہ مخدوم جی کو محی الدین ثانی فیروز نے اس لئے کہا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب شیعیت کا زور ہر طرف بڑھ رہا تھا ان کے مرشد نے سنی عقیدے کی عام اشاعت کر کے گویا اس دین کو زندہ کر دیا تھا[4]

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اُردو ۔ صـ ۶۸

[2] ۔ ڈاکٹر زور ۔ مجلہ عثمانیہ جلد ۱۶ ۔ شمارہ ۲ ۔ صـ ۱

[3] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اُردو ۔ صـ ۶۸

[4] ۔ ڈاکٹر انصار اللہ ۔ فیروز بیدری ۔ قادریہ سلسلہ کا ایک بزرگ شاعر ۔ سازِ ذوق نظر حیدرآباد ۔ جولائی ۱۹۸۵ء ۔ صـ ۶۴

Marfat.com

جمیل جالبی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "پرت نامہ" میں عبدالقادر جیلانی کی مدح نہیں اپنے پیر کی توصیف مقصود تھی [1]

سری رام شرما نے فیروز کی ایک نایاب شعری تخلیق "یوسف نامہ" کا ذکر کیا ہے جواب اتنی ناپید ہو چکی ہے کہ دکن کے محققین کے یہاں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا [2] سری رام شرما رقمطراز ہیں کہ "یوسف نامہ" یوسف عادل شاہ کی سیرت پر نظم کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے "تذکرہ اُردو مخطوطات" میں فیروز کی مثنوی "توصیف نامہ میراں محی الدین" کی نشان دہی کی تھی۔ ادارہ ادبیات اُردو میں اس مثنوی کا ایک نایاب نسخہ موجود ہے جو ناقص الآخر ہے اور جس میں صرف ایک سو دو (۱۰۲) شعر موجود ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد نے اس قدیم مثنوی کی طرف توجہ کی اور رسالہ "اردو ادب" میں اسے اردو دان طبقے سے روشناس کروایا [3] انہیں انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا لیکن یہ نسخہ بھی ناقص الآخر تھا اور اس کے اشعار کی تعداد ایک سو بتیس (۱۳۲) تھی جب کہ خود فیروز نے "پرت نامہ" کے آخر میں مثنوی کے اشعار کی تعداد ایک سو اکیس (۱۲۱) بتائی ہے اور کہتا ہے ؎

صد و بست و یک جب کیا بیت میں

۱۹۶۵ء میں مسعود حسین خان نے "قدیم اُردو" جلد اول میں اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے انجمن ترقی اُردو اور ادارۂ ادبیات اردو دونوں کے نسخوں کی مدد سے متن مرتب کیا ہے۔ انہیں بھی اس مثنوی کے صرف ایک سو بتیس (۱۳۲) شعر ہی دستیاب ہو سکے ہیں۔ "اردو شہ پارے" میں ڈاکٹر زور فیروز کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"فیروز کا رتبہ بڑا معلوم ہوتا ہے اس لیے نہیں کہ ابن نشاطی نے اس کو استاد کہا ہے بلکہ وجہی نے بھی "قطب مشتری" میں اس کو اُردو شاعری کا استاد بتایا ہے۔ ۔ ۔ وجہی جیسے مغرور شاعر کا جب یہ خیال ہو تو ظاہر ہے

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۳۹۷

[2] ۔ سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۰۳

[3] ۔ نذیر احمد۔ رسالہ اردو ادب۔ شمارہ جون ۱۹۵۰ء۔

Marfat.com

کہ فیروز بہت بڑا شاعر تھا۔[1]

وجہی نے "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) میں دو جگہ فیروز کا ذکر بڑے احترام و عقیدت سے کیا ہے ؎

کہ فیروز محمود اچتے جو آج — تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج
کرنا در تھے دونوں بی اس کام میں — رکھیا نیئں کتے بول اچھوں نام میں

آگے چل کر وجہی کہتا ہے کہ ؎

کہ فیروز آخواب میں رات کوں — دعا دے کے چومے میرے ہات کوں
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس — کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
توں ایسی طرز دل نے پنچانوی — کہ دُسرے کریں سب تیری پیروی

معلوم ہوتا ہے کہ فیروز کے شاعرانہ کمال اور استادی کا سکہ دکن میں ایک عرصے تک چلتا رہا۔ "قطب مشتری" کے تقریباً پینتالیس[45] چھیالیس[46] برس بعد جب ابن نشاطی نے "پھول بن" لکھی تو اپنی عظمتِ فن کی داد فیروز جیسے استاد سے طلب کی تھی اور کہا تھا ؎

نہیں وہ کیا کروں فیروز اُستاد — جو دیتے شاعری کا بیچ مری داد

فیروز کے ہم عصر شعراء میں شمس اللہ قادری نے مثنوی "یوسف زلیخا" اور لیلیٰ مجنوں کے شاعر احمد گجراتی اور محمود وجہی کا نام بتایا ہے[2] ملا خیالی بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔

"پرت نامہ" میں جیسے "توصیف نامہ" سے بھی موسوم کیا گیا ہے شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کی گئی ہے اور شاعر اپنے پیر و مرشد شیخ ابراہیم مخدوم جی کو بھی جن میں عبدالقادر جیلانی کا سا تقدس تھا، خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ مسعود حسین خان "پرت نامہ" کے مقدمے میں رقمطراز ہیں :-

"پرت نامہ کے بارے میں ہم ڈاکٹر نذیر احمد کے اس بیان سے

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۸۳

[2] ۔ شمس اللہ قادری۔ اردوے قدیم۔ ص ۶۲

Marfat.com

متفق ہیں کہ یہ کوئی ایسا بڑا ادبی نقش نہیں جو استاد فیروز کی شہرت کے شایانِ شان ہو۔ یہ دراصل ایک مرید کا نذرانہ عقیدت ہے۔ ۔ ۔ کہیں کہیں عقیدت مندانہ اشعار میں شاعرانہ لہک اور گداز آگیا ہے"[1]

"پرت نامہ" کے سنہ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے مثنوی کے بعض اشعار سے شاعر کے مرشد شیخ جی کا بقید حیات ہونا ظاہر ہوتا ہے مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ خدا مجھے ہمیشہ تیری "چھانو تل" رکھے اور تیری پشت پناہی اور تیرا سہارا ہمیشہ قائم رہے ؎

سو توں رکھ ہے دین کا باردار　　جو تج چھاوں تل جگ پکڑیا قرار
تو تج چھانو تل ہے سدا سکھ اسے　　نہ دنیا و دیں کا کدھی دکھ اسے
اچھو منج اُپر چھانو تیرا جرم　　کہ آدھا میرا سو تیرا کرم

اور چونکہ شیخ جی کا انتقال ۹۶۳ھ میں ہوا تھا اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "پرت نامہ" اس سے قبل لکھا گیا ہوگا لیکن نصیر الدین ہاشمی نے شیخ مخدوم جی کا سنہ وصال ۹۴۰ھ تحریر کیا ہے اور اس بناء پر وہ "پرت نامہ" کو ۹۴۰ھ سے پہلے کی مثنوی بتاتے ہیں[2] ڈاکٹر زور نے "پرت نامہ" کا سنہ تصنیف ۹۶۲ھ بتایا ہے[3]

فیروز کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود حسین خان لکھتے ہیں :-

"بنیادی طور پر وہ استاد تھا اور استاد کی حیثیت سے زبان دان تھا"[4]

فیروز کے "پرت نامہ" میں وہی لسانی خصوصیات نظر آتی ہیں جو اس دور کی زبان کا خاصہ ہے یعنی دبستان گولکنڈہ نے بیدری زبان کی پیروی میں پراکرتی الفاظ کے تناسب کو عربی اور فارسی لغات کے ساتھ برقرار رکھا تھا۔ قیاس کیا

---

[1] ۔ مسعود حسین خان۔ قدیم اُردو۔ جلد اول۔ ص ۳۳۸، ۳۳۹

[2] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اُردو۔ ص ۶۸۔

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ ص ۳۵۷

[4] ۔ مسعود حسین خان۔ مقدمہ پرت نامہ۔ قدیم اردو جلد اول۔ ص ۳۴۳

Marfat.com

جا سکتا ہے کہ اس لسانی رجحان کو بیدر سے گولکنڈہ منتقل کرنے اور اُسے یہاں طرز رائج الوقت بنانے میں فیروز نے بھی اہم رول ادا کیا ہوگا۔ فیروز کی زبان صاف ہے اور اس میں نامانوس الفاظ کی ایسی بہتات نہیں جیسی کہ اس سے قبل کے شعراء کے کلام میں دکھائی دیتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان کی روایات کی ابتدائی نشو ونما ہو چکی تھی اور فیروز کو اپنے دور ماقبل کے شاعروں سے ایسی لفظیات کا خزانہ ملا تھا جس میں جذبات وخیالات کے اظہار کی صلاحیت بتدریج پیدا ہو چکی تھی۔ فیروز کے اشعار میں روانی اور طرزِ ادا میں شگفتگی کا احساس ہوتا ہے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ "پرت نامہ" ادبی اعتبار سے فیروز کا کوئی غیر معمولی کارنامہ نظر نہیں آتا ممکن ہے اس کے علاوہ فیروز نے اپنے کلام کے ایسے یادگار اور بلند پایہ نمونے چھوڑے ہوں جنھوں نے نصف صدی کے بعد بھی ان کے نام کو شعراء کے ذہن سے محو نہ ہونے دیا۔ اگر "پرت نامہ" ہی فیروز کا واحد ادبی کارنامہ ہوتا تو وجہی اور ابنِ نشاطی جیسے نامور شاعر اس کی عظمت کے ایسے معترف نہ ہوتے۔ فیروز کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

بڑا عبدالقادر محی الدین ولی ۔ رہے۔ جملہ معشوق اس کی گلی
کہ عشقوں بسایا سو بازار راس سچا عبدالقادر خریدار خاص
جو اس کا سدا گرم بازار ہے کہ جس عبدالقادر خریدار ہے
سو سلطان معشوق سبحان کا کہ سبحان عاشق سو سلطان کا
خدایا جو معشوق تیرا ہے محی الدین سو پیر میرا ہے
تجے راونے جگ داتا جنم محی الدین سوں توں کہاتا جنم
محی الدین معشوق عاشق خدا نہیں عشق معشوق عاشق جدا
بندے عشق میراں سو دل میں دھرے سو بندا جو میراں کوں عاشق کرے
محی الدین میرا نگہدار سچ دنیا سوں نکو کر گرفتار منج
مجے دین بھاتا نہ بھاتی دنیا انگھے دین آتا و جاتی دنیا

بقول جمیل جالبی فیروز اور محمود نے ایک نیم پختہ آدھ کچری ادبی زبان میں فارسی کا رس گھول کر جس روایت کو جنم دیا اس نے گولکنڈہ میں اردو شاعری کے اسلوب

Marfat.com

کو متعین کرنے میں مدد دی۔[1]

فیروزؔ نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ غزل کے اشعار سے ان کی قدرتِ بیان اور ان کے شگفتہ و شاداب طرز ادا کا انداز ہ ہوتا ہے ان اشعار میں تشبیہات اور استعارات بھی ہیں اور خیال کی ندرت بھی ہے

یاقوت تے سُرنگی دو لعل ہے ادھرنج — کیونکہ عقیق ہونگے اس رنگ کے چمن میں
تیری کمر کے ہاوے سکھ سکھ ہوا جو بلا — جیوں تار پیرہن کا یہ تار پیرہن میں
سرو و قامت سُہاوے جو تو بہار بن میں — نازک نہال نیچیا اس جیو کے چمن میں
دونین ہر قدم تل میں فرش کے بچھاؤں — جوں ہنس چلے لٹکے سو دھن نہڈے نگن میں
جس بزم میں جھمکے میرا جو چاند سب نس — روتا جھوں و جلتا جیوں شمع انجمن میں
گوریاں سہیلیاں میں سب جگ کہاں بسیاریاں — جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں
فیروزؔ جسے صمد کا دیکھین جمال صوری — ہر حال اس صنم کا آ ٹھیں خیال من میں[2]

دوسری غزل درج ذیل ہے جو فیروزؔ کے کلام کی رنگینی و دلکشی اور میسا ختگی خوش گوئی کی مظہر ہے

سنگار بن کا سرو ہے سو قد تیرا اے شہ پری
لکھ پھول تے نازک دے تو حور ہے یا استری
خوبان منے ور سازتوں خوش شکل خوش آوازتوں
بھورنگ کرتی نازتوں چنچل سلکھن چھند بھری
یہ انگ باون باس کر ابھرن مکمل راس کر
راتا مرصع کاس کر سوہے تری جوبنی ہری
اے نار سب سنگار سوں پگ پائلاں جھنکار سوں
جب بیج آوے پیار سوں ہوسی بدھاوا ہر گھڑی[3]

---

[1] ۔ جمیل جالبی ۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ۔ ص ۲۹۶

[2] ۔ " " " ۔ ص ۲۹۹

[3] ۔ " " " ۔ صفحہ

Marfat.com

فیروز کی غزلوں میں ہندوی اور فارسی رجحانات کا ایک نیا امتزاج نظر آتا ہے جس میں گیتوں کا رس اور مٹھاس بھی ہے اور غزل کی روایات کی جھلک بھی۔ جمیل جالبی نے "پرت نامہ" میں فیروز کی زبان پر پنجابی لہجہ و الفاظ کی نشان دہی کی ہے [1]

ادبی نقطۂ نظر سے "پرت نامہ" اور اس قسم کی دوسری شعری کاوشوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں مگر اردو زبان کا لسانی مطالعہ کرتے ہوئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا زبان و ادب کے مختلف مدارج کا جائزہ لینے کے لئے ان ہی کڑیوں سے ہمیں مدد ملتی ہے لسانی اعتبار سے اس قدیم مثنوی کی اہمیت مسلمہ ہے چنانچہ دیوی سنگھ اپنے مضمون "پرت نامہ کا لسانی پہلو" میں لکھتے ہیں :-

"لسانی پہلو سے "پرت نامہ" کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی روشنی میں کئی پیچیدہ مسائل لسانیات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے" [2]

فیروز اور قریشی کی زبان میں جو حیرت انگیز مماثلت ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود حسین خاں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "دکنی اردو ارتقاء" کے تمام مدارج بیدر میں طے کر چکی تھی اور فیروز ایک پختہ زبان اور اسلوب کے ساتھ گولکنڈہ پہنچے تھے اس لئے دبستان گولکنڈہ میں فیروز کی وہی اہمیت ہے جو دبستانِ دہلی میں استاد ذوق یا ناسخ کی دبستان لکھنؤ میں ہے [3]

ملاخیالی

ملاخیالی، فیروز اور محمود کے ہم عصر تھے۔ وہ ایک مشہور اور خوش حال شاعر تھے۔ انھوں نے قلعہ گولکنڈہ کے باہر دو منزلہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد ملاخیالی کے خوبصورت اور کشادہ باغ میں بنائی گئی تھی۔ مسجد اب بھی موجود ہے لیکن اس کے دروازے پر وہ کتبہ باقی نہیں جس پر یہ اشعار کندہ کئے گئے تھے [4]

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۔

[2] ۔ دیوی سنگھ چوہان۔ پرت نامہ کا لسانی پہلو (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء۔ ص ۲۵۔

[3] ۔ مسعود حسین خان۔ مقدمہ پرت نامہ۔ قدیم اردو جلد اول۔ ص ۳۷۳۔

Marfat.com

منت یزداں کہ در دورانِ شاہ دیں پناہ
قطب عالم شاہ ابراہیم ان نیکو سرشت
کردہ ایں مسجد بنا ملاخیالی گز شرف
می سزد کارند حورانِ بہشتی سنگ وخشت
رکنے از جنت برائے بینش آمد باخدا
از برائے آں بود تاریخ او "رکنِ بہشت" [1]

یہ کتبہ جاذبِ نظر خط نسخ میں صاف اور شفاف سنگِ موسیٰ کی کمان پر کندہ کروایا گیا تھا۔ ملاخیالی کی یہ مسجد ایک ایسے عجوبۂ روزگار درخت کے رُو برو واقع ہے جو دنیا کے قدیم ترین درختوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور اسکا قطر ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرورِ ایام نے اس درخت کو نباتات کے زمرے سے نکال کر جمادات میں شامل کر دیا ہے اور اب دیکھنے پر یہ درخت کوئی پیڑ نہیں، بلکہ اپنی وضع، رنگ اور ظاہری شکل کے اعتبار سے ایک حجری پیکر دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ ملاخیالی نے یہ مسجد محض اس لئے بنائی تھی کہ جو لوگ اس عجوبۂ روزگار درخت کو دیکھنے آتے تھے وہ صانع حقیقی کے کمال کے اعتراف میں سجدۂ شکرانہ بجالائیں اور مسجد کے نیچے کے کمروں میں تھوڑی دیر دم لے کر اس درخت کا نظارہ کریں۔" [2] مسجد جس اہتمام اور نفاست کے ساتھ بنائی گئی ہے اور دیواروں اور محرابوں پر جو نازک اور رنگین نقش ونگار ہیں اُن سے ملاخیالی کی فن تعمیر سے دلچسپی اور اُن کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملاخیالی کے حالاتِ زندگی پر تاریکی کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ ابنِ نشاطی نے "پھول بن" میں ملاخیالی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں فن کا اچھا مبصر اور شعر وادب کا مستند نقاد قرار دیا ہے اور کہتے ہیں ؎

---

[1] ۔ ست گرو پرشاد۔ فرخندہ بنیاد حیدرآباد۔ ص ۶۲۔

[2] ۔ ڈاکٹر زور۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو۔ پانچواں باب۔ ص ۳۵۵۔

Marfat.com

اچھے تو دیکھنے ملا خیالی
یو میں برتیا ہوں سو صاحب کمالی

ملا خیالی کی تعمیر کردہ مسجد کے کتبے پر جو اشعار کندہ ہیں ان کے ایک مصرع ؎ از برائے آں بود تاریخ او رکنِ بہشت۔ کے الفاظ "رکن بہشت" سے ۹۷۷ اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ سنہ تعمیر ۹۷۷ھ (مطابق ۱۵۶۹ء) کندہ کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس سنہ میں ملا خیالی بقیدِ حیات تھے۔ وہ گولکنڈے کے چوتھے حکمراں ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہدِ حکومت کے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس دو منزلہ مسجد کا سنہ تعمیر ۱۶۶۵ء بتایا ہے[1] جو درست نہیں کیونکہ "رکنِ بہشت" سے ۹۷۷ اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

"داستانِ فتح جنگ" میں سید اعظم نے بھی ملا خیالی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے اور اُن سے اپنی خوشہ چینی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں ؎

خیالی کی خوباں غواصی کی بحر
ہلالی کے گوہر ہور بحری کی لہر[2]

جس پر خلوص انداز میں احترام کے ساتھ دور مابعد کے شاعروں نے فیروز، محمود اور ملا خیالی کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی شہرت و ناموری کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری اس عہد میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے بعد کی نسلیں بھی ان کی پیروی پر فخر کرتی ہیں اور انہیں قابلِ تقلید تصور کرتی ہیں۔ ان شعراء کا ایک ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسالیب، بحور، لب و لہجے، بندش و تراکیب اور ابلاغ کے وسیلوں کو عجمی سانچوں میں ڈھال کر نئی روایات کو پروان چڑھایا۔ ملا خیالی کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے۔ جس کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۵۸۔
[2] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۳۹۵۔

Marfat.com

بالی سروپ سو دھن جوں پوتلی نین میں
صاحب جمال ایسے سکھی نہ کوئی لنگھن میں
سنسار کے چتارے لکھنے منگے ہیں سارے
مکھ دیکھ سُد بسارے گم ہو رہے اپن میں
تجہ کیس گھنگرو والے بادل پیٹاں ہیں کالے
تس مانگ کے اُجالے بجلیاں اٹھیاں گگن میں
لھاریاں بہواں اٹل ہے کالا سمندر بجل ہے
جل میں نین کمل ہے پتلیاں بھنور نین میں
نارنج پھول جاتی تس پھول آسمانی
دو پھول زعفرانی اُپجے ہیں سیم تن میں
اُپجے اُتم رُچ سوں دھج لے کھڑے ہیں سج سوں
ٹلسے نہ مست گنج سوں ہوسی نا کس پٹن میں
مہکتے سو دوے گلالاں جھمکے سو جوت گلالاں
کس نور کیاں ہلالاں چند سور ہے بدن میں
یہ بول بولتا ہوں موتی سوں رولتا ہوں
امریت گھولتا ہوں گھٹ دودھ کے رجن میں
فارسی میں ہے ہلالی ترکی میں ہے جمالی
دکھن میں ہے خیالی ہے شاعری کے فن میں[1]

اس غزل کے مقطع میں ملا خیالی نے خود کو ترکی اور فارسی شاعروں کا ہم مرتبہ بتایا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی ادبی عظمت کا پورا پورا احساس تھا وہ اپنی شعر گوئی کو امرت گھولنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملا خیالی کا سرمایۂ کلام مختصر ہے اس لیے ان کی شاعری میں طرز ادا اور تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں اظہار خیال کی زیادہ گنجائش نہیں لیکن مندرجہ بالا غزل سے شاعر کی سراپا نگاری، ان کی خوبصورت

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۰۵۔

Marfat.com

تشبیہات اور اچھوتے استعاروں اور رنگین بیانی کا اندازہ ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ فیروز، محمود اور ملا خیالی کی فنی صلاحیت اور تخلیقی کاوشوں نے دکن میں غزل کو ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے فروغ پانے کے قابل بنا دیا تھا۔ انہیں شعراء کی بدولت غزل ایک مقبول اور آزمودہ ادبی سانچہ بن سکی۔

ابنِ نشاطی کے علاوہ سید اعظم نے بھی ملا خیالی کا ذکر بڑی عقیدت اور بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملا خیالی اپنے عہد کے مسلّم الثبوت شاعر تھے۔

مشتاق

مشتاق، فیروز اور محمود کی طرح اپنے عہد کا ایک نامور شاعر تھا۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ وہ سلطان محمد شاہ بہمنی (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء) کے دور میں موجود تھا اور اس نے بہمنی سلطنت کے ایک اور بادشاہ سلطان محمد شاہ بہمنی متوفی (۱۵۱۶ء) کے دور میں شہرت حاصل کی تھی[1] ڈاکٹر راجا ریڈی اور پی سوریا نارائن ریڈی نے اپنی کتاب میں ۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء حکومت کرنے والے بہمنی تاجدار کا نام شہاب الدین محمود شاہ ابن محمد شاہ تحریر کیا ہے۔[2]

"تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" میں مشتاق کو بہمنی دور کا شاعر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے عہد سلطان محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ/۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء) اور سلطان کلیم اللہ (۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء تا ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء) کا زمانہ دیکھا تھا[3] ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق قطب شاہی یا عادل شاہی عہد سے تھا[4] سخاوت مرزا، مشتاق کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتے

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۴۴

[2] ۔ راجا ریڈی، پی سوریا نارائن ریڈی۔ کاپر کائز آف دی بہمنیز۔ ص ۱۔

[3] ۔ اردو نسیم۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد۔ پانچواں باب ص ۲۷۵۔

[4] ۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ قدیم دکنی شاعر مشتاق کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں (مضمون) مشمولہ اردو ادب علی گڈھ۔ سہ ماہی۔ جون ۱۹۵۸ء ص ۱۔

Marfat.com

ہیں کہ وہ دورِ بہمنی ہی کا سخن ور تھا۔[1] سخاوت مرزا لکھتے ہیں کہ مشتاق نے اپنے قصیدے میں خلیل اللہ کی مدح کی ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شائد اس کا ممدوح شاہ خلیل اللہ بادشاہ قلم ہیں جو عادل شاہی دور کی مشہور شخصیت تھے۔ نذیر احمد کا استدلال یہ ہے کہ یہ خلیل اللہ بت شکن معاصر سلطان محمود شاہ بہمنی (متوفی ۹۲۴ھ) و کلیم اللہ بہمنی (متوفی ۹۳۴ھ) نہیں ہیں بلکہ شاہ خلیل اللہ خطاط الملقب بہ "بادشاہ قلم" معاصر سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو میر خلیل اللہ ابن نعمت اللہ گولکنڈوی (۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء) ہیں۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ مشتاق کے ممدوح سید شاہ برہان الدین خلیل اللہ ثانی بت شکن ہیں جن کے صاحبزادے سید شمس الدین محمد اور شاہ کاظم تھے ان کے حالاتِ زندگی پر "تبصرۃ النوارقات" مؤلفہ ابوالحسن سید من اللہ حسینی میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔[3] مشتاق کے حسبِ ذیل شعر سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے وہ کہتا ہے ؎

سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ ہے
بت شکن و دین کرم

"بھوگ بل" میں قریشی نے اپنے عہد کے شہرت یافتہ فنکاروں کا ذکر کیا ہے سخاوت مرزا نے مشتاق کو قریشی کا ہم عصر بتایا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ محمود شاہ بہمنی (۸۸۲ھ تا ۹۲۴ھ) اور امیر برید (۹۲۷ھ تا ۹۴۲ھ) کے زمانے میں موجود تھا نصیر الدین ہاشمی نے بھی مشتاق کا نام بہمنی دور کے شعراء کی فہرست میں

---

[1] ۔ سخاوت مرزا۔ کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا۔ رسالہ اردو کراچی جنوری و اپریل ۱۹۵۹ء۔ ص ۱۷۳۔

[2] ۔ نذیر احمد۔ قدیم دکنی شاعر مشتاق کے زمانے کے تعین کے سلسلے میں (مضمون) مشمولہ اردو ادب علی گڈھ سہ ماہی۔ جون ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۷۔

[3] ۔ سید من اللہ حسینی۔ مسودہ تبصرۃ النوارقات۔ بہ تصحیح و ترجمہ و مقدمہ سید ہاشم علی رفعت۔ مخطوطہ نمبر ۲۹۸۸۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ص ۳۳۔

Marfat.com

شامل رکھا ہے۔ ڈاکٹر زور "دکنی ادب کی تاریخ" میں مشتاق کو "سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانے کا ایک شاعر تحریر کرتے ہیں[1] جن شاہ خلیل اللہ کی مشتاق نے منقبت کہی ہے ان کے بارے میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ وہ شاہ حبیب اللہ کے خلیفہ اور بیدر کے مشہور بزرگ خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں سے تھے[2] مشتاق نے بہمنی بادشاہوں کے تزک و احتشام اور ان کے دربار کی عظمت کو سراہا ہے[3]

مشتاق ایک غزل گو اور قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ممکن ہے اس نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہو لیکن ان کے نمونے ہمیں کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ مشتاق کی قصیدہ گوئی کے بارے میں ڈاکٹر ایف۔ دِ۔ نسیم لکھتے ہیں کہ ان میں شاعرانہ نازک خیالیوں اور لطافتوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ بہمنی دور ہی میں اردو کس حد تک صاف اور مفاہیم واسالیب سے پُر ہو چکی تھی[4]

مشتاق نے تشبیہات و استعارات سلیقے اور خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ اس کی غزل گوئی کا مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہو رجیو اُپر بے کل کھڑی
دیکھے تو ہے جیو کے اوپر نیں دیکھے تو نئیں کل کھڑی
سورج کے گل میں چاند جیوں یوں تجھ گلے ہیکل دسے
قربان اس کے ہات پر جن پہ تیری ہیکل گھڑی

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۴۔

[2] ۔ " " " " " ۔ ص ۱۵۔

[3] ۔ سخاوت مرزا۔ کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو کراچی سہ ماہی جنوری / اپریل ۱۹۵۹ء۔ ص ۱۷۹۔

[4] ۔ ۱، د نسیم۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند چھٹی جلد۔ پانچواں باب ص ۲۵۶۔

Marfat.com

آبِ حیات اولب تیرے جان بخش وجاں پرور اہے
مشتاق بوسے سوں پیا امرت بھری اوکل گھڑی ہے[1]
اوکسوت کیسری کر تن چمن میانے چلی ہے آ
رہے کھلنے کوں تیوں دستی اوچینے کی کلی ہے آ
سورج مرجاں میں جیوں دستا نظر دوں کا پنتی تھر تھر
جو لڑے پچاں بھری سر تھے اور رخ اوپر ڈھلی ہے آ
سورج کی تاب سینے جوں پگھلتا برف آپس میں
اورخ دیکھت نظر آنکھیاں کے انکھیاں میں گلی ہے آ
کھیا مشتاق فارسی سوں رہتے تم کاں جو میں آؤں
کہی واں گھرا ہے میرا اکن کی جاں گلی ہے آ[2]

نصیرالدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" میں مشتاق کی غزلیہ شاعری کے بعض نمونے پیش کئے ہیں۔ مشتاق کی دو غزلوں کے چند شعر درجِ ذیل ہیں جن سے شاعر کی قادرالکلامی نازک خیالی اور صنفِ غزل پر شاعر کی مضبوط گرفت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

تجھ نرگسیں اس باغ میں جیوں کلی سوزخسارہ دسے
اولب سوردپشکریاں چھریاں اس گل تھے یکبارہ دسے
انکھیاں اُپر ہے بال یا پنجرے منے کھنجی رہیا
یا جال میں مچھلی ہے یا بادل میں سیارہ دسے
آوے نظر کے حبیب پر شیریں منھا جیوں جیو اہے
جیو کے شکر سیتی بنیا سولب شکر پارہ دسے
نا رسلے دیکھن رخ کون تجھ اوزلف موئے جیوں رقیب
رخ روح ہے ہور زلف سو جیوں نفس امارہ دسے

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور ۔ دکنی ادب کی تاریخ ۔ ص ۱۵۔
[2] نصیرالدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ ص ۴۵۔

Marfat.com

لب کے بساط اوپر رکھیا چوپر نظر کا کھیلنے
ہنس کر کہے مشتاق تجھ پھانسہ سو پو بارہ دسے

— o — o —

نیں تجھ مدبھرے دیکھت نظر میانے اثر آوے
اَدھر کے یاد کرنے میں زباں اوپر شکر آوے
صفا اس گال کوں دیکھت نظر سو جا گا گر پڑتی
مکھی کے پر میں کان طاقت سورج لک جا گذر آوے
رقیب او دیو جیون جب تب پری کے سات یوں آتا
کہ پھولاں سات کانٹا ہور شکر میانے کنکر آوے
نظر تیں عشق کے مشتاق تجھ کو تو عیب رک دیکھے
کہتا ٹیڑا انگن کوں ناچنے کا ناہنر آوے [1]

مشتاق نے شاہ خلیل اللہ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشتاق ایک مشاق قصیدہ نگار تھا۔ اشعار سے شاعر کے زورِ بیان اور پختہ مشقی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ بہمنی دور میں صنف قصیدے نے بھی خاصی ترقی کر لی تھی۔ مشتاق ایک اچھا قصیدہ نگار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا بہت کم کلام دستبرد زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچ سکا ہے۔ قصیدہ نگاری میں مشتاق کو اتنا عبور حاصل ہے کہ وہ ایک مطلع پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مطلع ثانی کہہ کر اپنے اشہبِ فکر کو ایڑ لگاتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مشتاق، شاہ خلیل اللہ خطاط بادشاہ قلم کی مدح میں رطب اللسان نہیں بلکہ شاہ خلیل اللہ ثانی کی تعریف کر رہا ہے ؎

مطلع ثانی کہوں شاہ جو ہے محترم
تخت ولایت اُپر شاہ سلیماں حشم

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو ۔ صفحہ ۴۶ ۔

Marfat.com

سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ ہے
- - - - بت شکن و دیں کرم

اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں ؎

ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم — غمزے کا اے طور ہے گود میں پالے ستم
صاف صفا صفحہ پر جدول مشکیں ہے خط — موں پو وفا کے رہیا بُرقع بسرے کا جم
لطف سخن یوں اہے شہد ہے جیوں نیش میں — راکھے قہر مہر میں شیریں میں راکھے اوسم

لب منے اے نقش و رنگ مے منے جیوں عیش ہے
کر کہ بچن تھے دکھاتے آگ کا باغ ارم
گرمی ملا ہم ستی آب میں آتش رکھے
بات میں سب گھات ہے مدح میں ہے جیوں کہ ذم
قصد اہے کعبہ کا کرنے طواف آستاں
جیوں کہ مسلمان کون فرض ہے طوف حرم
فتنہ شجاعت کا دیکھ رستم و ستا چھپا
شور سخاوت کا سن ہو گیا حاتم اصم
ہاک غضب کی اگر جاوے فلک کے اُپر
سیر ستاریاں کا سب بند ہوئے نا ہلکہ کھم
نور بصر شمس الدین شاہ محمد رہے
ہور شہ کاظم اہے شاہ کے دل کے صنم
فہم سوں مشتاقیا نقش یو اخلاص کا
ضرب ارادت ستی دل پو اُچا جیوں ورم [1]

مشتاق سلطان محمود بہمنی (۸۸۷ھ تا ۹۲۴ھ) اور کلیم اللہ بہمنی (۹۳۳ھ تا ۹۳۴ھ) بلکہ علی برید اول (۹۴۹ھ تا ۹۸۷ھ) تک بقید حیات تھا [2]

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اُردو ۔ ص ۴۶ ۔

[2] ۔ سخاوت مرزا ۔ کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا (مضمون) مشمولہ رسالہ اُردو کراچی ۔ سہ ماہی ۔ جنوری و اپریل ۱۹۵۹ء ۔ ص ۱۸۱ ۔

Marfat.com

لطفی

لطفی مشتاق کا ہم عصر تھا۔ لطفی نے اپنے قصیدے میں بقول نصیر الدین ہاشمی شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے[1] ممکن ہے مشتاق اور لطفی ایک ہی مرشد کے مرید ہوں۔ بہمنی دور میں شیخ نور سمنانی دکن میں موجود تھے اور سلاطین بہمنیہ کے دربار میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔[2] ان کے ایک مرید ابو العطا محمود بن علی خواجہ کرمانی تھے جو قصیدہ گوئی میں شہرت رکھتے تھے۔ لطفی ان کی قصیدہ گوئی سے متاثر تھا[3] خواجہ کرمانی کے ایک مشہور فارسی قصیدے کا مطلع ہے ؎

قرطہ زر چاک زد لعبت سیمیں بدن

ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مضمون "قدیم اردو شاعر لطفی کے زمانے کا تعین" میں لطفی کو گیارھویں صدی ہجری یعنی سترہویں صدی کا شاعر بتایا ہے۔ لطفی کی ریختی اور قصائد کے چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ریختی میں لطفی کا اسلوب صاف سلیس اور رواں ہے اور اس پر قدامت کی چھاپ زیادہ گہری نہیں معلوم ہوتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں — یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں
سب نس کھڑی جلوں گی جاگا سوں نا ہوں گی — ناجل کو کیا کروں گی اول سوں مدمتی ہوں
جلتے کون نا جلاؤ تجنے کون آگ لاؤ — بوجوں تو پھر جلاؤ نا یک رتی رتی ہوں
شہہ کے ملن کے ماتی ہر نس جلن کوں آتی — سب قد کھڑا جلاتی پن آہ نئیں کتی ہوں
میں مست ہوں سجن کی سُد بُد سٹی ہوں تنکی — آپ عشق کی مدن کی مغرور مدمتی ہوں
رسیا رسیلے بھوگی سو شہہ محمد — مندر منے سجن کی نس جاگتی رہتی ہوں

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۴۷۔

[2] ۔ " " " " " ۔

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۱۶۔

[4] ۔ نذیر احمد۔ قدیم اردو شاعر لطفی کے زمانے کا تعین۔ (مضمون) مشمولہ رسالہ معاصر۔ پٹنہ۔ جولائی ۱۹۵۹ء۔ ص ۲۳۔

Marfat.com

لطفی تیرے چلن کی پاکی کہاں ہے اس میں　　جیوں پانچ پانڈؤں کی کہتے سو دھرپتی ہوں

لطفی کو صنفِ قصیدہ سے بھی دلچسپی تھی۔ لطفی کے اشعار میں شوکت الفاظ ہے اور اس کا لب و لہجہ پُر اثر اور مرعوب کن ہونے کی وجہ سے قصیدہ کے لئے موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے مثلاً لطفی کے ایک قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو اس نے "شہہ دُلدل سوار" حضرت علی کی مدح میں کہے ہیں ؎

مملکت دارا لیا بہمنِ اسفند یار
تخت فریدوں دیا جربت سیمیں رتن
اے شہہ دُلدل سوار فارس خنجر گداز
صفدر شرزہ شکار شرزۂ لشکر شکن [1]

لطفی کا قصیدہ درج ذیل ہے ؎

صبح ہوا یا صفارین کا کجلا کوا　　چھوڑ چمن کی ہوا غیب ہوا بازغن
سور سحر سُرگ کے گود تھے ظاہر ہوا　　کیس لگا رین کے سیس جلایا اگن
کرن کی جھاڑو بندا رین کی کالک چرا　　فرش ملمع بچھا خسرو رومی بہ فن
چار پہر برقرار یونچ زہیا تھا منجار　　غرب کے کوئے منے ڈول ڈبایا رسن
نین سورج جہان تھے لعل ہوئے سُرک کے　　رین کا کاجل منگا نین میں کھینچا انجن
سرک تھے نکیل چندر لعل لہو کے بھتر　　سور چھپایا خنجر چندر دکھایا مکھن
چندر کا بالا بچا رین کی دائی اُچا　　مشک و عنبر میں چھپا جھانک کے راکھے چتن
ماہ ننہا تھا ننہا شاہ کے پھیری بدل　　جمع ہوا تھا بہم شاہ کا پھیرا بہرن
سرگ کا طوطی ہریا مشک خطائی چڑیا　　رات کا عنبر سُریا صبح کے پھوٹے کرن
سُرک کا بالا کنور بیٹھا تخت کے اوپر　　نام دھرایا چندر مور کا بیضہ کرن
رین کے پسیار تھے سرک ہوا نو عروس　　جیوں لٹ افشاں درست سُرک کے مکھ پیرہن
مشک کا کالک بھکیا تھال میں کیسر رکھیا　　رات کا ہندو شکیا سرک تھے لاگیا ڈرن

---

[1] تاریخ ادبیات اردو۔ باب ۲۷۸

Marfat.com

اوشہ شہہ دلدل سوار فارس خنجر گذار
صفدر۔ شبرزہ شکار شرزۂ لشکر شکن
لطفی بے عین پر عین عنایت دھرد
اے شہہ خوبان من اے مہ تابان من[1]

مشتاق کی طرح لطفی نے بھی اپنی شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب سے کام لیا ہے۔ ممکن ہے صنفِ قصیدہ کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے طرزِ ادا کو پرشکوہ اور باوقار بنانے کے لئے ان شاعروں نے یہ انداز ترسیل اختیار کیا ہو۔ مشتاق اور لطفی کے کلام کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہمنی دور میں زبان میں ایسا کس بل اور ایسی قوتِ اظہار پیدا ہو گئی تھی کہ قصیدہ جیسی صنف میں طبع آزمائی کی کامیاب کوششیں کی گئی تھیں۔

خواجہ محمد دہدار فانی

خواجہ محمد دہدار فانی شیراز کا باشندہ تھا اور اس کا نام محمد تھا اس کو عربی النسل بتایا گیا ہے[2] اس کے اجداد خوزستان کے شہر حویزہ میں رہا کرتے تھے اور پھر شیراز میں سکونت اختیار کی تھی۔ والد کا نام محمد دہدار عیانی تھا[3] نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں ان کا نام محمد دہدار عیانی اور اپنے ایک مضمون میں خواجہ محمد دہدار بتایا ہے[4] فانی کے والد کا اپنے وقت کے مشہور عالموں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی تصانیف "زبدۃ الافکار" "خلاصۃ الاذکار" "کنز الرموز" اور "اسرار دل وجان" دستیاب ہو گئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم جفر اور تفسیر میں انہیں دستگاہ حاصل تھی۔ وہ "نقطویوں" کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ اس جماعت کے ایک فرد خواجہ امری (مقتول ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء) سے ان کے بڑے معرکے رہے۔ خواجہ امری نے قتل سے پہلے محمود دہدار کی ہجو میں اشعار کہے تھے جو "ریاض الشعراء" میں نقل کئے گئے ہیں[5] محمد دہدار بھی نقطویوں کا سخت مخالف تھا چنانچہ اس نے اس

---

[1] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۴۸، ۴۹۔ [2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ الف۔ ص ۲۴۶۔ [3] ۔ نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں علماء و فضلاء کی خدمات (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۵۔ [4] ۔ نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں علماء و فضلاء کی خدمات۔ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۶۔

Marfat.com

جماعت پر لعن طعن کی ہے۔ محمد دہدار جفر، تصوّف اور دوسرے علوم پر دسترس رکھتا تھا اسے مجذوب بابا رجب خصلہ پوش سے بڑی عقیدت تھی اور ان کی صحبت میں دنیوی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ فانی کا سنہ ولادت ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء تحریر کیا گیا ہے[1] اس کی ابتدائی تعلیم شیراز میں ہوئی تھی اور ممتاز عالم شاہ فتح اللہ شیرازی سے شرف تلمذ حاصل تھا ابھی حصولِ علم کے تمام مراحل طے نہیں ہوئے تھے کہ بیس[۲۰] اکیس[۲۱] سال کی عمر میں وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کا سفر اختیار کیا[2] اُس وقت بیجاپور میں علی عادل شاہ اوّل (۹۶۵ھ ۔ ۹۸۸ھ) سریر آرائے سلطنت تھا۔ فانی نے رفتہ رفتہ دربار میں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور ایک قلیل عرصے میں علی عادل شاہ کا مقرب بن گیا۔ ہندوستان آکر دہدار اپنے استاد شاہ فتح اللہ شیرازی کو بھولا نہیں تھا۔ بادشاہ سے ان کی سفارش کر کے انہیں ہندوستان بلوایا اور زادِ راہ کے لئے کثیر رقم بھجوائی۔ جب شاہ فتح اللہ بیجاپور پہنچے تو دہدار نے تحصیل علم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد ۲۷ ربیع الثانی ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء کو جب فتح اللہ نے بیجاپور کی سکونت ترک کر دی اور دربارِ اکبری کا رخ کیا تو درس و تدریس کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شاید اب فانی کے لئے بیجاپور میں دلبستگی کا کوئی سامان نہیں رہا تھا اس لئے وہ احمد نگر کی طرف متوجہ ہوا جہاں برہان نظام شاہ کی حکومت تھی[3] لیکن نذیر احمد لکھتے ہیں:۔

"خواہ اس کا احمد نگر آنا شاہ فتح اللہ کے آنے جانے سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو یا اس کا اٹھارہ سالہ قیام احمد نگر غلط ہو بہرحال امکان اس کا ہے کہ وہ مرتضیٰ نظام شاہ کے دورِ حکومت ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء تا ۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء میں احمد نگر پہنچا ہو یہاں ناظرِ مملکت کے ذمہ دار عہدے پر فائز ہوا"[4]

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ الف۔ صفحہ ۲۴۶۔

[2] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۲۹۔

[3] ۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن جلد دوم۔ صفحہ ۸۸۷۔

[4] ۔ نذیر احمد۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں علماء و فضلاء کا حصہ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶۔

Marfat.com

آزاد بلگرامی نے "یدِ بیضا" اور محمد قاسم نے "تاریخ فرشتہ" میں یہ بتایا گیا ہے کہ دہدار فانی اٹھارہ سال تک یہاں رہا اور شاہ حسین نجفی کے آگے زانوے ادب تہہ کیا اور برہان شاہ کے پوتے کے تخت نشین ہونے کے بعد برار کا انتظام اس کے سپرد کیا تھا لیکن اس قدر شناس بادشاہ کی وفات کے بعد وہ سورت چلا آیا اور یہیں قیام پذیر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ برار کا علاقہ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں مغلوں کی وسیع سلطنت کا جزو بن چکا تھا اس لئے دہدار فانی کو برار کی حکومت عطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دہدار فانی کا سنہ وفات ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء بتایا گیا ہے[۲] "یدِ بیضا" کے حوالے سے نذیر احمد نے لکھا ہے کہ انتقال کے وقت اس کی عمر ۹۶ سال تھی[۳]

تذکرہ "محبوب الزمن" سے پتہ چلتا ہے کہ خان خاناں سے دہدار فانی کے اچھے مراسم تھے "عرفات عاشقین" کے مصنف نے ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۱ء میں بمقام گجرات دہدار فانی کے فرزندوں سے ملاقات کی تھی[۴]

تاحال دہدار فانی کے چھوٹے بڑے سینتیس (۳۷) رسالوں کا پتہ چلا ہے۔ وہ ایک صاحبِ دیوان شاعر تھا[۵] لیکن اس کا دیوان ہم تک نہیں پہنچ سکا ہے صرف چند اشعار اور رباعیاں دستیاب ہو سکی ہیں دیوانِ فارسی شرح گلشنِ زار، حاشیہ فصل الخطاب، شرح البیان اور شرح نفحات الانس جامی اس کی یادگاریں ہیں۔ فانی کا تعلق خطہ شیراز سے تھا اس لئے وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے لیکن ماحول کے تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے دکنی میں بھی شعر موزوں کئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فارسی اسلوب اور لفظیات کا اثر زیادہ ہے اور ان کی زبان ان کے ہم عصر شعراء کے

۱۔ محمد قاسم فرشتہ۔ تاریخِ فرشتہ۔ جلد دوم۔ صہ ۱۵۶، ۱۵۷۔

۲۔ (ا) سخاوت مرزا۔ "شاہ دولت" (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۴ء۔ صہ ۹۔

(ب) نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ صہ ۲۴۷۔

۳۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صہ ۲۲۹۔

۴۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ صہ ۲۴۸۔

۵۔ ایضاً۔ ایضاً۔ ایضاً۔

Marfat.com

مقابلے میں اس حیثیت سے منفرد ہے کہ اس میں فارسی الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ ان کے پیشِ نظر چونکہ فارسی غزل کے نمونے تھے اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی مانوس آہنگ اور طرزِ ادا، اشارات و علائم اور ان ہی روایات سے ان کا شعری مزاج اثر پذیر ہوا ہے مندرجہ ذیل اشعار مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

جے مست ہے درس کے اُس کوں شراب کیا ہے
جس کا گزک جگر ہے تس کوں کباب کیا ہے
زاہد ز بیم دوزخ چنداں مرا ترساں
برہا کے دوکھ کے انگے دوزخ عذاب کیا ہے
از غمزہ ہائے خوبی خون کرد جانِ من را
مجہ سے اتیت اوپر اتنا عتاب کیا ہے
از راہ وصل جانی جاں دہ اگر توانی
جن آپ کوں لوٹایا تسکوں خراب کیا ہے

جمیل جالبی فانی کی غزلوں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :۔
نو غزلوں میں سے جو ہمیں ملی ہیں آٹھ میں ردیف اور قافیہ ہیں۔ غزل کی زمین بھی مشکل ہے۔ ۔ ۔ بحریں فارسی اور رواں ہیں تراکیب و بندش میں بھی فارسی اثرات نمایاں ہیں [1]

دہار فانی غزل کی ہیئت سے واقف اور اس صنف کا مزاج شناس معلوم ہوتا ہے۔ اس نے موضوعات بھی وہی اپنائے ہیں جو فارسی غزل میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ اس کے اشعار میں پند و موعظت اور اخلاق آموزی کا عنصر موجود ہے۔ شاعر نے متصوفانہ مضامین سے بھی سروکار رکھا ہے ؎

احدیت زمین وحدت بیج — و حدیت تمام مجھ گلزار
گر کہے کوئی جو کیا لوے پن ہے — ہے لوے پن انیت غفار
میں پنا نئیں ہے پنی ایسا — تو پنا ہوئے جس سبب اظہار

---

[1] ۔ جمیل جالبی ۔ تاریخ ادب اردو ۔ جلد اول ۔ ص ۲۳۰ ۔

Marfat.com

مے پینے سوں ہے لاک منجہ توبہ　　توں پینے سوں لاک استغفار
ہیں پینا ہور توں پینا فانی　　ہے۔ یو دونوں توں جان بے اعتبار

کیوں مرغِ دل ہوائے حقیقت میں اڑ سکے
جب حرص کا بندیا اچھے دھاگا جو پر منے
شریعت بسنتی کرتن اوپر توں
حقیقت تھان پر ڈلتا رہتا اچھ
چلیا ہے سب وقت مے پینے کا ہنوز غافل ہوا ہے فانی
عبث کی کرتا ہے مغز خالی اسی سوں باتاں لڑا لڑاتوں
ارے اس یک پینے کے باغ میں آ
دوئی کا تخم ہرگز بونکو توں
سدا یو فرض فانی تجھ اُپر ہے
خدا یک جان دیکھوں دونکوتوں

مختصر یہ کہ غزل کی روایات کو متعین کرنے میں ہمارے جن اوّلین شعراء نے حصہ لیا ہے ان میں دبدار فانی کا نام بھی شامل ہے۔ سخاوت مرزا کو ایک قدیم بیاض میں فانی کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے [1]

سداتوں عشق میں پاتی متا اچھ　　کوندی لے ذکر کی دم سوں تھبا اچھ
نکو کر کھور چھاروں مہات اپنا　　رضا کے سر نکوساں چب ستھا اچھ
اگر پیری کوں نیکیاں ہے تو دل میں　　سلامت تھان کوں جانا کتھا اچھ
کہاں لگ یو نچہ ہیرا پھر سکے گا　　لگے گا تھان کوں آخر جتا اچھ
بندیا کیا خوب فانی لیاھتی کوں　　نہ باندیا کوئی یاں عالم یتا اچھ [2]

برہان: ربن جانم کے معاصرین میں محمد امین آتشی، سید محمد رضا مشہدی

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخِ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۴۸۔
[2] ۔ " " " " " " " " " "

Marfat.com

مرزا مقیم، مقیمی، ملک قمی اور ظہوری کے علاوہ دہدار فانی بھی تھے۔

عاشق دکنی

عاشق دکنی دورِ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا شاعر ہے۔ اس کے حالات زندگی سے ہم واقف نہیں ہیں۔ لیکن اپنے اشعار میں بار بار شاہ صبغۃ اللہ حسینی کا ذکر کر کے شاعر نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ وہ انہیں کا معتقد اور ارادت مند تھا۔ "چار پیر و چہارہ خانوادہ" میں عاشق دکنی اپنے پیر و مرشد کے بارے میں کہتا ہے

کتا منقبت پیر کا با ضرور — محمد کا دستا ہے او عین نور
جسے ناوں ہے صبغۃ اللہ کر — مریداں سمجھتے ہیں اللہ کر
محمد کوں ہم پیر سوں پائے ہیں — کدھیں حق ہو ہمنا کو دکھلائے ہیں
خلیفے محمد کے روشن ضمیر — دو بیشک دسے صبغۃ اللہ پیر
او سایا مریداں پو قائم اچھو — خصوصاً مرے پر تو دائم اچھو

"چار پیر و چہار دہ خانوادہ" نام کی ایک اور مثنوی حسن نے تقریباً ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ لکھی تھی۔ یہ مثنوی کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے[1]

نذیر احمد لکھتے ہیں کہ عاشق کے پیر شاہ صبغۃ اللہ نائب رسول (۹۵۲ھ تا ۱۰۱۵ھ) شاہ روح اللہ حسینی کے صاحبزادے اور یہ کہ ان کی والدہ خواجہ بندہ نواز کی نواسی تھیں۔ نذیر احمد کے اس خیال کی خواجہ بندہ نواز کے مرید خاص محمد علی ساماني کے بیان سے تردید ہوتی ہے۔ "سیر محمدی" میں محمد علی ساماني رقمطراز ہیں کہ خواجہ بندہ نواز کی منجھلی صاحبزادی بی بی بتول سید سالار کی رفیقۂ حیات تھیں اور ان کے دو لڑکے تھے ایک میاں کلمۃ اللہ اور دوسرے میاں روح اللہ اور دونوں لاولد تھے[2] صبغۃ اللہ بھروچ میں پیدا ہوئے تھے[3] انھوں نے ابتدائی تعلیم احمد آباد میں مشہور عالم شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے حاصل کی۔ ان کی رفیقۂ حیات گجرات کے وزیر چنگیز خان کی بیٹی تھیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں انھوں

۱۔ مخطوطہ نمبر ۳۴۰۳۔ کتب خانہ سالار جنگ۔

۲۔ محمد علی ساماني۔ سیر محمدی۔ ص ۱۳۱۔

۳۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ الف۔ ص ۲۔

Marfat.com

سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور پھر کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۵۹۱ھ میں وارد بیجاپور ہوئے۔ بیجاپور میں ان دنوں ابراہیم عادل شاہ ثانی سریر آرائے سلطنت تھا اس نے ان کو خوش آمدید کہا اور ان کے علم وفضل کا معتقد ہوگیا بیجاپور میں انھوں نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ شہر کی نامور شخصیتیں امراء اور اہلِ علم ان کے مرید بن گئے۔[1] عاشق بھی ان کا نیاز مند تھا اور ان ہی سے فیضِ روحانی حاصل کیا تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری نے[2] اپنے تذکرے اور ابراہیم زبیری نے "روضۃ الاولیائے بیجاپور"[3] میں ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری رقمطراز ہیں کہ عاشق کے مرشد صبغۃ اللہ نائب رسول اللہ بہروچی روح اللہ حسینی کے فرزند تھے اور آپ کی والدہ شاہ کمال صوفی حسینی کی صاحبزادی تھیں۔ وہ مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز کے داماد تھے۔ ان کا اصل وطن اور مولد بہروچ صوبہ گجرات تھا۔ صبغۃ اللہ نے ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

عاشق کی ایک عاشقانہ مثنوی اور دوسری دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے ایک "چار پیر چہار دہ خانوادہ"[4] ہے اور دوسری "حضرات خمسہ" اول الذکر مثنوی کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے یہ ایک مختصر سی مثنوی ہے جو صرف اٹھارہ صفحات پر تحریر کی گئی ہے اس مثنوی میں حمد و نعت منقبت پیر اور مناجات کے بعد "احوال زیدیان" "احوالِ چشتیاں" اور "احوالِ ہبیریاں" جیسے پندرہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور دو سو ستر ابیات میں ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اسی مناسبت سے مثنوی کا نام بھی "چار پیر و چہار دہ خانوادہ" رکھا گیا ہے۔ عاشق کی اس مثنوی سے ان کے تاریخی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اس مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

۱۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۷۰۔

۲۔ عبدالجبار ملکاپوری۔ تذکرہ اولیاء دکن۔ جلد سوم ص ۴۹۴ تا ۴۷۰۔

۳۔ ابراہیم زبیری۔ روضۃ الاولیائے بیجاپور۔ ص ۴۴-۶۳۔

۴۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۷۱۔

Marfat.com

خدا کا ہر یک حمد ہر یک ثنا
کرن ہار ہے سب بڑا ہور نھا
ہر ایک شے بھی تسبیح سوں مشغول ہے
نہ کوئی چیز اب سے کدھیں بھول ہے
خدا سارے عالم کوں پیدا کیا
خلافت ولے آدمی کوں دیا
خلافت کا انسان ہے مستحق
انپڑتا ہے حقدار کوں آ کے حق

مثنوی کے آخر میں عاشق کہتا ہے کہ میں نے اپنی مثنوی میں پہلے معرفت کی باتیں بیان کی ہیں اور آخر میں اپنے پیر کی درگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ؎

اول سے خدا ہور آخر کوں پیر یہی بول کر کھیں ہیں روشن ضمیر
اول حمد حق کا کیا ہوں عیاں پچھیں پیر کا ہے قصیدہ بیاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی "فہرستِ مخطوطات اردو" میں اسی نام کے ایک مخطوطے کو شاہ تراب چشتی گنج الاسرار کی تصنیف بتایا گیا ہے [1]

عاشق کی مثنوی "حضرات خمسہ" کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے کا مخزونہ ہے اس پر کوئی سرخی درج نہیں لیکن مثنوی میں شاعر نے واضح طور پر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

کتاباں میں لئی اس کا مذکور ہے یو حضرات خمسہ سو مشہور ہے

آگے چل کر ایک اور جگہ کہتا ہے۔ ؎

کیا ہوں یو حضرات خمسہ بیاں
یو ہے مرتبہ عارفاں کو عیاں

ڈاکٹر زور نے تذکرہ مخطوطات اُردو میں اس مثنوی کے دو مختلف نسخوں کی نشان دہی کی ہے اور انھوں نے اس کا نام اعتبارات خمسہ

---

[1] ۔ عبدالشاہد خان شیروانی ۔ فہرست مخطوطات اردو مسلم یونیورسٹی ۔ ص ۱۴۳۔

Marfat.com

تجویز کیا ہے[1] کیونکہ مثنوی کے ایک شعر میں شاعر نے چار اعتبارات کا اصطلاح ذکر کیا ہے ؎

دیئے چار یاں اعتبارات ہیں
اور دیکھے تو چاروں ہی یکذات ہیں

اس مثنوی میں وحدت، الوہیت، عالم مثال اور عالم اجسام جیسے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ مثنوی شاعرانہ محاسن یا طرزِ ادا کی انفرادیت کے اعتبار سے اہم نہیں۔ شاعر نے براہ راست انداز میں تصوّف و معرفت کے نکات کی تشریح کی ہے اور عارفانہ مسائل کی تشریح کے لئے سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے ؎

اواجسام میں نت تعلق دھرے ولیکن نہ ہرگز تصرف کرے
اگر علم ہو اس کا اس کے اوپر کہیں اس کوں ملکوت اسفل کگر
تعلق رکھے ہور تصرف کرے ہمیشہ اواجسام میں نت بھرے

عاشق کا قصیدہ پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ قصیدے کی بحر وہی ہے جس میں نصرتی نے بھی دو قصائد کہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں قصیدے کے لیے یہ طویل بحر مقبولیت حاصل کر چکی تھی قصیدے کا ممدوح جیسا کہ عاشق نے بیان کیا ہے خود ان کے پیر و مرشد ہیں چنانچہ مثنوی "چار پیر و چہار دہ خانوادہ" کے اختتامیہ شعر میں وہ کہتے ہیں ؎

اول حمد حق کا کیا ہوں عیاں
پچھیں پیر کا ہے قصیدہ بیاں

اس قصیدے کے چند شعر یہ ہیں جن میں عاشق نے صبغۃ اللہ کی مدح کی ہے اور ایسے بدنصیب مرید کو جو اُن کے در سے اٹھ کے کہیں اور چلا جاتا ہے گمراہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات۔ ادارہ ادبیات اردو۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۶ اور ۲۱۶۔
(مخطوطہ نمبر ۵۷۰ اور ۶۰۷۔ ادارہ ادبیات اُردو)

Marfat.com

اس دور میں نئیں ہے ولی کوئی صبغتہ اللہ سار کا
مرشد میرا کامل ہے او ہور پیر ہے صنکار کا
اس کو محمد کی خلافت ہوئی مدینے میں عطا
عالی نسب فرزند ہے او حیدر کرار کا
تیرے فقیراں کوں سدا الفقر فخری کا ہے دم
ہر ایک دل خدمت کرے لے بھیس خدمتگار کا
بیعت تیرے سوں جو کرے ہور پھر دھندے ارشاد کئیں
او راہ سٹ گمراہ ہونا آر کا نا پار کا
تیری نگاہ سرسری اکسیر ہے تاثیر بھی
جس پر پڑے کنجن ہوا کیا گھر کا ہور کیا بھار کا
جس دل کے گھر میں توں اچھے جم جم وہ گھر لینا اچھو
جس گھر میں تیرا نئیں گذر لایق ہے او گھر دار کا
تیرے مریداں کی قدر کیا جانتے ہیں علم کو
خاصاں کی صف میں دیکھنا ہر ہر ہے اک اسرار کا
تج اسم اعظم پر اثر پڑتا ہو وہیں ہر وقت میں
مج کوں ایتا کچھ کام نئیں کس ذکر ہو اذکار کا
سونا روپا یاقوت ہور موتی تو سب ماٹی دسیں
ہیرا تو یوں دِستا منجے پتھر ہے جانو گار کا
تج عشق کے میدان میں عاشق کلانا مفت نئیں
سچ سچ گریباں چاک ہوں ہور ہوش نئیں سنسار کا

عاشق کی زبان اور لب و لہجے میں وہ گونج اور طنطنہ و شکوہ نہیں جو قصیدت کی صنف کے لئے ضروری ہے اس لئے عاشق کی یہ شاعرانہ سعی زیادہ مشکور نہیں معلوم ہوتی اس میں نہ رفعت تخیل ہے نہ زورِ بیان اور ندرت خیال۔ اس قصیدے کی اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ یہ کہ وہ اردو قصیدہ نگاری کے دورِ اولین کا ایک نمونہ ہے۔

Marfat.com

سید فتح علی حسینی گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویان" میں جن "میر یحییٰ مخاطب بہ عاشق علی خاں عاشق"[1] کا ذکر کیا ہے وہ عہد مابعد کے شاعر ہیں۔

بُرہانُ الدّین جانم

برہان الدین جانم میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے[2] ادارہ ادبیات اُردو میں میراں جی کی ایک مختصر خود نوشت محفوظ ہے[3] جس میں انھوں نے اپنے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تحریر کیا ہے۔ وہ مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے اور ان کے والد کا نام سید علی تھا۔ حاجی دوام الدین مکہ مکرمہ میں حضرت ابو بکر قحافہ کے مکان کے قریب محلہ قرشیہ میں سکونت پذیر تھے[4] ہندوستان آکر انھوں نے چغتائی خاندان میں شادی کی تھی[5] اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرکے مکہ واپس ہو گئے تھے۔ یہیں شمس العشاق کی ولادت ہوئی تھی[6] برہان الدین جانم اور شمس العشاق کے خاندانی شجرے پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔

میراں جی بن حاجی شریف دوام الدین (عرف حاجی مکی) ابن سید علی بن سید محمد بن سید حسین بن سید داؤد بن سید زین بن سید احمد بن سید حمزہ بن سید سیف اللہ بن سید ابو الحسن بن سید اسد اللہ بن سید ابو الحسن بن سید عبد اللہ المظلوم امام زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین[7] "مجمع الانساب میں لکھا ہے کہ "شاہ میراں جی فرزند یحیٰ برہان الدین صاحب دوم باباشاہ صاحب سوم شیخ فرید . . . ." جس سے پتہ چلتا ہے کہ برہان الدین جانم شاہ میراں جی کے فرزند اکبر

---

[1] ۔ سید فتح علی حسینی گردیزی ۔ تذکرہ ریختہ گویان ۔ مرتبہ عبدالحق ۔ صـ۱۱۵ ۔

[2] ۔ عبدالجبار ملکاپوری ۔ تذکرہ اولیائے دکن ۔ حصہ اول ۔ صـ۲۰۶ ۔

[3] ۔ میراں جی شمس العشاق ۔ نسل نامہ و خود نوشت حالات ۔ مخطوطہ نمبر ۸۶۳ ۔ ادارہ ادبیات اردو ۔

[4] ۔ " " " " " " " " " " " " " " " " صـ۲ ۔

[5] ۔ اکبر الدین صدیقی ۔ مقدمہ کلمۃ الحقائق صـ۳

[6] ۔ " " " " " " صـ۴۱۳ ۔

[7] ۔ اکبر الدین صدیقی ۔ مقدمہ ارشاد نامہ ۔ قدیم اردو ۔ دور دوم ۔ جلد اول ۱۹۶۱ء ۔ صـ۱۲ ۔

Marfat.com

تھے[1]۔ "ڈاکٹر زور نے آپ کا سنہ ولادت ۹۵۰ھ/۱۵۴۴ء قرار دیا تھا لیکن اکبرالدین صدیقی نے "شجرۃ الاتقیاء" کے اشعار کی مدد سے آپ کا سنہ ولادت ۱۴۸۱ء بتایا ہے[2] مہاپنڈت راہول سانکرتیاین نے "دکنی ہندی کا ویہ دھارا" میں ان کا سنِ ولادت ۹۵۰ھ بتایا ہے لیکن عیسوی سنہ انھوں نے ۱۵۴۳ء تحریر کیا ہے[3]۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی والدہ ترک نژاد اور علوی تھیں ان کی تاریخ وصال ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء بتائی گئی ہے جو "خواب گاہ حرم پاک" سے مستخرج ہوتی ہے[4]۔

محمد حسینی معظم کے شجرۃ الاتقیاء سے برہان الدین جانم کے حالاتِ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ معظم کہتے ہیں کہ میراں جی شمس العشاق کے مرشد کمال الدین بیابانی نے پیشین گوئی کی تھی کہ انہیں ایک خدا پرست لڑکا تولد ہوگا جو "قطب الاقطاب" زمانہ ہوگا اور اسی بناء پر انھوں نے تبتل و تاہلِ زندگی اختیار کی تھی۔ کمال الدین بیابانی نے کہا تھا کہ لوح پر اس فرزند کا نام "برہان" تحریر کیا ہوا نظر آتا ہے ؎

ترت ایک فرزند اب ہوئے گا — بڑا قطب اقطاب او ہوئے گا
دیکھا لوح پر نام برہان ہے — ملایک کہے ظل سبحان ہے
اوسے راز مکشوف ہوگا تمام — پرستش کرے گا اسے خاص و عام[6]

معظم کہتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر تک برہان الدین جانم تحصیلِ علم میں مصروف رہے اور علم ظاہری میں کمال حاصل کیا اس کے بعد علمِ باطنی کے کسب کا اشتیاق پیدا ہوا اور اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیعت کی ؎

عمر جب ہوا پانزدہ سال کا — ہوا شوق غالب چھپے حال کا

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۱۳

[2] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو مخطوطات۔ جلد اول۔ ص ۱۹۔

[3] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۶۔

[4] ۔ مہاپنڈت راہول سانکرتیاین۔ دکنی ہندی کا ویہ دھارا۔ ص ۸۔

[5] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۳۔

[6] ۔ محمد حسینی معظم۔ شجرۃ الاتقیاء۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۰۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۲۔

Marfat.com

ہوئے دوست بیعت پدرسوں کئے ہوا قطب روشن پدرسوں کئے

اپنے والد کی تعلیم و تربیت سے جانم بہت جلد ایک جید عالم اور صوفی بن گئے[1] ماں باپ کے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر روانہ ہو گئے جس کا مقصد حصول علم و دانش تھا۔ جانم کی مدت سفر معظم نے تین سال بتائی ہے اور کہتے ہیں ؎

سفر میں کتنے نعمتاں پائے ہیں
برس تین بعد از وہ پھر آئے ہیں

محمود خوش دہاں نے "معرفت السلوک" میں آپ کے القاب شاہ مربیاں پناہ طالباں، حقیقت دستگاہ، مقبول حضرت الاکمل الاولیاء والافضل الاتقیاء صدر نشین محمد مصطفیٰ صاحب الشریعت والطریقت بحر الحقیقت والمعرفت مہدی دین و ہادی المومنین امام العاشقین والعارفین کامل الانسان، محقق زماں مظہر ذات وصفات سمان۔ اور شمس المحققین تحریر کئے ہیں[2] جانم کے مراتب عالیہ کا اکثر تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسحاق حسینی نے جب بارہ سال مسجد نبوی میں مصلیوں کی خدمت کرتے ہوئے گذار دیے تو عالم رویا میں آنحضرت نے فرمایا تھا "اگر حصولِ حق سبحانہ تعالیٰ خواہی نزد شاہ برہاں رو کہ در شہر بیجاپور است"[3] ڈاکٹر زور انہیں ایک عظیم صوفی اور جید عالم بتاتے ہیں[4] امین الدین اعلیٰ نے اپنے والد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں جانم کو مرتبہ ولایت پر فائز بتایا ہے اور انہیں اسرار علم لدنی کا ماہر کہتے ہیں۔ ؎

اکمل ولا بیت تج عطا ثابت ثبوت نامی خطا
جز عین حق ہرگز نہ تھا برہان بن میراں اُپر
علم لدن مقدور تج نکتہ خفی مکشوف تج اشکال مشکل حل تج برہان بن میراں اُپر

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۳۲
[2] ۔ محمود خوش دہاں۔ معرفت السلوک۔ ص ۲۔
[3] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول۔ ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۸۔
[4] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۳۲۔

Marfat.com

طائر ہوائے لامکاں سایہ حرم وحدت رواں　　حج قرب زائر ہر زماں برہان بن میراں اُپر[1]

ایسے ولی کامل کے بارے میں معظم کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں آپ کے معتقدین اور ارادت مندوں کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ گئی تھی ؎

خلیفے خلیفوں کے ہیں کئی ہزار　　مریداں تو ہیں شاہ کے بیشمار

کتاباں ہوئے اور چلا یہ کلام　　بلخ اور بخارا یو سب روم وشام[2]

برہان الدین جانم علوم اسلامی کے علاوہ ہندو فلسفہ اور ویدانت پھر بھی نظر رکھتے تھے۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے سنسکرت الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بقول اکبر الدین صدیقی "اس زبان پر قدرت تامہ رکھتے تھے"[3] جانم نے ہندو فلسفہ کی اصطلاحیں بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کی ہیں اور اسلامی تصوف کی تشریح و وضاحت میں اس سے مدد لی ہے۔

برہان الدین جانم کے ہم عصروں میں شاہ محمد گوالیاری، شاہ وجیہہ الدین گجراتی قاضی محمود دریائی، علی جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی، مخدوم جی ملتانی اور شاہ ابوالحسن قادری کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ "حدیقہ رحمانی میں لکھا ہے کہ لوگوں میں برہان الدین جانم اتنے مقبول اور ہر دل عزیز تھے اور ان کی روحانی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ لوگ انہیں سجدۂ تعظیمی کیا کرتے تھے۔[4]

"روضۃ الاولیاء بیجاپور" میں برہان الدین جانم کی تاریخ وفات ۱۵ جمادی الآخر لکھی ہے مگر سنہ موجود نہیں۔ تذکرہ اولیائے دکن بیجاپور میں سال وفات ۹۵۰ھ/۱۵۴۴ء لکھا ہے عبد الجبار ملکاپوری نے تذکرہ اولیائے دکن میں ان کی تاریخ وفات جمادی الثانی ۹۵۰ھ لکھی ہے[5]

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۹۔

[2] ۔ محمد حسینی معظم۔ شجرۃ الاتقیاء۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۰۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۳۔

[3] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۳۱۔

[4] ۔ غلام علی موسوی۔ مشکوٰۃ النبوۃ۔ مخطوطہ نمبر ۲۱ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری۔ ص ۵۳۲۔

[5] ۔ عبد الجبار ملکاپوری۔ تذکرہ اولیائے دکن حصہ اول۔ ص ۲۰۶۔

Marfat.com

علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں نذیر احمد لکھتے ہیں:۔ ان کا رسالہ ارشاد نامہ ۹۹۰ھ م ۱۵۸۲ء کی تصنیف ہے جو ڈاکٹر زور کے بقول ان کی آخری کتاب ہے اور اسی بناء پر یہ قیاس ہوتا ہے کہ اسی سنہ کے قریب ان کا انتقال ہوا ہوگا"[1] اکبرالدین صدیقی نے اپنے مضمون "کتبہ امین درگاہ بیجاپور" میں لکھا ہے کہ عبدالحق کے بیان کے برخلاف جانم نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد انتقال کیا وہ تحریر کرتے ہیں "کتب خانہ گجی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں اس میں حضرت جانم کی تاریخ وفات "عزیز اجاں چشتاں جانم" لکھی ہے جس سے ۱۰۰۷ھ اعداد حاصل ہوتے ہیں اگر اسے صحیح تسلیم کیا جائے تو برہان الدین جانم کی وفات ۱۰۰۷ھ میں واقع ہوئی"[2] لیکن ارشاد نامہ کے مقدمے میں اسی تاریخ کو اکبرالدین صدیقی نے "عزیز جاں چشتیاں جانم" تحریر کیا ہے یعنی عزیزا کے بجائے عزیز لکھا ہے اور الف کا ایک عدد کم کرکے ۱۰۰۶ھ تاریخ نکالی ہے[3] انھوں نے ایک اور تاریخ "برہان خلد مسنے" کا بھی ذکر کیا ہے جس سے جانم کی تاریخ وفات ۹۹۲ھ اخذ کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"دونوں تاریخوں کے درمیان چودہ سال کا فرق ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
دو مختلف تاریخوں نے شبہ میں ڈال دیا۔ اگر ۹۹۲ھ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو وفات کے وقت آپ کا سن ۱۰۸ ہوگا اور ۱۰۰۶ھ کو تسلیم کیا جائے تو ۱۲۲ سال کا"[4]

جانم کا مزار بیجاپور میں مرجع خلائق ہے ان کی رفیقۂ حیات کا مزار بھی پائیں میں موجود ہے۔ ان کا نام بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی تھا اور وہ "سکھ انجن" کے شاعر شاہ ابوالحسن کے بھائی شاہ مصطفیٰ قادری کی صاحبزادی تھیں ان کے

---

[1] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۲۱، ۲۲۲۔

[2] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ کتبہ امین درگاہ بیجاپور (مضمون) مشمولہ بجھتے چراغ۔ ص ۶۲۔

[3] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم جلد اول۔ ۱۹۷۱ء۔ ص ۳۱۔

[4] ۔ " " " " " " " " " " " " ص ۳۱۔

Marfat.com

حالاتِ زندگی پر سیّدہ جعفر نے "سکھ انجن" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[1]

برہان الدین جانم کے مشہور خلفاء میں شیخ داول، سیّد جلال، سید علی بن سیّد بابو، اسحاق حسینی، خضر میاں، شاہ مرتضیٰ چشتی، ان سنگار خاں، شیخ محمود خداوند شاہ اور قاضی محمود بحری کے والد بحر الدین قاضی دریا جانم کے بعض خلفاء شاعر بھی تھے[2]

سلطان ابراہیم عادل شاہ کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اکثر عالمِ جذب میں رہتے تھے اس لئے احکامِ شریعت کی زیادہ پابندی ممکن نہ تھی بعض ظاہر بین علماء ان سے اسی بنا پر ناخوش تھے۔

ڈاکٹر زور نے برہان الدین جانم کا زمانہ ۱۵۴۳ء - ۱۵۹۱ء بتایا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ اپنے والد کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے[3] وہ رقمطراز ہیں کہ جانم "اردو زبان" ہی میں "تلقین" کیا کرتے تھے[4] حقیقت یہ ہے کہ جانم نے اپنے والد کی روایت کو نباہا اور جنوبی ہند میں رشد و ہدایت کے فیض کو اپنی تصانیف کے ذریعے سے جاری رکھا۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ان کی دو خدمات قابلِ ذکر ہیں ایک تو یہ ہے کہ "انھوں نے تصوّف کے فلسفہ وجود کو مرتب کر کے اُسے ایک باقاعدہ شکل دی اور آب و آتش خاک و باد کے تعلق سے وجود کا مطالعہ کر کے اس کے چار مدارج واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود مقرر کئے۔ دوسری یہ کہ تصوّف و اخلاق اور شریعت و طریقت کو اپنی نظم و نثر کے ذریعے پیش کیا[5]

جانم کا مطمحِ نظر رشد و ہدایت اور پند و موعظت تھا جس کی جھلک ان کی تمام ادبی کاوشوں میں نظر آتی ہے۔ وہ معرفت و سلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان

---

[1] ۔ سیدہ جعفر۔ سکھ انجن۔ ص ۴۴-۴۶۔

[2] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو دور دوم۔ جلد اول۔ ۱۹۷۱ء ص ۳۲۔

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۳۰۔

[4] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ص ۳۲۔

[5] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۲۰۲۔

Marfat.com

میں اپنے معتقدین اور مریدوں کے ذہن نشین کروانا چاہتے تھے۔ صوفیاء کا عوام سے براہ راست تعلق تھا اس لئے وہ اسی زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنانا چاہتے تھے جو اس وقت عوام میں رائج تھی۔ یہ زبان رائج العوام ضرور تھی لیکن فارسی کی قدر و منزلت اور مرتبے تک نہیں پہنچ سکی تھی اور تصنیف و تالیف میں فارسی ہی مروج تھی اس لئے دکن کے صوفیاء نے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ "ہندی زبان" میں کوئی "عیب" نہیں اور اُسے بھی وسیلۂ اظہار بنایا جا سکتا ہے۔

رچرڈ میکس ویل ایٹن لکھتے ہیں کہ بیجاپور میں شمس العشاق اور پھر ان سے زیادہ ان کے فرزند برہان الدین جانم نے چشتیہ سلسلے کی تعلیمات کو اپنی تصانیف سے تقویت پہنچائی اس سلسلے میں جانم شمس العشاق سے آگے ہیں۔[1]

برہان الدین جانم چشتیہ سلسلے کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے خواص و عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ جانم کے متعدد رسالے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ رسائل ادبی محاسن اور شعری خوبیوں کے اعتبار سے درخور اعتنا نہیں لیکن زبان کے ارتقاء کو سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان رسائل کے ذریعہ سے برہان الدین جانم نے اسلامی عقائد اور احکام شریعت کو اپنے ایسے مریدوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جن میں عربی اور فارسی کتابیں پڑھنے کی علمی استعداد موجود نہیں تھی۔ معتقدین ان سے مذہبی امور سے متعلق مختلف سوالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا کرتے تھے اور آسان اور عام فہم زبان میں انہیں جواب دیئے جاتے۔ ان سوالات اور ان کے جوابات کو جانم نے نظم کی شکل میں اپنی کتاب "ارشاد نامہ" میں جمع کر دیا ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ مرشد کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ ارشاد نامہ ۹۹۳ھ کی تصنیف ہے جیسا کہ خود شاعر نے بیان کیا ہے ؎

یہ سب بولیا ہے انجان　　عابد عاجز ہے برہان
ہجرت نہ صد نو دمان　　ارشاد نامہ لکھیا جان

---

[1] ۔ رچرڈ میکس ویل ایٹن صوفیز آف بیجاپور ۔ صفحہ ۔

Marfat.com

"ارشاد نامہ" کا کوئی مکمل نسخہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں ادارہ ادبیات اُردو میں اس کا جو نسخہ موجود ہے وہ بھی ناقص ہے۔ اکبرالدین صدیقی "ارشاد نامہ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ انہیں کتب خانہ امین درگاہ میں اس کے تین نسخے ملے ہیں جو خستہ حالت میں ہیں [1]

ارشاد نامہ کی ابتداء حسبِ روایت حمد سے ہوتی ہے اس طرح حمد کے تیس (۳۰) اشعار کے بعد نعت کہی ہے اور پھر اپنے پیر و مرشد اور والد بزرگوار میراں جی شمس العشاق کی مدح میں بھی تیس (۳۰) شعر کہے ہیں اس کے بعد برہان الدین جانم کہتے ہیں کہ میں نے "ہندی" میں تصوف کے بعض مسائل سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ اس سے عوام استفادہ کر سکیں۔ یہاں وہ "ہندی زبان" کو ذریعہ ابلاغ بنانے پر معذرت خواہ نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موتی سمندر سے ملیں یا کسی کھڈ سے ان کی قدر و قیمت ایک ہی ہوتی ہے اس لئے "ہندی" زبان میں اگر بصیرت افروز اور سبق آموز باتیں بیان کی جائیں تو انہیں قابلِ توجہ سمجھنا چاہئے۔ "ہندی" کو ذریعۂ اظہار بنانا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے ؎

عیب نہ راکھیں ہندی بول — معنیٰ تو چک دیکھیں کھول
جوں کہ موتی سمندر سات — ڈبرے میں جے لاگے ہات
کیوں نہ لیوے اس بھی کوئے — سہانا چتور جے کوئی ہوئے

اس کے بعد اپنی اس ادبی مساعی کی ستائش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے بول سمندر کے موتی اور جگمگاتے رتن ہیں جنھیں میں نے بڑی "مشقت" اور "جتن" کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ یہاں مشقت اور جتن کے الفاظ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زبان کے محدود سرمایئے کی وجہ سے علمی معلومات اور سنجیدہ افکار کی ترسیل آسان نہ تھی جانم کہتے ہیں ؎

ہیں سمندر کے موتی ..لو — کیا رتن کے جوتی ..لو
گھڑیا تو ہی مشقت سوں — جتن راکھیں شفقت سوں

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی ۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اُردو دور دوم ۔ جلد اول ۱۹۷۱ء ۔ ص ۷۳ ۔

Marfat.com

موتیاں کیرا تھا انبار　　پورو کیتا ہار۔۔ں ہار
گوہرے کوئی ہوئے شناس　　سوہے چُن چُن لیوے خاص

جانم کی یہ طویل نظم دو ہزار دو سو بیس (۲۲۲۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کے اشعار کی تعداد ڈھائی ہزار بتائی ہے جو درست نہیں [1] اسی طرح نذیر احمد نے تعداد اشعار . . . . . تحریر کی ہے [2]

"ارشاد نامہ" کے تمام سوالات کی نوعیت مذہبی اور نیم فلسفیانہ ہے مثلاً ذات وصفات کا مفہوم، قدیم وجدید کی بحث، کائنات کی تخلیق، سبعہ صفات کی حقیقت، عناصر اربعہ کا بیان، تدبیر وتقدیر، انسان کا مجبور یا مختار ہونا وغیرہ۔ طالب عقل کی اہمیت کے متعلق سوال کرتا ہے ؎

تب یوں کہیا ان بھی کھول　　منجہ تو بولن ناہیں بول
کی اس گیان تھے برباد　　او منجہ شاہدی کا یاد
یوں ان دونوں تھے چھڑائے　　اب منجہ کیوں کر کھویا جائے
یہاں عقل دلالی باج　　یہ منج سمجھے کیوں بھئی آج
جے تھے عقل سد مقیم　　سو ہو رہیا کور تلیم

تو مرشد جواب دیتے ہیں ؎

ارے باج عقل تو کچہ نہیں　　تو کیا سجا لوڑے کہیں
کوں عقل عقل سوں لوڑ　　اور فہم فہم سوں جوڑ
کی اس عقل مقیم کے پاس　　جوں رے دیوے کاپر کاس
یہ تو عقل دلالی ہوئے　　تو وہ اپ سیں آپیں جوئے
نہیں تو اندھا رے　　کیا کام ہووے بارے
جو کچہ اندھا رے کھوے　　تو وہ باقی لے کر جوئے
جے کھویا سو پایا من　　پس باقی لیہ بجھایا تن

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۳۱۔
[2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۲۲۔

Marfat.com

میراں جی خدا نما نے شمس تبریز کے فارسی رسالے "مرغوب القلوب" کی شرح "شرح مرغوب القلوب" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے نسخے ادارہ ادبیات اُردو اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہیں۔ شرح مرغوب القلوب کے دوسرے باب میں میراں جی خدا نما نے نفس، دل، روح، نور اور ذات کی صفات پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد نامہ کے اشعار بھی نقل کئے ہیں [1] لیکن ارشاد نامہ جانم کی سب سے طویل نظم ہے۔ جمیل جالبی ارشاد نامہ کی طوالت کو "اکتا دینے والی" قرار دیتے ہوئے اس کو زیادہ موثر نظم نہیں سمجھتے ان کا خیال ہے کہ جانم کی مختصر نظمیں مثلاً "صحت البقاء" وغیرہ "ارشاد نامہ" سے بہتر ہیں [2] "ارشاد نامہ" "کلمۃ الحقائق" سے قبل لکھا گیا ہے۔ کیونکہ موخر الذکر تصنیف میں ارشاد نامہ کے بعض شعر موجود ہیں۔ جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ "ارشاد نامہ" "کلمۃ الحقائق" سے پہلے لکھا گیا تھا۔

وصیت الہادی جانم کی ایک ایسی نظم ہے جس کی نقلیں اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ، اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری اور انجمن ترقی اُردو علی گڈھ میں اس کے نسخے محفوظ ہیں۔ اس مثنوی کا نام "مثنوی اذکار" بھی تحریر کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ اس درگاہ کا وہ نسخہ مستند قرار دیا جا سکتا ہے جسے محمد محرمی چشتی قطب المشایخ نے تحریر کیا ہے [3] قرب زمانی کے اعتبار سے بھی یہ نسخہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا موضوع دو مقام چار راہیں اور منزلوں کی تشریح ہے۔ یہ نظم زیادہ طویل نہیں اس میں اکیاسی (81) اشعار ہیں جنھیں پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس متصوفانہ رسالے کی ابتداء بھی حمد اور نعت سے ہوتی ہے اس کے بعد ذکر قلبی، ذکر روحی اور ذکر خفی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نذیر احمد نے "وصیت الہادی" کے اس نسخے کا ذکر کرتے ہوئے جو انجمنِ ترقی اُردو کا مخزونہ ہے اس کے اشعار کی تعداد ۸۳ بتائی ہے [4]

---

[1] ۔ عبد المقیط قتیل۔ میراں جی خدا نما۔ ص ۸۹، ۹۰ ۔ [2] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۳۸۰

[3] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول ۱۹۵۱ء۔ ص ۴۵۔

[4] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۲۵۔

Marfat.com

وصیت الہادی کی بحر "ارشاد نامہ" کی بحر کے مقابلے میں طویل ہے اس نظم کے ابتدائی شعر جو حمد میں ہیں درج ذیل ہیں ؎

سکتا قادر قدرت سوں سمجھے تجے توں کوئی کیا
جس کوں لوڑے دیوے وہ کہیا بھیدی من بشار
بہو روپ پرگٹ آپ چھپایا کوئی نہ پایا انت
مایا موہ میں سب جگ باندھیا کیو تکر نیت

وصیت الہادی کے ہر باب ایک آیت سے مزین ہے مثلاً الصلوات الانبیاء والاولیاء یعلون فی قلوبھم وایمون اور اس کے بعد یہ شعر درج ہیں ؎

کب یک جیو سوں کب یک تن سوں بندگی تھے نئیں خالی
تن من جیو اس سوں جوڑے یک چت دیویں تالی
خاموشاں میں خاموش ہویں بولیناں سوں ل بولیں
کنتھا کنتھن سبھی سنتے ناچت کدھری ڈولیں
چلتیاں سوں مل مل کر جایئں بیٹھیاں سوں مل بیسیں
ان کا رنگ کوئی نہ بوجھیں جیسیاں سوں مل دیسیں

"وصیت الہادی" ایک مسلسل و مربوط نظم ہے اس کے اوزان ہندی ہیں [۲] اور زبان، بیان اور مزاج کے اعتبار سے اسی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں عربی اور عجمی اثرات اور مقامی رجحانات شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اس نظم میں موضوع کی وجہ سے عربی اور فارسی الفاظ کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ جانم کا کلام میراں جی کے کلام کی نسبت سادہ و سلیس ہے سنسکرت کے تت سم اور تت بھو الفاظ کی تعداد بھی مقابلتہً کم نظر آتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سرعت کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہی تھی۔

"سکھ سہیلا" بھی جانم کی شعری کاوش ہے۔ سہیلا اس گیت کو کہتے ہیں جو خوشی

---

[۱] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۲۵۔
[۲] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۲۰۴۔

Marfat.com

کے موقعوں پر گایا جاتا ہے۔ یہ دکنی ادب کا پہلا سہیلا ہے جس سے ہم متعارف ہوئے ہیں اس سے قبل کے کسی سہیلے کا ہمیں تاحال علم نہیں ہو سکا ہے۔ سہیلا سماع کی محفلوں میں بھی گایا جاتا تھا۔ دکن کے صوفیائے کرام نے تصوف کے رموز و غوامض کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے لئے گیت کے انداز میں سہیلے کہے تھے ان میں عارفانہ مطالب کو بڑی سہولت اور آسانی کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیا گیا تھا۔

برہان الدین جانم کا یہ سہیلا اٹھائیس[۲۸] بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں چار مصرعے ہیں اور ہر بند میں آخری مصرعہ مشترک ہے۔ اس تکرار کا مقصد غالباً نظم کے مرکزی تصور کو بخوبی ذہن نشین کروانا ہے۔ "سکھ سہیلا" ایک ترکیب بند ہے جس میں مریدوں کو وحدت کی تعلیم دی گئی ہے[۱] ہندو جوگی اور سنیاسی اور بعض مسلم فقراء روحانی ترقی کے لئے "جو خدید قسم کے طریقے اختیار کرتے ہیں" ان سے دور رہ کر خدائے واحد کی عبادت کرنے پر زور دیا گیا ہے[۲] اس نظم میں کہیں کہیں تشبیہات و استعارات سے بھی مدد لی گئی ہے۔ "سکھ سہیلا" کو ڈاکٹر حفیظ سیّد نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

برہان الدین جانم نے ظاہر پرستوں پر کڑی تنقید کی ہے اور کہتے ہیں کہ عرفان مصنوعی ذرائع اختیار کرنے اور ظاہری رسومات انجام دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا اس کا براہ راست تعلق خلوص اور جذباتی وابستگی سے ہے۔ جانم ان جوگیوں، سنیاسیوں اور تارک الدنیا فقیروں پر طنز کرتے ہیں جو "سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود" ہیں اور کہتے ہیں ؎

لوچت موندت جٹا دھاری کیس نکھاں جوں ریچھ
کانوں مندرا گھال پھریں لیو۔ن جمبوا کھینچھ
انتر اندری نہ من کی مادیں بیٹھن انکھیاں منچھ
لوگاں یہ مت کچھ الا دھی جن بوجھ بختوں لا دھی

---

[۱] ۔ ڈاکٹر الیف۔ د۔ نسیم تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ صفحہ ۲۶۲۔
[۲] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ مثنوی شاذ نامہ۔ قدیم اردو۔ دورِ دوم۔ جلد اول ۱۹۸۱ء۔ صفحہ ۲۰

Marfat.com

ذاکر ہو کر دم چلا ویں تسبیح لے کر ہات
دل کے منکے نا ہیں پھیرے تب لگ خالی بات
نندرا کیری آسا ماریں سیں جاگیں ساری رات
لوگان یہ مت کچھ الادھی جن لوجہ بختوں لادھی

سکھ سہیلا کا مزاج اور اس کی بحر ہندوی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ گا کر سنانے کے لئے کہی گئی تھی تاکہ اہلِ محفل شعر و موسیقی کی زبان میں تصوّف کی باتیں سن کر وجد میں آسکیں "۔[1] برہان الدین جانم کی دوسری شعری تخلیقات سے جب ہم "سکھ سہیلا" کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے بکثرت ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً

پنتھ اکاس کا وینکم جانے جل کا مارگ ــــ مین
سادھو کا انت سادھو جانے دوجے کو نہیں چین
اسیا سادھو بھاگوں نہیں تو چرنو رھیا لین

نذیر احمد سکھ سہیلا کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب زبان کا کوئی "خاص معیار" نہیں ہوتا تو ایک ہی مصنّف کی مختلف تحریروں میں زبان مختلف ہو جاتی ہے۔[2]

جانم نے "منفعت الایمان" میں اسلامی عقائد پر روشنی ڈالتے ہوئے الحاد اور شرک سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ حمد و نعت کے بعد شاعر اپنے اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ "حقِ مطلق" تک پہونچنے کے لئے "ارادت حق" لازمی ہے ؎

جس کو ہووے ارادت حق
تو وہ بوجھے حق مطلق

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۲۰۴ ۔
[2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف ص ۲۲۶ ۔

Marfat.com

اس کے بعد ملحدوں کے غلط تصورات اور عقائد پر روشنی ڈالتے ہوئے "در بیان اعتقاد ملحدان" کے زیرِ عنوان کہتے ہیں کہ جن میں بصیرت ہوتی ہے وہ "تن" میں "دُسرا" "وجود" دیکھ سکتے ہیں ؎

بعض آنکھیں تن وجود ـــــ تن میں دُسرا دیکھ وجود

"در بیان نصیحت گوید" میں طالبوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ اور دہریوں کی صحبت سے پرہیز کرنے کی تاکید کی ہے۔ اسلامی عقائد کی تعلیم دی گئی ہے آخری شعر میں اپنا تخلص اور مثنوی کے نام دونوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یوں فرمائے شاہ برہان
اس میں اپنے نفع ایمان

اس مثنوی کے نسخے اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری اور انجمنِ ترقی اُردو دہلی میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ ڈاکٹر زور کو دستیاب ہوا تھا جس میں ایک سو ستر (۱۷۰) شعر ہیں۔ اورینٹل مینو سکرپٹ لائبریری حیدرآباد کے نسخے میں دو اشعار زائد ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کے کتب خانے میں "منفعت الایمان" کا جو نسخہ محفوظ تھا اس میں ایک سو بتیس (۱۳۲) شعر ہیں ؎۱

"نسیم الکلام" "منفعت الایمان" سے چھوٹی نظم ہے اور اس میں صرف پینتالیس (۴۵) اشعار موجود ہیں۔ اس مختصر مثنوی کے ایک نسخے کی عبدالحق نے نشان دہی کی ہے ؎۲ یہ بحث ابتدا ہی سے اہلِ دانش اور علماء کا موضوع بحث بنی رہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ جبریہ اور قدریہ نظریوں کی تائید اور تردید میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ "نسیم الکلام" کا موضوع بھی یہی مسئلہ ہے برہان الدین جانم نے "یضل اللہ ما یشاء ویحکم ما یریدون قال علیہ السلام لا تتحرک من ذرۃ الا باذن اللہ تعالیٰ" کی مدد سے اپنے تصورات کی وضاحت کی ہے "نسیم الکلام" میں تین آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جانم کہتے ہیں ؎

۱۔ مخطوطہ نمبر ۲۱۶ - انجمنِ ترقی اردو پاکستان۔
۲۔ عبدالحق۔ رسالہ اُردو۔ جولائی ۱۹۲۵ء۔ ص ۵۲۴۔

Marfat.com

کہے کی یہ نفع زیاں کس رنگ تھے لیکھوں
قرآں میں تو تین بھاؤ پر بول چلایا دیکھوں
اول جے مج بھاؤ سے سوہے کرسوں آج
ٹیک رتی کا کام نئیں میرے اُچھے باج[1]

"حجت البقاء" جانم کی ایک خاص طویل نظم ہے اس میں آٹھ سو(۸۰۵) پانچ شعر موجود ہیں۔ ابن درگاہ بیجاپور میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے[2] اور ایک ڈاکٹر زور کے پاس محفوظ تھا[3] جمیل جالبی نے "حجت البقاء" کے اشعار کی تعداد سولہ سو سے زائد بتائی ہے۔ اسی رسالے کا نام انجمنِ ترقی اردو پاکستان کی فہرست میں "حجتِ بقاء" تحریر کیا گیا ہے انجمنِ ترقی اردو دہلی کا نسخہ ناقص الاخر ہے اور اس میں ۱۷۴۱ ابیات موجود ہیں لیکن عبدالحق کے نسخے میں اشعار کی تعداد ۸۰۵ آٹھ سو پانچ ہے[4] مختلف مذہبی امور سے بحث کرتے ہوئے شاعر نے سالک کے لئے مرشد کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ایک ایسے بے مرشد طالب کی سرگذشت ہے جو شیخ کی ہدایت سے محروم تھا لیکن جب مرشد نے منزل کا پتہ بتایا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس پر کائنات کے اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔ جانم نے نظم میں مختلف عنوانات قائم کئے ہیں مثلاً "کلام مرشد" "کلام طالب" اور "جوابِ مرشد" وغیرہ ابتداء میں حمد کے یہ اشعار ہیں ؎

آپ واحد وہی یکٹ — دیکھ قدرت کیا بکٹ
جے دھاوے اس کے پنت — نہ سمجیا کس یہ انت
اُن اپیں اپرم پار — نہ کھوجت پاویں ٹھار
بے چوں چگو نہ جان — کیوں کرتا اس بکھان

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی ۔ مقدمہ ارشاد نامہ ۔ قدیم اردو ۔ دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء ص ۴۹ ۔
[2] ۔ " " " " " " " " " ص ۵۱ ۔
[3] ۔ " " " " " " " " " ۔
[4] ۔ " " " " " رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء ۔ ص ۵۳۸ ۔

Marfat.com

بے تنظروں کوں دیکھ نہ آوے نا بوجھیں بوجھیا جا وے [1]

"حجت البقاء" میں پیر کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ایک ایسے جویائے حق کا حال بیان کیا گیا ہے جس میں طلب صادق ضرور موجود تھی لیکن رہبری کے لئے مرشد کامل کی دستگیری حاصل نہ تھی اس لئے اس کی ریاضت اکارت گئی۔ بالآخر ایک مرشد کامل سے ملاقات ہوئی۔ طالب ان سے سوالات کرتا جاتا ہے اور مرشد جواب دیتے جاتے ہیں۔ مکالمے کے پیرائے میں لکھی ہوئی یہ مثنوی شمس العشاق کے "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کی یاد دلاتی ہے۔ اس مثنوی میں ہمہ اوست کے تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے [2]

جانم کی ایک نظم "نکتہ واحد" بھی ہے جس کا موضوع توحید ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر زور "اُردو شہ پارے" میں رقمطراز ہیں کہ اس قسم کی دو نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک بارہ اشعار پر اور دوسری انتیس (۲۹) اشعار پر مشتمل ہے [3]۔ ڈاکٹر زور نے جس انتیس (۲۹) شعر کی مثنوی کا ذکر کیا ہے وہ غالباً فرمان از دیوان ہے جس کا مختصر تعارف جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں کروایا ہے [4] "نکتہ واحد" میں حروف تہجی کے ذریعے سے طریقت کے رموز کو بے نقاب کیا گیا ہے مثلاً" شاعر کہتا ہے ؎

الف :- ایمان اللہ پر واں سب جگ بنایا
اسی قدرت یہ بھانب رچیا اپس آپ چھپایا

ب :- بہروپ ان ایسا کیتا باقی اپنا کھیل
بازی کھیلے آپ کھلاوے بہو جنا میل

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۵۱۔

[2] ۔ نذیر احمد۔ ملی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۲۴۔

[3] ۔ ڈاکٹر زور۔ اُردو شہ پارے۔ ص ۳۲

[4] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۲۰۸۔

Marfat.com

ت :- توکل نہ بوجیا جاوے تن من آپ نہ بیرے
تج خود ان آپس کھو وے توحید مرشد کیرے [1]

اِس مثنوی میں حروف تہجی کو سلوک کے کنایوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے حروف تہجی کے ذریعہ طریقت کے اسرار و رموز کی تشریح کا طریقہ مجرمی روایت میں بھی موجود ہے۔

نذیر احمد لکھتے ہیں کہ اسی طرح کی ایک تیسری نظم انجمنِ ترقی اُردو دہلی کے کتب خانے میں ایک فارسی رسالے کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس کی پیشانی پر برہان الدین جانم صراحتاً درج ہے۔ علاوہ بریں حرف "م" کے لئے جو بیت ہے اس میں اپنے والد کا ذکر اس طرح کیا ہے [2]

م :- میراں جی مرشد پایا معلوم ہوا تمام
ن :- نور ذات میں دیکھیا ہوا بیان تمام

اس میں کل سولہ ابیات ہیں [2]

جانم کی ایک اور مختصر مثنوی "بشارت الذکر" ہے اس کا جو نسخہ [3] کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے اس میں شاعر کا نام شاہ میراں جی تحریر کیا گیا ہے جسکی بنا پر "دکن میں اُردو" میں نصیر الدین ہاشمی نے اسے شاہ میراں جی شمس العشاق سے منسوب کیا ہے [4] نظم صرف ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے [3]

نظم دیک گنت کیا ساٹ اے
ایک یک اُن موزوں کیا پاٹ اے

اِس مختصر سی مثنوی میں پانچ اذکار یعنی جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی کی

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۰۶۔
[2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ صفحہ ۲۲۷۔
[3] ۔ مخطوطہ نمبر ۴۷۲۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ حیدر آباد۔
[4] ۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۵۰۔

Marfat.com

تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نظم پانچ حصّوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ حسبِ دستور نظم میں پہلے حمد کہی گئی ہے اور پھر نعتیہ اشعار ہیں۔ اس نظم کی بحر فارسی ہے اور اندازِ بیان پر بھی فارسی اسلوب کا اثر نمایاں ہے [1] "وصیت الہادی" اور "بشارت الذکر" کا موازنہ کیا جائے تو ہندوی اوزان کی اجنبیت اور فارسی بحر کی روانی کے فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جانم کی ایک مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور اس کا نام "رمزالواصلین" بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس میں مسائلِ تصوّف کی تشریح کی گئی ہے [2] لیکن ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں جہاں اس کا ذکر آیا ہے انھوں نے اس مثنوی کا نام "رموزالواصلین" تحریر کیا ہے [3] اس نظم میں نور، روح، دل اور نفس کی شناخت سے بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ تفرید و تجرید، مراقبہ اور اسی قبیل کے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ذات و صفات کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

علم ارادت قدرت بار — سنتا دیکھتا بولتا ہار
جسے صفات یہ جانِ حیات — اس کوں نا ہیں کد ممات
ایسیاں صفتاں سوں ہے ذات — جوں کہ چند نا چاند سنگات

اس نظم کی زبان جانم کی دوسری نظموں کے مقابلے میں صاف ہے اور اس کے اشعار بیساختہ اور رواں ہیں [4]

جانم کی دو اور مثنویوں "کفرنامہ" اور "مسافرت خاں میاں و بیان خلاصہ" کی بھی نشان دہی کی گئی ہے راجو خاں اور خاں میاں دونوں برہان الدین جانم کے مرید تھے۔ اس مثنوی میں بھی مکالمے کے انداز کو اپنایا گیا ہے۔ طالب سوال

---

[1] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخِ ادب اردو ۔ جلد اول ۔ ص ۲۴۴۔
[2] ۔ ڈاکٹر زور ۔ اردو شہ پارے ۔ ص ۳۲ ۔
[3] ۔ ڈاکٹر زور ۔ تذکرہ اردو مخطوطات ۔ جلد پنجم ۔ ص ۲۷۸ ۔
[4] ۔ رفیعہ سلطانہ ۔ اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ۔ ص ۱۶۲ ۔

Marfat.com

کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے جاتے ہیں[1]

برہان الدین جانم ایک کثیر التصانیف بزرگ تھے ان کی ایک اور شعری تخلیق "نعت جانم" یا "توحیدِ حقیقت" ہے ۔اس میں توحید اور وجود باری تعالیٰ کی تشریح کی گئی ہے۔ نعت کے چند اشعار یہ ہیں ؎

بنی نور برقا کیا آپ پر　　اپیں آپ دیکھیں اپیں چھاپ کر
ددی اور شرکت نہ یاں کچ اچھے　　توہیں توں کا بھانہ نہ کیا بیچ رچے
نہ اس بن خالی کوئی ٹھار ہے　　نہ کوئی روپ تج باج اظہار ہے

آخر میں کتاب کے نام کی اس طرح وضاحت کی ہے ؎

یوں ہے دیک توحید حقیقت نام
ہونا نور واصل مرتب تمام
یہ توحید بولے حضرت شاہ برہاں
جے عاشق خدا کوں اتو ہوئے عیاں[2]

"عبرت آدم" کے نام سے برہان الدین جانم کی ایک اور نظم دستیاب ہوئی ہے یہ ایک مختصر سی نظم ہے جس میں صرف اکیس(۲۱) شعر ہیں۔ اس میں جانم نے خدا کی زبان سے آدم کی سرگذشت بیان کی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ میں نے زمین و آسمان اور ساری کائنات آدم کے لئے پیدا کی لیکن وہ ایسا نادان ہے کہ صفت پر فریفتہ ہے اور صانع کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اس کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

کہیں کہ یہ سب بنائے کا ہے کیرے کاج
کہیں عبرت آدم گونج مج سوں ہوئیں آج
اس امر میں کل اشارت یہ سب تیرے تائیں
ان کی پچھان میری کرج سوں جیوڑا لائیں

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی ۔ مقدمہ ارشادنامہ ۔ قدیم اردو ۔ دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء ۔ ص ۵۵ ۔

[2] ۔ " " " " " " " " ص ۵۸ ۔

Marfat.com

تیسرا مکھڑا دیکھیں ات میٹھا مج کوں بھایا
اپن خدمت کارن کوں تیری خدمت لایا
تیرے کارن نعمت الواں میوے شکر بنات
تیرے تائیں مانک موتی رتن ہیرے ذات

مثنوی "پنج گنج" بھی جو ادارہ ادبیات اردو کا مخزونہ ہے[1] جانم سے منسوب کی گئی ہے اس میں شاعر کا نام اس طرح آیا ہے ؎

دیکھیں گے جو ہے پیر شاہ برہان
کہتے دو وضع سوں ہر ایک کوں بیاں

مثنوی کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصّہ کو "گنج" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گنج اوّل ذکر جلی، گنج دوم ذکر قلب و وسوسہ گنجِ سوم ذکر روح مشاہدہ گنج چہارم ذکر سر معانیہ گنج اور پنجم ذکر خفی سے متعلق ہے۔ اس کی زبان نسبتاً صاف اور "ارشاد نامہ" کی نسبت سہل ہے۔ ڈاکٹر زور پنج گنج کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے کسی مرید نے جانم کے نام سے یہ مثنوی لکھی ہو کیونکہ "پنج گنج" کی زبان جانم کی مثنویوں کے مقابلے میں جدید اور آسان معلوم ہوتی ہے[2]

برہان الدین جانم نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کی مفارقت پر جو پر درد مرثیہ کہا تھا اس سے ان کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس مرثیے کا شمار اردو کے اولین مراثی میں ہوتا ہے۔ اس مرثیے پر سب سے پہلے عبدالحق نے روشنی ڈالی تھی لیکن انھوں نے شاعر کے نام سے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف کیا تھا۔ اکبرالدین صدیقی نے "کلمتہ الحقائق" کے مقدمے میں اس مرثیے کو برہان الدین جانم کا نتیجۂ فکر قرار دیا ہے[3] لیکن جمیل جالبی اس انتساب کو مشکوک قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

---

۱۔ مخطوطہ نمبر ۵۴۳۔ ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔
۲۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات۔ ادارہ ادبیاتِ اردو۔ جلد سوم۔ ص۸۱۔
۳۔ اکبرالدین صدیقی۔ کلمتہ الحقائق۔ ص۔

Marfat.com

"مرثیہ کے حاشیے پر شاہ حسین ذوقی این تاریخ گفت است شمس العشاق ۹۰۲ھ کے الفاظ تحریر کئے گئے ہیں اور مخطوطے میں اس مرثیے پر برہان الدین جانم کا نام درج نہیں ہے"[1]

یہ مرثیہ خاصا طویل ہے اور درمیان میں اکثر جگہ دوہرے بھی کہے گئے ہیں جن کی تعداد پندرہ ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

شاہ میراں جی جگ رتن سوہے تن منج دل کندن — لیتا چھنا اپنی اذں جے کج حکم الہی کا
سوہی میراں مج پیر ہے اوں روز کا دست گیر ہے — حج بن میں سیر ہے جے کج حکم الٰہی کا

دوہرا

بن تیل دیوا کیوں جلے بن دونگہ پنکھی جوں پھرے
یو جیو با ول تج بنا بن جل مچھی تڑپا کرے
تجہ سوز برہے داغ پر جوں موم گلتا آگ پر
یوں دکھ لکھیا مج بھاگ پر جے کج حکم الٰہی کا
منج باج نا کج غم کرو توکل تکیہ اس پر دھرو
بولیا چالیا تم معاف کرو جے کج حکم الٰہی کا
کوئی نار ہیں ات چگ دونی سب جگ مرن ہار
کوئی آنگھیں کوئی پچھیں بنھ لگے پیتن چلن ہار[2]

کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قدیم بیاض میں برہان الدین جانم کا ایک مرثیہ محفوظ ہے[3] اس کو میر سعادت علی رضوی نے اپنی کتاب "عادل شاہی مرثیے" میں اور پھر چراغ علی نے بغیر حوالہ دیئے ہوئے "اردو مرثیہ کا ارتقاء" بیجاپور اور گولکنڈے میں ۱۱۰۰ء تک" میں نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ انیس (۱۹) اشعار پر مشتمل ہے۔ جانم خاندان نے سالہا سال تک دکن میں معرفت کی شمع کو روشن رکھا اور طالبانِ علم

---

[1] ۔ جمیل جالبی ۔ تاریخ ادب اردو ۔ جلد اول ۔ ص ۱۶۷ ۔
[2] ۔ اکبر الدین صدیقی ۔ مقدمہ کلمتہ الحقائق ۔ ص ۵ ۔
[3] ۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۴۴ ۔ کتب خانہ سالار جنگ ۔ حیدرآباد ۔

Marfat.com

کو سیراب کرتے رہے۔ برہان الدین جانم کا شمار بیجاپور کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے اور ان کے فیضِ روحانی سے جنوبی ہند کے اکثر چشتیہ اربابِ طریقت سرشار رہے ہیں۔ جانم کا ایک علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے تصوّف کے مباحث و مسائل کی ترتیب و تدوین کی اہمیت کو پہلی بار پوری شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور متصوفانہ اصطلاحات و مفاہیم کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دینے کی کوشش کی۔ جانم کے مرثیے میں ان کے صوفیانہ مزاج اور عارفانہ روش کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے اپنے مرثیے میں انھوں نے ایک منفرد انداز اختیار کیا ہے اور صرف گریہ و بکا پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ فلسفۂ شہادت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام روایت کے مطابق مرثیے کی ابتدا تو ماہ محرم کے آغاز کے ذکر سے ہوتی ہے لیکن بہت جلد جانم کا عارفانہ مزاج اپنے موضوع کے متصوفانہ پہلو کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور وہ تکوینِ عالم کی صوفیانہ نقطۂ نظر سے تشریحیں پیش کرتے ہیں۔ تخلیقِ کائنات کا ذکر کرتے ہوئے جانم کہتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے مرتبۂ احدیت سے مرتبہ واحدیت کی طرف نزول کیا تو عالم مثال میں آدم صفی اللہ خلق ہوئے جس کا مقصد یہ تھا کہ نبی آدم کو شہادت عظمیٰ کی اہمیت کا ادراک حاصل ہو۔ جانم کہتے ہیں ؎

دکھی ہو احدیت میانے نکل وحدت منے آنے
یو غم عالم کو دکھلانے صفی آدم ہوا پیدا

پورا مرثیہ متصوفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور اردو مرثیے کی تاریخ میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ابن عربی کے فلسفہ تنزلات سے استفادہ کیا گیا ہے اور اسے صوفی مرثیہ نگار نے اپنے مسلک کی روشنی میں نظم کیا ہے۔ جانم نے نور محمدی کی تخلیق کا بھی ذکر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ خالق مطلق نے اس نور کو حسین کے نور کا مبدا بتایا۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو مرثیہ کی ابتدا کا سہرا بھی چونکہ صوفیہ کے سر ہے اس لیے مثنوی آغاز میں یہ صنف صوفیانہ تصوّرات اور عارفانہ طرزِ فکر کی حامل رہی اور اسی پسِ منظر میں رثائیہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ یہ پورا مرثیہ جانم کے صوفیانہ مزاج اور عالمانہ طرزِ فکر کا ترجمان ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

محرم کا چندا پھر کھن پولے ماتم ہوا پیدا محباں کے دلاں میں سب شہاں کا غم ہوا پیدا

Marfat.com

دکھی ہو احدیت میانے نکل وحدت منے آئے
یو غم عالم کوں دکھلائے صفی آدم ہوا پیدا
الست ربکم اب سوں او رھاں سن کے بولے یوں
سواء قالو ا بلیٰ کا جوں کر شمہ بہم ہوا پیدا
او واجب تحم غم بویا سو ممکن خواب میں رویا
او جالا ممتنع کھویا ہو عارف غم ہوا پیدا
مکاں سٹ گنج مخفی کا لیا ہے بھیس سفلی کا
پھرا کر اسم علوی کا یوسب عالم ہوا پیدا
احد وحدت میں احمد ہو ہوا ظاہر محمد ہو
حسین سرور کیرا جد ہو یو اسم اعظم ہوا پیدا

اس مرثیے کے آخری آٹھ اشعار رثائیہ ہیں اور حسن تعلیل کی صنعت کا برجستہ استعمال کرتے ہوئے جانم نے یہ بتایا ہے کہ چرند و پرند اور بنی آدم سب غم حسین میں نالہ کناں اور غمگین ہیں۔ انھوں نے یزیدی فوج کو جو کربلا میں حسین سے لڑنے آئی تھی "کفر کی فوج" سے تعبیر کیا ہے اور کہتے ہیں ؎

جناور سب سٹے زوجاں دریا کیاں کھلبلیاں موجاں
شمر جب کفر کیاں فوجاں لے شبہہ کے سم ہوا پیدا

بعض رسالے جو جانم سے منسوب ہیں محققین کی نظر میں مشتبہ ہیں اور وہ ان کو جانم کی تصنیف تسلیم کرتے ہوئے پس و پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں "فن نامہ" اور "پنج گنج" قابل ذکر ہیں۔ زبان کی صفائی اور لسانی مزاج کی بنا پر ڈاکٹر زورؔ[1] انہیں عہد مابعد کی تصانیف سمجھتے ہیں۔ جانم نے "ارشاد نامہ" جیسی طویل نظمیں بھی کہی ہیں اور "عبرت آدم" جیسی مختصر نظمیں بھی۔ اس کے علاوہ جانم نے گیتوں اور دوہروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں بھی اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کی مفید باتیں بیان کی ہیں۔ گیتوں میں بالعموم روزمرہ زندگی کے

---

[1] ۔ ڈاکٹر زور ۔ تذکرہ مخطوطات ۔ جلد پنجم ۔ صـ۱۲۲ ۔

Marfat.com

تجربات اور حیات کی ابدی سچائیوں کو ہلکے پھلکے لیکن بصیرت افروز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جائم کے گیتوں، دوہروں اور عقدہ وغیرہ پر مقصدیت کی چھاپ خاصی گہری ہے لیکن اس کے باوجود یہ دلچسپ اور پر اثر محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں شعری محاسن کی تلاش ادبی تاریخ سے عدم واقفیت کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

سو کھ کا سرور چھوڑ کر سکھی ڈاپڑ پھرتیں ہاں
کریں سیلا واسمدر سیتیں جے موتیاں لاگے کھاں
جب لگ تن نئیں چھوڑیا جیو کوں تب لگ ہونا دور
جب لگ نظر نئیں چھوڑے آنکھ کوں تب لگ ہونا دور
جب لگ سُنیا نئیں چھوڑیا کان کوں یوسب اعضا رحال
جب لگ فہم نئیں چھوڑیا دل کوں بوجھت ہونرا ل
یوسب تن مین من برتن دیکھ چھوڑیں اے سوکھ دوکھ
دوکھ سوکھ یک کرسی تو پاوے سیج کا سو کھ ملا

جائم کے گیت اور دوہرے دو مختلف رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں ایک پر ہندوی اسطور و اسلوب کا اثر نمایاں اور دوسرے پر فارسی آہنگ کی چھاپ ہے بقول جمیل جالبی "اس دور کے ادب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں ان دو طرز ہائے احساس اور دو اسالیب کے درمیان کشمکش کا احساس ہونے لگتا ہے"[۲] جائم نے خیال اور دھرے بھی نظم کئے ہیں۔ دھرے کے ساتھ راگ راگنی بھی لکھ دی ہے اس سے شاعر کے ذوقِ موسیقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ برہان الدین جائم چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے اس سلسلۂ طریقت میں روحانی مدارج طے کرنے میں موسیقی بہت موثر خیال کی جاتی ہے[۳] غالباً اسی لئے

۱۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۲۰۸/۲۰۹۔
۲۔ " " " " ص ۲۱۰۔
۳۔ نذیر احمد۔ ملک گجرات تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۳۔

Marfat.com

برہان الدین جانم نے موسیقی سے ربط رکھا ہوگا۔ جانم کے گیت اور دوہرے اس حقیقت کے غماز ہیں کہ صوفیاء نے دیر و حرم کے تفرقے کو مٹانے اور باہمی اخوت پیدا کرنے کی کیسی پرخلوص کوشش کی تھی۔ ان میں ہندو مسلم خیالات کی یکجہتی کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔

دکنی کے علاوہ جانم نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ "مخزن السالکین" "ارشاد الطالبین" "سوال و جواب" اور "راز و نیاز" جانم سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جانم کا ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ؎

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار
متجلّی است از در و دیوار

ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے جس سے فارسی میں ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گفتار شاہ برہان کے نام سے بعض قدیم بیاضوں میں جانم کی چند نظمیں اور اشعار محفوظ ہیں ایسی تین نظمیں دستیاب ہوئی ہیں[1] جیسا کہ کہا جا چکا ہے چشتیہ سلسلہ سے روحانی نسبت کے باعث جانم کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا چنانچہ متعدد راگنیوں میں انھوں نے نظمیں کہی ہیں مثلاً مقام بلا رے۔ بلاول۔ دھناسری۔ اساوری نٹ، رام کلی بھاکرا، توڈی، بھیرویں، بسنت اور گوری وغیرہ[2] مولوی عبدالحق نے بھی برہان الدین جانم کے موسیقی سے لگاؤ کو چشتیہ صوفیاء کے اس تصور کا نتیجہ قرار دیا ہے موسیقی روحانی مدارج طے کرنے کا ایک وسیلہ ہے[3] مختلف راگ راگنیوں کے تحت کہے ہوئے اشعار کی دو مثالیں یہ ہیں ؎

در مقام اساوری

پیاری کنیا بھولی کس سنگ — تغیر دستا تیرا رنگ
جون آئینہ پکڑیا زنگ — عاشقی کے ایسے ڈھنگ

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم۔ جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۶۳، ۶۴۔

[2] ۔ ص ۶۴۔

[3] ۔ عبدالحق۔ بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان (مضمون) مشمولہ قدیم اردو۔ ص ۳۹۔

Marfat.com

درمقام گوری

میں عاشق اُس پیو کی جسنے منجے جیو دیا ہے
او میرے جیو کا برقا لیا ہے

بین اور حقیقت سے بھی جانم کی شعر گوئی کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

بین

اَکھے جانم پرت سب میں ہے دو نیں کوئی اس تھے بھار
او ذرہ ہے سب میں ظاہر سارے اس کے آدھار
کرو پرت ہولوں ہی بچار۔ عشق قوی ہے قرار

بین اول

اُو معشوق آپیں بے مثل ہے نور بنی بنایا
اپس آپیں دیکھنے کسی آرسی لایا ؎

بین دوم

کھر کھرے پیو جیو میں اُپیں آپ دکھاوے ایسی میٹھی معشوق کوئی کیوں دیکھن پاوے
جن دیکھے پیو اپنا ہوسے اونا بھاوے

بین سوم

کل شئی میں محیط ہے اوسے کوئی نا بچھانے
جسے کوئی عاشق اس پیو کی او جیو میں جانے

؎ عبدالحق۔ بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان (مضمون) مشمولہ۔ قدیم اردو۔ ص ۶۵۔

Marfat.com

حقیقت

اللہ میں کس نا دیکھوں جدا۔ ان سب میں یک خدا بندا۔ اپین ہونا خدا
واحد ہونا یک پنے سوں دوجا ناہیں بچار
بھو روپ دھارے بھول پڑے لوڑے دیکھن ہار
آپس آپس دیکھن کا ان کیتا ہے بھو بھیک
کس کہوں میں کس کہا داں ان سب میں ایک ہی ایک
آکھے جانم آپس کھوجے بوجھیں منزہ ذات
سب شاہد آپ جناوے مرشد کے مکھ بات[1]

دکن کے صوفیائے کرام نے متصوفانہ تصورات کی تشریح کے لئے مختلف ایسے ذرایع اپنائے تھے جن کی مدد سے کم علمی استعداد رکھنے والے عوام بھی مستفید ہو سکتے تھے۔ گیتوں کے علاوہ مختلف کھیلوں کے ذریعے سے بھی مذہبی امور کی وضاحت اور احکامِ شریعت کی صراحت کی گئی ہے۔ بیجاپور کے شاعر شاہ ابوالحسن نے ایک طویل مثنوی "آنکھ مچولی" کھیل کے انداز پر نظم کی ہے۔ اسی طرح "دھا دھوکنی کے کھیل" کے وسیلے سے جانم نے بھی مسائلِ تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تمام کوششیں دراصل "بادہ وساغر" کے "پردے" میں "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کو ظاہر کرتی ہیں۔

حقیقت بھاکر ڑا

دھا دھوکنی کا کھیل جو لائے۔ کن فیکوں کا میلاے۔ غفلت کی دائی بھائے
روز میشاق تھے آنکھ میچانی روز محشر لگ کھیل
غفلت کو نچاتن کا کو ناقولوں بھائی ٹھیل
دینا گھری نس اندھیاری مایا رچنا ماؤ

---

[1] ۔ عبدالحق۔ بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان (مضمون) مشمولہ۔ قدیم اردو۔ صفحہ ۔

Marfat.com

کلمہ چند نا جگ میں پیارا چاؤ محمد کیرے جاؤ
یہاں جن اندھے وہاں بی اندھے [1]

اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں "حضرت جانم موسیقی کے ماہر، سُر تال سے واقف تھے راگ راگنیوں پر انھوں نے نظمیں اور دوہرے لکھے اور پیچیدہ بحروں میں اپنا کلام پیش کیا اور یہ بحریں ایسی ہیں کہ عروض کے علاوہ پنگل سے بھی مطابقت رکھتی ہیں" [2] عبدالحق کے یہاں برہان الدین جانم کی مثنوی کے علاوہ بہت سے خیال اور دوہے بھی محفوظ تھے [3] ایک خیال کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

خیال

اب سندیہ مجھ ہے شہہ کا — جب کب بھاگوں انتر ملے
پیر پیرم کے ہیڑے میرے — نینوں مانھ جوں کنکر ملے
نس دن جاگے برہ ماری — نہ نیندا دیکھے نین پڑے
پلکیں میری آگ جلے کیوں — سپنے دیکھوں سو کھڑے
قول پیا تج آس لگی من — آس لگی تج پاس رہن
نہہ کا بینا مجہ کوں لاگا — لوگ دیوانی دیکھ ہنس [4]

جانم کا کلام متصوفانہ ہے۔ اس لئے ان کا اندازِ بیان سادہ اور براہ راست ہے لیکن بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت سے خالی نہیں جانم اس دور کے دوسرے شعراء کی طرح عروض اور قواعد کے زیادہ پابند نہیں۔ اکثر مصرعوں کی قرأت کھینچ تان کر کرنی پڑتی ہے اور وہ ضرورتِ شعری کے لئے لفظ کی ہیئت بھی تبدیل کر دیتے ہیں بعض اوقات ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بھی بنا دیتے ہیں۔

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اُردو۔ دورِ دوم جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۷۱۔
[2] ۔ ص ۷۵۔
[3] ۔ عبدالحق۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۵۳۔
[4] ۔ ص ۵۴۔

Marfat.com

نثر میں بھی برہان الدین جانم سے بہت سے رسالے منسوب ہیں ان میں "کلمتہ الاسرار" "مقصود ابتدائی" "ذکر جلی" "معرفت القلوب" "ہشت مسائل" اور کلمتہ الحق سے ہم متعارف ہو سکے ہیں۔ کلمتہ الاسرار کے قلمی نسخے اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری[1] حیدرآباد اور عثمانیہ[2] یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں لیکن اس کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ امین الدین اعلیٰ کی تصنیف ہے۔ اس رسالے کی زبان عہد جانم کی نثر سے جدید تر معلوم ہوتی ہے۔ "مقصود ابتدائی" کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[3] اور "کلمتہ الحقائق" کے ساتھ اس کی جلد بندی کی گئی ہے۔ دونوں رسائل کی زبان اور موضوع میں یکسانیت ہے اور رسائل کی تشریح کا انداز بھی ایک سا ہے اور دونوں ساتھ ہی شیرازہ بند ہیں۔ طالب اور مرشد کے سوال وجواب اور مکالمے کی طرز میں خیالات کی پیشکشی کا انداز بھی وہی ہے جس کی بناء پر ڈاکٹر زور نے "مقصود ابتدائی" کو جانم کی تصنیف قیاس کیا ہے[4] مقصود ابتدائی کے بارے میں نذیر احمد کا خیال ہے کہ اس کی دوسری اور تیسری بیت جانم کے منظوم رسالے "وصیت الہادی" سے ماخوذ ہے اور اس رسالے کا پہلا سوال "کلمتہ الحقائق" کے پہلے سوال سے مطابقت رکھتا ہے اس کے علاوہ دونوں رسالوں کی زبان کی عمومی مشابہت کی وجہ سے بھی یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں رسالے برہان الدین جانم ہی کی تصنیف ہوں گے[5]۔

جانم کے ایک اور رسالے "ذکر جلی" کا تعارف اکبر الدین صدیقی نے "ارشاد نامہ" کے مقدمے میں کروایا ہے۔ لیکن وہ اس کو جانم کا رسالہ تسلیم کرتے ہوئے

---

[1] ۔ حمیرہ جلیلی۔ مقدمہ کلمتہ الاسرار۔ ص۱۱۔

[2] ۔ " " " " " " ص۱۱۔

[3] ۔ مخطوطہ نمبر ۴۰۱ ب۔ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد۔

[4] ۔ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات۔ ادارہ ادبیات اردو۔ جلد اول۔ ص۵۴۔

[5] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص۲۴۰۔

Marfat.com

پس وپیش کرتے ہیں[1] "معرفت القلوب" کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ امین درگاہ بیجاپور کے کتب خانہ میں اور ایک آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں موجود ہے[2] اور اس میں طریقت سے معرفت تک کے مختلف مراحل کی توضیح کی گئی ہے۔ "دکن میں اردو" میں نصیرالدین ہاشمی کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[3]۔ "ہشت مسائل" میں بھی مکالمے کے طرز کو اپنایا گیا ہے اور "مقصود ابتدائی" کی طرح اس میں مصنف نے سوال وجواب کے ذریعے سے اپنے مطالب کی تشریح کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔

"کلمتہ الحقائق" اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ قدیم اردو کا اولین نثری کارنامہ ہے جو مکمل حالت میں دستیاب ہوا ہے دوسرے یہ کہ اس کے مصنف کے بارے کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کلمتہ الحقائق کے مختلف نسخوں میں کوئی اہم اختلاف جس سے نثر کی صورت اور معنوی حیثیت بدل جاتی ہو نظر نہیں آتا۔ "کلمتہ الحقائق" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب سے زیادہ ضخیم رسالہ ہے۔

جانم کی دوسری تصانیف کی طرح کلمتہ الحقائق کا موضوع بھی مذہبی ہے۔ اور اس میں ذات وصفات فنا وبقا، نور کی تخلیق، وجود اور عناصر اربعہ جیسے موضوعات پر سوال وجواب کے پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ طالب رہبر سے سوالات کرتا جاتا ہے اور شبہات دور کر کے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے اس رسالے کے مطالب سے عہدِ جانم کے اس طبقے نے یقیناً استفادہ کیا ہوگا جس کی مذہبی معلومات زیادہ وسیع نہیں تھیں۔ مرشد کی تشریحات بڑی بامعنیٰ ہیں لیکن عوام کی ہدایت کے پیشِ نظر عام فہم اور سلیس اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مرشد نے قرآنی آیات واحادیث سے اپنے بیانات کی سند پیش کی ہے اور جابجا ان سے مدد لی ہے۔ "کلمتہ الحقائق"

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی ۔ مقدمہ ارشادنامہ۔ قدیم اردو ۔ دور دوم ۔ جلد اول ۱۹۷۶ء ۔ ص ۷۳ ۔

[2] ۔ ۔ ۔

کی نثر کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

سوال :۔ کہ خدائے تعالیٰ اول تھے اول کیوں ہے۔

جواب :۔ قدیم تھے قدیم اول تھے اول اپیں تھا۔

سوال :۔ کہ کیوں تھا وکہاں تھا ؟

جواب :۔ بے چوں وبے چگونہ تھا وچون وچہانہ باید گفتن ولیکن ہستی باقی لاشک وشبہ۔

سوال :۔ او کہاں تھا کہیں تو تعلقات جاگا سوں دھرتا تھا بھی ؟

جواب :۔ تیرے بھی وقت سوں تعلق دھرتا ہے تو اس ہر شے کا آفریدہ گار دیکھ جان اور اس جاگا کا سب آفرید گار وہی پچھان۔ اس تھے اول وادل کا بھی اول وآخر قدیم وجدید سب اس تھے بے زبان ہوتا اس تھے بول میں آیا کہ اول تھے اول ہے جملہ مخلوقات تھے لامکان ہے۔

"کلمۃ الحقائق" کے نسخے ادارہ ادبیات اردو۔ اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی اور انجمنِ ترقی اردو دہلی میں موجود ہیں اس کا ایک نسخہ سید محمد مورخ بیدری کے یہاں بھی محفوظ ہے اور ان تمام نسخوں میں سب سے قدیم ہے۔ ۱۰۶۸ھ میں لکھا ہوا نسخہ ہے جو خانقاہ عنایت الٰہی حیدرآباد میں محفوظ ہے[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور اکبرالدین صدیقی نے جولائی ۱۹۶۱ء میں کلمۃ الحقائق مرتب کرکے شائع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے جانم کے ایک چھوٹے سے رسالے "مجموعہ الاشیاء" کا ذکر کیا ہے[2]۔ جس کا ایک نسخہ انجمنِ ترقی اردو دہلی کے کتب خانے میں کلمۃ الحقائق کے ساتھ شیرازہ بند ہے تمہید میں مصنف نے غرضِ تصنیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے :۔

"اے رسالہ واسطے طالب کے سوال ہور جواب مختصر لاتے ہیں ذات مطلق کے تئیں اس وجہ سوں کہو جسے موافق اس حدیث کے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ بھی جسے کوئی اپس کوں پچھانا سو خدا کو پچھانیا۔

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ کلمۃ الحقائق۔ ص ۱۱۔

[2] ۔ نذیر احمد۔ علی گڈھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۳۵۔

Marfat.com

بندہ کسے کہتے ہیں پس واجب ہے کہ اس وجہ پچھانت کرنا اس وقت
محبوب کوں اپس یں پاوے"[1]

یہ رسالہ بھی مکالمے کی شکل میں سپردِ قلم کیا گیا ہے اور صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں کہ جو مخصوص الفاظ جانم نے کلمۃ الحقائق میں استعمال کیے ہیں وہ اس رسالے میں بار بار تحریر کیے گئے ہیں[2] جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ رسالہ بھی جانم ہی کی تصنیف ہوگا۔

برہان الدین جانم اردو کے اولین نثر نگاروں اور شاعروں میں سے ہیں ان کے عہد میں ہماری زبان کو تحریری روپ عطا ہوئے غالباً ایک صدی کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا اس لئے جب ہم لسانی اعتبار سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جانم کی تصانیف اپنے دور کی قواعد اور لسانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں اس عہد میں عروضی اصولوں کی بھی سختی سے پابندی ممکن نہ تھی اس لئے ردیف وقوافی میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کی مثالیں بھی موجود ہیں اکثر ردیفوں میں "س" اور "ص" اور "ط" اور "ت" "ع" اور "ا" اور "ک" اور "ق" کو ایک ہی صوتیے Phoneme کے طور پر برتا گیا ہے۔ ضرورتِ شعری کے لحاظ سے ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بنا دیا گیا ہے اور اسی طرح سادہ الفاظ کو مشدد اور مشدد کو سادہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ادب کے اس ابتدائی دور میں نثر اور شعر کے اعلیٰ ترین نمونوں کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ یہ ادبی زبان کا عہدِ طفولیت تھا اس لئے اس میں منجھی ہوئی زبان اور نکھرے ہوئے اسلوب کی مثالیں نہیں ملتیں۔ رچاؤ اور پختگی تشکیلی دور یا دورِ آغاز سے نہیں زبان و ادب کے عہدِ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن زبان یاوری نہیں کر رہی ہے اور اظہار کے راستے مسدود ہیں۔ ان کے یہاں جملوں میں الفاظ کی وہ ترتیب نہیں جو قواعد کی رو سے ہونی چاہیے۔ ایسا محسوس ہوتا

---

[1] نذیر احمد۔ ملی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ ص ۲۳۸۔
[2] " " " " " " " ص ۲۳۸۔

Marfat.com

ہے کہ الفاظ ترسیل میں کہیں کامیاب ہیں اور کہیں معنی کو الجھا رہے ہیں۔ فارسی اور دکنی نثر کا امتزاج اس زمانے کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ کہیں پورا جملہ فارسی میں ہے تو کہیں دکنی کے ساتھ ابتدا یا انتہا میں فارسی الفاظ سے خیال کی ترسیل میں مدد لی گئی ہے۔

ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں جانم کی زبان اور ان کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شمس العشاق شاہ میراں جی کی بہ نسبت جانم کا اندازِ بیان سادہ ہے۔ غالباً ڈاکٹر زور کے پیش نظر میراں جی کا "خوش نامہ" اور "خوش نغز" تھے جن کی زبان پر قدامت کی چھاپ خاصی گہری ہے۔ ڈاکٹر زور نے جانم کی زبان کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے فارسی اور عربی لفظ زیادہ استعمال نہیں کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جانم کی زبان میں دیسی الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور انھوں نے عربی اور فارسی کے بجائے سنسکرت سے استفادہ کیا ہے۔

جانم نے اپنی زبان کو "گجری" سے تعبیر کیا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" میں لکھتے ہیں :۔ "یو زبان گجری نام ایں کتاب کلمۃ الحقائق"[1] اسی طرح "ارشاد نامہ" میں کہتے ہیں ؎

یہ سب گجری کیا بیاں　　کریہ آئینہ دیا نماں
کلمۃ الحق سب کیا بیاں　　دیکھ خلاصہ ہوئے عیاں

رسالہ "حجت البقاء" میں اپنی زبان کو "گجری" بتاتے ہوئے کہتے ہیں ؎

جسے ہوئے گیاں بچاری
نہ دیکھیں بھا کا گجری

محمود شیرانی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح دکن کے باشندوں نے اردو کا نام دکنی رکھا ہے اسی طرح گجرات کے رہنے والوں نے اُسے گجراتی سے موسوم کیا[2]

---

[1] ۔ اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ کلمۃ الحقائق ۔ ص ۱۲ ۔
[2] ۔ محمود شیرانی۔ پنجاب میں اردو۔ ص ۴۱ ۔

Marfat.com

اکبرالدین صدیقی جانم کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ گجری نے گجرات سے متعلق ہو کر غلط فہمی پیدا کر دی ہے اس کا تعلق گجرات سے نہیں۔ لفظ "گجری" گذرگاہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور کثرت استعمال سے گذرگاہ گجری میں تبدیل ہوگیا۔ جانم نے "کلمۃ الحقائق" اور "منفعت الایمان" میں اپنی زبان کو "جو گجری" کہا ہے اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق "گذری" سے ہے [1] ڈاکٹر گیان چند جین رقمطراز ہیں کہ ایک زمانے میں اردو کا ایک نام "گجری" بھی تھا ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں یہ نام گجرات والا اور گجرات (پنجاب) کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے چنانچہ دکنی شعراء برہان الدین جانم اور امین الدین اعلیٰ نے اپنی زبان کو "گجری" سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر زور گجراتی کو دکنی سے علیحدہ بولی قرار دیتے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا شعراء کی "گجری" کو گجراتی نہیں مانتے بلکہ گجرات کے شاعر خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" کو گجراتی کا نمائندہ تصور کرتے ہیں [2] جمیل جالبی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ میراں جی نے "ہندوی" میں لکھنے کا جواز یہ دیا تھا کہ عوام چونکہ عربی فارسی سے واقف نہیں تھے اس لئے وہ "ہندوی" زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں لیکن اس کے برخلاف جانم اعتماد کے ساتھ اسی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ [3]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ میراں جی نے اپنی زبان کے لئے "گجری" یا "گوجری" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اگر جانم گجرات کی نسبت سے اپنی زبان کو "گجری" کہتے تو پھر اس کے لئے ہندی کا لفظ استعمال نہیں کرتے جیسا کہ انھوں نے ارشاد نامہ میں کیا ہے ؎

یہ سب بولوں ہندی بول — پر توں انبھ سینی گھول
عیب نہ راکھیں ہندی بول — معنیٰ تو چھک دیکھیں کھول

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اردو۔ دور دوم جلد اول ۱۹۷۱ء۔ ص ۴۲۔
[2] ۔ ڈاکٹر زور۔ اردو کی ابتداء۔ (مضمون) مشمولہ اردوئے معلیٰ لسانیات نمبر۔ ص ۱۳۲۔
[3] ۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۲۰۳۔

Marfat.com

ہندی بولوں کیا بکھان جے گرو پرسادتھا منجہ گیان

"ارشاد نامہ" میں انھوں نے دوسری جگہ اپنی زبان کو "گجری" بتایا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم اُردو کے لکھنے والے کبھی اپنی زبان کو "گجری" کبھی "ہندی" اور کبھی "ہندوی" سے موسوم کرتے رہے کیونکہ اس وقت تک اس خاص زبان پر کوئی مخصوص لسانی لیبل چسپاں نہیں ہوا تھا۔

"ارشاد نامہ" کے مقدمے میں اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ جانم کی زبان اپنے ہم عصروں کی زبان کی نسبت ادبی اعتبار سے اس لئے پست نظر آتی ہے کہ اگر ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد قلی قطب شاہ اور وجہی نے اپنے عہد کی "ادبی زبان" استعمال کی ہے تو جانم نے "مقامی" عوام کی زبان میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نثر و نظم کو ایک مخصوص مقصد کے حصول کا وسیلہ بنایا تھا اور متصوفانہ تصورات اور مذہبی افکار کی نشر و اشاعت کا مقصد ان کے پیشِ نظر تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جانم کے ہم عصر شعراء نے غزل اور مثنوی کی صنف کو اپنایا تھا اور جانم کا خاص موضوع تصوّف تھا۔[1] ڈی پی محمد گنج متر اپنی کتاب "ہندی کا سروت نیا چنتن" میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جانم کے سامنے مربوط نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا جس کی وہ تقلید کرتے ان کا ایک جملہ "ہندی" میں ہے تو دوسرا فارسی میں۔[2]

---

[1] ۔ اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ ارشاد نامہ۔ قدیم اُردو۔ دورِ دوم۔ جلد اول ۱۹۶۱ء۔ ص ۸۲۔

[2] ۔ ڈی پی محمد گنج متر۔ ہندوی کا سروت نیا چنتن۔ ص ۱۰۳۔

Marfat.com

پانچواں باب

گجرات میں اردو شاعری ۱۶۰۰ء تک

شمال سے مالوہ ہوتے ہوئے دکن جائیں تو گجرات پہلی منزل ہے۔ حیرت ہے کہ نویں صدی ہجری (شاید آٹھویں صدی) ہی سے اس نواح میں اردو کا پتا چلتا ہے۔ شیرانی نے تاریخ فرشتہ کا ایک اقتباس دیا ہے جس کے مطابق مالوے کے بادشاہ علاء الدین محمود خلجی (۸۳۹ھ تا ۸۸۰ھ) نے شاہِ ایران سلطان ابو سعید مرزا (۸۵۵ھ تا ۸۷۲ھ) کی مدح میں ایک ہندی قصیدہ بھیجا تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے۔

"قصیدۂ غرّا کہ در مدحِ سلطانِ ایران گفتہ بود، ظاہرا بزبانِ ہندی بود محصوب شیخ علاؤالدین ہمراہِ خواجہ جمال الدین فرستاد۔۔۔ و شہنشاہِ ایران ازاں قصیدہ کہ زادۂ طبعِ بادشاہِ مالوہ بود چنداں محظوظ شد کہ از ہدایائے دیگر آں قدر خوش حال نہ شد"[1]

ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ فارسی رسم الخط میں ہوگا۔ اگر یہ ہندی تھا تو اسے اردو ہی کا سمجھنا چاہیئے۔ اگر شاہِ مالوہ اردو میں شعر کہتا تھا تو اس کے دربار میں ضرور کچھ ہندی اردو شعرا رہے ہوں گے۔

گجرات کی اردو تاریخ کے لیے تین سنین کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ۶۹۶ھ م ۹۷-۱۲۹۶ء میں علاؤ الدین خلجی نے گجرات کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔

۲۔ ۸۰۱ھ م ۱۳۹۸ء میں تیمور نے دلّی پر پہلا حملہ کیا۔ دلّی کا بادشاہ بھاگ کر گجرات میں پناہ لینے گیا۔ مراۃِ احمدی میں لکھا ہے:

"مقارنِ ایں حال سلطان ناصر الدین محمود شاہ از دہلی فرار نمودہ بہ گجرات رسید و از آں جا مایوس شدہ بہ مالوہ رفت"[2]

اسی زمانے میں فیروز شاہ بہمنی نے تیمور کے پاس اپنا سفیر بھیجا۔ تیمور نے خوش ہو کر

۱۔ بحوالۂ شیرانی: گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۰ء و فروری ۱۹۲۱ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اول میں یہ عنوان گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں۔ ص ۱۶۰

۲۔ مرزا محمد حسن علی: مرآتِ احمدی جلد اول ص ۴۷۔ بمبئی۔ بہ حوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۶۱

Marfat.com

دکن، گجرات اور مالوے کے صوبے فیروز شاہ کو عطا کر دیئے۔[1] لطف کی بات یہ ہے کہ ان اصولوں پر تیمور کی حکومت نہ تھی۔ دوسرے کی املاک کو عطا کر دینا خوب ہے۔ بہر حال اس سے لوگوں نے سوچا کہ چونکہ یہ علاقے تیمور نے فیروز شاہ کو تفویض کر دیئے ہیں اس لیے وہاں تیمور کے حملے کا خدشہ نہیں۔ نتیجتہً شمال سے بہ کثرت اولیاء، صوفیا، علماء اور دوسرے لوگ گجرات آ گئے۔ اردو کے فروغ میں یہ اچھا ہوا۔

تیمور کے حملے کے بعد گجرات پر دلّی کی حکومت کی گرفت کمزور ہو گئی۔ وہاں کا صوبہ دار ظفر خاں تھا۔ ۱۴۰۷ء میں دلّی کی حکومت کے حالات اتنے ابتر ہو گئے کہ امرا کے اصرار پر ظفر خاں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۱۴۰۷ء[2] میں وہ مظفر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اس طرح گجرات کی خود مختار سلطنت کا آغاز ہوا۔ مظفر شاہ ہندوستانی الاصل تھا، ایران و توران سے نہیں آیا تھا۔

۳۔ اکبر نے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں گجرات کو مغل سلطنت میں ملا لیا گو چھٹ پٹ لڑائی ۱۵۸۳ء تک جاری رہی۔ اہلِ شمال سے رابطے کی وجہ سے گجرات کی زبان میں فارسی کے عناصر آ گئے۔ اردو کی گجری بولی کے ادب کے لئے سب سے سازگار پونے دو صدیاں تھیں جن میں گجرات کی خود مختار بادشاہت اور علیحدہ شخصیت تھی۔ شیرانی گجری زبان و ادب کے ابھرنے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندو اکثریت سے خود کو ممیّز رکھنے کے لئے اردو کی نگہداشت کی۔ لکھتے ہیں:

> "گجرات کی زبان اگرچہ گجراتی ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم اردو کو اپنی زبان تسلیم کر لیا۔ عام طور پر اقلیتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی قومیت کو غیر اکثریت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی زبان، مذہب اور رسوم کی سختی کے ساتھ پابند ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت گجرات میں مسلمانوں کی ہوئی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔
> قرائن اور آثار سے پایا جاتا ہے کہ گجرات میں شروع ہی سے مسلمان اردو بولتے رہے ہیں"[3]

شیرانی نے گجرات میں اردو کے فروغ کی جو تاویل کی ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ جا بجا اردو کی شناخت کے لئے اس میں مسلمانی عناصر کی موجودگی کو ایک لازمی شرط قرار دیتے ہیں۔ یہ محدود ش

---

[1] عبدالحمید صدیقی: تاریخ بہمنی سلطنت ص ۱۰۳، بہ حوالۂ جمیل جالبی جلد اول، ص ۹۱

[2] ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی: سخنورانِ گجرات۔ ص ۳۶۔ ترقی اردو بورڈ دلّی۔ ۱۹۸۱ء

[3] شیرانی گوجری یا گجراتی اردو۔ مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۶۱

Marfat.com

امر ہے. بہرحال یہ حقیقت ہے کہ گجرات کے تمام اردو مصنفین مسلمان تھے.

ذیل میں گجری شاعری کے قدیم ترین نمونوں اور اہم شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے.

شیخ احمد کھٹو.

ڈاکٹر سمن راجے کی ہندی کتاب "ساہتیہ اتہاس' آدی کال" کے مطابق یہ دلی میں ۱۳۳۶ء (م ۷۳۷ - ۷۳۶ ھ) میں پیدا ہوئے. اس تاریخ کا ماخذ نہیں دیا. ان کا ذکر مولوی عبدالحق' محمود شیرانی اور نجیب اشرف ندوی نے کیا ہے لیکن تفصیلی حالات ڈاکٹر سیّد ظہیرالدین مدنی نے اپنی کتاب سخنورانِ گجرات[1] میں دیئے ہیں. شیخ احمد کے دو مریدوں نے ان کے حالات قلم بند کئے ہیں. مولانا قاسم نے مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول میں اور محمد بن سعید ایرجی نے تحفتہ المجالس میں. دونوں نے زیادہ تر چشم دید واقعات لکھے ہیں. مرقاۃ الوصول شیخ کی وفات کے محض بارہ سال بعد لکھی گئی.

شیخ احمد دہلی کے کسی رئیس کے بیٹے تھے لیکن حالات کے تحت دیندوانہ کے ایک جولاہے کے گھر میں آگئے. وہاں سے کچھ عرصے بعد انھیں ایک بزرگ شیخ اسحاق[2] مغربی کھٹولے آئے اور بڑے ناز و نعم سے ان کی پرورش کی. احمد شیخ اسحاق کو باباجیو اور بابو جیو کہتے تھے. شیخ احمد نے جوانی ہی سے چلّہ کشی' ریاضت اور عبادت کی زندگی اختیار کی. ۸۰۳ھ میں کھٹو سے گجرات بہ مقام پٹن آئے. گجرات کے پہلے بادشاہ مظفر شاہ اوّل کی دعوت پر احمد آباد سے سات میل دور سرکھیج میں سکونت اختیار کی. ۸۴۹ھ میں عیدالفطر سے واپس آئے تو طبیعت خراب ہوگئی. ۱۵ شوال کو رحلت کر گئے. شیخ کو سرکھیج میں دفن کر دیا گیا لیکن تحفتہ الکرام اور مراۃِ احمدی کے مطابق یہ موضع کھٹو میں مدفون[3] ہیں.

شیخ فارسی کے شاعر تھے اور احمد تخلص کرتے تھے. نجیب اشرف ندوی کے مطابق تحفتہ المجالس[4] میں

---

[1] ڈاکٹر سمن راجے: ہندی ساہتیہ اتہاس' آدی کال. کانپور ۱۹۷۶ء ص ۴۰۹

[2] شیخ احمد کھٹو کے حالات اور نمونہ کلام بڑی حد تک سخنورانِ گجرات ص ۴۴ تا ۴۷ سے ماخوذ ہیں.

[3] تحفتہ المجالس کا اقتباس جو اخبار الاخیار میں منقول ہے. بحوالہ شیرانی: اردو کے فقرے اور دوسرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے. مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۴۸

[4] تحفتہ الکرام ص ۲۲ ' مراۃ احمدی ص ۵۰' بحوالہ عبدالحق. اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام. ص ۲۵ فٹ نوٹ.

[5] گجرات میں اردو عہدِ ولی سے پہلے. ملی گڑھ تاریخ ادب اردو. ص ۱۰۰

Marfat.com

ان کے متعدد گجراتی اشعار ہیں. چونکہ شیخ احمد کی عمر کا تقریباً نصف اوّل دلّی میں گزرا اس لئے وہ موجودہ گجراتی زبان کے شاعر تو نہ ہوں گے، گجری اردو ہی کے شاعر رہے ہوں گے. مرقاۃ الوصول میں ان کی زبان سے کم از کم چار ہندی اشعار اور ہوئے ہیں. ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا قیاس ہے کہ یہ شیخ ہی کے ہوں گے. کم از کم دو کی شانِ نزول ایسی ہے کہ وہ شیخ نے فی البدیہہ تصنیف کر کے فرمائے ہوں گے. ہندی کے ڈاکٹر انبا شنکر ناگر[1] نے انھیں گجری کا پہلا شاعر مانا ہے. انھوں نے شیخ کے تین دوہے درج کئے ہیں جو ڈاکٹر مدنی کے منقول دوہوں میں آخری تین ہیں. دونوں کے متون میں ایک آدھ لفظ کا فرق ہے. دونوں کی مدد سے ذیل میں یہ چاروں دوہے درج کئے جاتے ہیں. ہندی میں ان کا ماخذ نہیں دیا لیکن ظاہر ہے کہ مرقاۃ الوصول ہی سے لیا ہوگا. کسی نے تحفۃ المجالس میں مندرجہ دوہے نہیں دیئے.

۱۔ ایک دفعہ ایک شخص نے دوہا پڑھا

توں جانتہ کرتار جی منجہ ساجن بیپر ہ ساس سریسی سار کروں تھاری بالہا

بندگی مخدوم درحال بریں نسق فرمودند[2]

توں جانتہ کرتار جی منجہ سائیں بیپر ہ سائیں کی ہے سار پالجرمانہ جوبن بسنہ

(پنجرہ)

نسق کے معنیٰ کلام کو ترتیب دینا ہے. کیا مرقاۃ الوصول کے فارسی جملے کے یہ معنی ہیں کہ اس شخص نے دوہا غلط پڑھا تھا. شیخ نے درست کر کے پڑھا. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوہا شیخ کی تصنیف نہیں. بعد کے تین دوہے اپنی شانِ نزول کے باعث شیخ کے معلوم ہوتے ہیں.

۲۔ ایک کنیز آنکھوں میں سرمہ ڈال کر شیخ کے سامنے آئی. شیخ نے غضب میں آکر یہ دوہا کہا.

دوکھا کاجل جے کروں، توسوکن دکھ دینا نہ پیو دیکھن دینا مجھ نہ آپ دیکھ سکی نا

۳۔ ایک شخص نے مصرع کہا

بھولی بوجھوں بند تا دورن کسی ماس

اور عرض کیا کہ اس کی مناسبت میں کچھ فرمائیے. شیخ نے دوہا کہا

ویئی بجھتیں ایک پل جانوں برس پچاس جی کن دیکھ دیس کی برسن انت نہ ماس

(دُتیم)

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر سمن راجے: ہندی ساہتیہ اتہاس، آدی کال. ص ۴۰۹

[2] مرقاۃ الوصول بحوالہ سخنورانِ گجرات ص ۴۷

Marfat.com

۴۔ قاضی عالم کے والد قاضی حاکم نے اپنے مکان میں ایک جگہ پردہ باندھا تھا۔ شیخ نے اسے دیکھ کر یہ دوہا پڑھا

تتی بدھی کنزی جوں دھن اوجھل ہوئے　　مور کھ راکھے نین دؤ منہ کے راکھے ہوئے

(تتی)　　(دھی)

ان میں کم ازکم پہلے تین دوہے شیخ کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔ کم ازکم یہ تو یقینی ہے کہ یہ چاروں دوہے ۸۴۹ھ سے پہلے کے ہیں۔

فضل الدین محمد قوام بلخی

یہ احمد آباد کے قریب قصبہ کیری کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ۸۲۷ھ میں ایک فارسی لغت 'فرہنگِ بحرالفضائل' لکھی۔ اس کے چودھویں باب کا عنوان ہے

'در الفاظِ ہندوی کے در نظم بکار آید'

محمود شیرانی نے ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور کے شعبۂ اردو میں ایک مضمون پڑھا 'فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر' یہ مضمون مخزن اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ لغت میں ایک جگہ بلخی نے ذیل کا شعر لکھا ہے

دیکھ پیکھ پیو پر گھر جاوے　　تِس نِس نینو نیند نہ آوے[1]

اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس شعر کا مصنف خود محمد بلخی ہے یا کوئی اور۔ بہرحال اہم بات یہ ہے کہ یہ ۸۲۷ھ سے قبل کی تخلیق ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ بالکل ہندی ہے۔

شاہ عالم م ۸۸۰ھ

ابوالبرکات سراج الدین سید محمد بخاری معروف بہ شیخ منجھن ملقب بہ شاہ عالم حضرت قطب عالم کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں اور نجیب اشرف ندوی نے علی گڑھ تاریخ ادب (ص ۱۰۰) میں شاہ عالم کا سنہ وفات ۸۸۰ھ لکھا ہے۔ قطب عالم پنجاب سے آئے اور گجرات میں بس گئے۔ حضرت شاہ عالم کے متعدد اردو فقرے اور ملفوظات ملتے ہیں۔ ان کے ایک مرید مقبول عالم نے ان کے اور ان کے والد کے اقوال و ملفوظات 'جمعاتِ شاہیہ' کے نام

---

[1] شیرانی فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر۔ مخزن مارچ ۱۹۲۹ء، اپریل ۱۹۲۹ء بار طباعت مقالات شیرانی جلد اوّل ص ۱۱۷۔

Marfat.com

سے مرتب کئے ہیں. اس مجموعے میں ان کے گجری کے اقوال بھی ملتے ہیں۔ ان میں دو ایسے ہیں جنہیں شعر کہا جاسکتا ہے۔ ان کی زبان ہندی آمیز گجری ہے لیکن اس دور میں اردو کو ایسی لفظیات سے اجتناب نہیں تھا۔ پہلا منظوم قول یہ ہے

کاندھی کا راجا تم سر کوئی نہ بوجھے　　سکیں کا راجا تم سر کوئی نہ بوجھے[1]

اس کے بارے میں فرمایا تھا" اگرچہ بزبانِ ہندی است امّا موافقِ عربی است"

مزید فرماتے ہیں کہ کسی نے ذکر کیا ہے کہ سقایہ میں خدا کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ اس کا کیا کروں حق تعالےٰ خود مجھے نہیں چھوڑتا۔ بادشاہ گھوڑے پر سے نہیں اترتا' گھوڑا بیچارہ کیا کرے۔

ایتو بدو بر بھو یا کیں اکہارے　　ہوں لاج مروں بیگ نیارو نہوئے[2]

واللہ اعلم یہ کیسی زبان ہے شاید اُردو رسم الخط نے اسے مسخ کر دیا ہے۔ 'بر بھو' 'پر بھو' ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرع کے معنی یہ ہیں "میں شرم سے مرتا ہوں وہ جلدی الگ (نیارا) نہیں ہوتا' برج کے انداز سے 'ہوں' بمعنی میں ہے۔ نیارا کو نیارو کر دیا ہے۔ والیِ گجرات سلطان قطب الدین م ۸۶۲ھ کو حضرت شاہ عالم سے عقیدت تھی۔ ان کی مدح میں یہ دوہا کہا:

منجھن شاہ جہانیاں جس دیتا سبحان　　شاہوں کیرا شاہ توں دونہ جل تیری آن[3]

شیخ بہاء الدین باجن م ۹۱۲ھ

شاہ بہاؤ الدین کے والد حاجی مغرالدین (مخدوم جہانیاں کے خلیفہ) دہلی سے آکر احمد آباد میں بس گئے جہاں ۹۰۷ھ میں بہاؤ الدین کی ولادت ہوئی۔ ابھی باجن ۴ سال کے تھے کہ ان کے والد ۱ ایک سو پچاس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا[4]۔ باجن شیخ رحمت اللہ بن شیخ عزیز اللہ متوکل مانڈوی کے مرید تھے۔ شیخ رحمت اللہ حضرت نظام الدین اولیا کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ باجن نے دور دور تک سفر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

---

[1] جمعاتِ شاہیہ بحوالہ عبدالحق: اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام. ص ۲۳،

[2] ایضاً　　ایضاً　　ص ۲۴

[3] جمعاتِ شاہیہ جلد پنجم بحوالہ نوائے ادب' اکتوبر ۱۹۵۴ء۔ یہ بحوالہ جالبی ص ۹۸

[4] ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی: سخنورانِ گجرات ص ۴۷۔ دلّی ۱۹۸۱ء

Marfat.com

ایں فقیر از طرفِ سندھ تا خراسان و از طرفِ دکن تا قریب سرحد سیلان مسافرت نمود[1]

باجن حج کے لیے جانے کے بعد گرو کے مرشد کا انتقال ہوگیا۔ شیخ رحمت اللہ ہدایت کر گئے کہ باجن کی واپسی کے بعد انھیں خرقۂ ولایت اور تبرکات دے دیئے جائیں. ڈاکٹر مدنی نے ایک خرقِ عادت واقعہ لکھا ہے کہ واپسی پر باجن نے خرقۂ خلافت اور فرمان مرشد کے مزار پر رکھ دیئے. قوالوں نے باجن کا کلام گانا شروع کیا اور اس شعر پر پہنچے.

شاہ رحمت اللہ رے منجہ پیہ ملاؤ　　تم باج لاگوں کس کے پاؤ

اس وقت قبر سے آواز آئی "باجن لاگے تیرے پاؤ" اسی وقت سے ان کا لقب باجن[2] مشہور ہو گیا. باجن کے معنی باجا ہیں. سیاحت کرتے کرتے یہ برہان پور پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے کیونکہ پیر نے بشارت دی تھی.

"مقام شما در برہان پور است و وصال شما ہماں جا خواہد شد" (خزائنِ رحمت اللہ بہ حوالہ سخنورانِ گجرات ص ۴۸)

ان کی عمر کے آخری چالیس یا اس سے زیادہ سال برہان پور میں گزرے. ۹۱۲ھ میں انتقال کیا. برہان پور میں مدفون ہیں۔ ان کے خلیفہ شیخ علی متقّی ہیں.

ان کی دو تصانیف کا پتا چلتا ہے.

۱. جنگ نامۂ پشواز و ساری. اردو کا یہ جنگ نامہ ۲۱۹ شعروں کی مثنوی ہے. اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۹۱۱ھ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ہے. مخطوطات کی فہرست جلد اوّل میں اس کا نام "جنگ نامۂ پشواز، ساری، چولی، تہبند و ازار" لکھا ہے (ص ۳۶۲ نیز ۴۱۸) لیکن فہرست جلد چہارم میں جہاں اس کا تفصیلی بیان ہے وہاں صرف "جنگ نامۂ پشواز و ساری" لکھا ہے. معلوم ہوتا ہے نسخے کے متن یا ترقیمے میں اس کا نام نہیں دیا، سرورق پر کسی نے نام لکھ دیا ہے. اس کی ابتدا اور اختتام کے دو دو اشعار یہ ہیں.

آغاز:　سنو جھگڑا ساری ہور پشواز کا　　عجائب یو جھگڑا بڑے راز کا

---

[1] شیرانی: گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں. مقالات جلد اوّل ص ۱۴۵ یہ جملہ خزائن رحمت اللہ سے ماخوذ ہے. میں نے شیرانی کے جملے کو شیخ فرید کے منقولہ جملے (دکنی اُردو ص ۱۶۲) کی مدد سے درست کیا ہے.

[2] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں. مقالاتِ شیرانی جلد اوّل. ص ۱۶۴.

Marfat.com

کہ پشواز و ساری دونو سوکناں　　کہ مسکی کے سوکن پہلے ناگنا

خاتمہ:　کہ لڑ سوکناں کے سینے جب تھکے　　سنے شاہ باجن یو جھگڑا لکھے

کیے شاہ باجن ہیں قصہ تمام　　سلامؑ علیکم، علیکم سلام

(فہرست جلد چہارم ص ۶۶-۶۵)

یہ مثنوی اردو وزن میں ہے۔ باجن کا بقیہ کلام ہندی اوزان میں ہے۔ معلوم نہیں اس ہلکے پھلکے موضوع کی مثنوی واقعی معروف شاہ باجن ہی کی ہے یا کسی اور کی؟

۳۔ خزائن رحمت اللہ (فارسی)۔ سب سے پہلے اس کا ذکر محمود شیرانی نے کیا جنھیں اس کا ایک ناقص الطرفین نسخہ ملا۔ اس میں نام درج نہ[1] تھا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اس کے ایک نسخے مملوکہ حکیم توحید میاں خطیبِ جامع مسجد برہان پور کی خبر دی ہے (سخنورانِ گجرات ص ۴۹)۔ ڈاکٹر شیخ فرید نے اپنے مضمون "حضرت شاہ بہاؤ الدین باجن باجن" میں اس کتاب پر شرح وبسط سے لکھا ہے[2]۔ انھوں نے برہان پور کے مزید تین نسخوں کا ذکر کیا ہے جو سیّد احکام اللہ، سیّد محمد مطیع اللہ راشد اور بشیر محمد خاں وکیل مرحوم کے مملوکہ ہیں۔ یہ سب ناقص ہیں۔ ظاہرا توحید میاں کا نسخہ اس کے علاوہ ہونا چاہیئے۔ پاکستان میں اس کے دو[3] نسخے موجود ہیں:

۱۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں گلستانِ رحمت کے نام سے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ فرید شیرانی کے نسخے کا نام "گلستانِ رحمت" لکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے حوالے سے کہی ہے[4] لیکن شیرانی کے نسخے میں تو کوئی نام ہی نہ تھا۔

۲۔ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ناقص الاوّل نسخہ خزانۂ رحمت اللہ کے نام سے (فہرست مخطوطات جلد دوم ص ۳۳۰)

اس کتاب کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نجیب اشرف ندوی[5] نے خزینۂ رحمت، عبدالحق[6]

---

[1] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں۔ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۶۴۔

[2] مشمولہ "دکنی اردو" مرتب ڈاکٹر دلوی۔ بمبئی ۱۹۸۷ء

[3] دکنی اردو ص ۱۷۲ بحوالہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، اردو املا کی تاریخ، معارف جون ۵۱ و علمی نقوش ص ۱۸۱

[4] علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو ص ۱۰۲

[5] ابتدائی نشوونما ص ۲۷

Marfat.com

الف. دنسیم[1] اور ظہیر الدین مدنی[2] نے خزانۂ رحمت اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے فہرست[3] نگار نے خزائنِ رحمت اللہ درج کیا ہے. خود کتاب کے مختلف نسخوں میں نام قدرے اختلاف سے ملتا ہے. ڈاکٹر مدنی کے مطابق کسی نسخے میں اس کا نام یوں درج ہے. . .

"ایں رسالہ را خزانۂ رحمت اللہ" نام نہاد (سخنورانِ گجرات ص ۵۰ دوسری سطر)

ڈاکٹر شیخ فرید نے کسی اور نسخے سے اس جملے کو یوں لکھا ہے

ایں رسالہ را "خزائنِ رحمت رحمت اللہ" نام نہاد (دکنی اردو ص ۱۶۸)

معلوم ہوتا ہے.. ۹ صفحات کی اس کتاب کا نام "خزائن رحمت اللہ" رہا ہوگا. اس کتاب میں سات خزانے یا ابواب ہیں. چھ خزانوں میں مناقب، اہلِ طریقت کے افعال، ان کے حالات، چھ مفتوح اوراد اور بزرگوں کے وصال کی تاریخات وغیرہ ہیں. ساتویں خزانے میں شاہ باجن کے اشعار ہیں. ہمارے لئے یہی حصّہ اہم ترین ہے. .

صوفیانہ گیتوں کی ایک قسم جکری ہوتی ہے. اس کا تفصیلی بیان اسی کتاب کے بارہویں باب میں دیکھئے. باجن نے اپنے پورے کلام کو جکری قرار دیا ہے. خزائن رحمت اللہ کے ساتویں باب کا فارسی عنوان یہ ہے. . .

خزینۂ ہفتم در ذکر اشعار کہ مقولۂ ایں فقیر است، بہ زبانِ ہندوی جکری خوانند و قوالانِ ہند آں را در پردہ ہائے سرودی نوازندو می سرایند. بعضے در مدحِ پیرِ دستگیر و وصفِ روضۂ ایشاں و وصفِ وطنِ خود کہ گجرات است و بعضے در ذکرِ مقصدِ خود و مقصوداتِ مریدان و طالبان و بعضے در عشق و محبت دریں خزانہ بالتفصیل جمع کردہ شد بہ نامِ پر دہا و سرود،[4]

شیخ فرید کے یہاں اس عنوان میں ایک دو لفظ کا فرق ملتا ہے جو اہم نہیں.

یہ موضوعات ہیں باجن کی جکریوں کے. حیرت ہے کہ انھوں نے اپنے وطن گجرات کو بھی ان کا موضوع بنایا. بعد والوں کے یہاں ان میں مشائخ کا شجرہ اور عام طور سے طریقت و سلوک کے مطالب ہوتے

---

[1] تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند. چھٹی جلد ص ۲۱۴.

[2] سخنورانِ گجرات. ص ۴۹.

[3] فہرست. جلد دوم. ص ۲۳۰

[4] جالبی. ص ۱۰۷ سخنورانِ گجرات ص . ۵۰

Marfat.com

تھے. محمود شیرانی نے ایک مضمون[1] میں جکری کی ہیئت درج کی تھی. ڈاکٹر جمیل جالبی نے باجن کی جکریوں کو سامنے رکھ کر اس کی یوں وضاحت کی ہے۔

"ابتدائی اشعار جو ہم قافیہ ہوتے ہیں عقدہ کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد تین تین چار چار مصرعوں کے بند آتے ہیں جنھیں پتین کہا جاتا ہے۔ آخری بند جو عام طور پر تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے تخلص کہلاتا ہے. پہلے دو مصرعے ہم قافیہ اور تیسرا الگ لیکن ہم وزن ہوتا ہے"[2]

اس نظم کا وزن ظاہرا ہندی ہوتا ہے لیکن دراصل یہ لوک گیت کی طرح من کی ترنگ میں لکھا ہوا گیت ہوتا ہے جو نہ اردو وزن پر کسا جا سکتا ہے نہ ہندی وزن پر۔ اسے قوال گاتے ہیں اور اس کے ساتھ مزامیر بھی استعمال کئے جاتے ہیں. سلسلۂ چشتیہ میں غنا اور سماع بہت مقبول رہا ہے اسی لیے جکری کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔ اس کے ساتھ یہ ہمیشہ درج کیا جاتا ہے کہ یہ کس راگ میں گائی جائے گی۔ اس صنف کا گجرات سے خصوصی تعلق ہے۔ شعرائے گجرات کے باہر دو تین جکریاں ہی ملیں گی۔

باجن کے کلام کا سب سے کثیر نمونہ محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں دیا ہے[3]۔ ان کے بعد اور ان سے کم نمونہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے مقالے میں ہے۔ باجن کا کلام نہ صرف ہندی رنگ میں ہے بلکہ اس میں ہندی گیت کے سے جذبات ہوتے ہیں مثلاً یہ اشعار دیکھئے

کھولو کھولو ری یار دکھلاؤ مکھو　　جس مکھو دیکھیں میری نینو جی سکھو
جس مکھو دیکھیں دکھ دلدّر جاوے　　شاہ رحمت کا درسن باجن پاوے[4]

دوہے

بھونرا لیوے پھول رس، رسیا لیوے باس　　مالی سینچے آس کر بھونرا کھڑا اداس

اور ان کی مشہور جکری ہے جسے سب سے پہلے شیرانی نے اور ان کے بعد بہتوں نے نقل کیا۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے نسخۂ شیرانی اور نسخۂ برہان پور دونوں سے لے کر یہ جکری نقل کی ہے۔ اس کے

---

[1] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں۔ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۷۶
[2] تاریخ ادب اردو ص ۱۰۷
[3] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں۔ مقالات جلد اوّل
[4] جالبی۔ ص ۱۰۹

Marfat.com

چند اشعار یہ ہیں:

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے　　جب ملتی ہے تب چھلتی ہے
اوّل ان چھل بہت چھلائے　　ان چھوہری بہتی کھلائے
ان رو کر بہت رُولائے

عقدہ در پردۂ کدارا

مصطفٰے جگ کا موہن رے

کاندھے سوہے کانبلی سر پر سوہے تاج　　لت کت آوے نبی محمد تمھ کارن معراج

اور یہ کلام دیکھئے جس میں اردو عنصر زیادہ ہے

عقدہ در پردۂ بلاول

شرابِ محبت بھر بھر پیالے　　آتشِ عشقت نُقل نوالے
پس روئے رسول مالا مالی　　نبی رسول کی چنوں جالی
بھکاری آیا عیدی مانگے　　بیری کا کچھ تجھ دھر سانگے
صحتِ تن اور عمر دراز　　رزق فراخ توفیقِ نماز
اوکن سکلی کن کر لیٹیں　　باجن کو دیکھن لیٹیں[1]

کلمہ پڑھیں، نماز گزاریں، روزے رکھریں تیس
ایک من ایک جنّت اللہ دھاریں، وِن پروروں سیس

باز رسید ہوائے زمستاں نالے ندیاں بھر پور چلے
دھرتی بھوری ساون آیا باجن روکھڑے
مور پپیہا پیو پیو بولیں جنگل ڈونگر ہرے بھرے[2]

تمیرانی نے گوجری سے متعلق اپنے مضمون میں باجن کی زبان کے سانی پیو پر بھی توجہ

---

[1] جالبی ص ۹۰
[2] فہرستِ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو جلد دوم، ص ۳۳۲

Marfat.com

دلائی ہے. 'یہ فتنی کیا کسے چھلتی ہے' اس حکری کا عنوان پنجاب یونیورسٹی کے نسخے گلستانِ رحمت میں یہ ہے

صفتِ دنیا بہ زبانِ دہلوی گفتہ[1]

لیکن برہان پور کے نسخے میں یہ عنوان ہے

صفتِ دنیا ایں درویش بہ زبانِ ہندی گفت است

خزانۂ رحمت اللہ میں ساتویں خزانے کے عنوان میں جو فارسی عبارت ہے اس میں کراچی کے نسخے میں 'ذکر اشعار کہ مقولۂ ایں فقیر است بہ زبانِ ہندوی'[2] ہے اور برہان پور کے نسخے میں 'بہ زبانِ ہندی'[3] ہے. لاہور کے نسخے میں دو مختلف نظموں سے پہلے لکھا ہے

مناقبِ حضرتِ ایشاں بہ زبانِ دہلوی نبشتہ شدہ است

و ایں مناجات بہ زبانِ ہندوی گفتہ شدہ است[4]

گویا ان کے نزدیک دہلوی' ہندوی اور ہندی ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے۔ ان کی زبان پر گجراتی کے واسطے سے برج کا بہت اثر ہے. برج کی جمع مثلاً کلالن' لوکن وغیرہ دھڑلے سے لاتے ہیں. مخطوطے میں ان الفاظ کے آخر میں ایک ہائے مختفی ہوتی ہے مثلاً درویشنہ' عاشقنہ' کانغرنہ. مجھے یقین ہے کہ یہ دراصل ہائے مخلوط ہے یعنی درویشنھ' عاشقنھ' کلالنھ۔ اس طرح آخری ن یا نھ ساکن سے متحرک نہیں. جمع مضارع میں بھی وہ اسی طرح نھ کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً دھرنہ (دھریں) کرنہ (کریں) یا تو یہ آخری ہا مخلوط ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ ملفوظ نہ ہو محض مکتوبی ہو مثلاً درویشنہ کا تلفظ درویشن ہو' درویشنھ نہ ہو. املے کی یہی روش حضرت سیّد محمد جونپوری کے یہاں تھی 'ہم درویشنہ کی ایہی ریت'. وزن کا تقاضا ہے کہ اسے درویشن پڑھئے یا درویشنھ۔ درویشنہ بروزنِ مستفعِلن نہیں پڑھا جا سکتا۔

---

[1] مقالاتِ شیرانی. جلد اوّل' ص ۱۶۸

[2] فہرستِ مخطوطاتِ انجمن. جلد دوم' ص ۳۳۱

[3] سخنورانِ گجرات ص ۱۱۱

[4] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل. ص ۱۶۹ ـ ۱۶۸

Marfat.com

باجن کے یہاں جمع مضارع کی ایک متروک شکل ملتی ہے۔ دھرنہ یعنی دھرن یا دھرنھ (دھریں) ترسنہ۔ اس صیغے کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ دھرن، کرن مصدر کی شکل میں تو پنجابی وغیرہ کئی زبانوں میں ملتے ہیں لیکن جمع مضارع کی شکل میں نہیں۔

مستقبل میں گا کے علاوہ سوں کا لاحقہ بھی ملتا ہے۔ کری سوں۔ دے سوں (دوں گا)۔ اترے سی۔[1]

شیرانی لکھتے ہیں:

"بحیثیت فارسی نگار شیخ باجن کسی بلند رتبے کے مستحق نہیں ہیں مگر وہ دونوں زبانوں یعنی اردو اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ نہ ان کی شاعری بلند پایہ ہے"

لیکن ہمارے لئے باجن کی اہمیت کسی بڑے شاعر کی نہیں بلکہ قدیم شاعری کی ہے جس نے سولھویں صدی عیسوی میں اردو شاعری کی۔

قاضی محمود دریائی محبوب اللہ :

ان کے مفصل حالات سید نجیب اشرف ندوی نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں اور ڈاکٹر مظہر الدین مدنی نے سخنورانِ گجرات میں دیئے ہیں۔ صوفیا اور اولیا کے تذکروں میں متعدد خوارق اور کرامات دی رہتی ہیں۔ اس کی انتہائی مثال سیر الاقطاب[2] اردو ترجمہ خواجگانِ چشت مصنفہ حضرت الہدیہ بن شیخ عبدالرحیم میں خواجہ معین الدین چشتی کے حالات میں دیکھئے۔ اجے پال جوگی اور شادی دیو کے بیان میں بالکل طلسم ہوشربا کا لطف آجاتا ہے۔ حضرت کے حکم سے شادی دیو راما ساگر حوض کا پورا پانی ایک پیالے میں بھر کر لے آتا ہے۔ کافروں کی سحر خوانی سے پہاڑیوں سے لاکھوں سانپ خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے ساتھیوں کی طرف آتے ہیں۔ خواجہ کے حکم پر ان کے رفقا سانپوں کو پکڑ کر پہاڑیوں کی طرف پھینک دیتے ہیں اور ہر سانپ کی جگہ ایک سایہ دار درخت اگ آتا ہے۔ پھر جادوگر آگ برساتے ہیں لیکن وہ حصار میں داخل نہیں ہو سکتی۔

اجے پال جوگی بہت سے سانپوں کو اپنے جسم کے چاروں طرف لپیٹ کر ہرن کی کھال پر بیٹھ کر آسمان پر اڑ جاتا ہے۔ خواجہ اپنی نعلین آسمان کی طرف بھیجتے ہیں۔ نعلین جوگی کی کفش کاری کرتے

---

[1] مقالات شیرانی جلد اوّل صہ ۱۷۵ - ۱۷۴

[2] محمد معین الدین دردائی (مترجم): سیر الاقطاب ص ۱۴۶ تا ۱۴۸۔ نفیس اکیڈمی کراچی۔ جون ۱۹۷۲ء

Marfat.com

ہوئے زمین پر لاتی ہیں۔ جوگی خواجہ سے معافی مانگتا ہے۔ خواجہ اسے پیالے سے پانی پلاتے ہیں جسے پیتے ہی اس کے سینے سے کفر و شرک کی ضلالت دور ہو جاتی ہے اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ خواجہ نے جوگی سے پوچھا کہ جو خواہش ہو عرض کر۔ اس نے عرش کے مقامات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ نے اس پر نظر ڈالی اور وہ تمام آسمانوں کی سیر کر آیا' فرشتوں کے روکے نہ رکا۔ خواجہ نے پھر پوچھا کہ اور کوئی خواہش ہے۔ جوگی نے کہا' میں حیاتِ دائمی چاہتا ہوں'۔ خواجہ نے اسے قیامت تک زندہ رہنے کی بشارت دی چنانچہ اب بھی لوگوں کو اجمیر کی پہاڑیوں میں کبھی کبھی اجے پال سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات مختلف کتب میں خوارق کا بیان اتنے اختلاف سے ہوتا ہے کہ ان کی نادرستی ثابت ہو جاتی ہے۔ جن کو عقیدہ ہو وہ ان ضعیف روایات پر باور کرے لیکن ایک تحقیقی کتاب لکھنے والے کے لئے دشواری ہو جاتی ہے کہ وہ صوفی اہلِ قلم کے سلسلے میں ان خوارق کو جگہ دے یا نہ دے۔ صوفیاء کے حالات میں ان خوارق اور کراماتوں کے سوا دوسرا مواد بہت کم ہوتا ہے۔ میں نے اس تاریخِ ادب میں جن خوارق کا بیان کیا ہے میں نہ ان کی صحت کا ضامن ہوں نہ میں نے ان کی جانچ پرکھ کی ہے۔ انھیں عوامی عقیدے کے مطابق لکھ دیا گیا ہے۔

قاضی محمود کے دو معتقدوں نے ان کے ملفوظات مفتاح القلوب اور تحفۃ القاری کے نام سے مرتب کئے۔ کنز الکرمات اور فوائدِ محمدی بھی انھیں کے عقیدت مندوں کے ملفوظات کے مجموعے ہیں۔ ذیل میں ان ماخذ کے بجائے زیادہ تر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر مدنی کے بیانات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قاضی محمود کا وطن گجرات کا قصبہ بیر پور تھا۔ ان کے والد قاضی حمید الدین حضرت شاہ عالم کے مرید تھے۔ بیعت کرنے کے بعد جب یہ واپس ہونے لگے تو شاہ عالم نے ہدایت کی کہ بڑودہ میں ان کے والد حضرت قطب عالم سے ملتے جائیں۔ قطب عالم نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھ کر دبانے کی کوشش کی لیکن یہ نہ دبے۔ اس پر قطب عالم نے کہا

برادرا ہوں چاو لندھا چاو لندھا

شاید 'چاؤ لندھا' گجراتی کا کوئی مرکب لفظ یا فقرہ ہوگا۔ بہرحال اس روز سے قاضی حمید شاہ چائلندھا یا چائلندہ یا چالندھا یا چلندھا کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ شاہ چائلندھا نے چار شادیاں کیں۔ یہ چاروں بہنیں تھیں اور ایک کے انتقال کے بعد دوسری

Marfat.com

سے شادی کی۔ قاضی محمود ۸۷۳ھ میں پہلی بیوی[1] سے پیدا ہوئے۔ جب محمود کی شیر خوارگی کا زمانہ تھا ان کے والد انھیں شاہ عالم کے پاس لے گئے۔ شاہ عالم نے بچے کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اتنا بلند کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں شیخ کے شملے تک پہنچ گئے اور شاہ عالم کہتے جاتے 'قاضی کا شملہ بڑا' قاضی کا شملہ بڑا'۔ یہ ان کی عظمت کی پیشین گوئی تھی۔

یہ لڑکپن ہی سے سخت ریاضت اور مجاہدہ کرنے لگے۔ چلّے کھینچتے' نیم کی پتیوں سے روزہ افطار کرتے' جاڑوں میں تمام رات پانی میں کھڑے رہ کر ریاضت کرتے۔ یہ اپنے والد سے بیعت کے لئے درخواست کرتے لیکن وہ ٹالتے رہے جس کی وجہ سے محمود بہت ناامید رہنے لگے تھے۔ آخر انتقال سے ایک دن پہلے شاہ چائلندھانے ۹۱۱ھ میں انھیں اپنا مرید بنایا۔ اس پر قاضی محمود نے جوشِ مسرّت میں ایک نظم لکھی۔ والد سے بیعت کے باوجود انھیں حضرت شاہ عالم سے خصوصی ارادت تھی۔

سخنورانِ گجرات میں ڈاکٹر مدنی نے لکھا ہے کہ قاضی محمود ۹۲۰ھ میں احمد آباد سے بیرپور چلے گئے اور شاہ عالم کے انتقال کے بعد تعزیت و فاتحہ کے لئے احمد آباد پہنچے۔ ڈاکٹر مدنی یہ فراموش کر گئے ہیں کہ شیرانی کے بقول شاہ عالم کا انتقال ۸۸۸ھ میں ہوا۔ ندوی اور مدنی دونوں نے اس سلسلے کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ندوی لکھتے ہیں کہ قاضی محمود حضرت شاہ عالم کو ان کے عرف منجھن شاہ سے یاد کیا کرتے تھے۔ شاہ عالم نے وفات سے پہلے اپنے خلیفہ کو قاضی محمود کے لئے کچھ تبرکات سپرد کئے۔ ان کے انتقال کے بعد قاضی محمود خلیفہ سے ملے تو حسبِ عادت پیر مرحوم کے لئے منجھن شاہ کا نام استعمال کیا۔ خلیفہ کو یہ ناگوار گزرا اور انھیں تبرّکات دینے سے انکار کر دیا۔ قاضی نے کہا 'نہ دو میں مزار پر جا کر طلب کرتا ہوں خود شاہ عالم قبر سے باہر آ کر مجھے دیں گے'۔ قاضی مزار پر گئے اور جوش و جذبہ کے ساتھ ایک نظم پڑھی جس کا پہلا اور آخری بند یہ ہے

کی کروٹ لی اہرا سائیں　　اوس رھن کی بیلا ناہیں
مل بچھڑے کی اب بیلا آہیں
قطب عالم تن جو ہو پاؤں　　چن چین کلیاں سیج بچھاؤں
آج میتھا منجھن شاہ پاو لاگے ماؤں

---

[1] سخنورانِ گجرات۔ ص ۵۲

Marfat.com

اس کا یہ اثر ہوا کہ شاہ عالم سینے تک قبر سے باہر نکل آئے اور انھوں نے تبرکات کے علاوہ حلوہ و نان کے عطیے سے بھی سرفراز کیا۔[1]

ڈاکٹر مدنی نے اس معرکے کو قدرے اختلاف سے بیان کیا ہے۔ قاضی نے خلیفۂ شاہ عالم (نبیرۂ قطب عالم شیخ جیو) کو مزار پر لے جا کر کہا کہ پہلے آپ نام سے آواز دیجئے پھر میں آواز دوں گا دیکھیں کسے جواب ملتا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے آواز دی جواب نہ ملا۔ پھر حضرت محمود نے گریہ وزاری کے بعد کہا "منجھن میاں۔ منجھن میاں محمود غریب آپکی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ اس پر مزار سے آواز آئی کہ محمود ہم نے تمھارا سلام قبول کیا۔ اس پر حضرت محمود نے تبرکات مانگے۔ قبر سے ایک ہاتھ باہر آیا اور ایک کرتا اور حلوہ حضرت محمود کو عنایت کیا۔[2]

دونوں بیانات کا فرق ظاہر ہے۔ اگر شاہ عالم اپنے خلیفہ کو ایک پندرہ سال کے لونڈے سے زک دلانا چاہتے تھے تو شیخ جیو کو خلیفہ ہی کیوں بنایا۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار فی ابرار میں لکھا ہے کہ سلطان مظفر کے زمانے میں قاضی محمود احمد آباد میں بڑے ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ خود کو محمود غریب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ کہتے ہیں

من میں گرب توں مت کرے تج سیں ہیں کئی لاکھ　　تیرا کہنا کون سنے محمود ساں ماکھ
(گرو)

انھیں دریائی کا لقب اس لئے دیا گیا کہ دریائی سفر میں جب آفت آتی تو لوگ حضرت محمود کو یاد کرتے۔ آپ کو کشف سے معلوم ہو جاتا اور آپ مدد فرماتے۔ اس طرح یہ گجرات کے خواجہ خضر تھے۔

ان کی وفات کی تاریخ اور روایت میں بڑا اختلاف ہے۔ مجمع الاولیا[3]، تحفتہ الکرام[4] اور خزینۃ الاصفیا[5] میں ۹۲۰ھ کو تاریخِ وفات قرار دیا ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں قطعۂ تاریخ بھی ہے۔

---

[1] ندوی: علی گڑھ تاریخ۔ ص ۱۱۶۔

[2] مدنی: سخنورانِ گجرات۔ ص ۵۷۔

[3] بحوالہ مقالاتِ شیرانی۔ جلد اوّل، ص ۱۷۷۔

[4] تحفتہ الکرام، جلد اوّل، ص ۸۱ بمبئی۔ بحوالہ جالبی ص ۱۱۰ فٹ نوٹ

[5] خزینۃ الاصفیا جلد دوم، ص ۸۰۔ مطبع ثمرِ ہند لکھنؤ بحوالہ جالبی ص ۱۱۱۔ ۱۱۰ فٹ نوٹ نیز مقالاتِ شیرانی، جلد اوّل، ص ۱۷۷

Marfat.com

حضرتِ محمود شیخِ باکمال　　سالکِ مشکل کشا، محمود داں
شد چوزیں دنیا فانی در جہاں　　سالِ وصلِ او بگو 'شیخِ ہدا'

'شیخِ ہدا' سے ۹۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔

عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی اسرار الابرار میں سنہ انتقال ۹۲۵ھ درج کیا ہے۔[1] مراۃ احمدی کے مطابق وہ ۹۲۰ھ میں احمد آباد سے اپنے وطن بیر پور گئے جہاں ۹۴۱ھ میں انتقال کیا۔[2] ذیل کے حضرات نے بھی یہی سال درج کیا ہے۔

مولوی عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۶۳ اور قدیم اردو ص ۹۴۔

سخاوت مرزا: تذکرۂ حضرت مخدومِ جہانیاں جہاں گشت ص ۱۲۹۔ نور احمد فریدی: تذکرۂ شاہ رکنِ عالم ص ۵۹۱۔ جمیل جالبی: تاریخِ ادب اردو ص ۱۱۰۔

اور اب روایات کا اختلاف دیکھئے۔ ندوی لکھتے ہیں۔

ان کا ایک مرید عماد الملک بیمار ہوگیا۔ جب بچنے کی امید نہ رہی تو ایک قاصد آیا کہ عماد الملک کے حق میں دعا کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ قاصد اصرار کرتا رہا۔ تب انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنی عمر کے بقیہ بارہ سال عماد الملک کو دے دیں گے۔ وہ قاصد کے ساتھ عماد الملک کے شہر گئے۔ اس کے منھ میں دم کیا۔ وہ اچھا ہوگیا لیکن اگلے دن ان کا وصال ہوگیا۔ ان کا جنازہ بیر پور لایا گیا۔[3]

اس روایت میں یہ محلِ نظر ہے کہ قاضی صاحب نے کہا تھا کہ عماد الملک کی عمر پوری ہوگئی لیکن وہ اس کے بعد ۱۲ سال زندہ رہا۔ اپنے لئے کہا تھا کہ عمر کے بارہ سال باقی ہیں لیکن وہ فوراً انتقال کر گئے۔ گویا عرش پر رکھی لوحِ محفوظ کے احکام غلط تھے۔

اب ملاحظہ ہو سخنورانِ گجرات کی روایت جو کسی کتابِ ملفوظات ہی سے لی ہوگی۔

۱۳ ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۹۴۱ھ میں حضرت محمود چانپانیر (محمد آباد) میں تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کا عرس کا دن تھا۔ رات کا کچھ حصہ گزر چکا تھا۔ انھوں نے کھانا منگایا۔ تھوڑا کھانا کھا کر

---

[1] الف۔ دنسیم: تاریخ ادبیاتِ مسلماناں چھٹی جلد۔ ص ۲۱۶

[2] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل۔ ص ۱۷۷

[3] علی گڑھ تاریخ۔ ص ۱۱۸۔

Marfat.com

اٹھ گئے اور کہا میرے سینے میں درد ہوتا ہے' میں آرام کروں گا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو حضرت نے کہا میرے سینے میں شدت کا درد ہے۔ حاضرین نے سینے پر گرم دواؤں کی مالش کی اور سینکا۔ اس کے بعد حضرت نے وضو کیا' سورۂ یٰسین پڑھی' چند نفلیں پڑھیں اور قبلہ رو بیٹھ کر یہ شعر پڑھا۔

کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ ایں درگاہ　　بحقِ اشہدُ ان لاالٰہ الّا اللہ

اور جان دے دی۔[1]

حقیقتِ حال یہ ہوگی جس پر ندوی کی بیان کردہ روایت ایزاد کر دی گئی۔ مراۃِ احمدی نے دردِ سینہ سے موت کو ان کے شایانِ شان نہ سمجھ کر لکھ دیا کہ حضرت نے مجلسِ اسماع میں وجد و حال کی حالت میں انتقال کیا۔[2]

قاضی محمود کو موسیقی کا بہت شوق تھا چنانچہ ان کی مجالس میں داؤد اور حسن نامی دو موسیقار یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

مولوی عبدالحق نے ان کی زبان کے بارے میں لکھا ہے۔

"قاضی صاحب کا کلام ہندی میں ہے یعنی وہ ہندی جو دہلی کے علاقے میں مروّج تھی۔ بحریں بھی ہندی ہیں۔ کہیں کہیں مقامی گجراتی اور عربی فارسی کے لفظ بھی آگئے ہیں"[3]

ان کے یہاں تین خصوصیات نمایاں ہیں ۱۔ زبان میں ہندی ۲۔ فن میں موسیقی اور ۳۔ موضوع میں حسن و عشق۔ اس کی تائید میں ذیل کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

"از تجلّیاتِ عشق پیوستہ حسبِ حالِ عاشقانہ بہ ہندی بہ طرزِ دل پسندی می بست"[4]　　تحفۃ الکرام

"اشعارِ عاشقانہ بہ زبانِ ہندی فرمودے"[5]　　خزینۃ الاصفیا

"قاضی محمود از تجلّیاتِ عشق پیوستہ بر حسبِ حال نقشِ عاشقانہ بہ عبارتِ ہندی در مقاماتِ ہندیہ

---

[1] سخنورانِ گجرات۔ ص ۵۸-۵۷

[2] ایضاً　　ص ۵۸

[3] قاضی محمود دریائی۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۸ء۔ بازطباعت قدیم اردو ص ۹۵۔ کراچی ۱۹۶۱ء

[4] تحفۃ الکرام۔ جلد اوّل۔ ص ۸۰۔ بحوالۂ مقالاتِ شیرانی۔ جلد اوّل۔ ص ۱۷۶۔

[5] خزینۃ الاصفیا۔ جلد دوم۔ ص ۸۰ بحوالۂ مقالاتِ شیرانی اوّل۔ ص ۱۷۷

Marfat.com

بہ طرزِ دل پسندی بست"[1] مراۃ احمدی

پروفیسر ابراہیم ڈار نے احمد آباد کے ایک کتب خانے میں ان کے دیوان کی خبر دی ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

'دیوان سارے کا سارا ہندی زبان و صوفیانہ رنگ میں ہے'[2]

ڈاکٹر مدنی نے لکھا ہے کہ قاضی محمود کی بحریوں کا ایک مجموعہ احمد آباد کے مشائخ[3] خاندانِ شہدی میں محفوظ ہے جس کی مائکرو فلم نقل مدنی کے پاس ہے۔ ابراہیم ڈار نے اسی کا ذکر کیا ہو گا۔ ایک دیوان مولوی عبدالحق کے پاس تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان میں وہی نسخہ ہونا چاہیئے۔

جالبی نے لکھا ہے کہ ہندوی روایات کے مطابق شعرا اپنا ایک ہندوی تخلّص رکھتے تھے۔ کبیر نے کبیر داس اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے الکھ داس تخلّص اختیار کیا۔ اسی روایت کے تحت قاضی محمود اپنے نام کے ساتھ داس کا لفظ استعمال کرتے تھے مثلاً

تِس محمد اللہ یارا محمود داس سورا تاری[4]

ان کے کلام کی زبان ہی ہندی نہیں' اس کی ادبی روایات بھی ہندی ہیں۔ رادھا کرشن کے معاملے کی وجہ سے ہندی شعر میں پتی پتنی روپ کی روایت چل گئی ہے۔ اس کے مطابق شاعر خود کو پتنی (عشق کرنے والی عورت) اور خدا یا مرشد کو پتی (محبوب شوہر) قرار دیتا ہے۔ اردو کے صوفی شعرا کے یہاں بھی اس کے متعدد نمونے ملتے ہیں جنھیں ڈاکٹر برکاش مونس نے اپنی کتاب میں تفصیل سے دیا ہے۔ محمود دریائی نے بھی اس رنگ میں بکثرت لکھا ہے۔ ایک شعر اور ایک نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو۔

نینوں کا جل' مکھ تنبولا' ناک موتی' گل ہار سیس نماؤں' نیہ اپاؤں' اپنے پیر کروں جوہار

ارے بادل تو برسیں نیکی دھار ہوں رنگ آپنے سب دکھ من بسار

---

[1] مراۃ احمدی۔ کلکتہ ص ۱۲۱۔ بحوالہ جالبی۔ ص ۱۱۱

[2] ابراہیم ڈار: گجرات کا ایک قدیم شاعر۔ رسالہ اردو' جولائی ۱۹۴۰ء۔ ص ۲۸۸' بحوالہ تاریخ مسلمانان۔ جلد ششم۔ ص ۲۱۷

[3] سخنورانِ گجرات۔ ص ۵۰۔

[4] جالبی۔ ص ۱۱۳

Marfat.com

اطلس کیری انگیا سوہے سوؤں لال سو موتی
آج پریتم گھر آویں گے ہوں ہیوں بیر بھوٹی
چک کا جل کر کنگن چولا ادھر تنبول سو ہنیا
کوئب چیر پاٹو ہریا لا دیکھت موہے رسیا

قاضی محمود نے جب پتی پتنی روپ میں لکھنا شروع کیا تو احمد آباد کے مشائخ نے خیال کیا کہ قاضی محمود کلام ہندی میں بکواس کرتے ہیں کہ وہ زن اور خداخاوند ہے۔ کلماتِ نامشروع کہتے ہیں۔ سب جمع ہو کر شاہ عالم کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ جا کر محمود ہی سے معلوم کرو۔ یہ سب ان کے پاس گئے قاضی صاحب سب حضرات کو بڑی شفقت سے اپنے گھر لے گئے اور ایک خاص جوش کے انداز میں ایک نظم سنائی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

آؤ جی میرے لاڑ کھیلے ہو کنٹھ لاگو گود بھاؤ باندھا جوڑا سر سے چھوٹا' تب ہو رنگ ناباؤ

معلوم نہیں کہ اس نظم میں اعتراض کا جواب کہاں ہے۔ یہ نظم خود پتی پتنی روپ میں ہے۔

امیر خسرو اور شیخ باجن کی طرح قاضی محمود ہندوستانی موسیقی کے بڑے ماہر تھے۔ حجری لکھنے والوں میں وہ سرِ فہرست ہیں۔ ہر حجری کے قبل واضح کر دیتے ہیں کہ وہ کس راگ میں گایا جانا چاہیئے۔ راگنی گوری سے نمونہ ملاحظہ ہو

تو کیا جانے پریم کہانی تجھ میں ہونا ہوڑا پانی
نین حیوے اپنا آل گنوایا ڈھونڈ رہات نا اس من لایا

والد کی بیعت کی خوش خبری پر جو نظم کہی وہ چوپائی کی بحر میں ہے

کہی منجھ پنڈت داس بچاری کوسوں گرہا منجھ سر بھاری
کی مجھ ہنس مکھ ویسے باہاں کی سادھ رہے من مانہاں

ڈاکٹر مونس لکھتے ہیں

'کیا ان چوپائیوں کو ہندی میں شامل نہ کرنے کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے'[1]۔

مثال دیگر۔ درملہار

---

[1] علی گڑھ تاریخ۔ ص ۱۰۴ — ۱۰۳

[2] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ص ۱۹۰

Marfat.com

آیوری مجھ ملن کے کاج　　تجھ پر پیار میرا ہے آج
تپتی تھی نِت جپتی تھی　　تجھ کارن بھی کھپتی تھی

کبھی کبھی عربی فارسی الفاظ بھی لے آتے ہیں

پانچوں وقت نماز گزاروں دائم پڑھوں قرآن　　کھاؤ حلال، بولو مکھ ساچا، راکھو درست ایمان
دین دنی کی نعمت پاؤ جو جنت راکھو شانوں　　محمود مکھ تیں تل نہ بسارے اپنے دھنی کا نانوں

عشقِ الٰہی میں بدمست، اس موسیقار کی شاعری اس شدت سے ہندی آہنگ اور ہندی روایات میں سرشار ہے کہ اسے اردو ادب کا جزو گردانتے قدرے تکلف ہوتا ہے لیکن ہم مان ہی چکے ہیں کہ اس گئے گزرے عہدِ پاستاں میں ہندی اردو میں کوئی فرق نہ تھا۔

قاضی محمود کے پسماندگان کے اشعار:

سیّد نجیب اشرف ندوی نے علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو[1] میں لکھا ہے کہ قاضی محمود کے انتقال پر ان کے صاحبزادوں اور بھائی نے جنازے کو مخاطب کر کے کچھ شعر پڑھے۔ یا تو انھوں نے دوسروں کے شعر پڑھے یا شعر خود انھیں کی تصنیف تھے۔ اشعار یہ ہیں

شاہ چاند محمد۔ قاضی محمود کے سوتیلے بھائی تھے۔ ان کے تین اشعار میں سے ایک یہ ہے۔

تم بن مج کو سب جگ سُنّا، کس دھر رکھوں راؤ　　میٹھے بچنوں بولو ساتھی، کیوں نہیں کہتے آؤ

شاہ لاڑ محمد۔ فرزند

تجھے مانگوں تجھے مناؤں سمروں تیرا ناؤ　　لاڑ سے محمود پیا سوں موکھ دیکھ بل جاؤ

شاہ جمال۔ فرزند

نینوں نیند نہ آوے ہیں، نہ سادھ من مانہاں　　کس دن ملے توں مجھے گل دے دے بانہاں

شیخ تاجن

یہ قاضی محمود کے خلیفہ تھے جب انھیں بیعت و خلافت ملی تو انھوں[2] نے ایک نظم لکھی جو قاضی محمود کو بہت پسند تھی۔ اس کا ایک بند لکھا جاتا ہے

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۱۸
[2] ایضاً ص ۱۲۰

Marfat.com

اسمندر کنے آئے گئے کو تھر ہر نہ رہیا　　نین در لاج ارے تج کو میں بہوتیں کہیا
میرا میرا کی گرو کینن باندھی نمورے　　جو کہتے ہم ہیں لورے سو نر گئے ادھورے
آخر وہ پچھتاوین گے چھیلے کل جگ گورے

شاہ علی محمد جیو گام دھنی ۹۷۳ھ :

آپ کے جدِّ اعلیٰ سیّد احمد کبیر رفاعی معشوق اللہ تھے۔ آپ کے والد کا نام اور لقب قطب عالم شاہ ابراہیم جمال اللہ تھا۔ شاہ علی محمد کا لقب بھی معشوق اللہ تھا۔ ان کی تاریخِ وفات متفقہ طور پر ۹۷۳ھ ہے۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۷۷ برس کی عمر میں ہوا[1] جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تاریخِ پیدائش ۸۹۶ھ یا ۸۹۵ھ رہی ہوگی۔ ان کا مولد و ماویٰ احمد آباد گجرات تھا۔ صاحب تذکرۂ اولیائے دکن نے لکھا ہے کہ گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا یعنی گاؤں کے مالک۔ اسی کو قدیم تلفظ سے گام دھنی کہا گیا[2]۔ اسی تذکرے میں لکھا ہے کہ محمد غوث گوالیری گوالیر سے گجرات آئے تو آپ سے ملے اور آپ کے کلام کو تسلیم کیا۔

شیخ علاؤ الدین ثانی برناوی نے اپنی کتاب چشتیہ ۶۶-۱۰۶۵ھ میں لکھا ہے کہ جب شیخ بہاؤ الدین برناوی گجرات گئے تو احمد آباد میں شاہ علی محمد جیو کے مہمان ہوئے۔ شاہ صاحب نے شیخ برناوی کو اپنا ہندی کلام سنایا جو شیخ نے پسند کیا۔ اس پر شاہ علی محمد نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ شیخ برناوی کو پیش کیا[3]۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا دیوان اُن کی بات میں مرتب ہو چکا تھا۔ کتابِ چشتیہ میں لکھا ہے کہ وہ نسخہ اب تک شیخ کے ذخیرے میں موجود ہے۔

مراۃ احمدی میں لکھا ہے کہ محلّہ سلطان پور بیرونِ دروازۂ رائے پور شاہ علی محمد جیو کا بسایا ہوا ہے[4]۔ شاہ صاحب کا انتقال ۱۴ جمادی الاول ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) کو ہوا۔ ان کا مزار احمد آباد میں اندرونِ حصار دروازہ رائے کھڑ میں ہے۔ کتابِ چشتیہ کے مطابق ان کا نقش نگیں

---

[1] سخنورانِ گجرات۔ ص ۵۹۔

[2] تذکرۂ اولیائے دکن بحوالہ عبدالحق: مضمون شاہ علی محمد جیو گام دھنی، رسالہ اردو جولائی ۲۸ء۔ بازطباعت قدیم اردو ۱۹۶۱ء۔ ص ۵۸۔

[3] گوجری یا گجراتی اردو۔ مقالاتِ شیرانی۔ جلد اوّل۔ ص ۱۷۹۔ ۱۷۸

[4] علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۹۔

Marfat.com

'اللہ باقی محمد ساقی' تھا جو پان کی شکل میں کندہ کیا گیا تھا۔ جب مریدوں کو شجرہ دیا جاتا تھا تو اُس پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔[1]

ان کے دیوان کا نام 'جواہرِ اسرارِ اللہ' ہے۔ اس کی دو ترتیبیں ہیں۔ پہلی ترتیب کے مرتب کے نام میں اختلاف اور خلفشار ملتا ہے۔ شیرانی نے پنجاب میں اردو میں اس کا نام شیخ حبیب اللہ بن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی لکھا۔[2] مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۲۸ء میں شاہ علی محمد جیو پر ایک مضمون لکھا۔[3] مولوی صاحب کے نسخے میں مرتب کا نام ابن الحسن شیخ محمد ابنِ عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی لکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نتیجہ نکالا کہ ابوالحسن شیخ محمد اور شیخ حبیب اللہ دو بھائی تھے جو عبدالرحمٰن کے بیٹے تھے۔ اس تضاد کی انھوں نے دو متبادل تاویلیں کیں۔ یا تو ابوالحسن شیخ محمد کی جگہ سہواً شیخ حبیب اللہ لکھا گیا ہے ۲۔ یا دونوں نے الگ الگ ترتیب کیں۔

شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء میں مضمون لکھا 'گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں' اس میں انھوں نے نسخے کا فارسی دیباچہ نقل کیا[4] اور ثابت کیا کہ مرتب کا نام شیخ حبیب اللہ ابنِ عبدالرحمٰن ہے لیکن فٹ نوٹ میں وہ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق نے مرتب کا نام ابن الحسن شیخ محمد بن عبدالرحمٰن لکھا ہے جب کہ صحیح نام ابوالحسن ہے چونکہ دوسری ترتیب کے مرتب نے یہی نام لکھا ہے، نیز فارسی قصیدے میں مرتب نے خود اپنا نام ابوالحسن نظم کیا ہے۔[5] اس طرح یہ توطے ہو گیا کہ اس کا نام ابن الحسن نہیں ابوالحسن ہے۔ لیکن شیرانی اس تضاد سے گزر گئے کہ ان کے نسخے میں مرتب کا نام شیخ حبیب اللہ ہے اور دوسرے مرتب نیز قصیدے کے مطابق اس کا نام ابوالحسن ہے۔

'اردو کی ابتدائی نشوونما' میں مولوی عبدالحق نے شیرانی کی تقلید میں مرتب کا نام شیخ حبیب اللہ لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابوالحسن اور حبیب اللہ دو علیحدہ شخصیتیں یا دو بھائی نہیں بلکہ ایک ہی

---

[1] مقالاتِ شیرانی۔ جلد اوّل، ص ۱۷۹

[2] ایضاً صد ۱۹۰

[3] قدیم اردو۔ ص ۵۹

[4] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل، ص ۱۸۰ - ۱۷۹

[5] مقالاتِ شیرانی۔ جلد اوّل، ص ۱۸۰

Marfat.com

آدمی ہیں. نام ابوالحسن اور لقب حبیب اللہ ہے. شاہ علی محمد کے جدِّ اعلیٰ کا لقب معشوق اللہ، والد کا لقب جمال اللہ، خود شاہ صاحب کا لقب معشوق اللہ تھا. ان کے بیٹے کا نام اور لقب شاہ مصطفےٰ حبیب اللہ اور دو پوتوں کا نام سیّد عبدالقادر شاہ علی جیو نادر اللہ اور شاہ ابراہیم معرفت اللہ۔ یہ دیکھتے ہوئے کوئی شک نہیں رہتا کہ ابوالحسن کا لقب حبیب اللہ رہا ہوگا۔

دوسری ترتیب شاہ صاحب کے پوتے شاہ ابراہیم نے کی. اس کی ابتداء میں ایک طویل عربی عبارت ہے پھر فارسی دیباچہ جس میں صراحت کی ہے کہ میرے دوستوں نے کہا کہ جواہر اسرار اللہ کا دیباچہ جو ابوالحسن شیخ محمد نے لکھا ہے وہ نہایت مختصر ہے، آپ اس پر نیا دیباچہ لکھیے. میں نے ان کی تعمیل کی ہے، کلام کو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ابوالحسن شیخ محمد کے اس قصیدے کو بھی درج کر دیا ہے جو انھوں نے حضرت علی محمد جیو کی مدح میں لکھا تھا۔[2]

حق یہ ہے کہ ترتیب ثانی میں کلام اس قدر ہے جس قدر ترتیب اوّل میں ہے لیکن مرتب ثانی نے یہ جدّت کی[3] ہے کہ اسے ابواب میں تقسیم کر دیا ہے. اس نے کلام کو ردیف کے اعتبار سے تقسیم نہیں کیا بلکہ ہر نظم کے پہلے لفظ کے پہلے حروف کے اعتبار سے تقسیم کیا ہے. اس طرح ہر حرف کا ایک باب قائم کیا ہے باب الالف، باب الباء وغیرہ۔ یہ ترتیب بے معنی ہے. اس سے کوئی رہبری نہیں ہوتی. مرتب نے نظموں کی تقسیم حجری کے انداز پر کی ہے. باجن کے یہاں حجری کا پہلا بند عقدہ، درمیانی بند بیتین اور آخری بند تخلّص کہلاتا تھا. یہاں مرتب نے پوری نظم کو مکاشفہ کہا ہے اور بندوں کو نکتہ. پہلا بند نکتۂ اوّل در عقدہ. پھر نکتۂ دوم، نکتۂ سوم وغیرہ جیسے حجری میں بین اوّل، بین دوم ہوتی تھیں. آخر میں نکتہ در تخلّص ہے۔ اس طرح نکتہ یعنی بند ہے. انھوں نے بھی پہلے بند کو عقدہ اور آخری بند کو تخلّص کہا.

لام کے باب میں ایک صنفِ نظم 'سی حرفی' ہے. اس میں ہر حرفِ تہجی سے متعلق ایک شعر یا ایک مصرع کہا جاتا ہے. اس میں مثلّث کی طرح بند ہوتے ہیں. بارھویں باب میں اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے گا. شیرانی لکھتے ہیں.

---

[1] ندوی: علی گڑھ تاریخ. ص ۱۰۸

[2] مقالاتِ شیرانی. جلد اوّل، ص ۱۸۰

[3] ایضاً ص ۱۸۵

Marfat.com

'معلوم ہوتا ہے بارہ ماسے کی طرح سی حرفی بھی ہندی نظم کی ایک پرانی شاخ ہے'[1]

'سی حرفی' فارسی لفظ ہے۔ ہندی صنف کا یہ نام نہیں ہو سکتا تھا۔ پنجابی میں یہ قدیم میں بھی رائج تھی اور آج بھی رائج ہے۔ حیدر آباد میں جواہرِ اسرار اللہ کی دونوں ترتیبوں کے مخطوطات ملتے ہیں اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

مراۃ احمدی کے مصنف نے ان کے کلام کو ایران کے صوفی شاعر محمد شیریں مغربی م ۸۰۹ھ کے برابر رکھا ہے۔

'جز نقشِ توحید نہ سرودے۔ دیوانے دارد بہ زبانِ ہندوی در روش و معنی برابرِ دیوانِ مغربی است'[2]

عبدالحق لکھتے ہیں

"اگرچہ وحدتِ وجود کے مسئلے کو وہ معمولی باتوں اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں مگر ان کے الفاظ اور بیان میں پریم کا رس گھلا معلوم ہوتا ہے۔ طرزِ کلام بھی ہندی شعراء کا سا ہے۔ زبان ان کی سادہ ہے لیکن چونکہ پرانی ہے اور اکثر نیم مانوس الفاظ استعمال کر گئے ہیں اس لئے آجکل اس کا سمجھنا مشکل ہے"[3]

شیرانی بھی ان کی زبان کو مشکل اور دقیق بتاتے ہیں کیونکہ یہ پانچ سو سال پرانی اردو ہے اور اس میں گجراتی الفاظ کثرت سے ہیں۔

"خیالات و جذبات زیادہ تر ہندی ہیں اگرچہ فارسی جذبات بھی موجود ہیں"[4]

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

"شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام فلسفۂ ہمہ اوست کا ترجمان ہے اور اس میں اثباتِ توحید و وجود اور اسرارِ اللہ کو مختصر الفاظ میں اشاروں میں بیان کیا گیا ہے۔ گام دھنی بہت مشکل پسند شاء

---

[1] مقالات شیرانی جلد اوّل صہ ۱۸۵

[2] مراۃ احمدی جلد دوم، ص ۴۱ بحوالہ شیرانی مقالات، جلد اول، ص ۱۷۸۔ نیز خاتمۂ مراۃ احمدی ص ۶۵ اور تحفۃ الکرام، جلد اوّل، ص ۴۱ بحوالہ جالبی۔ ص ۱۱۵

[3] اردو جولائی ۲۸ء۔ باز طباعت قدیم اردو۔ ص ۶۱

[4] مقالات جلد اوّل۔ ص ۱۸۴

Marfat.com

ہیں اور ہر بات کو صرف اشاروں میں بیان کرنے کی وجہ سے ان کے کلام میں ابہام نمایاں ہو گیا ہے۔ سارا کلام وارداتِ قلبی، عرفانِ ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے"[1]

"ان کی شاعری کا مجموعی مزاج ہندوی ہے جس پر ہندی اسطور، روایت، ضمیات و رمزیات کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ باجن اور محمود دریائی کا کلام بھی اسی ہندی روایت کی کڑیاں ہیں لیکن گام دھنی کے کلام میں ہندوی روایت بہت گہری ہو کر اپنا ایک نیا رخ نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ گام دھنی کا کلام ہندی روایت کا نقطۂ کمال ہے"[2]

دیوان کی ابتدا سے مولا اور اپنی ذات کے ایک دوسرے کے ضم ہونے کے موضوع کے یہ اشعار دیکھئے۔ مولوی عبدالحق نے ان کے معنی بھی لکھ دیئے ہیں۔[3]

آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں　　آپیں آپس لے گل لاؤں
(گلے لگاؤں)

میرا ناؤں منجے اَتِ بھاوے　　میرا جی منجے پیر چاوے
میری نیہ منجھی سوں مائے　　رہری اپنیں روپ لبھائے
(سمائے)

کہیں سو مجنوں ہو بر لاوے　　کیں سو لیلیٰ ہوئے دکھاوے
(فریفتہ)

کہیں سو خسرو شاہ کہاوے　　کہیں سو شیریں ہو کر آوے
کہیں سو ساتھی کہیں علی جیو　　علی محمد کہیں کہاوے
کہیں سو شاہ حسینی راجا　　ایویں تل تل بھیس پھراوے
(اسی طرح لحظہ بھیس بناوے)

دیگر

مکاشفہ:۱۔ عاشق ہوں معشوق خدا کا　　آج نہیں میں سہی سدا کا

---

[1] مقالات جلد اول صـ۱۱۵
[2] " " صـ۱۱۶
[3] قدیم اردو ص ۶۲

Marfat.com

۲۔ فلک فلک اے خادم میرے طبل بجاویں نوکھنڈ مانہاں
قطب علی شاہ علی محمد ندا کریں سب ٹھائیں ٹھانہاں

مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی چھپ کر ہووے رات سنگھاتی
ولے سنبھال سو بکھرے کیسا دن ہو آوے سورج بھیسا
(بال)

مخطوطۂ آصفیہ لائبریری حیدرآباد سے
نکتۂ دوم یہ روپ پیا کر جاؤ توں جگ کیری بھیس آؤ توں
سب ماں ہی کرتا بھاؤ توں

دیگر کھول گھونگھٹ چھوری لاجا دو چولہوں کیری کا جا
جہاں ایتا گھونگھٹ کیجے سب کھول کھول نہ دیجے

ایک مکاشفے کے دو بند اور ان کے معنی ڈاکٹر پرکاش مونس کی کتاب[1] سے لکھے جاتے ہیں۔

ادھر پنوالی، چک رتنالی بینی باسک ہور تل کالی
ایہہ جیو مانگیں بھویں دمالی
جو جیوڑا پیو سوں لاگا ہئے جس نیہ کی آگا
تنہوں کا لوبھ سا بھاگا

(ہونٹ پان سے لال ہیں۔ آنکھیں سرخ ہیں۔ زلفیں سانپ جیسی ہیں اور کالے تل اور دنبالہ دار ابرو دل مانگتی ہیں۔ جو دل پیارے پریتم سے لگا اور جس کے دل میں محبت کی آگ روشن ہوئی اس کا تمام لوبھ (طمع) فرار ہو گیا۔)

ان کے شعر کا ترنم، حسن کے دل کش بیانات اور عشق کا والہانہ پن ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی زبان کو جیسا مشکل اور خیالات کو جیسا مبہم کہا گیا ہے مثالوں سے ویسا تو نہیں

---

[1] اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر۔ ص ۱۹۳

Marfat.com

معلوم ہوتا۔ ان کی زبان اور خیالات کی ہندی زدگی مسلّم ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا کلام فارسی اثرات سے بے نیاز نہیں۔ شیرانی نے اس ضمن میں دو امور کی طرف توجہ دلائی ہے[1]۔

اوّل یہ کہ انھوں نے بعض فارسی اوزان استعمال کیے ہیں مثلاً

رجز مربّع سالم — مستفعلن مستفعلن

کوجائے پیو کہتا نہیں — اے بھائیو ہوں کیا کروں

ہزج مربّع سالم — مفاعیلن مفاعیلن

جو جیوڑا پیو سوں لاگا — ہیے جس نیہ کی آگا

دوم بعض مصرعے فارسی ضرب الامثال سے ماخوذ ہیں

ع۔ جے تم لیلیٰ جو یا لوڑو منجھ مجنوں کی نینوں دیکھ

سعدی کے مشہور فقرے لیلیٰ را بہ چشمِ مجنوں باید دید سے ماخوذ ہے۔

ع ساجن گھر میں کرے سو لٹکے اے گگن پر ڈھونڈھن جانویں

فارسی کے ضرب المثل مصرع یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم

کا پرتو ہے۔ اسی طرح انھوں نے بعض فارسی فقروں اور محاوروں کے ترجمے کئے ہیں۔

'کان کرو یہ پرم کہانی' میں 'کان کرو' 'گوش کُنید' کا ترجمہ ہے

ع دھن تجھ پر لٹکے کیوں نہ کرے، تجھ جیسا ساتھی پیار دھرے

میں لٹکے کرنا، 'ناز کردن کا' اور 'پیار دھرنا' محبت داشتن کا ترجمہ ہے۔

میاں مصطفےٰ گجراتی م ۹۸۴ھ

ان کے اجداد بوہرہ تھے لیکن ان کے دادا مہدوی عقیدے پر ایمان لے آئے۔ ان کا تعلق سید خوندمیر کے دائرے سے تھا۔ وطنِ مالوف گجرات تھا لیکن میاں مصطفےٰ پٹن میں قیام کرتے تھے۔ انکی والدہ انھیں پیار سے 'خوب میاں' کے نام سے پکارتی تھیں جو گجرات کا مقبول نام ہے۔ مثنوی فیضِ عام[2]

---

[1] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۸۷ تا ۱۸۹

[2] مثنوی فیضِ عام۔ بحوالہ شیرانی: دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۰ء و فروری ۱۹۴۱ء۔ باز طباعت مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۸۳ نیز نارتبز فیض عام۔ فہرستِ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ جلد دوم ص ۳۳۸

Marfat.com

کے مطابق انھوں نے ۵۲ سال کی عمر میں ۹۸۴ھ میں انتقال کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ۹۳۲ھ میں پیدا ہوئے. اشعار یہ ہیں۔

میاں مصطفٰے کی مبارک عمر　　سو باون برس کی اتھی سر بسر
عدد سنہ ہجری کا بولو اتالے　　گئیں یوں کہ نوسو اسّی چار سال

۹۸۴ھ

یہ پٹن سے نکل کر مختلف مقامات پر گھومتے رہے. اکبر بادشاہ سے بھی ملاقات کی. وہاں علماء سے مناظرے کیئے. اکبر نے انھیں بہت پسند کیا اور ان کی تعظیم کی لیکن دوسرے علاقوں کے مغل سرداروں نے ان کے مہدوی عقیدے کے سبب انھیں اور ان کے ساتھیوں کو بہت سی اذیتیں دیں. گجری بولی کی ایک نظم میں کہتے ہیں

جو پیو جی ہم سوں نہیں جبرا　　وے چوکیں جو کہیں برا ہوا
کیا ہوا جو مغلوں بند پڑے　　لے پکڑ جو بیڑیوں ماہنہ جڑے
جوں چور سو آگل کئی کھڑے
جو پیو جی ہم سوں نہیں جبرا　　وے چوکیں جو کہیں برا ہوا
کیا ہوا جو ہالے بہت ہے　　کیا ہوا جو ساتھی چھوڑ چلے
کیا ہوا جو اس پنتھ جلے بلے[1]

جب میاں مصطفٰے مورجی گئے تو ایک فارسی آمیز ریختہ[2] لکھا. اس کا ایک بند یہ ہے

اس لٹکے اوپر واری رے　　اس غمزے کے بلہاری رے
دل برد بہ یک رفتار کہ خوش　　دیں برد بہ یک گفتار کہ خوش
ناگاہ متاعِ ہوش و خرد　　وابستہ بداں دستار کہ خوش
اس لٹکے اوپر واری رے
اس غمزے کے بلہاری رے

ان کے مکتوبات نیز مثنوی فیضِ عام میں ایک اور ریختہ یا سہیلا ملتا ہے جس کی فارسی بحر

(گذشتہ حوالہ)
[1] ایضاً مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۷۸-۱۷۷
[2] ایضاً ص ۱۹۹

Marfat.com

ع فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن ہے لیکن ہندی اشعار من کی ترنگ میں لکھے معلوم ہوتے ہیں نمونہ یہ ہے

عجب ایں فضلِ خدا شد کہ یار دابستہ ما شد — دلش از قیدِ رقیباں بہ ہمہ وجہ جدا شد
ناگہاں بر دَرم آمد کہ بہ باشیم ہمیں جا — جانم از غایتِ شادی زپئے رقص بپا شد
جم جم شادیاں روزی سہیلا ساز واری گاؤ
نت نت خوبیاں ادکیاں خوشی کے تھال بھراؤ[1]

ان دونوں ریختوں میں ایک اُردو بیت بار بار ٹیپ کے طور پر آتی ہے۔ میاں مصطفےٰ کا بس اتنا ہی اردو کلام ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو شاعر کے طور پر ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان چند اشعار کو ایک مہدوی بزرگ کے تبرّک کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

شیخ خوب محمد چشتی :

خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ ان کے فارسی رسالے 'خلاصۂ موجودات' کے آخر میں ایک شعر ہے

باخموشی از دلم آمد ندا در گوشِ ہوش — خوب! باہر یک مگو تاریخِ مولودت "خموش"

لفظِ خموش سے ان کی تاریخِ ولادت ۹۴۶ھ برآمد ہوتی ہے[2]۔ حیرت ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی پر گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ مرشد کی تاریخِ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ اردوئے قدیم میں ۱۰ شعبان ۱۰۰۹ھ دی ہے (ص ۵۱) لیکن اس کا ماخذ نہیں دیا۔ یہی تاریخ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے تاریخِ ادبیاتِ مسلماناں میں درج کی ہے لیکن مولوی عبدالحق نے مثنوی خوب ترنگ کی شہادت پر ثابت کیا کہ شیخ کا انتقال ۹۷۹ھ میں ہوا۔ خوب ترنگ میں صراحت ہے۔

وارثِ محمدی ہر ٹھانوں — شیخ کمال محمد نانوں
کیا عروج مقام اقدام — اللّٰہم اغفر و ارحم
کہ تاریخ تہنوں کی خوب — جن عدد 'ذاکر محبوب'

---

[1] دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ۔ مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۲۰۰

[2] نجیب اشرف ندوی: علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو ص ۱۲۱۔ عبدالحق: ابتدائی نشوونما۔ ص ۶۷

[3] ص ۲۲۲ بحوالۂ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی: گجرات میں مذہبی مثنویاں۔ نوائے ادب۔ ۱۹۵۰ء

Marfat.com

'ذاکر محبوب' سے ۹۷۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ 'اللّٰھم اغفر وارحم' سے واضح ہے کہ تصنیفِ مثنوی ۹۸۶ھ سے قبل مرشد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انڈیا آفس کے نسخۂ خوب ترنگ سے یہ سرخی نقل کی ہے۔

'آغازِ کتابِ خوب ترنگ بعضے مقالاتِ شیخ کمال محمد رحمتہ اللہ در معارفِ محمدیہ علیہ السلام' اس سے بھی ظاہر ہے کہ شیخ کمال محمد مثنوی سے قبل انتقال کر چکے تھے۔

تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ ان کی تاریخِ وصال 'خوب تھے' ہے[1]۔ اس سے ۱۰۲۳ھ نکلتا ہے۔ معلوم نہیں مولوی عبدالحق کے پاس اس کتاب کا کون سا نسخہ تھا جس میں تاریخِ وفات ۱۱۰۳ھ لکھی ہے[2] اور جس پر مولوی صاحب بجا طور پر معترض ہیں۔ لیکن 'خوب تھے' انھوں نے بھی درج کی ہے۔ شمس اللہ قادری نے صحیح تاریخ ۲۴ شوال ۱۰۲۳ھ دی ہے[3]۔ ان کا مزار چوک احمد آباد میں خان دروازے اور فرحت الملک کی مسجد کے پاس ہے۔

ان کی سوانحِ حیات کے بس یہی تین واقعات ولادت، شیخ کمال کی مریدی اور وفات معلوم ہیں۔

مرزا محمد حسن علی محمد خاں بہادر کی مصنّفہ مراۃِ احمدی گجرات کی تاریخ ہے۔ شیرانی کے مطابق اس کی جلد دوم طبعِ فتح الکریم ۱۳۰۷ھ اور علی شیر قانع کی تحفتہ الکرام جلد اوّل ص ۸۶-۸۵ تک ایک دوسرے کی حرف بہ حرف نقل ہیں لیکن پروفیسر نواب علی کی مرتبہ مراۃ احمدی جلد دوم مختلف ہے[4]۔ تحفتہ الکرام اور مراۃ احمدی میں خوب محمد کے بارے میں لکھا ہے۔

درویشِ کامل و صاحبِ لسان و صاحب سخن بودند۔ در تصوّف دستِ رسا داشتند و بر 'جامِ جہاں نما' شرح نوشتہ۔ امواجِ خوبی و خوب ترنگ از ایشاں یادگارِ مشہور و معروف است[5]"

---

[1] تحفتہ الکرام جلد اوّل ص ۶۷۔ بحوالہ جالبی ص ۱۲۰

[2] عبدالحق، میاں شیخ خوب محمد چشتی۔ رسالہ اردو جنوری ۲۹ء بازطباعت قدیم اردو، ص ۳۷

[3] اردوئے قدیم ص ۴۹

[4] شیرانی، اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے۔ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۰ء۔ بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل۔ فٹ نوٹ ص ۱۵۰

[5] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۹۰ و جالبی ص ۱۲۰

Marfat.com

نجیب اشرف ندوی نے ان کی فارسی تصانیف کی یہ فہرست دی ہے۔[1]

۱۔ حفظِ مراتب ۲۔ شروبِ جام ۳۔ عقیدۂ صوفیہ ۴۔ خلاصۂ موجودات ۵۔ صلح کل

تحفۃ الکرام اور مراۃ احمدی میں لکھا ہے کہ انھوں نے 'جامِ جہاں نما' کی شرح لکھی۔ ہو سکتا ہے کہ 'شروبِ جام' اسی کی شرح ہو۔ ظہیر الدین مدنی نے اس کتاب کا نام 'شرابِ جام' لکھا ہے۔ انھوں نے اس فہرست کی چار کتابوں کے موضوعات یوں لکھے ہیں۔[2]

حفظِ مراتب نثر ۱۰۰۹ھ کی تصنیف ہے۔ ضخامت ایک سو ایک صفحات۔ سوال و جواب کے پیرائے میں وحدتِ وجود کے نکات واضح کئے ہیں۔ عقیدۂ صوفیہ بھی فارسی نثر میں ہے۔ آخر میں ملفوظی تاریخ ۱۰۱۳ھ درج ہے۔

خلاصۂ موجودات پانچ صفحے کا فارسی رسالہ ہے۔ اس میں قطعۂ تاریخ میں ملفوظی تاریخ ۱۲ رجب ۱۰۱۴ھ دی ہے۔

صلح کل بھی فارسی نثر میں ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰۱۶ھ درج ہے۔

خوب ترنگ کی فارسی شرح امواجِ خوبی ان چھ کتابوں کے علاوہ ہے۔ اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ اس طرح انھوں نے کل سات فارسی کتابیں لکھیں۔

مثنوی خوب ترنگ۔ اس کی تاریخ ذیل کے اشعار میں درج کی گئی ہے۔

نسخے کی تاریخ اس ٹھانھ — پائے عدد ہر مصرعے ٹھانھ
خوب محمد گنے بچار — چودہ گھاٹ اوس برس ہزار
دوجا چاند جو تھا شعبان — دیس دوشنبہ کیا بیان[3]

دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ ۹۸۶ھ کا عدد برآمد ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ پہلے مصرع میں 'گنے' ہے۔ بعض کتابوں میں 'کئے' لکھا ہے۔ لیکن صحیح تاریخ گنے ہی سے برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں پیش کو ادا کرنے والا واو بھی شامل کرنے سے اعداد پورے ہوتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ مصرعِ ثانی میں ملفوظی تاریخ بھی ہے کہ ایک ہزار میں سے چودہ

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو ص ۱۲۱
[2] سخنورانِ گجرات ص ۶۱
[3] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۹۳

Marfat.com

گھٹانے سے عدد مل جاتا ہے۔ قباحت یہ ہے کہ 'گھاٹ' کے معنی 'گھٹانا' کوئی نہ سمجھے گا' دریا کا گھاٹ سمجھ کر مصرع کے معنی میں کھو جائے گا۔

نثیرانی نے دوجا چاند کے معنی محض دوئے کر لکھا ہے۔

'خوب ترنگ دوشنبے کے دن دوم شعبان ۹۸۶ھ کو ختم ہوتی ہے'[1]

لیکن انجمن ترقی اردو کی تقویم کے مطابق پہلی شعبان کو جمعہ تھا اور دوم شعبان کو شنبہ یعنی سنیچر تھا' دوشنبہ سوموار نہیں۔ اگر 'دوجا چاند' کے معنی ہندی کی دوج یا دوئج کا چاند ہو یعنی سلخ تو یہ مہینے کی آخری تاریخ کو ہوتا ہے اور اس دن بھی جمعہ تھا۔ اب یہ صورت بچتی ہے کہ رجب کی آخری تاریخ کو چاند رات تھی۔ اس سے اگلی رات کو دوجا چاند کہا ہو۔ یہ شعبان کی پہلی تاریخ تھی اور اس دن بھی جمعہ تھا۔ غرضیکہ کس طرح دیکھا جائے دوشنبے کے دن کی مطلوبہ تاریخ حاصل نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

لیکن شعر میں منظوم تاریخ کیا خوب ترنگ کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ محمد عاصم برہان پوری نے خوب ترنگ کا فارسی منظوم ترجمہ نغماتِ حیات کے نام سے کیا۔ انھوں نے اس شعر کا یہ ترجمہ کیا ہے۔

دومِ شنبہ بود و شعبان روز (کذا) شد شروع ایں نسخۂ بس دل فروز[2]

لیکن اردو خوب ترنگ میں کہیں یہ اشارہ نہیں، کہ شعر میں آغازِ کتاب کی تاریخ نظم کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخ کے اشعار کتاب کی ابتدا میں ہیں لیکن یہ تکمیل کتاب کے بعد لکھ کر شروع میں شامل کیے گئے ہوں گے جس طرح آجکل کتابوں کا مقدمہ ابتدا میں ہوتا ہے لیکن زمانی اعتبار سے تکمیلِ کتاب کے بعد لکھا جاتا ہے۔

مرشد سے دن رات کچھ باتیں سن کر میاں خوب محمد کو ترنگ آئی اور اس لئے کتاب کا نام خوب ترنگ رکھا۔

وہ جیوں منجہ کو آئی ترنگ جمع کیے نے تس تس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب مدحِ رسول اللہ باب

---

[1] مقالاتِ نثیرانی جلد اوّل، صـ ۱۹۲

[2] بحوالہ شمس اللہ قادری: قدیم اردو ص ۵۱

Marfat.com

ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے (ص ۱۵) میں اس کتاب کا نام خوش ترنگ لکھا ہے جو سہو ہے۔

کتاب کا موضوع معرفت و مذہب و اخلاق ہے لیکن ان کے یہاں علی محمد جیو گام دھنی یا قاضی محمود دریائی کی طرح فنا فی العشق والی بات نہیں بلکہ انھوں نے مسائلِ تصوّف نظم کیے ہیں۔ بیشتر مسائل کو حکایتوں کے تمثیلی پیرائے میں اجاگر کیا ہے عبدالحق گام دھنی کی کتاب جواہرِ اسرارِ اللہ سے اس کا مقابلہ کر کے لکھتے ہیں۔

"خوب ترنگ اس کے مقابلے میں ایک خشک کتاب ہے جس میں صوفیانہ اصطلاحات میں تصوّف کے مقامات کا بیان ہے۔ میاں خوب محمد۔۔۔۔۔ تصوف کے نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں"[1]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انڈیا آفس کے نسخۂ خوب ترنگ کا مطالعہ کر کے اس کے متعدد عنوانات[2] درج کئے ہیں۔ ان میں سے چند درج کیے جاتے ہیں تاکہ موضوع کا بہتر اندازہ ہو سکے۔

حضرتِ وحدت۔ قوس احدیت۔ حضرتِ الٰہیت۔ قوسِ ظاہر وجود۔ حقائق موجودات۔ خلق پیش از ظہور عینِ حق بود و بعد از ظہور عینِ عالم۔ حق فاعل بہ صفات است نہ بہ ذات۔ وغیرہ۔

بیچ بیچ میں بار بار 'سوال و جواب تنبیہہ' کا عنوان آتا ہے۔ مثنوی کی ہیئت کی یکسانیت کو شکست کرنے کے لئے کئی بار 'جھولنہ' لے آتے ہیں۔ جھولنا دکن میں ولی کے عہد تک ملتا ہے۔ یہ ہندی کی ایک صنفِ سخن ہے۔ اس میں چار چار مصرعوں کا ایک بند یا کئی بند ہوتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے مصرعے ہم قافیہ اور تیسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ شاذ چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ خوب ترنگ کے جھولنے میں صرف دو اشعار ہوتے ہیں اور دونوں مثنوی کے ڈھنگ پر مختلف القافیہ ہوتے ہیں۔ ہر مصرع ہندی کے ۲۷ ماترائی وزن کا ہوتا ہے مثلاً نظم کا پہلا جھولنہ یہ ہے

ہے گھونگھٹے مکھ منہ چھپا جنہ جان پینن کو بھی لاگ نہیں

---

[1] اردو کی ابتدائی نشو و نما ص ۶۹-۶۸

[2] ابواللیث صدیقی: قدیم اردو کے دو نادر مخطوطے۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۲ء ص ۸۸

Marfat.com

— ہوں سمجھے کون کہیا پن سمجھن نہیں ہے پینین کون بھی ماگ نہیں

جیوں دیکھے ہیں سبیں دیکھیں تھیں سکی دیکھیں کون کھوں دیکھ کریے
ایسا بھید کچھ کو چٹ رہے کھویے گھونگھٹا سو کیوں خوب پڑیے[1]

پرانی ہندی زبان اردو رسم الخط میں کچھ کی کچھ پڑھی اور نقل کی جاتی ہے جس کے سبب اس کا موزوں پڑھنا اور مفہوم سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

خوب ترنگ کی حکایات میں سب سے مشہور حکایت صفائِ دل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چین میں مصوّروں کا ایسا باکمال گروہ تھا جو اڑتے مصوّر کی تصویر بنا دیتا تھا۔ باہر سے ایک دوسرا گروہ آکر بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ نے دونوں گروہوں کا امتحان لینے کے لئے طے کیا کہ دونوں آمنے سامنے کی دیواروں پر نقش بنائیں۔ بیچ میں پردہ تان دیا گیا۔ چین کے مصوّروں نے دیوار پر بہترین رنگوں سے بہترین تصویریں بنائیں۔ دوسرے گروہ نے صرف یہ کیا کہ اپنی دیوار کو اتنا شفاف اور تابندہ کر دیا کہ آئینے کی طرح ہوگئی۔ بادشاہ آیا۔ چین کے نقّاشوں کی تصویروں کی داد دی۔ جب درمیان کا پردہ اٹھایا گیا تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دوسری دیوار پر بھی ویسی ہی تصویریں تھیں یعنی عکس دکھائی دے رہا تھا۔

دیس وعدے کا تھا جب　　محل دیا سلطان نے تب
بلا چیتا ری آنیں تانہ　　دور کیے پردے اک ٹھانہ
سب حیرت منہ ہوئے سو دیکھ　　دو نہ پاسوں چتریا اک بھیکہ[2]

آغاز کتاب میں موجود (میں) کے مسئلے پر بحث کرتے ہیں جو ۱۶۷ شعروں کو محیط ہے۔ اس میں موجود کی تین قسموں موجودِ وجود، موجودِ ذہنیں یعنی صفات اور موجودِ اضافی یعنی اِسم کی تشریح کی گئی ہے[3]۔ بالکل ابتدائی اشعار

ہے موجود سو کیتی ثناں　　پہلوں اس کا کر عرفان
اک موجود وجود ج ہوئے　　کس کی چھٹ پر چھٹا نہ سوئے

---

[1] ابواللیث صدیقی: قدیم اردو کے دو نادر مخطوطے۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۲ء۔ ص ۸۸

[2] عبدالقادر سروری: اردو مثنوی کا ارتقاء ص ۳۸۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۶۸ء

[3] ڈاکٹر ابواللیث: اردو کے قدیم کے دو نادر مخطوطے اردو جولائی ۵۲ء ص ۸۷

Marfat.com

وہ آپیں ذاتیج چھاج ذات نہ وہ چھٹ ماں محتاج

ہب دوجا موجود پچھان وے موجود سو ذہیں جان
دھریا اس کا نانوں صفات ہاتھ لاوَتب پائے ذات[1]

اس طرح پوری کتاب میں تصوّف کے مسائل نظم کیے ہیں جنھیں حسبِ موقع تمثیلی حکایات سے سمجھایا ہے۔ ان میں شیخ چلہی (شیخ چلّی) کی حکایت بھی ہے۔

خوب ترنگ میں ایک طرف ہندی زدہ زبان ملتی ہے مثلاً چین کے نقّاشوں کے بیان میں، دوسری طرف زبان کا رجحان عربی فارسی کی طرف بھی ہے مثلاً غوامضِ معرفت کے بیان میں مثنوی کی ابتدا میں اپنی زبان کے لئے کہتے ہیں۔

جیوں میری بولی منھ بات عرب عجم مل ایک سنگھات

انڈیا آفس کے نسخے میں حاشیے میں دوسرے مصرع کی تشریح یوں کی ہے۔

'یعنی زبانِ عرب و عجم یک جا کردہ ایں نسخہ نوشتہ اند'[2]

اپنی شرح امواجِ خوبی میں لکھتے ہیں

"ہر یک شعر بہ زبانِ خود تصنیف کردہ اند و می کنند و من بہ زبانِ گجراتی کہ الفاظ عجمی و عربی آمیزاست"[3]

اس اقتباس میں 'کردہ اند و می کنند' کے صیغے حیران کن ہیں۔ کیا یہ کسی دوسرے نے لکھے ہیں۔ مثنوی کی ابتدا میں اس کی زبان کے لئے یہ بھی کہا ہے۔

جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولے بولی گجرات

امواجِ خوبی میں بولی گجرات کا ترجمہ 'ہندی' کیا ہے[4]

خوب ترنگ میں اپنے سے پیشتر کے مصنفوں کی نسبت عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے کا

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث: اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے اردو جولائی ۵۲ء ص ۸۷

[2] ایضاً ص ۸۳

[3] عبدالحق: میاں شیخ خوب محمد چشتی۔ قدیم اردو ص ۶۹

[4] ایضاً

Marfat.com

رجحان زیادہ ہے. لیکن بعض اوقات یہ عربی فارسی الفاظ کو دکنی طریقے سے مسخ کر لیتے ہیں. شیرانی نے یہ مثالیں دی ہیں۔[1]

مصرے (مصرع). دُرس (درست). داندانوں (دندانہ کی جمع). دریے (دریا۔ ندی بھلے دریے میں جد). کاگل (کاغذ). تانبا (طعمہ)

بیلا تانبے کی تھی تب — تانبا کھاتے تھے وے سب

زلیچہ (زیلوچہ یا غالیچہ). ذہنی (ذہین). خو (خوے: پسینہ)

دکنی کی جو خصوصیات ہیں وہ اس گجری مثنوی میں بھی ملتی ہیں. رسالہ اردو میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے مضمون[2] میں اس کا لسانیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

خوب ترنگ کئی بار چھپ چکی ہے. حمیدیہ کالج بھوپال میں غالباً جرمنی کا ٹائپ ایڈیشن ہے۔

امواجِ خوبی. یہ خوب ترنگ کی فارسی نثر میں شرح ہے. دیباچے میں لکھتے ہیں

'آغازِ خوب ترنگ' ترجمۂ شرح نما کہ مسمّی است بہ امواجِ خوبی از بعضے منقولاتِ حضرت شیخ کمال محمد رحمم اللہ در معارفِ محمدیہ علیہ السلام'

اس کی تاریخ دو اشعار سے برآمد کی ہے. پہلا شعر یہ ہے۔

شمارِ عدد شمار ز تاریخِ شرحِ نعتِ محمد — ہزار سال مکمّل ز فکرِ خوب محمد

شیرانی لکھتے ہیں: "شرحِ نعتِ محمد' اور 'فکرِ خوب محمد' اس کے مادۂ تاریخ ہیں"[3]

شاید شیرانی نے مادوں کو حل کر کے نہیں دیکھا. 'شرحِ نعتِ محمد' سے ۱۱۲۰ھ نکلتے ہیں۔ یہ صحیح تاریخ نہیں. 'فکرِ خوب محمد' سے ۱۰۰۰ھ برآمد ہوتے ہیں اور یہ صحیح تاریخ ہے۔

تاریخ کا دوسرا شعر ہے۔

شمارم سالِ شرحِ نعتِ احمد — دہم سال از دہم عشر از دہم صد[4]

دسویں صدی کی دسویں دہائی کا دسواں سال یعنی ۱۰۰۰ھ۔ حیرت ہے کہ اس واضح ملفوظی

---

[1] شیرانی: مقالات جلد اوّل ص ۱۹۲

[2] اردو۔ جولائی ۵۲ء۔ ص ۹۱ تا ۹۶

[3] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۹۱

[4] ایضاً

Marfat.com

تاریخ کو شمس اللہ قادری نے ۹۹۹ھ پڑھا ہے[1]۔ خوب محمد نے تاریخ کے دونوں اشعار میں اپنی کتاب کو 'نعتِ احمد' کہا ہے۔ خود خوب ترنگ میں بھی کہا تھا

نعت میں کرتا ہوں سیر　　یا اللہ تمّم بالخیر

دراصل خوب ترنگ کا موضوع نعت نہیں، مسائل تصوّف ہیں۔

مصنّف نے امواجِ خوبی کو "ترجمۂ شرح نما" کہا تھا۔ شیرانی لکھتے ہیں:

"امواجِ خوبی حقیقت میں شرح کہلانے کی مستحق نہیں ہے کیونکہ اس میں مصنّف نے اپنی مثنوی کے متن کی پابندی کا بہت کم لحاظ رکھا ہے، نہ ہر شعر کی علیٰحدہ علیٰحدہ تشریح کی ہے البتہ مطالب وہی ہیں۔"[2]

'اس دور کی ابتدائی اردو' وہ بھی نظم، مسائلِ تصوّف کے بیان کی متحمّل نہ ہو سکتی تھی۔ خوب ترنگ میں لکھتے ہیں

اینہاں شعر کا قصد نہ لیکھ　　اینہاں مراتب کہوں سو دیکھ
ارض سما منہ جے نہ سمائے　　وزنِ شعر منہ وے کیوں آئے

یہی بات امواجِ خوبی کے دیباچے میں کہی ہے۔

"ایں جا قصد شعر مبیں حفظِ مراتب نہ کنی کہ مضمونِ مراتب بغایت مُغلق و اشکالے تمام دارد و اگر قصدِ رعایتِ شعر باشد از افہام مُستَمِعان دور تر افتد کہ ما دمعنی فی الارض ولا می اسماء کہ در زمین و آسمان نہ گنجد در وزنِ شعر و قافیہ چگونہ سنجد"[3]

لکھتے ہیں کہ یہ مشکل مضامین وزن و قافیے کی قید کے ساتھ ادا نہیں کیے جا سکتے۔ سوال یہ ہے کہ وضاحت کی خاطر نثر میں لکھا تو فارسی نثر میں کیوں لکھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک اردو یا گجری کو نثر کا وسیلۂ اظہار نہیں بنایا گیا تھا۔ دوسری وجہ وہی ہے جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر گرفت کیا ہے کہ ۹۸۰ھ میں اکبر نے گجرات کو فتح کر لیا تھا جس کی وجہ سے زبانِ گجری کمزور ہو گئی اور شمال سے فارسی کا ریلا آیا۔ نظم تو انہوں نے گجری میں لکھ دی۔ خیال آیا ہوگا کہ فارسی میں بھی لکھ کر اپنی اہمیت و قدر و قیمت کا احساس دلائیں۔

---

[1] اردوئے قدیم ص ۵۰

[2] مقالاتِ شیرانی اوّل ص ۱۹۲

[3] بحوالہ جالبی۔ ص ۱۶

Marfat.com

فارسی میں خوب ترنگ کا ایک ترجمہ اور ایک شرح دوسرے حضرات نے لکھی۔ ان کی تفصیل شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں دی ہے۔[1]

۱۔ محمد عاصم برہانپوری شیخ نور اللہ رمز الٰہی کے مرید تھے۔ انھوں نے ۱۱۶۵ھ میں خوب ترنگ کا شعر بہ شعر ترجمہ کر کے اس کا نام نفحا حیات رکھا۔ بعض کتابوں میں اس کا نام نغماتِ حیات لکھا ہے۔ مثنوی کی تاریخ یہ ہے

در ہزار و یک صد و ہم شصت و پنج　　گشت ظاہر ایں لآلی گنج گنج

۲۔ شیخ محمد مخدوم متوفی ۱۱۵۵ھ، ارکاٹ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے خوب ترنگ کے بعض مشکل اشعار کی شرح مفتاح التوحید کے نام سے لکھی۔ دیباچے میں مصنف نے اس کی یوں شرح کی ہے۔

مُفتاح التوحید در حلِ مشکلات و شرحِ معضلاتِ مثنویِ شیخ خوب محمد گجراتی،

معلوم نہیں یہ کتاب نثر میں تھی یا نظم میں۔ غالباً نثر میں ہوگی۔ ان دونوں کتابوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی خوب ترنگ اس عہد میں کتنی معروف و مقبول ہوئی۔

بھاؤ بھید۔ یہ رسالہ صنائع و بدائع کے بارے میں ہے۔ خود لکھتے ہیں

گفتہ صنائع بدائع را زبانِ گجرات از جہتِ یاد داشت می گویم۔ امید بہ حضرتِ صانع و بدیع چنانست کہ مقبول گرداند۔ دوہرہ

حمد خدا کی خوب کہہ کہہ صلوٰۃ رسول　　بچھیں صنعت شعر کی کہے تو ہوئے قبول

امابعد ایں رسالہ بہ خطاب "بھاؤ بھید" مخاطب شدہ است در بیانِ تلوناتِ کلام و انواعِ مفہومات نظام

بھاؤ بھید اس نانو کر بات بکٹ سمجھائن　　بھاؤ بھید کے شعر کے خوب جو بجھ آپ آئن[2]

اس کی ایک جلد مولوی عبدالحق کے پاس تھی۔ وہ اس کے مشمولات کے بارے میں لکھتے ہیں "اگرچہ تشریح ہر صنعت کی فارسی میں کی ہے لیکن اس کا مفہوم گجراتی اردو میں بھی ادا کیا ہے۔ مثالیں گجراتی اردو میں ہیں اور یہ تمام مثالیں منظوم اور خود اپنی تصنیف سے ہیں۔"[3]

---

[1] اردوئے قدیم۔ ص ۵۱

[2] عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۶۸۔۶۷

[3] ایضاً ص ۶۸

Marfat.com

لیکن مولوی صاحب نے جو مثالیں دی ہیں ان میں تشریح محض فارسی نثر میں ہے، گجراتی میں نہیں۔ ہاں مثالیں گجری کی ہیں لیکن ایک صفت کی تشریح گجری نظم میں ہے۔ مثال

'صفت تفریق تنہا آن است کہ میانِ دو چیز جدائی افگند۔ مثال

میں خوب تفریق تنہا پچھان جدائی دو ہوں مانہہ اس بھانت آن
کنول مُکھ جمل بن جدائی ایک بات کنول دلیں بھول سے نین یہ دلیں رات

آخری مصرع میں غالباً 'بھول' کی جگہ 'بھوں' ہے۔

ظاہر ہے کہ صنائع کی تفہیم کے لئے نثر کی وضاحت اور تفصیل درکار تھی۔

چھند چھند ان۔ اس کتاب کی تفصیل دو حضرات نے دی ہے۔ شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین کے ایک مضمون میں خوب محمد چشتی کے سلسلے میں اس رسالے کا مختصر تعارف کرایا[1]۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں اس کا ایک ناقص الآخر کرم خوردہ نسخہ تھا۔ شیرانی نے اسی کو دیکھ کر لکھا دوسرا نسخہ انڈیا آفس میں ہے جس کا تعارف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے رسالہ اردو جولائی ۵۲ء میں پیش کیا۔ وہاں کا نسخہ بھی ناقص الآخر اور بے حد کرم خوردہ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث کے علم میں اب اس کا کوئی دوسرا نسخہ باقی نہیں۔ اس نسخے میں ۱۱ سطری مسطر کے ۵۲ اوراق ہیں۔ بھاؤ بھید کی طرح اس کتاب کی تاریخِ تصنیف بھی معلوم نہیں۔ رسالے کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

بسم اللہ کر نانوں دھر چھند چھنداں پنگل اور عروض اور تال ادھیا تینہ آں

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا رسالہ یا حصہ پنگل یعنی ہندی عروض سے متعلق ہے اور دوسرا عربی فارسی اردو عروض سے۔

پنگل کے حصے میں مصنف نے اوّل لگھو (چھوٹی) اور گرو (بڑی) ماترا کے نشان 'ا' اور 'ر' درج کئے۔ ان کے امتزاج سے انھوں نے ہندی پنگل کے آٹھ گن واضح کئے۔ جدّت یہ دکھائی کہ گرو ماترا کی 'ر' کے لئے تھی' تجویز کیا اور لگھو 'ا' کے لئے 'ت'۔ اب دیکھئے کیسے ادا کرتے ہیں۔

مگن	ر ر ر	تھی تھی تھی
رگن	ر ا ر	تھی تتھی
نگن	ا ا ا	ت ت ت وغیرہ

---

[1] گوجری یا گجراتی اردو دسویں صدی ہجری میں۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء بازطباعت مقالاتِ شیرانی جلد اوّل۔ ص ۱۹۷ تا ۱۹۹

Marfat.com

انھوں نے گنوں کو عروضی ارکان کے مطابق بھی کیا ہے مثلاً مندرجہ بالا تین مثالوں کو مفعولن، فاعلن اور فَعَل کے۔ انھوں نے ان گنوں کے ساتھ موسیقی کی تال اور ماتراؤں کی تعداد بھی دی ہے اور ہندی اشعار سے مثالیں دی ہیں۔ ان سب کا ایک طویل نقشہ دیا ہے اور پنگل کی فارسی عروض سے مطابقت دکھائی ہے۔[1]

دوسرا حصہ عروض کا ہے جس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

پنگل گن سب کہہ رہیا، اب عروض گت آکھ — مصرعِ خوب اونیس کے جدی جدی بدھ راکھ

(انیس) (بھاکھ)

عروض کو نثری کتابوں سے سمجھنا ہی مشکل ہوتا ہے نظم میں تو یہ بالکل ناقابلِ فہم ہو جائے گا۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ عروض کے بیان کے لئے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ مروّجہ عروضی طریقے سے بالکل مختلف ہے اور زیادہ پیچیدہ اور الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے[2] مثلاً ارکانِ عروض کے ذکر میں کہتے ہیں

خوب اصل جز آٹھ ہیں ان کی بکت پچھان — دوئی خماسی، تن مہن، چھکوں سباعی جان

(بکٹ؟) (چھکوں)

اب اس خماسی اور سباعی کو کون ناواقفِ عروض سمجھ سکتا ہے۔ فعولن اور فاعلن خماسی ہیں اور مفاعیلن، فاعلاتن، مستفعلن، مفعولات، متفاعلن اور مفاعلتن سباعی۔

اوزان کی مثالوں میں انھوں نے اپنے تصنیف شدہ اشعار لکھے ہیں جس کے طفیل اردو نثر میں بعض عربی فارسی اوزان کا پہلی بار افتتاح ہوتا ہے۔ دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

رمل مثمن مخبون مقصور

جو رمل خبن کرے قصر تو یوں خوب پچھان — نہ کہوں ہوں جو توں نہیں فہم کرے گا تو توں جان

مضارع اخرب مثمن

اخرب کرے مضارع تب خوب سن سو من دھر — پہلا نے سو جہلا، مے دو کیں جدی کر

---

[1] چھند چھندان کا پنگل کا بیان۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مضمون اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے۔ رسالہ اردو جولائی ۵۲ء سے ماخوذ ہے۔

[2] چھند چھندان کا عروض کا بیان۔ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۹۷ تا ۱۹۸ سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

ان کے بیان کردہ اشعار کو کوئی مُبتدی خاک نہیں سمجھ سکتا، موزوں بھی نہیں پڑھ سکتا۔ ہاں جو پہلے سے عروض جانتا ہے وہ ضرور کتاب دیکھ کر تصدیق کر لے گا۔

خوب محمد ماہر فن تھے انھوں نے خوب ترنگ اور امواجِ خوبی کی کئی کئی تاریخیں لکھی ہیں، اردو میں پہلی بار علمِ بدیع پر کتاب لکھی، پہلی بار ہندی پنگل اور اردو عروض پر رسالہ لکھا۔ ان کی یہی مہارتِ فن اور استادی خوب ترنگ میں ظاہر ہوتی ہے جہاں وہ مسائل بیان کرنے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، لطفِ شعر سے سروکار نہیں رکھتے۔ ان سے پہلے نظامی دکنی نے اپنی مثنوی میں فارسی وزن استعمال کیا ہے ورنہ ان کے دوسرے پیش رو اور یہ خود ہندی اوزان ہی میں لکھتے ہیں۔ اردو عروض کی کتاب لکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا اردو اوزان کا استعمال کرنے لگے تھے۔ گجرات و دکن میں یہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو زبان اور فنِ شعر کو ہندی سے کچھ کچھ ہٹا کر فارسی کی طرف موڑا۔ لیکن ابھی ہندی روایت اس حد تک غالب ہے کہ بدیع اور عروض کی کتابوں کا نام بھاؤ بھید اور چھند چھندان رکھا جاتا ہے۔

سیّد اسحاق سرمست:

انجمن ترقی اردو پاکستان میں ایک مخطوطہ 'اقوالِ سیّد محمد جونپوری' ہے۔ فہرستِ مخطوطات جلد دوم میں اس کے ضمن میں 'سرمست' کا ذکر آیا ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"آخر میں سیّد اسحاق کی جو سرمست تخلّص کرتے تھے اور سیّد محمد کی چوتھی پشت میں تھے ایک دکنی اردو غزل درج کی ہے جس کے سات شعر ہیں۔ ان کا انتقال بطور مرتب ۲۹ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ کو برہان پور میں ہوا۔

یہ غزل گیارہویں صدی ہجری کے آغاز کی اردو کا بہترین نمونہ ہے اس لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

مرے جیو کو پیو باج آرام نئیں — بجز عشق بازی مجھے کام نئیں
کلیجہ کا کیوں کھا سکے اُو کباب — کہ جے عاشقی کا پیا جام نئیں
کرے کیوں محبت کے کعبے کا حج — بندھیا جے محبت کا احرام نئیں
ترا مکھ و تجھ بال آتے ہیں یاد — جو بھاتے مجھے صبح اور شام نئیں
ہوا گھر جدائی کی کلفت سوں گور — ولے کیئں بھی وصلت کا ابرام نئیں
ہر اک پھل منے غم کا آغاز ہے — ولے درد کا کچھ بھی انجام نئیں

Marfat.com

بچاروں کوں ہے عقل سرمست سوں　　بجز عبد ہی کچھ اسے کام نئیں"[1]

یہ غزل ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی نقل کی ہے[2]۔ فہرستِ مخطوطات اور جمیل جالبی دونوں کے متون کو سامنے رکھ کر مندرجہ بالا متن درج کیا ہے۔

غزل کا وزن فارسی ہے لیکن زبان ہندی سے فارسی کی طرف جاتی معلوم ہوتی ہے یعنی جو کام ولی نے بہت بعد میں کیا سرمست ان سے پہلے شروع کر چکے تھے۔

خان محمد متوفی ۱۰۲۸ھ :

ان کے حالات سید نجیب اشرف ندوی نے علی گڑھ تاریخِ ادب میں لکھے ہیں[3]۔ ان کا تعلق شاہ غزنی کے خاندان سے تھا۔ حضرت شاہ عالم کی نگاہِ فیض سے یہ ایک خدا رسیدہ صوفی ہو گئے۔ انھوں نے اشغال کو ایک اصولی اور زمانی صورت دینے کے لئے 'ہفت تصوّر' ترتیب دی اور اس کو 'تصوّرِ طوبیٰ' کے نام سے یاد کیا۔ یہ کتاب فارسی میں ہے لیکن اس میں ۱۴ ہندی دوہے اور اشعار بھی ہیں۔ واضح نہیں کہ یہ انھیں کی تصنیف ہیں یا کسی اور کے ہیں۔ ندوی نے جو چند اشعار درج کیے ہیں ان میں یہ ریختہ بھی ہے۔

دلا غافل چہ می خپسی کہ اتنی نیند کیوں کریے　　کہ وقتِ مرگ درپیش است اپنی میت سے ڈریئے

شیرانی کے مطابق یہ ریختہ شیخ جنید کا ہے[4]۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ قاضی فضل حق نے اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء میں ایک مضمون میں ایک بیاض مرقومہ ۱۲۸ھ کا تعارف کرایا جس میں یہ ریختہ شیخ فریدالدین کے نام سے درج ہے[5]۔ زبان کے پیشِ نظر دسویں صدی ہجری کا نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ عالم کس کا ہے۔

خان محمد نے اشعار نقل کرتے وقت یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ ان کی تصنیف ہیں۔ کیا عجب ہے کہ انھوں نے جو دوسرے اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ان کا نہ ہو اور وہ سب سے

---

[1] فہرستِ مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو جلد دوم ص ۳۲۷ - ۳۲۶

[2] جمیل جالبی کی تاریخ ص ۱۳۷

[3] علی گڑھ تاریخ ص ۱۲۵

[4] پنجاب میں اردو ص ۲۶۲

[5] جمیل جالبی: ص ۸ ۲ ۶

Marfat.com

سے شاعر ہی نہ ہوں۔ بہرحال وہ چند اشعار یہ ہیں

جے کچھ عقبا کام نہ آوے　　دنیا نام اس ہی کہاوے
جس تھیں نجہ پیہ بسرے سہی　　دنیا نام اس ہی کو کہے

چنتا آنو پنتھ کی، لوہو ہوا سو جیو　　ناں جانوں کس پنتھ میں مجھے چلاوے پیو[1]

---

[1] گرو گرنتھ تاریخ نمبر ۱۳۵

Marfat.com

چھٹا باب

اردو نثر ۱۶۰۰ء تک

گزشتہ تین بابوں میں شمالی ہند، دکن اور گجرات میں سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک اُردو شاعری کے نقوش و آثار کا سراغ لگایا گیا ہے۔ عموماً ہر زبان کے ادب میں نظم پہلے آتی ہے نثر بعد میں۔ شاید یہ بھی ہو کہ نثر کے نمونے اس حد تک محفوظ نہیں رکھے جاتے جس حد تک نظم کے نمونے۔ اردو ادب کی ابتدائی صدیوں میں نظم کے مقابلے میں نثر بہت کم ملتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوگی کہ فارسی کی دھاک کے دور میں ادیبوں نے اردو میں شعر کہنے کی جرأت تو کی ہوگی لیکن نثر لکھنے کا غیر ادبی اقدام نہیں کیا ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کے استعمال میں نثر کی مقدار نظم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اور یہ بات چیت کی حد تک ہی نہیں تحریر تک کے معاملے میں درست ہے۔ اردو اور کھڑی بولی کی قدیم تاریخ میں بھی یہی صورت رہی ہوگی۔

یہ افسوس ناک بات ہے کہ اردو اور دیوناگری رسم الخط میں موجود تحریروں کا یکجا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ دونوں میں بہ یک وقت نظر ڈال کر ہی کھڑی بولی اور اردو کی مسلسل تاریخ کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والوں نے صرف اردو رسم الخط کے نمونوں کو سامنے رکھا اور اردو زبان کی ابتدا، فارسی لغتوں، تاریخوں، سفرناموں اور ملفوظات وغیرہ میں آئے ہوئے اردو الفاظ سے کی۔ حالانکہ اسی عہد میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی بولی کے نمونے کہیں زیادہ مل سکتے ہیں۔

چونکہ ہمیں کھڑی بولی یا اردو زبان کی تاریخ نہیں لکھنی ہے اس لئے فارسی کتابوں میں ملنے والے اردو یا ہندی کے اقتباسات پر نظر نہیں کی جاتی ہے۔ ہاں ان میں سے بارہا ایسے اردو نثر کے نقروں کو ضرور نشان زد کی جاتا ہے تاکہ باقی ماندہ نثری کتابوں سے پہلے کے نثری نمونے سامنے آ جائیں۔ یہ نثری فقرے تقریباً تمام تر صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ انھیں موضوعی اہمیت سے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ہے اور یہ بزرگ اپنے اپنے علاقوں کی اپنے اپنے

۱۔ شیرانی: اردو کے قدیم ترین نمونے، ص ۱۰۔ ۱۱۔ شیرانی نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کے کام کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے۔ شیرانی کی بعد کی تحریروں میں بھی یہ بات ملتی ہے۔

Marfat.com

میں تفصیل سے دیئے ہیں۔ وہاں سے نیز دوسرے کئی ماخذوں سے جمع کر کے انھیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فقرے اور جملے اردو کے قدیم نثری مکالموں کے باقیات الصالحات ہیں۔

شیخ قطب الدّین بختیار کاکی م ۶۳۳ھ:

ان کا صرف ایک فقرہ ملتا ہے جو اہرِ فریدی میں مذکور ہے کہ ان کے مرید خواجہ فرید الدین شکر گنج کی آنکھ دُکھ رہی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اس پر پٹّی باندھ رکھی تھی۔ مرشد نے پٹّی کا سبب پوچھا۔ مرید نے جواب دیا 'آنکھ آئی ہے' شیخ نے کہا:

'اگر آنکھ آئی ہے' ایں را چرا بستہ آید۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے مطابق غوث قلندر پانی پتی سے متعلق تذکرۂ غوثیہ میں شیخ کاکی کا یہ جملہ یوں درج ہے:

'اگر آنکھ آئی ہے تو سو آئی ہے'[2]

لیکن جواہرِ فریدی کا بیان زیادہ معتبر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت کاکی نے شکر گنج کا اردو فقرہ دہرا دیا لیکن اپنی طرف سے فارسی ہی میں کلام کیا۔ گویا حضرت کاکی کا کوئی اردو فقرہ نہیں ملتا۔

شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر م ۶۶۴ھ:

یہ شیخ بختیار کاکی کے خلیفہ تھے۔ مندرجہ بالا مکالمے میں ان کی زبان سے اردو کا ایک جملہ 'آنکھ آئی ہے' استعمال ہوا ہے۔

ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کا ۶۵۹ھ میں انتقال ہوا۔ اُن کی ایک ملازمہ تھی جسے شکر گنج مادرِ مومناں کہا کرتے تھے۔ وہ شیخ جمال الدین کے خوردسال بیٹے شیخ برہان الدین کو ان کی خدمت میں لائی۔ شکر گنج نے رخصت کے وقت انھیں خلافت نامہ اور شیخ جمال الدین کا مصلّٰے اور عصا وغیرہ مرحمت کیا اور فرمایا کہ جس طرح ہماری طرف سے جمال الدین مجاز تھے اسی طرح تم بھی مجاز ہو۔ اس پر مادرِ مومناں نے کہا:

'خوجہ برہان الدین بالا ہے' اس پر شکر گنج نے جواب دیا۔

---

[1] جواہرِ فریدی ص ۲۰۸۔ دکشوریہ پریس لاہور۔ ۱۳۰۱ھ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۳۸

[2] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء (۱۹ویں صدی کے اوائل تک)۔ ص ۲۶

Marfat.com

"مادرِ مومناں! پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے"[1]

صاحبِ سیرالاولیا نے اس جملے کی تاویل و تشریح یوں کی ہے۔

'یعنی ماہِ شبِ چہاردہم در اوّلِ شبِ خوردمی باشد کہ تبدریج بہ کمال می رسد'

یہ صحیح نہیں پورن ماشی یعنی پونوں کا چاند شام کے وقت جب طلوع ہوتا ہے تو افق میں تھالی کی طرح بڑا ہوتا ہے۔ آسمان پر اوپر چڑھ کر اتنا بڑا دکھائی نہیں دیتا۔ ہوسکتا ہے پونوں کے چاند سے خواجہ کا مطلب دوج کا چاند یعنی ہلال ہو کہ وہ تیرہ دن میں بڑھ کر کمال پر پہنچ جاتا ہے۔ شاید وہ 'ہوا' 'پونوں' کا لفظ استعمال کر گئے۔

شیخ علاؤ الدین علی احمد صابر کو شیخ فرید نے قصبہ کلیر ضلع سہارنپور میں قیام کا حکم دیا۔ وہ وہاں کے لوگوں کے ہاتھ نالاں ہو گئے اور شیخ فرید سے اُن کی شکایت کی۔ شیخ نے لکھ بھیجا کہ کلیر تمھارے قبضے میں ہے۔

'خواہ کھوہ کھاہ خواہ دوہ کھاہ'[2]

یعنی خواہ بہ جبر و اکراہ اس سے نفع اٹھاؤ یا بہ لطف و مرحمت۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے ان سے سوال کیا کہ میرے کتنے لڑکے ہوں گے۔ انھوں نے جواب دیا۔

'ایک دو تین چار پانچ چھ ہفت'[3]

ایک موقع پر یہ سرسہ میں مقیم تھے اور اکثر شیخ عبدالشکور کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے۔ لوگوں کو جاننے کا تجسس ہوا کہ دیکھیں یہ وہاں جا کر کیا کرتے ہیں چنانچہ وہ ایک دن راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ شیخ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہو کر فرمایا۔

'سرسہ کبھی سرسہ، کبھی نرسہ'[4]

معلوم نہیں 'نرسہ' کے کیا معنی ہیں

ایک مرتبہ ان سے ایک مرید نے پوچھا کہ جسم میں عقل کا کون سا مقام ہے؟ شیخ نے جواب

---

[1] سیرالاولیا ص ۱۸۳ بحوالہ مقالات شیرانی جلد اوّل ص ۱۲۹۔

[2] مقالاتِ شیرانی اوّل۔ ص ۹ ۱۰۔

[3] جواہرِ فریدی ص ۲۶۰ بحوالہ مقالاتِ شیرانی ص ۱۴۰۔

[4] جواہرِ فریدی ص ۲۷۵ بحوالہ مقالاتِ شیرانی ص ۱۳۸ یا پنجاب میں اردو ص ۲۵۹۔

Marfat.com

دیا 'بیچ سر کے'[1]

جواہرِ فریدی میں ان کا یہ ذکر مرقوم ہے

اینو ہہ توں اُتھو نہ توں اہیں توں[2]

یعنی اِنھوہ توں انھون توں' اہیں توں یا یہاں تو' وہاں تو' سب جگہ تو۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں تصوّف کے اذکار میں ایک رسالہ جواہرِ خمسہ موجود ہے جو ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس میں شیخ فرید کا ایک عمل مذکور ہے جس میں ہدایت ہے کہ پہلے آسمان کی طرف دیکھ کر کہو

انہوہتہ توں' اہو نہہ توں' انھیں توں

پھر زمین کی طرف دیکھ کر یہی کہو۔ پھر نظر اٹھا کر تین یا سات بار یہی ذکر دہراؤ[3] خواجہ بندہ نواز نے اذکارِ چشتیہ میں اسی ذکر کا یوں ذکر کیا ہے۔

'بعضے ذکرِ زبان ہندوی بر طریقِ پنج رکنی است۔ راستا بگو اینہا توں' درچپّا بگو یدا و نہا توں' بالائے سر سوئے آسماں بگو یدا و نہا توں۔ وایں ذکر منسوب سوئے شیخ المشائخ فریدالدین اجودھنی است' (رسالہ اذکارِ چشتیہ۔ مجموعہ یازدہ رسائل)

دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اوراد و تصوّف کی دو قلمی کتابیں ہیں جن میں حضرت فرید کے یہ اردو فقرے درج ہیں۔

۱۔ در راستا بگوئی 'او ہی ہے' درچپّا بگوئی 'ایہی ہے' 'در دل بگوئی 'اینہی ہے'

۲۔ در راستا 'ہمہ توں' و درچپّا 'ہے توں' و 'در دل 'ہمہ توں'

۳۔ دیگر گوید از طرفِ دل 'ہوں توں' و طرفِ آسماں 'توں ہوں'[4]

خلاصہ یہ ہے کہ ان سب بیانات میں ایک ہی ذکر کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں' ایک بار اوپر دیکھ کر کہو 'وہاں تو' پھر نیچے دیکھ کر کہو 'یہاں تو' اور آخر میں سامنے دیکھ کر کہو 'ہر جگہ تو'۔ یا ایک بار دائیں طرف (راستا) دیکھ کر کہو 'وہاں تو' پھر بائیں طرف (چپّا) دیکھ کر کہو

---

[1] جواہرِ فریدی بحوالۂ شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم

[2] بحوالۂ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۲۹۔

[3] نقوشِ سلیمانی ص ۴۱

[4] ایضاً ص ۴۱

Marfat.com

یُہاں تو' اور پھر دل ہی دل میں کہو کہ ہر جگہ تو۔ گویا ہمہ اوست کا ورد ہے۔

شیخ حمید الدین ناگوری م ۶۷۳ھ:

یہ شیخ معین الدین چشتی کے مرید تھے۔ زندگی فقر و افلاس میں گزری۔ شیخ بہاء الدین باجن نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ حمید الدین کے بیٹے فاقوں کی تاب نہ لاکر ان کے پاس گئے کہ کشائشِ رزق کے واسطے دعا کریں۔ فاقوں کی نقاہت سے غش کھا کر گر پڑے۔ شیخ حمید الدین آنکھیں بند کئے یادِ حق میں مشغول تھے۔ اُن کے گرنے کی آواز سن کر انھیں دیکھا۔ اُن کا مافی الضمیر سمجھ گئے اور کہا:

'ہاں بابا کچھ کچھ'[1]

یعنی مستقبل میں کچھ کچھ ملتا دکھائی دیتا ہے۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی م ۷۲۴ھ:

جب علاء الدین خلجی اپنے چچا کو قتل کرکے سلطنت دہلی پر قابض ہوا تو لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ رعایا میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے حضرت قلندر کو خوش کرنا ضروری ہے۔ امیر خسرو کو اس خدمت پر متعین کرکے بھیجا گیا۔ خسرو نے جا کر انھیں خوش کیا۔ پھر حضرت نے بھی خسرو کو اپنا کچھ کلام سنایا جسے سن کر خسرو آب دیدہ ہو گئے۔ حضرت نے پنجابی میں پوچھا

تُرکا کچھ سمجھدا اے؟[2]

امیر خسرو نے جواب دیا 'اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھتا'۔ شیخ کا جملہ پنجابی ہے لیکن اردو سے زیادہ دور نہیں۔ صرف د اور ت کا فرق ہے۔

تاریخِ فیروز شاہی مؤلفہ شمس سراج عفیف:

محمد بن تغلق نے ۷۵۲ھ میں ٹھٹھہ سندھ کے مقام پر حملہ کیا لیکن اسی دوران میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد فیروز شاہ تغلق نے حملہ کیا لیکن لشکر میں قحط اور گھوڑوں میں وبا کی وجہ سے وہ کنارہ کش ہو کر گجرات کی طرف لوٹ گیا۔ اہلِ ٹھٹھہ نے اس موقع پر ایک جملہ کہا جو مختلف کتابوں میں مختلف طرح لکھا ہوا ہے اور سب کے سب شمس سراج عفیف

---

[1] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۳۶۔

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔ ص ۱۴

Marfat.com

کی تاریخِ فیروز شاہی سے نقل کرتے ہیں۔ یہ تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے چھاپی ہے۔ مصنف کے والد اور چچا فیروز شاہ تغلق کے ملازم تھے اور مصنف ان کے قائم مقام کے طور پر کام کرتا رہا۔ شیرانی نے پنجاب میں اردو میں یہ جملہ اس طرح لکھا ہے

برکت شیخ تھیا۔ اک مواک نہا[1]

انھوں نے لکھا ہے کہ تھیا اور تھا ملتانی زبان (لہندا) کے مصدر تھیونا سے بنا ہے اور یہی مندرجہ بالا جملے میں ہے۔ 'نہا' کے معنی ہیں 'بھاگ گیا'۔ بعد میں شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۳۰ء میں مضمون لکھا "اردو کے فقرے اور دوہرے آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے" اس میں مندرجہ بالا جملے کا متن بدل کر یوں لکھا ہے

برکت شیخ پٹھا' اک موا' اک[2] نٹھا

یعنی دونوں فعل بدل گئے۔ شیرانی لکھتے ہیں کہ شیخ پٹھا عرف تھا شیخ حسین کا جو ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ ان کا مزار ٹھٹھے کے قریب ہے۔

سید سلیمان ندوی نے نقوشِ سلیمانی میں اس قول کو یوں لکھا ہے

'برکت شیخ تھیا' ایک موا' ایک نھیا[3]

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سکندر حاکم بنگال نے ایک افسر ملک قبول سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے۔ افسر نے ہندی میں جواب دیا 'تورا بانہ'[4]۔ سلیمان ندوی کے مطابق اس کے معنی تورا بندھ یا تورا بندھو کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ چونکہ بندھو کے معنی بھائی ہیں اس لئے راقم السطور کی رائے میں 'تورا بانہ' کے معنی 'تیرا غلام' ہیں۔ بانہ 'باندی' کا مذکر ہو سکتا ہے گو ہندی اردو میں مستعمل نہیں۔

علی مولا بدایونی: ڈاکٹر مسعود حسین خاں حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات خیر المجالس سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت نظام الدین اولیا سنِ بلوغ کو پہنچے علی مولا بدایونی نے کہا۔

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۱۰۷

[2] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۴۴

[3] نقوش سلیمانی ص ۴۶ بحوالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اردو نثر کا آغاز۔ ص ۳۹

[4] تاریخِ فیروز شاہی ص ۱۶۰ بحوالہ نقوشِ سلیمانی ص ۴۶

Marfat.com

'ارے مولانا یہ بڑا ہوسی' یعنی یہ مردِ بزرگ ہوگا۔ مولانا علاء الدین نے کہا' علی تو کس بنا پر کہتا ہے۔ علی مولا نے جواب دیا کہ میں اس میں دو چیزیں دیکھتا ہوں۔ ان میں سے ایک کو علی مولا نے زبانِ ہندوی میں کہا۔

جو منڈا سا بندی سو پائیں پسری .

یعنی جو کوئی سر پر منڈاسا (دستار) باندھتا ہے وہ کسی کے پاؤں میں گرتا ہے[1]

ہو سکتا ہے دوسرا ہندی فقرہ دراصل یوں ہو 'جو منڈاسا بندھے سو پائیں پسرے'

حیرت کی بات یہ ہے کہ بدایوں یوپی کا باشندہ پنجابی انداز سے 'بڑا ہوسی' کہے۔ یوپی والا 'گا' کے لئے 'سی' کبھی بول ہی نہیں سکتا۔

سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت م ۷۸۵ھ: بہار کے شطاری صوفی امام الدین راجگیری کے ملفوظات 'اورادِ امام الدین راجگیری' کے نام سے ملتے ہیں۔ ان میں حضرت مخدوم کا بھی ایک اردو فقرہ درج ہے۔ کسی نے مخدوم سے پوچھا کہ

'یہ کیا بات ہے کہ وہی اوراد اور اعمال ہیں جو وہ بھی پڑھتا اور کرتا ہے جو خود مخدوم لکھتے اور کرتے ہیں لیکن اس کو اس کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ اس پر مخدوم صاحب نے جواب دیا۔ کھانڈا ہے پھانڈا کہاں[2]

یعنی خندق تو موجود ہے۔ اس سے نکلنے کا ذریعہ کہاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے تئیں عرفان کی کمی ہے قاضی محمود دریائی کے دادا کا نام خطیب محمود تھا۔ یہ اور مخدومِ جہانیاں 'اِخوان اللہ' بنے یعنی ایک دوسرے کے مرید ہو گئے۔ اس موقع پر مخدوم نے کہا

'ساگ لپٹا بھات ہے اور بھات لپٹا ساگ'[3]

---

[1] خیر المجالس ص ۲۱۶ بحوالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں: علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۷

[2] بحوالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز ص ۲۹

[3] بحوالہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۳۰ علی گڑھ تاریخ ادب ص ۱۱۴

Marfat.com

شاہ راجو قتال م ۷۳۱ھ:

سیّد یوسف حسینی عرف سیّد راجا عرف شاہ راجو قتال ۷۲۷ھ میں دہلی سے دولت آباد آئے۔ یہ خواجہ بندہ نواز کے والد ہیں۔ شاہ راجو کی تاریخ وفات اکثر کتب میں ۷۳۱ھ درج ہے گو بعض میں ۷۹۵ھ بھی دی ہے۔ جمعاتِ شاہیہ میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے اُچھ کی زبان میں ان کے لئے فرمایا

'تساں راجے اساں خوجے'[1]

یعنی تم راجہ ہو ہم خواجہ ہیں۔ اُچھ سے مراد ریاست بہاول پور ہے۔ پنجابی میں 'تسی' تم یا آپ کو اور 'اسی' ہم کو کہتے ہیں۔ بہاول پور کی زبان پنجاب اور سندھ کی سرحد پر ہوگی۔

ایک مرتبہ شاہ راجو قتال کو سلطان فیروز تغلق سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے سلطان کی مزاج پُرسی کے طور پر پوچھا

"کاکا فیروز چنگا ہے؟"[2]

بادشاہ نے اس جملے کو اپنے لئے بسا غنیمت بلکہ بڑا اعزاز سمجھا۔ اس جملے میں کاکا اور چنگا پنجابی کے الفاظ ہیں۔

شیخ نصیر الدین محمود چراغِ دہلی م ۷۵۷ھ

ان کی تاریخ وفات شیرانی نے ۷۵۷ھ[3] اور سیّد سلیمان ندوی نے ۷۵۲ھ[4] لکھی ہے۔ اوّل الذکر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ شیخ سراج الدین عثمان معروف بہ شیخ اخی سراج بھی شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے اور ان کے حکم سے بنگال چلے گئے تھے۔ پیر کے انتقال کے بعد دہلی واپس آگئے اور شیخ نصیر الدین کے مرید ہوگئے۔ شیخ نے انھیں واپس بنگال جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہاں شیخ علاء الدین قلی پہلے سے موجود ہیں۔ اس پر شیخ نصیر الدین نے کہا

تم اوپر دے تَل

---

[1] جمعاتِ شاہیہ ورق ۱۰۰۔ بحوالہ جمیل جالبی ص ۹۸۔

[2] جمعاتِ شاہیہ ورق ۱۰۰۔ بحوالہ جالبی ص ۹۸۔

[3] مقالات جلد اوّل ص ۱۴۴۔

[4] نقوشِ سلیمانی ص ۴۴۔

Marfat.com

تَل سے مراد تلے یعنی نیچے۔ اس قول کو فالِ نیک سمجھ کر وہ واپس بنگال چلے گئے۔ اس جملے کا اخذ محمد قاسم فرشتہؒ کی تاریخ ہے۔ ہر مصنف اسی کتاب سے یہ جملہ نقل کرتا ہے لیکن بعض کے یہاں ں کا متن مختلف ہوتا ہے۔ عبدالحقؒ، شمس اللہؒ قادری اور محمود شیرانی نے اس جملے کو اسی طرح کھا ہے جب سیّد سلیمان ندویؒ نے اسے 'تم اوپر تل تلے' اور تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانؒ میں 'تم اوپر وے تلو' لکھا ہے۔

چراغ دہلی کے ملفوظات کا نام 'خیرالمجالس' ہے اس میں لکھا ہے کہ

فرمودند در عہدِ موسیٰ بت پرستے بود۔ روزے اُو راتپ آمد۔ برسرِ پائے بت سر نہاد و گفت۔

"تو میرا گسائیں، تو میرا کرتار۔ مجھ اس تپ تھیں چھڈا"[6]

فارسی کتاب میں بت پرست کے الفاظ فارسی میں نہ لکھ کر ہندی میں لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ چراغ دہلی یا راوی کے مطابق یہ بت پرست کے اصل الفاظ ہیں۔ موسیٰ کے زمانے میں کسی کا ہندی میں بولنا لغو ہے۔ اگر اس نے کسی اور مروجہ زبان میں کہا تھا تو اسے ہندی میں ترجمہ کر کے کیوں لکھا گیا؟ واقعے کی نادرستی سے قطعِ نظر ہمارے لئے یہ اہم ہے کہ خیرالمجالس کے سنہ ترتیب میں یہ ہندی جملہ ملتا ہے۔ اس میں چھڈا پنجابی انداز میں ہے یا پھر کو بہ شکل ڈکھ دیا ہو جیسے گڑھ کو کبھی گڈھ نہیں بولتے لیکن قدما رملی گڈھ لکھ دیتے تھے۔

شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے مرید شیخ صدرالدین کلیم کتاب صحائف السلوک کے مصنف ہیں۔ اس میں ایک جوگی کا یہ قول درج ہے۔

'دھندھا لوک نہ جانے اندھا'[7]

---

[1] تاریخ فرشتہ نولکشوری ایڈیشن ص ۲۹۹۔ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۴۴۔

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۱۷۔ [3] اردوئے قدیم ص ۲۳۔

[4] نقوش سلیمانی ص ۴۴۔

[5] ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند چھٹی جلد ص ۱۹۸۔

[6] خیرالمجالس ص ۱۱۲ بحوالہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں: علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۸

[7] صحائف السلوک ص ۱۷۷، مسلم پریس جھجھر۔ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۴۵

Marfat.com

حضرت زین الدین سیّد داؤد خلد آبادی م ۷۷۱ھ:

یہ شیراز میں پیدا ہوئے اور ہندوستان تشریف لائے۔ شیخ برہان الدین غریب کے مرید تھے۔ جب محمد تغلق نے اہلِ دہلی کو دولت آباد چلے جانے کا حکم دیا تو آپ بھی دولت آباد آئے۔ ۷۷۱ھ میں خلد آباد میں انتقال کیا۔ ان کے نزع کے عالم میں ان کے مرید مولانا نصیر الدین بدھری نے ان سے دو بار درخواست کی کہ کسی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیں۔ انھوں نے کہا

'منجہ مت بُلاوہ'[1]

یعنی میری توجہ جدھر لگی ہے اس سے نہ ہٹاؤ

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری م ۷۸۲ھ:

ان کا ذکر تیسرے باب میں کیا جا چکا ہے جہاں ان کے اشعار درج کئے گئے ہیں۔ انھوں نے فارسی میں ارشاد السالکین و شرحِ آداب المریدین لکھیں۔ ان کے ایک مرید نے ان کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے مرتب کیا۔ شیرانی نے پنجاب میں اردو میں منشی محبوب عالم کی بیاض سے ایک کج مندرہ نقل کیا ہے[2] جس میں مختلف امراض کے لئے جھاڑ پھونک کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[3] اپنے مقالے میں لکھتی ہیں کہ "ایک کج مندرہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کا ذکر پروفیسر عبدالغنی نے اپنی تصنیف 'پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ' میں کیا ہے۔" معلوم نہیں وہ یہی کنج مندرہ ہے کہ دوسرا؟ 'کج مندرہ' کے کیا معنی ہیں ہمیں معلوم نہیں۔ یہ لفظ کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔ بہرحال اس کج مندرے سے اس زمانے کی اردو زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں دو دوہے بھی ہیں۔ پرانے رسم الخط میں اس کی عبارت کو صحیح پڑھنا مشکل ہے۔ اس کی دو تین سطریں یہ ہیں۔

"اوانکارا' ارشنا کرتا' بیدن ہرتا' وہی ایک سرجن ہار' دو جگ تین تلوک' چار بید' پانچ پند' چھ ناسِک' سات سمندر' آٹھ بس' نوگرہ' دس راون' اگیارہ دور' بارہ راس'

---

[1] رونق علی، روضۃ الاقطاب ص ۲۱۴ بحوالہ اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۳۹۔

[2] پنجاب میں اردو ص ۱۷۳-۱۷۲۔

[3] اردو نثر کا آغاز و ارتقاء ص ۳۵۔

Marfat.com

تیرہ تنمہول، چودہ بھون، پندرہ تتہہ، سولہ کلا، چار کھان، چار بان، پانچ بھوت لات نان، توّے ناتھ، چوراسی سیدھ واہا، چوسٹھ جوگنی۔۔۔"

قدیم زبان، اردو رسم الخط کی خرابیاں۔ نہ تحریر درست ہے نہ قرأت صحیح۔ چونکہ یہ عمل ایک ٹوٹکا ہے اس میں فعل بہت کم ہیں اسی لئے ہم عصر زبان کی قرار واقعی نمائندگی نہیں کرتا۔

سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ کتب خانہ الاصلاح ویسنہ میں ایک فال نامے کے دو پرانے کاغذات ہیں[1]۔ فال نامے کے سرنامہ پر اسے یحییٰ منیری کی تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ اس میں مختلف اعداد کے جوابات اردو میں ہیں۔ اس طرح اردو کے کل ۲۷ جملے ہیں۔ چند یہ ہیں۔

۱۱۱ جو من کی مستی کیا ہوئی سو ہوئی

۱۱۳ نا ہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے

۲۳۲ آگے بُرے دن گئے اب سکھ یا وہ گے

۳۱۱ تورے دن کے اب سکھ سو جتانا ہیں

نقوشِ سلیمانی میں معدن المعانی سے اردو کے دو فقرے نقل کئے ہیں۔ خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے ان سے عرض کیا 'باٹ بھلی پر سانہ کرے'

انھوں نے جواب دیا 'دیس بھلا پر دور'[2] دونوں کے اقوال مل کر دوہے کا ایک مصرع ہو گیا۔

ڈاکٹر رفیعہ لکھتی ہیں کہ اسی واقعے کو پروفیسر حسن عسکری مظفر بلخی کے مکتوب میں ایک دوہے کے سلسلے میں نقل کرتے ہیں۔ مکتوب میں دیا ہوا دوہا یہ ہے

باٹ بھلی پر سانکری نگری بھلی پردور نانہہ بھلا پر پا قلا کر ہر ٹجور (کذا)[3]

حسن عسکری کا مضمون سامنے نہیں۔ یہ واضح نہیں کہ مکتوب میں دوہے کو مظفر بلخی کی تصنیف ظاہر کیا ہے کہ یحییٰ منیری کی؟

فیروز شاہ تغلق کے بعد ناصر الدین محمد شاہ بادشاہ ہوا۔ اس نے ایک بار تخت گنوا دیا۔

---

[1] نقوشِ سلیمانی ص ۴۹۔

[2] معدن المعانی ص ۲۰۳ مطبوعہ اشرف الاخبار۔ بہار۔ ۱۸۸۴ء بحوالہ نقوشِ سلیمانی ص ۴۹۔

[3] سید حسن عسکری: شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی۔ معارف جلد ۴۔ بحوالہ ڈاکٹر رفیعہ ص ۳۵۔

Marfat.com

دوبارہ ۷۹۲ھ میں تخت پر قابض ہوا۔ دہلی میں اس وقت غلاموں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ملک اور دفاتر میں ان کا رسوخ و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ دوبارہ تخت نشین ہونے پر نصیر الدین نے انھیں دلّی سے اخراج کا حکم دیا۔ ان میں سے کچھ چھپ کر وہیں رہ گئے۔ یہ لوگ بنگال اور مشرقی ہند کے باشندے تھے اس لئے بادشاہ نے ان کی شناخت کا یہ طریقہ نکالا کہ اُن سے فقرہ 'کھڑا کھڑی' کہلایا جاتا تھا۔ اور اس کے تلفظ سے طے کر لیا جاتا تھا کہ وہ پورب کا باشندہ ہے کہ نواحِ دہلی کا۔[1]

سیّد اشرف جہانگیر سمنانی م ۸۰۰ھ:

یہ سمنان کے بادشاہ ابراہیم کے بیٹے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد کچھ دن خود بھی بادشاہت کی لیکن بعد میں چھوڑ کر درویشی اختیار کی۔ ۲۳ سال کی عمر میں پہلی بار ہندوستان آئے آخر کچھوچھہ اودھ میں مقیم ہو گئے جہاں ۸۰۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے مرید نظام حاجی غریب یمنی نے ان کے ملفوظات کا مجموعہ لطائفِ اشرفی کے نام سے ترتیب دیا۔ ان میں سانپ بچھو کاٹے کے کئی منتر لکھے ہیں جو کتابت و طباعت کی غلطی کی وجہ سے مسخ ہو گئے ہیں۔ بچھو کے کاٹے کے تین منتر یہ ہیں[2]

۱۔ دھر بندھوں، دھر کندھوں، سوا لاکھ سپاہی بندھوں، اپنے بھگت گرو کے سکت ہوں یکہ جو آگیں چڑھے۔

۲۔ اینکے لکڑی پانی پر آئی، انکس بندھوں نر بس پرائی۔ مری یکہ جو آگیں جائے

۳۔ کانی کوتی جنگل کے کاجل دھکانا تھ پانچ چیز۔۔۔ الخ۔۔۔

ان فقروں سے سیّد اشرف کے عہد کی اردو نثر کا پتہ چلتا ہے۔ ان سے منسوب رسالے کے بارے میں آگے بحث کی جائے گی۔

لطائفِ اشرفی میں ان کے دو معاصرین کے ملفوظات ملتے ہیں۔

مولانا کریم الدین دانش مند:

جب سیّد اشرف ردولی کے پاس سے گزرے، وہاں قریب کے ایک گاؤں میں مولانا کریم الدین

---

[1] مقالاتِ شیرانی حصہ اوّل ص ۱۴۷ - ۱۴۶

[2] لطائف اشرفی ص ۳۹۶۔ نصرت المطابع دہلی۔ بحوالہ نقوشِ سلیمانی ص ۵۰۔

Marfat.com

دانشمند رہتے تھے. سیّد صاحب ان سے ملنے گئے. کسی نے مولانا کو اطلاع دی تو مولانا نے فرمایا.

ہَے ہَے حضرت ایشاں رانہ شاید کہ در خانۂ من بیایند. ایشاں بسیار مردِ بزرگ اند و مثلِ ہندوی فرمودند 'چھیری کے منھ کھنڈا سمائے'[1]

سلیمان ندوی صراحت کرتے ہیں کہ مشرقی یوپی میں چھیری بکری کو اور کھنڈا چاولوں کے چورے کو کہتے ہیں[2]۔

شیخ رجا: یہ ایسے بزرگ تھے جو خلافِ شرع کوئی کام نہ کرتے تھے. ایک دن سیّد اشرف انھیں ایک مجذوب ابراہیم نامی سے ملانے لے گئے. ابراہیم تارکِ الصلوٰۃ تھے. انھوں نے دونوں کو کھانے پر مدعو کیا. سیّد اشرف شریک ہو گئے لیکن شیخ راجا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک تارکِ الصلوٰۃ کے ساتھ ہم طعام نہیں ہونا چاہتا. اس پر مجذوب نے غصّہ کر کے اُن پر ایک تکیہ کھینچ مارا. سیّد اشرف نے بیچ بچاؤ کیا اور شیخ راجا سے پوچھا کہ تم نے یہ کیا کم عقلی کی کہ کھانا نہیں کھایا. اس پر شیخ نے جواب دیا.

'عجیب مرد مان اند. بے پرکھ آپنہ الیسوں کنہ' آپ تے ویسوں کہنہ'[3]

شاہ کوچک ولی م ۸۰۵ھ: شاہ برہان الدین غریب کے خلیفہ تھے. ربیع الاوّل ۸۰۵ھ میں انتقال کیا. تاریخ بیڑ میں ان کے دو اردو فقرے درج ہیں

نہوڑے آدے نہوڑے جائے' لالے کوں تیرے بارے

سیّد محمد اوس نہ پتیائی[4]

خواجہ بندہ نواز سیّد محمد گیسو دراز م ۸۲۵ھ: ان کے ایک مرید عبد اللہ بن عبد الرحمٰن چشتی نے تصوف کی ایک کتاب عشق نامہ لکھی ہے اس میں خواجہ کا یہ مقولہ بتایا جاتا ہے۔

---

[1] لطائف اشرفی ص ۳۸۴ بحوالہ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، اردو نثر کا ارتقا ص ۲۰۰

[2] لطائف اشرفی ص ۳۸۹ بحوالہ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، اردو نثر کا ارتقا ص ۲۰۰

[3] مقدمہ تذکرہ گیسو دراز تاریخ بیڑ ص ۱۳۹ بحوالہ مقالہ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ ص ۲۰۰ — بقول حسینی ص ۱۰۱

[4] جس کا ہدیہ نہ لیا جائے اس میں یہ اقوال ص ۱۴۰ پر ہیں

Marfat.com

'بھوکوں ہوئے سوں خدا کچھ انپڑیتا ہے؟ خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہورہے'[1]

کیا یہ واقعی خواجہ بندہ نواز کے الفاظ ہیں. مولوی عبدالحق نے یہی فقرے شیخ وجیہ الدین علوی کے مجموعۂ ملفوظات بحرالحقائق سے دیئے ہیں[2]. وہاں ان جملوں سے پہلے کچھ اور جملے ہیں جن سے بات زیادہ مکمل ہوجاتی ہے.

"در حکایت کردن فرمودند کیا ہوا جو بھوکوں موا. بھوکوں موئے تیں کیا خدا کوں انپڑیا' خدا کو انپڑنے کی استعداد ہورہے"

اس مکمل تر ملفوظے سے یہ ظاہر ہے کہ اس کے قائل وجیہ الدین علوی ہیں گیسو دراز نہیں.

شاہ قطب عالم گجراتی م ۸۵۷ھ:

سیّد برہان الدین ابو محمد عبداللہ ملقب بہ قطب عالم مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے اور سیّد ناصر الدین کے بیٹے تھے[3]. نجیب اشرف ندوی کے مطابق ان کا سنہ ولادت ۷۹۰ھ اور سنہ وفات ۸۵۷ھ ہے (علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۰). لیکن مولوی عبدالحق[4] اور ظہیر الدین مدنی[5] نے ان کا سنہ وفات ۸۵۰ھ درج کیا ہے. ابراہیم ڈار لکھتے ہیں کہ ان کا وطنِ مالوف اُچھ تھا جو مغربی پنجاب کی ریاست بہاول پور کا ایک قصبہ ہے. گجرات میں قطب عالم کی اچھی پذیرائی ہوئی. یہ گجرات کے بخاری سادات کے جدِ امجد تھے[6].

یہ دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا. ان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے چچا شاہ راجو قتال نے قبول کی. ان کے یہاں دو سال قیام کے بعد قطب عالم ۸۰۲ھ میں اپنی والدہ کے گھر پٹن چلے گئے. سلطان احمد والی گجرات (۸۱۴-۴۶ھ) ان کا بڑا معتقد تھا. جب اس نے

---

[1] شمس اللہ قادری' اردوئے قدیم ص ۲۳.

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۳۱.

[3] شمس اللہ قادری' اردوئے قدیم ص ۲۳.

[4] عبدالحق' اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام. ص ۲۲.

[5] ظہیر الدین مدنی، سخنوران گجرات. ص ۳۲۳

[6] ابراہیم ڈار' "گوجری اور اردو زبان کی نشوونما میں اہلِ گجرات کا حصہ" رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۹۰. اس مضمون کے بارے میں ڈاکٹر سیّدہ جعفر سے معلومات ملی.

Marfat.com

احمد آباد بسایا تو علماء سے اس شہر کی رونق بڑھائی۔ قطب عالم بھی پٹن سے احمد آباد آگئے۔ کچھ عرصہ بعد موضع بٹوہ چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔

گل رعنا میں عبدالحئی لکھتے ہیں کہ سندھ کے حاکم جام جانو نے اپنی ایک لڑکی حضرت قطب عالم کے بیٹے شاہ عالم سے منسوب کی اور دوسری لڑکی گجرات کے حکمراں محمد شاہ سے۔ جب محمد شاہ کو اطلاع ملی کہ جام جانو کی جو بیٹی شاہ عالم کو دی جانے والی ہے وہ محمد شاہ کی منگیتر سے زیادہ خوبصورت ہے تو اس نے جام جانو کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حسین تر لڑکی شاہ عالم کے بجائے محمد شاہ سے منسوب کر دی جائے۔ اس پر شاہ عالم کو بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے اپنے والد سے شکایت کی۔ حضرت قطب عالم کی زبان سے بے ساختہ یہ پنجابی جملہ نکلا

"بیٹے تسا نصیب وھوں ویجہ"[1]

اُچھ کے قیام میں ایک رات تہجد کے لئے اٹھے تو صحن میں کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور پاؤں زخمی ہو گیا۔ ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

'کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے۔

یہ فقرہ مختلف کتابوں میں مراۃ احمدی اور تحفۃ الکرام سے نقل کیا گیا ہے۔

محمود شیرانی: کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے (مراۃ احمدی جلد دوم ص ۱۷ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۵۰ نیز تحفۃ الکرام جلد اوّل ص ۱۷ بحوالہ مقالاتِ شیرانی، جلد اوّل ص ۱۶۲)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مقالاتِ شیرانی کے حوالے سے یہی متن نقل کیا ہے۔

(تاریخ ادبیاتِ مسلماناں جلد ششم ص ۹۱)

عبدالحق: 'لوہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے' (اردو کی ابتدائی نشو و نما ص ۲۲ بحوالہ تحفۃ الکرام ص ۱۷)

نجیب اشرف ندوی: کیا ہے لوہا ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے (علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۰)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: 'لوہ ہے یا لکڑ ہے یا پتھر ہے یا کیا ہے' (مراۃ اسکندری بحوالہ پروفیسر عبدالغنی پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ ص ۸۔ یہ بحوالہ اردو نثر کا آغاز ص ۴۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی: 'کیا ہے، لوہ ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے' (تحفۃ الکرام جلد اوّل ص ۸ بحوالہ جالبی ص ۹۵)

مولوی عبدالحق نے تحفۃ الکرام کے کسی ایڈیشن کے ص ۱۷ سے اور جالبی نے کسی دوسرے

---

[1] عبدالحئی، گل رعنا ص ۱۴۔ اس کا علم بھی ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحریر سے ہوا۔

Marfat.com

ایڈیشن کے ص ۱۸ سے نقل کیا ہے اور دونوں میں اتنا فرق ہے۔ قدیم مورخوں کے عدمِ احتیاط کا اندازہ کیجئے۔

قطب عالم کے فرزند شاہ منجھن ایک روز شاہ بارک اللہ چشتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب نے انھیں شاہ عالم کے خطاب سے یاد کیا۔ شاہ منجھن نے واپس آکر اپنے والد سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا

"چشتیوں نے پکائی، انے بخاریوں نے کھائی"[1]

'انے' گجراتی میں اور کے معنی میں ہے۔ 'بخاریوں' سے اپنے خاندان کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ عالم لکھتے ہیں کہ ایک بار وہ قطب عالم کے حجرۂ شغل میں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ سخت مضطرب ہو کر دیوار پکڑے سارے حجرے میں پھر رہے ہیں اور یہ ہندی الفاظ زبان سے جاری ہیں۔

"محمد پریں کھڑیا سائیں پریم پکھائے"[2]

جمیل جالبی نے اس جملے کو قدرے اختلاف سے یوں لکھا ہے۔

"محمد پریں کھیڑیا سائیں پرم چمکائے"[3]

انھوں نے جمعاتِ شاہیہ سے ایک اور قول درج کیا ہے

"آئیں کہہ کر جوری کمائے۔ جوری کا کرری میٹھا لاگے (کذا۔ جالبی ص ۹۷)

قطب عالم پنجابی تھے۔ ان کے کئی اقوال پنجابی میں ہیں۔ انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عالم م ۸۸۰ھ: قطب عالم کے فرزند سراج الدین ابو البرکات سیّد محمد مخاطب بہ شاہ عالم و معروف بہ شاہ منجھن نے ۸۸۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کے ملفوظات کا مجموعہ جمعاتِ شاہیہ مرتبۂ مقبول عالم ہے جس میں ان کے والد کے، ان کے اور دوسروں کے اقوال ملتے ہیں۔ ان کے بعض ملفوظات مراۃِ احمدی اور تحفۃ الکرام میں بھی موجود ہیں۔ مشہور اردو اقوال یہ ہیں:

گجرات کے ولی شیخ محمد قصبہ نڑیاد کے رہنے والے تھے۔ ایک روز اپنے گھر کے آگے بیٹھے

---

[1] مراۃ احمدی جلد دوم ص ۴۸، تحفۃ الکرام جلد اوّل ص ۴۸ بحوالۂ مقالاتِ تیرانی اوّل ص ۱۵۱

[2] جمعاتِ شاہیہ بحوالۂ عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشو و نما ص ۲۳۔

[3] جمعاتِ شاہیہ ورق ۶۳ مخزونۂ انجمن ترقی اردو پاکستان بحوالۂ جالبی ص ۹۶۔

Marfat.com

سبزی دھو رہے تھے۔ شاہ عالم اُدھر سے گزرے۔ شیخ محمد نے دل میں طے کیا کہ آج جب تک شاہ عالم مجھے کوئی خطاب نہ دیں گے میں ان کی کسی بات کا جواب نہ دوں گا۔ شاہ عالم نے تین دفعہ ان کا نام لے کر پکارا۔ وہ خاموش رہے۔ تب شاہ عالم نے مسکرا کر کہا

'ارے میاں الولک بولتے کیوں نہیں'[1]

مراۃ احمدی اور تحفۃ الکرام میں الولک کے معنیٰ 'مستِ ناز' لکھے ہیں۔ اس وقت سے شیخ محمد کا لقب میاں الولک ہوگیا۔

سلطان محمود بیگڑہ شاہِ گجرات بچپن میں فتح خاں کے نام سے مشہور تھا۔ اس وقت اس کا سوتیلا بھائی سلطان قطب الدین والیِ ملک تھا اور اس کی جان کے درپے تھا۔ فتح خاں کی ماں اسے لے کر اپنے بہنوئی حضرت شاہ عالم کے گھر آگئی تھی۔ ایک روز شاہ عالم فتح خاں کو پڑھا رہے تھے۔ سلطان کو معلوم ہوا تو بارادۂ قتل شاہ عالم کے حجرے کی طرف آیا۔ خانقاہ کے دربان نے بادشاہ کو روک دیا۔ بادشاہ نے کہا "تم مجھے باپ جیو کی زیارت سے کیوں محروم رکھتے ہو"۔ شاہ عالم نے مکالمہ سن کر دربان سے کہا کہ بادشاہ کو آنے دو۔ شاہ عالم نے فتح خاں سے کہا

'پڑھ ڈو کرے'[2]

اب جو سلطان نے نگاہ ڈالی تو ایسا معلوم ہوا کہ شاہ عالم کے سامنے ایک سفید ریش اور سفید ابرو کبڑا بیٹھا ہے

ملک سیف الدین کا بیٹا کمسنی میں فوت ہوگیا۔ وہ شاہ عالم کے پاس آیا اور مردہ بچے کو زندگی دینے کے لئے حضرت سے دعا کرنے کی درخواست کی۔ شاہ عالم نے اسے مشیت ایزدی پر صابر و شاکر رہنے کی نصیحت کی اور رخصت کیا۔ اسے تسکین نہ ہوئی۔ شاہ عالم کے کم سن فرزند شاہ بھیکھ سے کہا کہ تم سفارش کرو۔ شاہ بھیکھ نے جب والد سے کہا تو والد نے ان سے پوچھا کہ اگر تم مردہ بچے کی جگہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو تو میں دعا کروں۔ بیٹا تیار ہوگیا۔ شاہ عالم نے انھیں حجرے میں جا کر دعا کی۔

'راجن جی بچرو ئے بدل بچرو ٹا'[3]

---

[1] مراۃ احمدی جلد دوم ص ۸۱، تحفۃ الکرام جلد اوّل ص ۸۱ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۵۲،

[2] مراۃ سکندری ص ۵۶ بحوالہ مقالاتِ شیرانی ص ۱۵۳

[3] تحفۃ الکرام جلد اوّل ص ۲۶، مراۃ احمدی جلد دوم ص ۲۶ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۵۳،

Marfat.com

یعنی اے خدا بکری کے بچے کے عوض بکری کا بچہ لے لے۔

غنیمت یہ ہے کہ روایت میں یہ نہیں لکھا کہ شاہ بھیکھ نے جان دے دی اور سیف الدین کا بیٹا از سرِ نو زندہ ہو گیا۔

سلاطینِ گجرات کا رشتے دار سلطان شاہ غزنی ایک مغرور و ظالم جوان تھا۔ ایک روز شاہ عالم رتھ میں سوار جا رہے تھے۔ یہ جوان برابر سے گزرا۔ نہ گھوڑے سے اترا نہ سلام کیا۔ شاہ عالم کے مرید شیخ احمد نے عرض کیا کہ حضرت دیکھئے یہ جوان کس قدر مغرور ہے۔ شاہ عالم نے جواب دیا۔

'جو راجن جی کارو نہ بھایا ہووے تو تجھ جیسے فقیروں کی برسوں تیں کنّاسی کرے'[1]

ان الفاظ کا یہ اثر ہوا کہ مغرور جوان کا دل پلٹ گیا۔ واپس آیا حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور درگاہ میں دیگ شوئی پر مقرر ہوا۔

ان کے خانوادے کے افراد کی تصانیف میں ان کے چند مزید ملفوظات ملتے ہیں۔

۱۔ اے غیبانی سیّد عبد القادر پتر کی (کہ) میرا' جا تجھے سیّد عبد القادر کے حوالے کیا۔

۲۔ دیوا بڑھاؤ

۳۔ کیا چاہتی ہے سوا میں بھسکے (کذا)

۴۔ مخدوم خاں زادے بھانڈا تو صاف کیا' اپھیں نعمت چھوڑی چاہیئے۔

۵۔ ارے غیبانی پیو پُترے مونھ سمانا (ندوی' علی گڑھ تاریخِ ادب ص ۱۰۱۔۱۰۰)

(تیرے)

ڈاکٹر عبد الستار دَلوی نے منگرول گجرات کے ایک غیر معروف صوفی شاعر شیخ دین کی نظم "مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات در مدحِ شاہ عالم" کا تعارف اور متن نوائے ادب بمبئی بابت جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ یہ نظم مربّع ترجیع بند ہے جس کے ہر بند کا چوتھا مصرع ع نکالو شاہ عالم درد میرا' ہے۔ پہلا بند ہے

مدد کرنا شتابی پیر میرا — میرا دل مبتلا تم پر گھنیرا
دیا ہے مرتبہ حق نے انیرا — نکالو شاہ عالم درد میرا[2]

---

[1] تحفتہ الکرام جلد اوّل ص ۳۱ بحوالۂ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۵۵۔

[2] ڈاکٹر عبد الستار دلوی "مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات در مدحِ شاہ عالمؒ از شیخ دین گجراتی۔ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۵ء ص ۷۴۔۶۹۔ مجھے اس مضمون کی اطلاع ڈاکٹر سیّدہ جعفر سے ملی۔

Marfat.com

جمعاتِ شاہیہ میں سلطان سکندر کا یہ فقرہ بھی درج ہے۔

سلطان سکندر : "پیر ہوا، مرید جوگی ہوا"[1]

سکندر بن منجھو نے تاریخ مراۃِ سکندری میں یہ واقعہ

سلطان محمود بیگڑہ م ۹۱۷ھ : بیان کیا ہے۔

گجرات کے سلطان محمود بیگڑہ کی فرمائش پر ایک سنار سونے کا مرصّع رباب بنا کر بادشاہ کی خدمت میں لے جا رہا تھا۔ راستے میں قاضی نے پکڑ لیا اور رباب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ سنار نے بادشاہ کو جا کر یہ بتایا تو بادشاہ نے خلوت میں جا کر آہ بھری اور کہا:

نیچی بیری سب کوئی جھوڑے[2]

اور اس کے آگے فارسی میں کہا

بہ ما امرِ معروف می کنند۔ چرا بہ رسول آباد رفتہ بر میاں منجملہ (یعنی شاہ عالم) امر معروف نمی کنند کہ ایشاں جامۂ ابریشمی می پوشند و استماعِ سرود می نمایند

شیخ بہاء الدین باجن نے شیخ یحییٰ گجراتی کے تعلق سے ایک فقرہ لکھا ہے۔ یحییٰ کے والد شیخ لطیف حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ شیخ یحییٰ کے بیٹے شیخ عزیز اللہ متوکل ہیں اور عزیز اللہ کے بیٹے شیخ رحمت اللہ جو باجن کے مرشد ہیں۔ باجن لکھتے ہیں کہ گجرات میں شیخ یحییٰ کے بارے میں یہ فقرہ مشہور تھا

'وقت شیخ یحییٰ جیسا پڑے تیسا سہے' اپنی بیڈن کسے نہ کہے'[3]

شیرانی نے اس کے یہ معنی لکھے ہیں کہ اگرچہ تمھارا شیخِ وقت شیخ یحییٰ کی طرح مستجاب الدعوات ہو پھر بھی مناسب یہی ہے کہ جو تکلیف انسان پر آئے اسے خود جھیلے اور دوسروں سے اس کا تذکرہ نہ کرے۔

ان کے حالات تیسرے باب میں لکھے جا چکے ہیں۔

حضرت سیّد محمد جونپوری م ۹۱۰ھ : ان کا عرصۂ حیات ۸۴۷ھ م ۱۴۴۳ء تا ۹۱۰ھ م ۱۵۰۵ء ہے۔ ان کے چند ملفوظات اردو ادب کی تاریخوں میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا راقم الحروف

---

[1] مراۃ سکندری ص ۱۱۱ بحوالہ مقالاتِ شیرانی جلد اوّل ص ۱۵۶ — ۱۵۵

[2] [3] مقالاتِ شیرانی جلد اوّل، ص ۱۶۲، نیز ص ۱۵۰

Marfat.com

کے ایک شاگرد سیّد نصرت مہدی نے ایم فِل کے لئے مقالہ "اردو ادب میں مہدویوں کا حصّہ ۱۸۰۰ء تک" لکھا۔ اس میں بہت زیادہ تعداد میں مزید ملفوظات دیئے ہیں۔ واضح ہو کہ مہدوی حضرات اپنے ہادی کے ملفوظات کو فرامین کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ ذیل میں نصرت کے مقالے سے حضرت سیّد محمد مہدی کے فرامین درج کیے جاتے ہیں۔ سہولت کی خاطر ہر ملفوظے کا ماخذ اس کے فوراً بعد درج کر دیا گیا ہے۔

۱۔ بندہ کی قدر تم کیا جانو، جیو بندے کے صدقے سوں کھاتے سوتے پکڑی کھلاتے۔ خدائے پلائے بندے کی قدر بندے کے بھائی ہوتے تو جانتے (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲)

۲۔ بندے کا آنا جب ہوا جب حقیقت ایمان کی نہ رہی تھی مگر مجذوبوں میں (ایضاً ص ۶)

۳۔ فرمانِ حق تعالیٰ می شود کہ اے سیّد محمد دعویٰ مہدیت کا کہلاتا ہووے تو کہلا، نہیں تو ظالموں میں کا گروں گا (میاں سیّد یوسف: مطلع الولایت ص ۵۹۔ شاہ برہان: شواہد الولایت ص ۱۶۱۔ خاتمِ سلیمانی جلد اوّل ص ۳۴۳)

۴۔ حضرت میاں نظام اچھے جی اچھے (یا اچھو جی اچھو) (سیّد عبدالکریم: نور پاک ص ۱۴۴۔ خاتمِ سلیمانی جلد اوّل ص ۳۴۱۔ مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۹۸)

۵۔ طلبِ دنی کفر ہے، دنیا کا طالب کافر، خدا کا طالب مومن، خدا کوں دیکھنا ممکن۔
(بندگی میاں ولی جی: حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۰۔ نقلیات میاں سیّد عالم ص ۱۱۱)

۶۔ بندۂ اُمّی دوجے عالم پیر خالق پڑے (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۱۔ نقلیات میاں سیّد عالم ص ۱۱۲)

۷۔ ہمارے کوں اندھے بہرے ہو کر نہ پڑیں۔ خدا کا دین دیکھ پرکھ کر کریں
(نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۴)

۸۔ ہمارے ناقص کوں ولی کامل کا ایمان دیا جاتا ہے (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۱۷)

۹۔ ہمارے کوں اڑ پڑتے، اڑ کھڑتے، جلے بہارتے مریں (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۲۔ خاتمِ سلیمانی جلد اوّل ص ۳۶۷)

۱۰۔ اس دنیا دار کہتے تھے تیئں کافر کاہے نہیں کہتا (بندگی میاں سیّد یوسف؛ مطلع الولایت ص ۱۷۱۔ حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۰)

۱۱۔ مرغی میدہ کھاؤ اور ابریشمی نہالوں میں سوؤ پر نور چھوڑو۔ (سید عبدالکریم: نور پاک ص ۱۲۵۔ حرص)

Marfat.com

۱۲۔ تم کوں بھوجن ہم کوں پیو (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۵۸۔ نقلیاتِ میاں عبدالرشید۔ ص ۱۹۔
نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۱)

۱۳۔ پیو دین کا نہ دنیا کا (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۰۶)

۱۴۔ سب چھوڑ، خدا لوڑ (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۴)

۱۵۔ خدا کی خدائی کو کوئی (چاہ) چھے نئیں۔ بندہ کی طلب کو چھے نئیں (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۱۰۔
نقلیاتِ میاں سیّد عالم ص ۱۱۱) (انتہا)

۱۶۔ وہاں جو ہوا ہے سو یہاں ہوگا (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۳۳)

۱۷۔ خیر جی شاہ مدار کی نماز یک وقت بھی قضا نہیں ہوئی (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۶)

۱۸۔ حضرت کنج احمد کی زیارت کے بعد ان کے متعلق یوں فرمایا

رو پٹ کر ایماں لے گئے (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۸)

رو پٹنے (کر) ایماں لے گئے (خاتمِ سلیمانی جلد اوّل ص ۲۳۴)

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ شیخ احمد کھٹّو کی نسبت آپ نے فرمایا۔

رو پٹتے خدا کوں پونچے (تاریخِ سلیمانی جلد اوّل بحوالہ اردو کی ابتدائی نشو و نما ص ۲۰)

نصرت مہدی نے یہ قول 'کنج احمد' کے بارے میں لکھا ہے۔ غالباً یہ گنج احمد ہے۔ احمد کھٹّو کا لقب گنج بخش تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گنج احمد اور احمد گنج بخش ایک شخص ہیں اور خاتمِ سلیمانی اور تاریخِ سلیمانی ایک کتاب۔ اس طرح یہ مقولہ ایک ہی ہے جس کے کئی متن ہیں۔

۱۹۔ سیّد بدرالدین عبدالفتّاح کے بارے میں کہا

بھئی سیّد عبدالفتّاح ہمارے ہیں جی (بندگی میاں شاہ قاسم: فضیلتِ افضل القوم ص ۱۵)

۲۰۔ حضرت شاہ عالم کی زیارت کے بعد

'سوہاگ کی بو آتی ہے' (نقلیاتِ سیّدا صاحب ص ۲۷)

۲۱۔ ان کے فرزند حضرت سیّد محمود جب کسب چھوڑ کر واپس آ رہے تھے تو فرمایا جس کا پوت پوت ہو کر آوے، اسے کاہے خوشی نہ ہووے'

(بندگی میاں شاہ برہان الدین: شواہد الولایت ص ۲۶۹)

۲۲۔ میاں امین محمد کو فرمایا

شما ٹھنڈی سہاگن ہستید (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۲۴۶۔ نقلیاتِ میاں سیّد عالم ص ۴۸)

Marfat.com

۲۳۔ سر پہ بال رکھنے کے تعلق سے فرمایا

مونڈھی عروس پیو کوں کیوں بھاوے گی جی (فضل اللہ: سنت الصالحین قلمی ص ۱۵۹)۔

۲۴۔ بی بی بوں جی سے میاں عبدالحئی کی ولادت پر فرمایا:

خیر جی اے تو روشن منوّر ہیں۔

۲۵۔ مہدوی عقیدے کے مطابق جب بھی خدا کا طالب حضرت مہدی کے سامنے آتا تو ان کی ذات کو دیکھنے کے ساتھ تین گھڑی یا تین پاس یا زیادہ سے زیادہ تین دن میں خدا کا دیدار ہو جاتا۔ اگر تین دن میں بھی نہ ہوتا تو حضرت فرماتے

'خدائے تعالیٰ تو صادق الوعد ہے' جیو یہ کذب کس طرف واقع ہوتا ہے'

(نقلیاتِ ستیدا صاحب ص ۲۵)

۲۶۔ دونوں ہاتوں لاڈو' موئے جیوے مومن کے (حاشیۂ انصاف نامہ ص ۲۳۳)

۲۷۔ ہجرت کے متعلق فرمایا

خدا تعالیٰ بھی کہتا ہے' اینٹ ماٹی کے گھر چھوڑو۔ بندہ کہتا ہے اینٹ ماٹی کے گھر چھوڑو۔

(نقلیاتِ ستیدا صاحب ص ۲۳)

۲۸ ملک عثمان جالوری کو عملِ انسانی سے ذاتِ انسانی کے متاثر ہونے کے موضوع پر کہا 'عین حسینی سیّد ہے' پر کاموں کل جاتا ہے' (نقلیاتِ ستیدا صاحب ص ۱۳)

واضح نہیں کہ یہ نثر ہے کہ شعر؟

۲۹۔ ہندی گجراتی مقولہ 'البو بن اٹھانے کوڑلہ (ملک سلیمان: خاتم سلیمانی جلد اوّل ص ۳۸۶)

۳۰۔ شاہ خراسان کی فوج نے آپ کے اصحاب کو پریشان کیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو معذرت کی۔ حضرت نے بادشاہ کے سفیر سے کہا

نشہ کی چوٹ' شکر کی پوٹ (خاتم سلیمانی جلد اوّل ص ۳۶۲۔ مولوی عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۲۵)

۳۱۔ بھیا بسر کی جو کی (تاریخ سلیمانی بحوالہ جالبی ص ۱۳۳)

۳۲۔ سیّد خوندمیر خلیفۂ دوم سے فرمایا

'اگر سارکیاں پھسلیاں ہو ویں تو بھاگیں وہاتی کے ہاڑ ہو ویں تو گھسنا جاویں' ہشیار ہو جیو'

(میاں شاہ قاسم: افضل المعجزات المہدی ص ۴۱۵)

Marfat.com

یعنی اس بار خلافت کے اٹھانے میں اگر لوہے کی پسلیاں ہوں تو ٹوٹ جائیں اور ہاتھی کی ہڈیاں ہوں تو گھس جائیں۔ ہشیار رہنا۔

۳۳۔ میاں مصطفےٰ گجراتی کے بہتّرویں مکتوب میں ہے کہ حضرت میراں کبھی کبھی ہندوستان کی زبان میں بھی ارشاد کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار کہا

ہموں تموں میانے خدا بھیتر کی محبت ہے جیو' ہموں تموں میانے خدا بھیتر کی محبت ہے جیو

(شیرانی: دائرے کے مہدویوں کا اردو ادب کی تعمیر میں حصہ۔ مقالاتِ شیرانی جلد دوم ص ۱۹۸)

۳۴۔ ان کے مقلّد محمد مومن کی مثنوی 'اسرارِ عشق' ۱۰۹۱ھ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ مہدی علیہ السلام نے فرمایا

تمام عالم مصطفےٰ کی ولایت کی صفت کرنے بیچ مو۔ ہمارے ملّا نے دو گوجری دھیان میں مصطفےٰ کی ولایت کی صفت کیا۔

(مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو پاکستان جلد چہارم ص ۲۲۲۔ عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۲۰۱)

ان ملفوظات میں بعض کی زبان بہت فرسودہ اور بعض کی خاصی صاف ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ کتابوں میں راویوں نے جس طرح لکھا ہے، کوئی یقین نہیں کہ یہ مہدی کے واقعی الفاظ ہیں اور ان میں زبان کی اصلاح کا عمل نہیں کیا گیا۔

میاں دلاور م ۹۴۵ھ: یہ جے پور کے نزدیک دائرے کے مہدوی تھے۔ ان کا یہ فقرہ مشہور ہے

'صدقہ جاؤ جی اس باطن کے جس میں دینِ محمدی پرورش پاتا ہے'[1]

ہمایوں بادشاہ نے ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں مالوہ و گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ پر حملہ کیا۔ اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر ملا ہوا تھا۔ بہادر شاہ کو شکست ہوئی۔ ہمایوں کو مالِ غنیمت میں بہادر شاہ کا طوطا بھی ہاتھ آیا۔ ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرہ رکھا تھا۔ جب رومی خاں وہاں آیا تو طوطا چلّا اٹھا

پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام' پھٹ پاپی نمک حرام[2]

---

[1] مقالاتِ محمود شیرانی جلد دوم ص ۱۹۹۔

[2] حامد حسن قادری: داستانِ تاریخ اردو ص ۲۲۔ نجیب اشرف ندوی: علی گڑھ تاریخ ص ۱۰

Marfat.com

اس جملے کے بارے میں یہ شبہہ رہتا ہے کہ طوطا از خود سوچ کر انسانی زبان میں بات نہیں کر سکتا۔ اسے جو چند محدود الفاظ یا فقرے یا ایک آدھ جملہ رٹوا دیا جاتا ہے صرف وہی ادا کر سکتا ہے۔ رومی خاں کو دیکھ کر اپنی طرف سے وہ تبصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ بظاہر وہ رومی خاں کو پہچانتا بھی نہ ہوگا۔ حامد حسن قادری یا نجیب اشرف ندوی نے اس جملے کا ماخذ نہیں دیا۔ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ طوطے نے ایسا کہا ہوگا۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیری م ۹۷۰ھ:

ان کا انتقال آگرے میں ۹۷۰ھ میں ہوا۔ مشہور صوفی شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ان سے ارادت رکھتے تھے۔ وجیہ الدین کے بھتیجے سید شاہ ہاشم علوی کے ملفوظات کا مجموعہ مقصود المراد ہے۔ عبدالحق لکھتے ہیں۔

'اس کتاب میں شاہ صاحب کا ایک ہندی قول سید ہاشم کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔

بھیگی بچہ خدا کو نہ میلے [1]

یعنی بھکاری کو خدا نہیں ملتا۔

شیخ وجیہ الدین احمد علوی گجراتی م ۹۹۸ھ:

ان کے مفصل حالات اس باب کے آخر میں تحریر کئے جائیں گے۔

یہ محمد آباد (جانپانیر) میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں احمد آباد چلے آئے۔ گو یہ شاہ قادن کے مرید تھے لیکن ان کے فیضِ روحانی کا اصل سرچشمہ شاہ محمد غوث گوالیری تھے۔ ان کے مریدوں نے ان کے ملفوظات بحرالحقائق اور ملفوظ شاہ وجیہ الدین میں جمع کئے ہیں ان میں مرید فارسی میں سوال کرتے ہیں اور یہ یا تو محض اردو میں جواب دیتے ہیں یا جزواً فارسی اور جزواً اردو میں۔ سب سے پہلے ایسے فقرے مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں دیئے۔ اس کے بعد ان سے کہیں زیادہ فقرے سید نجیب اشرف ندوی نے علی گڑھ تاریخِ ادب میں بحرالحقائق نیز ملفوظِ شاہ وجیہ الدین سے دیئے۔ سب سے آخر میں جمیل جالبی نے ان سب سے زیادہ فقرے اور جملے نقل کئے۔ حالانکہ سب کے ماخذ وہی کتابیں ہیں لیکن چونکہ مختلف مخطوطوں سے استفادہ کیا ہے اس لئے فقروں کے متن میں قدرے اختلاف ملتا ہے۔

---

[1] عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۳۰

Marfat.com

سب سے پہلے ایک متنازع جملے کو لیجئے۔

خواجہ بندہ نواز کے ایک مرید عبداللہ بن عبدالرحمٰن چشتی نے خواجہ کے ملفوظات پر مشتمل فارسی کتاب عشق نامہ لکھی۔ یہ نہایت کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں لکھا ہے کہ اس میں خواجہ صاحب کا یہ اردو جملہ ہے

بھوکوں موئے سوں خدا کچھ انپڑیتا ہے۔ خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہور ہے۔[1]

لیکن بحرالحقائق میں یہ مقولہ مکمل تر ہو کر شیخ وجیہ الدین کے نام سے یوں ہے۔

۱۔ درحکایت کردن فرمودند "کیا ہوا جو بھوکوں موا۔ بھوکوں موئے تیں کیا خدا کوں انپڑیا، خدا کو انپڑنے کی استعداد ہور"[2]

عشق نامہ سیّد وجیہ الدین اور بحرالحقائق سے یقیناً پہلے کی کتاب ہے۔ قول بحرالحقائق میں زیادہ مکمّل ہے۔ کیا یہ 'عشق نامہ' میں واقعی موجود ہے۔ اب اس کتاب کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خدا معلوم شمس اللہ قادری سے کوئی سہو تو نہیں ہوا۔

اس جملے کو چھوڑ کر بحرالحقائق میں ذیل کے اردو جملے ملتے ہیں۔ میرا ماخذ اردو کی ابتدائی نشوونما' علی گڑھ تاریخ اور جمیل جالبی کی تاریخ ہیں۔

۲۔ جس چیز میں ذوق وشوق پاوے اسے ترک نہ دیوے

۳۔ بھونڈا ہوئے سو نا کرے۔

۴۔ کاہے دنیادار بھی اپنیچ (یعنی اپنے ہی ہیں)

۵۔ اپنوں کو کیا کشف ہوئے یا نہ ہوئے۔ کام اس کا ہے۔

۶۔ میں کہاں یا کدھاں؟ ریاضت کیتی؟

۷۔ جیسی تجلّی پکڑے تیسا ارادہ دیوے۔ اگر عبد کی تجلّی پکڑے عبدیت ارادہ دیوے

اردو کی نشوونما ص ۳۱۔ علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۲۔ ۱۰۱)

۸۔ اس سیں ہوا کیا خوب ہے۔ اس دنیا میں کہ دل خدا سوں مشغول ہووے۔

۹۔ عارف اسے کہویں جو خدا سے بھریا ہووے (سوں) (داستانِ تاریخِ اردو ص ۱۹۔ علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۲)

---

[1] اردوئے قدیم ص ۲۳

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۳۱

Marfat.com

۱۰۔ جب ترقی پکڑیں گے، تب آپیں درس کہیں گے (علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۲۔ اردوئے قدیم ص ۲۵)

۱۱۔ اگر کسی کوں تھوڑی بھی صفا ہوئے جو حرام لقمہ کھاوے یا حرام فعل کرے تو تیج پاوے۔ دوجے بار بھی پاوے، تیجے بار بھی پاوے۔ (علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۲۔ جمیل جالبی ص ۱۰۰)

نجیب اشرف ندوی نے ملفوظ شیخ وجیہ الدین سے ذیل کے جملے دیے ہیں۔

۱۲۔ دنیاداراں اپنیج ہیں۔

۱۳۔ ہمیں رسول کے لوگ۔

۱۴۔ اپنی جھک مار کر قبول کرے گا۔

۱۵۔ شیخ عربی کا تقویٰ کہاں، میرا مکان کہاں (علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۲)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے ایک مخطوطے سے لے کر معارف جون ۱۹۵۰ء میں شیخ وجیہ الدین کے کچھ اردو ملفوظات دیئے[1]۔ ظاہرا انھیں کو اپنی کتاب علمی نقوش میں لے لیا۔ ان میں سے لے کر جمیل جالبی نے ۱۲ جملے دیئے ہیں[2]۔ ان میں سے دو مندرجہ بالا ملفوظِ شیخ وجیہ الدین سے مشترک ہیں اور دو بحر الحقائق سے۔ معلوم ہوتا ہے غلام مصطفےٰ خاں کا مذکورہ مجموعہ ملفوظِ شیخ وجیہ الدین ہی ہے جس میں بعض اقوال بحر الحقائق سے مشترک ہیں۔ جالبی کے مذکورہ مزید اقوال یہ ہیں۔

۱۶۔ رات دن خدا جنوں کی مدح کرے

۱۷۔ نہ نہ یوں تو ذوق نہ ہووے

۱۸۔ اپنوں کوں کیا فائدہ

۱۹۔ سب چھوڑ بیٹھے تو شتاب فائدہ ہو جاوے

۲۰۔ یک ہوں یا دو ہوں۔

۲۱۔ ایک گھڑی یا دو گھڑی یا چار گھڑی

۲۲۔ تمہی ایہاں رہتے ہو

۲۳۔ ولیوں کیاں صفتاں ہوتیاں ہیں

۲۴۔ فقیر پر فرض تو نئیں (جمیل جالبی ص ۱۰۱۔ ۱۰۰)

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل: پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار (کراچی ۱۹۸۷ء) ص ۱۷۔

[2] ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں: علمی نقوش ص ۹۵ تا ۱۰۴ (کراچی ۱۹۵۷ء) بحوالہ جمیل جالبی: تاریخ ص ۱۰

Marfat.com

رسالے اور کتابیں :

ملفوظات کے بعد ہم اردو نثر کی مستقل کتابوں یا رسالوں (کتابچوں) یا طویل عبارتوں کی کھوج کرتے ہیں۔ تقابل کے لئے ہم ہندی نثر کا سرسری ذکر کرتے چلیں۔

قدامت کی تلاش میں ہندی میں ان ادبی نمونوں کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے جو دراصل قبلِ ہندی کے ہیں یعنی اَپ بھرنش آمیز مغربی ہندی یا مشرقی ہندی یا راجستھانی۔ چونکہ ہندی نے اپنے حصار میں بہار تا راجستھان کی سبھی زبانوں اور بولیوں کو داخل کر لیا ہے۔ اس لئے واضح نہیں ہوتا کہ کون سی کتاب واقعی ہندی کی ہے۔ ڈاکٹر سمن راجے نے اپنی ہندی کتاب ساہتیے اتہاس' آدی کال۔ کانپور ۱۹۷۶ء میں ہندی کی ابتدائی نثر کا ذکر کیا ہے۔

ان کے مطابق پہلی نثری کتاب اُدّھوتن سوری کی کُوَلے مالا کہا (۷۷۹ء) ــــ ہے۔ یہ اَپ بھرنش کی کتاب ہے لیکن اس میں دیسی زبانوں کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی کے آخر کی 'جگت سندری پریوگ مالا' منظوم کتاب ہے جس کے بیچ بیچ میں نثر بھی ملتی ہے۔ قدیم ہندی نثری ادب کے چار موضوع ہیں ۱۔ مذہبی ۲۔ تاریخی۔ ۳۔ ادبی ۴۔ متفرق مذہبی نثر میں زیادہ تر جینیوں کے شاستر ہیں۔ یہ کتابیں مختلف مقامات پر مروّجہ ہندی کی مختلف بولیوں میں ہیں لیکن انھیں کھڑی بولی کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں بارہویں صدی وکرمی کی "اُکتی وِیکتی شاستر' اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ یہ مدھیہ دیش میں لکھی گئی۔ ان کتابوں میں سنسکرت کی اخراط ہوتی ہے یا راجستھانی کی یا پوربی زبانوں کی۔ کوئی بھی ایسی نہیں جسے باقاعدہ کھڑی بولی کا نمونہ کہہ سکیں۔

برج بھاشا نثر میں کئی کتابیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک کرشن بھگتی کے بانی وَلّبھ آچاریہ کے بیٹے وِٹھل ناتھ م ۱۵۸۵ء کی 'شرنگار رس منڈن' ہے۔ دوسری وِٹھل ناتھ کے بیٹے گوکل ناتھ کی "چوراسی وَیشنووں کی وارتا" ہے لیکن چونکہ اس میں خود گوکل ناتھ کا بھی ذکر ہے اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی چیلے کی تصنیف نہ ہو۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں

"ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس" کے مصنف رام چندر شکل نے تو چوراسی وَیشنووں کی وارتا" کو کھڑی بولی کی پہلی تصنیف مانا ہے یہ جوگیوں اور سدھوں کے کلام کا مجموعہ ہے جو آٹھویں صدی عیسوی کے قریب کی تصنیف ہے[1]

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: مدھیہ کالین گدیہ کا ارتقا ص ۶۔

Marfat.com

رام چندر شکل کی کتاب کا صحیح نام 'ہندی ساہتیہ کا اتہاس' ہے میرے سامنے اس کا سمبت ۱۹۹۹م ۱۹۴۲ء کا ایڈیشن ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے مندرجہ بالا اقتباس کے لئے شکل کی کتاب کا صفحہ ۱۱ کا حوالہ دیا ہے۔ صـ۱۱ پر چورا سی سِدّھوں کا ذکر ہے۔ اس صفحہ پر یا اس کے آس پاس کہیں بھی چوراسی وشنوؤں کی وارتا کا ذکر نہیں۔ اس کتاب کا بیان 'نثر کا ارتقاء' نامی باب میں صـ۲۸۴ پر ہے۔ اس کے لئے لکھا ہے کہ اس کا عہدِ تخلیق سترھویں صدی بکرمی کا نصفِ دوم (یعنی سترھویں صدی عیسوی کا نصفِ اوّل) ہے[1]۔ اس کی اور اس کے بعد کی ایک دوسری کتاب "دوسو باون وشنوؤں کی وارتا" کی زبان کے بارے میں لکھا ہے۔

"ان وارتاؤں (تذکروں) کی کتھائیں بول چال کی برج بھاشا میں لکھی گئی ہیں جس میں کہیں کہیں بہت مروّج عربی فارسی لفظ بھی بے تامّل رکھے گئے ہیں"[2]

رام چندر شکل ایسے جاہل نہیں تھے کہ سترھویں صدی عیسوی کی اس نہایت مشہور کتاب کو آٹھویں صدی عیسوی میں رکھ دیتے اور برج بھاشا کی کتاب کو کھڑی بولی کا پہلا نمونہ کہہ دیتے۔

ان میں سے کوئی کتاب کھڑی بولی میں نہیں۔ کھڑی بولی کی پہلی ہندی کتاب گنگ کوی کی 'چند چھند بَرنَن کی مہما' ہے۔ گنگ کوی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۷ء) اٹاوہ کے اِنّور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ اکبر کے درباری کوی تھے اور عبدالرحیم خانخاناں کے دوست تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خانخاناں نے ان کی ایک مختصر نظم سے خوش کر ۳۶ لاکھ روپے انعام دیا تھا[3]۔ رام چندر شکل نے اس کتاب کے یہ نمونے دیے ہیں۔

"سِدّھی شری ۱۰۸ شری شری پات ساہی جی شری دل پتی جی اکبر ساہ جی عام کھاص میں تکھت اوپر وِراجمان ہو رہے۔ اور عام کھاص بھرنے لگا ہے جس میں تمام اُمراو آئے آئے کُرنِش بجائے جہار کر کے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مِسَل سے۔ جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم کے رسّے میں ریسم کی نُوحیں پکڑ پکڑ کے کھڑے تعجیم میں رہے۔

اتنا سن کے پات ساہی جی شری اکبر ساہ جی آدسیر سونا نر ہر داس چارن کو دیا۔ ان کے

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۳۸۴۔ سمبت ۹۹۹: بکرمی/۱۹۴۲ء کا ایڈیشن۔

[2] ایضاً

[3] ڈاکٹر کرشن لال ہنس: ہندی ساہتیہ کا سمیکشا تمک اتہاس ص ۲۵۷۔ کانپور ۱۹۷۴ء (ہندی کتاب)

Marfat.com

ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس بنچنا پُورَن بھیا۔ عام کھاص یر کھاص ہوا"[1]

رام چندر شکل اس کی زبان کے لئے کہتے ہیں۔

"یہ بھاشا اردو نہیں کہی جا سکتی، یہ ہندی کھڑی بولی ہے"[2]

یہ برج بھاشا بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں رہے، بھرے، آئے، بجائے وغیرہ میں یائے مجہول ہے برج کے انداز پر یائے لین یعنی یا ماقبل مفتوح نہیں۔ یہ کتاب چورا سی ویشنوؤں کی وارتا' پر مقدم ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے آخر تک ہندی میں کھڑی بولی نثر کی اور کوئی کتاب نہیں ملتی۔

ہندی نثر کے اس پس منظر کے ساتھ ہم اردو نثر کا آغاز تلاش کرتے ہیں۔ ابھی تک ہم نے اردو کے فقروں اور جملوں کی نشان دہی کی ہے۔ اگلی منزل مستقل کتاب کا وجود ہے۔ کتاب کی کھوج سے پہلے یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ پہلی موجود نثری کتاب کے یہ معنی لازماً نہیں کہ اردو نثر میں پہلی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے پیشتر بھی کوئی رسالہ یا کتاب لکھی گئی ہو لیکن آج وہ موجود نہیں۔ موجود بھی ہو تو خاکِ گم نامی میں دبی نظروں سے اوجھل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں بعض ایسی کتابوں کو اوّلیت کا شرف دے دیا جاتا ہے جو آج موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ماضی میں موجود رہی ہوں جس طرح آزاد نے فضلی کی کربل کتھا کا دعویٰ کیا تھا لیکن وہ موجود نہ تھی۔ بعد میں مل گئی۔ اس کے برعکس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نایاب کتب کے دیدار کے مدّعی محض اپنی یا اپنے علاقے کی اہمیت جتانے کے لئے غلط بیانی سے کام لے رہے ہوں۔ ایسے سب دعووں کو ذیل میں پرکھا جائے گا اور اردو کی پہلی نثری کتاب پر انگلی رکھی جائے گی۔

سیّد اشرف جہانگیر سمنانی:

حامد حسن قادری نے ان کا عرصۂ حیات ۷۸۸ھ تا ۸۰۸ھ دیا ہے[3] اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[4] ۶۸۰ھ تا ۸۰۰ھ۔ سیّد سلیمان ندوی نے ان کی تاریخ وفات ۷۹۸ھ درج کی ہے[5]۔ حامد حسن

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۸۹

[2] داستانِ تاریخ اردو ص ۱۷

[3] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۸۹

[4] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۲۰۶

[5] نقوش سلیمانی ص ۵۰

Marfat.com

قادری داستانِ تاریخ اردو میں لکھتے ہیں کہ میر نذر علی درد کاکوروی نے رسالہ نگار لکھنؤ بابت دسمبر ۱۹۲۹ء میں ایک مضمون میں لکھا۔

سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں زبانِ ہندی کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے۔

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے، ہمہ اوست میں خدا ہے جو تحقیق جان۔ اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔"[1]

قادری صاحب نے اس کا سنہ تصنیف ۸۰۷ھ لکھا ہے جو ۹-۱۴۰۸ء کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا زبان اس دور سے بہت بعد کی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس کی تفصیلی تحقیق کی جس کی تفصیل اپنے مقالے میں دی ہے[2]۔ ان کے استفسار پر حامد حسن قادری نے لکھا کہ انھوں نے یہ رسالہ خود نہیں دیکھا، اس کی تفصیل درد کاکوروی کے مضمون سے لی تھی۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر رفیعہ میر نذر علی درد سے بھی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ درد نے لکھا کہ

جناب حامد حسن قادری نے جس رسالے کی نشان دہی کی ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے نہ میں نے صاحبِ موصوف کو دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پرچہ 'یادگار' لاہور میں 'اردو اے شمالی ہند' کے عنوان سے میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں میں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں اورنگ آباد میں حضرت شاہ قادر اولیاء کی درگاہ میں محبوب علی شاہ نامی ایک خادم تھے (عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو گیا) ان کے پاس سید اشرف جہانگیر والی کتاب کو میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ قلمی کتاب تھی۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۸ کا ٹکڑا یہ ہے[3]

اے طالب آسمان و زمین ۔۔۔۔۔ الخ

حامد حسن قادری نے ان جملوں کو صـ ۱۱۸ سے متعلق کہا۔ درد کے مطابق یہ صفحہ ۱۸ پر تھے۔

---

[1] داستانِ تاریخ اردو ص ۱۷

[2] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۵۷-۵۶

[3] ایضاً ص ۵۷

Marfat.com

اب یہ کتاب کہیں موجود نہیں۔ اس کے واحد شاہد میر نذر علی درد کا کوروی بھی مالکِ کتاب محبوب علی شاہ کی طرح اب تک انتقال کر چکے ہوں گے۔ گویا یہ تمام دعوے بے دلیل ہیں۔ درد اردو کے محقق نہ تھے ورنہ اتنی قدیم کتاب کی (اگر وہ کبھی تھی) محض دو سطریں لکھنے پر اکتفا نہ کرتے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے مولوی عبدالحق سے ان کی رائے مانگی۔ انھوں نے جواب دیا۔

"جس رسالے کا ذکر حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے وہ بہت مشتبہ ہے اور وہ پائے ثبوت کو نہیں پہنچا۔"[1]

چونکہ اس کتاب کے شواہد کمزور ہیں، وجود مشکوک ہے، زبان جدید ہے اس لئے ہم اسے شمار سے خارج کر سکتے ہیں۔

شیخ عین الدین گنج العلم:

شمس اللہ قادری کے مطابق ان کا عرصۂ حیات ۷۰۶ھ تا ۷۹۵ھ ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ میں ان کے تذکرے میں عنوان میں ۷۰۶ھ تا ۷۹۹ھ لکھا ہے لیکن احوال کے بیچ میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات[2] ۷۹۵ھ میں ہوئی۔ گویا عنوان میں ۷۹۹ھ سہواً لکھ دیا تھا۔ ان کی شاگرد ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے میں ان کی زندگی ۷۰۶ھ تا ۷۹۹ھ طے کی ہے لیکن اندر لکھتی ہیں کہ ۸۹ سال کی عمر میں ۷۹۹ھ[3] میں رحلت فرمائی۔ ۷۰۶ میں ۸۹ شامل کر کے ۷۹۵ بنتے ہیں ۷۹۹ھ نہیں۔ گویا ان کے مطابق بھی تاریخِ رحلت ۷۹۵ھ ہونا چاہیئے۔ لکھتی ہیں کہ تذکرہ روضتہ الاولیائے بیجاپور اور روضتہ الاصفیا کے مطابق ان کی عمر ۱۳۲ سال ہوئی تھی۔ روضتہ الاولیائے بیجاپور کے مطابق ان کی ولادت شہر نویں[4] ہوئی جسے شمس اللہ قادری نے 'نئی دہلی' بتایا ہے۔ اگر یہ 'نئی دہلی' تھا موجودہ نئی دہلی نہیں، پرانی دہلی ہی ہونا چاہیئے یہ دہلی سے گجرات ہوتے دولت آباد گئے۔ اس وقت محمد تغلق دولت آباد کو پایۂ تخت بنا چکے تھے۔ وہاں انھوں نے دہلی سے آئے ہوئے ایک بزرگ سید خوندمیر علاؤالدین حسینی سے بیعت کی۔ ۷۳۷ھ میں وہ عین آباد سا گر گئے اور ۷۷۳ھ میں بیجاپور چلے گئے جہاں ۲۷ جمادی الاوّل ۷۹۵ھ (۱۳۹۲ء) کو انتقال کیا۔

---

[1] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۵۷ [3] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۱۵۱

[2] اردو نثر کا آغاز ص ۵۹

[3] بحوالہ پروفیسر سروری: علی گڑھ تاریخ ص ۱۵۱

Marfat.com

انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں طبقات ناصری کا تکملہ اور صوفیا کے احوال پر مشتمل اطوار الابرار قابل ذکر ہیں۔ شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

"آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف کئے تھے۔ منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعے میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی اور ان میں فرائض وسنن کے متعلق احکام ومسائل تحریر تھے"[1]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

'حکیم صاحب مرحوم نے ایک ملاقات میں مجھ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ یہ رسالے انھوں نے دیکھے تھے لیکن اردوئے قدیم کے کسی ایڈیشن میں ان کے اقتباسات شامل نہیں کیے گئے'

رفیعہ سلطانہ نے لکھا ہے کہ یہ نثری رسالے "ان کے بیان کی رو سے ۷۲۵ھ کی تصنیف ہیں"[2]۔ یہ سنہ اردوئے قدیم میں نہیں دیا۔ ظاہر اڈاکٹر رفیعہ کو یہ بات شمس اللہ قادری صاحب نے بتائی ہوگی۔

عین الدین گجرات اور دولت آباد ہوکر ۷۳۷ھ میں ساگر پہنچے۔ خاص دکن بیجاپور میں وہ ۷۷۳ھ میں جاتے ہیں۔ اگر وہ دہلی کے رہنے والے تھے تو ۷۲۵ھ میں دکن میں رسالے کیونکر لکھ سکتے تھے اور کیوں لکھتے۔ چونکہ یہ رسالے ناپید ہیں اور شمس اللہ قادری تک نے ان کا کوئی نمونہ نہیں دیا اس سے ان کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے اور ہم انھیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔

رسالہ جنونیہ یا جنونیت:

سب سے پہلے اس کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (۱۹۵۷ء) میں کیا۔ ص ۲۲۸ پر انھوں نے اس کا نام رسالۂ تصوف (چنو بپت) لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

مصنف سیّد چنو۔ تاریخ تصنیف مابعد ۱۱۵۰ھ کتابت

حالانکہ نسخے میں کوئی تاریخ تصنیف یا تاریخ کتابت نہیں لیکن بغیر دلیل کے مندرجہ بالا اندراج میں لکھنا ہاشمی کی خصوصیت ہے۔ لکھتے ہیں کہ مختصر فارسی عبارت کے بعد سیّد چنو کے ۱۱ قول یا گیارہ کلمے ہیں جن کی شرح فارسی میں ۱۳ صفحوں پر کی گئی ہے۔

---

[1] تاریخ زبان اردوئے قدیم ص ۴۱۔

[2] اردو نثر کا آغاز ص ۵۸۔

Marfat.com

اس رسالے کو اچھالنے والی ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے بیجاپور کے سرکاری میوزیم میں اس رسالے کو دریافت کیا۔ یہ دو دوسرے منظوم رسالوں پند نامہ اور چکی نامہ کے ساتھ ایک جلد میں مجلّد ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر ڈاکٹر رفیعہ نے اپنے مقالے میں صہ ۴۹ سے ۵۵ تک کیا۔ وہ سالار جنگ لائبریری کے مخطوطے سے واقف نہیں۔ آخر الذکر کی تفصیل ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے مرتبہ شکار نامہ کے مقدمے میں پیش کی[1]۔ انھوں نے اس سلسلے میں کہیں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا ذکر نہیں کیا جس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر رفیعہ سے الگ آزاد طور پر اس کا مطالعہ کیا۔ راقم السطور نے بھی اس مخطوطے کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ کو اس کا علم نہ تھا۔ سالار جنگ کا نسخہ زیادہ مکمل ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ نے بیجاپور کے نسخے کا تمہیدی جملہ جس میں مصنّف کا نام ہے دو جگہ لکھا ہے صہ ۵۰ پر اور صہ ۵۴ پر۔ دونوں جگہ مختلف ہے

بُعد ایں رای گوید حرص و ہوس گرفتار شوی محمد وخاں روزی ایں فقیر نشستہ بود، ص ۵۰

بعد از میگوید حرص و ہوا گرفتار شوی محمد وخاں روزی ایں فقیر نشستہ بود ص ۵۴

گویا ان کے نزدیک مصنّف کا نام محمو وخاں ہے۔ اس پیراگراف میں رسالے کا نام 'جنونیہ' لکھا ہے

'بنا بر ضرور ہر چہ خاطرِ ایں خام آمد بخامہ بند کردہ "جنونیہ" نام نہاد' ص ۵۰

لکھتی ہیں کہ فہرست میں بھی اس رسالے کا نام جنونیہ لکھا ہے۔ انگریزی عبارت میں اس کی سند اور رسالے کا نام یوں لکھا ہے

A Manuscript written in 795 A H

Comprising three works viz 'Januniya' Chabinama and "Pand nama"

وہ حیران ہیں کہ یہ سنہ متن رسالہ میں تو کہیں ہے نہیں۔ مرتب فہرست نے اس کو کہاں سے اخذ کیا۔ جب کہ کاتب نے ایک جگہ ۵۰۰ھ درج کیا ہے۔ ۵۰۰ھ برابر ہے ۱۱۰۶-۷ء کے جس میں اردو زبان کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ڈاکٹر رفیعہ نے اشارہ کیا کہ رسالے میں حافظ (۷۳۲ھ تا ۷۹۲ھ) نیز مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری (۶۶۱ھ تا ۷۸۲ھ) کا ذکر ہے جس کی وجہ سے وہ مانتی ہیں کہ اس رسالے کی تصنیف ۷۸۲ھ

---

[1] شکار نامہ صہ ۷۶ تا ۸۴ حیدرآباد ۱۹۷۲ء

Marfat.com

کے بعد ہوئی ہوگی[1]۔ وہ اسے ۷۹۵ھ کے قریبی زمانے کی تصنیف مانتی ہیں[2]۔

۵۰۰ھ کی گتھی کو ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب شاہ امین الدین علی اعلیٰ میں سلجھایا ہے انھوں نے بیجاپور کے عجائب خانے کا نسخہ خود دیکھا۔ اس کے آخر میں 'کارِ من نظام شد' میں 'شد' کو 'شدہ' اس طرح لکھا ہے۔

نظام شدہ : اسی کو ڈاکٹر رفیعہ نے ۵۰۰ھ پڑھ لیا۔ کیٹیلاگ میں جو سنہ کتابت ۷۹۵ھ لکھا ہے اس کے بارے میں کیٹیلاگ کے مصحح نے لکھا ہے کہ ۷۹۵ھ اس رسالے کا سنہ تصنیف ہے جس سے جنونیہ ماخوذ ہے[3]۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے نسخۂ سالار جنگ سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کی قرات کے مطابق مصنف کا نام محمد رونا اور فرمائش کنندہ کا نام سیّد جنون اور رسالے کا نام جنونیت ہے[4]۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص کا نام سیّد جنوں نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس نسخے کو دیکھا اس میں مصنّف کا نام صاف صاف 'سیّد وفا' ہے جبکہ ڈاکٹر رفیعہ نے 'محمد وخان' لکھا ہے۔ فرمائش کنندہ کا نام ڈاکٹر رفیعہ نے میر سیّد حسن محمد لکھا ہے۔ سالار جنگ کے نسخے میں نصیر الدین ہاشمی نے 'سید چنو' اور ڈاکٹر ثمینہ نے سیّد جنوں پڑھا۔ نسخے میں یہ نام 'سید جنو' لکھا ہے۔ اسے خواہ 'چنو' پڑھیے خواہ 'جنوں'۔ چونکہ اس میں نون غنّہ ہے ہی نہیں اس لئے 'جنوں' پڑھنے کا جواز نہیں۔ ہمارے یہاں چنّو بہ تشدید نون ایک نام ہوتا ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ رسالے کے مصنّف کا واقعی نام کیا ہے۔ فی الوقت 'سیّد جنو' پر قناعت کرنی ہوگی۔ رسالے کا نام بیجاپور کے نسخے میں جنونیہ اور سالار جنگ کے نسخے میں 'جنونیت' دیا ہے۔ اسی کی ہاشمی نے 'چنو پنت' جیسی مہمل قرات کی ہے[5]۔ 'نیت' کوئی بامعنی ترکیب نہیں۔ 'جنون' کے بجائے جنونیت کیوں کہا جائے۔ 'جنونیہ' بہتر ہے لیکن رسالے کے نام کے لئے یہ بھی مناسب نہیں۔ اگر مصنّف کا تخلّص 'جنوں' ہو تو اس کے معمّہ نما رسالے کو 'جنونیہ' کہا جا سکتا تھا۔

---

[1] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۵۱

[2] ایضاً ص ۵۵

[3] ڈاکٹر حسینی شاہد: شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۲۲۲ - ۲۲۱

[4] مقدمۂ شکار نامہ ص ۷۷

[5] فہرستِ مخطوطاتِ سالارِ جنگ ص ۲۲۸

Marfat.com

رسالے میں فارسی کے بہت سے اشعار ہیں۔ ان میں حافظ' سعدی اور مسعود بن جامی کے نام دیئے ہیں۔ دوسروں کے اشعار میں نہیں دیئے لیکن فارسی کے علما ان میں سے بہتوں کے مصنّف کی شناخت کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت لکھتی ہیں۔

'نثر میں حضرت گیسو دراز کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے لیکن معیّن انداز میں نہیں'[1]

لیکن معیّن انداز میں کیونکر نہیں۔ واضح تو کیا ہے۔

"حضرت مخدوم سیّد محمد گیسو دراز می گویند

دین و دنیا بہ یک جوئے نہ خرند ایں چنیں بو العجب حریفانند"[2]

شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر دو جگہ ہے۔ تمہیدات کے مصنّف حضرت عین القضاۃ ہمدانی کا قول بھی درج ہے۔ ان کے علاوہ ایک جگہ عبداللہ انصاری کا ذکر ہے[3]۔ یہ کون ہیں ایک عبداللہ انصاری معروف بہ عبدی باشندۂ ہریانہ نے ۱۰۷۴ھ میں مثنوی فقۂ ہندی لکھی۔ چونکہ یہ بہت بعد کے ہیں اس لئے جنونیہ میں مندرج عبداللہ انصاری کوئی دوسرا شخص ہوگا۔

شمس اللہ قادری نے خواجہ بندہ نواز کے ایک رسالے ہفت اسرار کا ذکر کیا ہے جس میں دکنی میں سات مقولے ہیں اور کسی مرید نے اس کی مبسوط شرح لکھی ہے۔ یہی بات ڈاکٹر زور نے دہرادی ہے گو اعتراف کیا ہے کہ اب ہفت اسرار ناپید ہے۔ ان دونوں حضرات نے شرح کی زبان کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن معلوم نہیں کیونکر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے نتیجہ نکال لیا کہ شرح کی زبان فارسی[4] تھی۔ بہرحال انھوں نے بہ وجوہ اس بات کو رد کر دیا کہ یہ رسالہ ہفت اسرار ہے۔ لیکن ڈاکٹر ثمینہ شوکت اتنی مشکّک نہیں۔ وہ اسے ہفت اسرار ماننے پر مائل ہیں۔ لکھتی ہیں۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ جنونیہ میں بھی سات مقولے اسرار یا معمّے شامل ہیں اور ان کی بھی فارسی میں ایک بسیط شرح لکھی گئی ہے"[5]

جنونیہ میں سات مقولے کدھر سے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ نے بیجاپور کے نسخے کا جو متن دیا ہے اس میں ۹ مقولے ہیں اور خود ڈاکٹر ثمینہ نے سالار جنگ کا جو متن دیا ہے اس میں ۱۸ مقولے ہیں۔ پھر

---

[1] مقدمہ شکارنامہ ص ۷۸

[2] مقدمہ شکارنامہ ص ۸۱

[3] ایضاً ص ۸۰

[4] اردو نثر کا آغاز ص ۵۵

[5] مقدمہ شکارنامہ ص ۷۹

Marfat.com

یہ کس نے لکھا ہے کہ ہفت اسرار میں اقوال کی شرح فارسی میں تھی۔ اگر سیّد جنوں نے خواجہ بندہ نواز کے اقوال بیان کئے ہوتے یعنی پوری کتاب کا تعلق ان سے ہوتا تو رسالے میں صرف ایک جگہ کیوں لکھا جاتا کہ حضرت مخدوم سیّد محمد گیسو دراز نے فرمایا ہے'۔ گیسو دراز کے قول کی تائید و تشریح کے لئے خود انھیں کا شعر کیوں پیش کیا جاتا۔

گیارہویں بارھویں صدی میں ہندی میں سدھوں اور ناتھ پنتھی جوگیوں نے معرفت کے مسائل معمّوں میں بیان کئے۔ انھیں کے انداز میں مراٹھی سنتوں گیانیشور وغیرہ نے لکھا۔ ڈاکٹر تمینہ نے دریافت کر لیا ہے کہ رسالے کے اردو جملے سنت گیانیشور کے مراٹھی ابھنگ کا ترجمہ ہیں جو انھوں نے شکار نامہ کے آخر میں درج کیا ہے۔ یہ جنونیہ سے قدرے زیادہ مفصّل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جنونیہ میں اسی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ اردو جملوں کے مصنّف نہ بندہ نواز ہیں نہ سیّد جنوں بلکہ سنت گیانیشور (تیرھویں صدی عیسوی) ہیں۔ سیّد جنوں نے مراٹھی سے اردو ترجمہ کیا ہوگا۔ محمد وفا نے ان کی فارسی تفسیر لکھی مثلاً

وہاں بسائے تین گاؤں۔ دو اجڑے ایک بستا نہیں۔

معنی ظاہر آن ست کہ آں جا آباداں کردند سہ دیہہ۔ شاید کہ یکے دنیا باشد دوم بہشت' سوم دوزخ۔

بیجاپور کا رسالہ زیادہ سے زیادہ تین صفحوں کا ہوگا جس میں اردو کے محض نو جملے ہیں جن کا طویل مفہوم فارسی میں ہے۔ رسالے کی ابتداء اور انتہا دونوں فارسی ہیں جس کے واضح معنی یہ ہیں کہ یہ فارسی کی کتاب ہے جس میں چند جملے اردو کے بھی ہیں۔ سالار جنگ کے نسخے میں اردو جملوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن ان سب کو ملا کر ڈاکٹر تمینہ شوکت نے چھ سطروں کے ایک پیراگراف میں لکھ دیا ہے جب کہ وہاں کا پورا رسالہ ۱۳ صفحوں کو محیط ہے۔ اس طرح اسے کسی طرح اردو کی کتاب نہیں کہا جا سکتا۔

اردو جملوں کی زبان بہت صاف ہے جو بندہ نواز کے عہد میں نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ برہان الدین جانم کی نثر سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ چونکہ یہ ایک فارسی رسالہ ہے جو کافی بعد کی تصنیف معلوم ہوتا ہے اس لئے اسے بھی اردو نثر کی پہلی کتاب نہیں کہا جا سکتا۔

---

[1] مقدمہ شکار نامہ ص ۷۸

Marfat.com

رسالۂ شاہ راجو :

اس کی خبر سب سے پہلے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے دی۔ ان کے مطابق کتب خانۂ رضویہ گلبرگہ میں ۱۴ رسالے ایک جلد میں بندھے ہیں جن میں ۱۱ رسالے فارسی کے ہیں تین[1] اردو کے۔ اردو رسالوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رسالۂ حضرت شاہ راجو ۲۔ شکار نامۂ بندہ نواز ۳۔ رسالہ دار الاسرار

بندہ نواز۔ ڈاکٹر حسینی شاہد[2] کے مطابق اس مجموعے کا نام 'مجموعۂ رسائلِ عربیہ' ہے اور اس میں ۱۷ رسالے ہیں نہ کہ ۱۴۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے میں رسالۂ شاہ راجو پر تفصیلی غور کیا ہے لیکن انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ کسی نسخے پر تاریخِ کتابت درج ہے کہ نہیں بالخصوص رسالۂ شاہ راجو کی ابتدا اور خاتمے کی تفصیل نہیں دی۔

شاہ راجو نام کے دو بزرگ گزرے ہیں۔

۱۔ شاہ راجو قتّال اوّل

ان کا نام سیّد یوسف حسینی بن سیّد علی تھا۔ یہ بعض کتب کے مطابق سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھتیجے اور بعض کے مطابق چھوٹے بھائی تھے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد تھے۔ ان کا عرف سیّد راجا تھا لیکن بعد میں شاہ راجو قتّال کے نام سے مشہور رہے۔ بیشتر تذکروں کے مطابق ان کی تاریخ وفات ۷۳۱ھ ہے۔ اُنھوں نے ۷۲۹ھ کے اوائل میں دولت آباد کے نزدیک خلد آباد میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔

۲۔ سیّد شاہ راجو ثانی

ان کا نام رضی الدین تھا۔ خواجہ بندہ نواز کی اولاد میں تھے۔ حیدر آباد میں رہتے تھے۔ گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔ ان کے نام سے کسی فارسی یا اردو تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔ سالار جنگ لائبریری میں ایک مختصر مثنوی سہاگن نامہ ہے جسے کوئی شاہ راجو اوّل سے اور کوئی شاہ راجو ثانی سے منسوب کرتا ہے۔ غالباً یہ بزرگِ ثانی ہی کی تصنیف ہے۔

رسالۂ مذکور ۱۶ صفحات کا ہے۔ اس کی لوح کے سوا اور کہیں اس کا نام مذکور نہیں۔ رسالے میں کوئی ترقیمہ نہیں۔ اس کا موضوع معرفت و دین کے مسائل ہیں جو سوال و جواب کی شکل میں پیش کئے

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۶۰۔

[2] ڈاکٹر حسینی شاہد: کلمتہ الحقائق' اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء ص ۱۱ فٹ نوٹ

Marfat.com

گئے ہیں. زبان کا نمونہ یہ ہے۔

"جان اے عزیز اوّل کچھ نہ تھا۔ آسمان تھا نہ زمین نہ عرش نہ کرسی' نہ چاند نہ تارے نہ کچھ تھا اور ذاتِ حق تعالیٰ اپنے تئیں آپی تھی. اس حد تلک کہ (کہ) صفتوں کا بھی ظہر نہ تھا' نہ اپنی خبر رکھتا تھا نہ غیر کی"[1]

یہ زبان بہت صاف ہے اور شاہ راجو قتّال اوّل کے عہد کی نہیں ہو سکتی لیکن دوسرے مقامات پر قدیم تر ہے مثلاً

سوال: چار و اعتبار کیا

جواب: جس وقت اپس میں ہونکو جاننا یعنی وجود ہوں تو اعتبار وجود کا اس ماما کیا ہو اپ سیں جانیا سو عدم سوں جلینیا ہے تو اعتبار علم کا ثابت ہوا. ہور جس وقت آپ سیں جانیا تو آپ سیں اپنی پرورش ہوا' تو اپنے کوں نظر آیا' تو اعتبار شہود کا ثابت ہوا"[2]

کئی سوال و جواب ایسے ہیں جن میں بہ مشکل کوئی متروک لفظ ملے گا.

ڈاکٹر رفیعہ اسے شاہ راجو قتّال اوّل سے منسوب کرتی ہیں کیونکہ سوال و جواب کی شکل میں نثری رسالہ لکھنا ابتدائی دور کا رنگ تھا بعد میں مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں[3]. اس کے برعکس پروفیسر عبدالقادر سروری نے علی گڑھ تاریخ میں لکھا ہے.

"اس رسالے کے شاہ راجو کی تصنیف ہونے کے بارے میں کوئی مزید شہادت سوائے اس کے نہیں مل سکی کہ وہ اس خاندان کے رسائل کے ساتھ منسلک ہے اور اس پر رسالہ شاہ راجو درج ہے. اس کے علاوہ یہ رسالہ روضتین کے کتب خانے میں محفوظ ہے"[4]

بیان کے آخر میں پھر اعادہ کرتے ہیں

'اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ رسالہ شاہ راجو ہی کی تصنیف ہے'[5]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے زیادہ احتیاط کا ثبوت دیا. لکھتی ہیں.

"نثری رسالہ جو شاہ راجو سے منسوب کیا جاتا ہے اس کی زبان سے مجھے ایسا اندازہ

---

[1] اردو نثر کا آغاز ص ۶۱ — [2] اردو نثر کا آغاز صـ ۶۲

[3] ایضاً ص ۶۴ — [4] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۴۷ — ۱۴۶

[5] علی گڑھ تاریخ ادب اُردو صـ ۱۴۷

Marfat.com

ہوتا ہے کہ یہ آپ کا مصنّفہ نہیں ہو سکتا۔ اس رسالہ کی زبان آپ کے فرزند گیسو دراز کے رسالوں سے بھی زیادہ صاف ہے۔ ممکن ہے یہ رسالہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد کا ہو جو شاہ راجو ہی کے لقب سے ملقّب تھے"[1]

رسالۂ شاہ راجو کے مسئلے کی طلسم کشائی بھی ڈاکٹر حسینی شاہد نے کی۔ شاید ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے تسامحات کی تصحیح کی ذمّے داری انھیں کے کندھوں پر ہے۔ انھوں نے رسالہ نوائے ادب بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں ایک مضمون "کلمتہ الحقائق' اردو نثر کا پہلا مستند نقش" کے عنوان سے لکھا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو اس رسالہ کا ایک نسخہ ملا تھا۔ حسینی شاہد نے اس نسخے کو بھی دیکھا اور اس کے دوسرے مخطوطوں کو بھی۔ لکھتے ہیں۔

"راقم الحروف کو اس رسالے کے مزید دس نسخوں کا پتہ چلا ہے' جن میں سے ایک پر مصنّف کا نام شاہ راجو قتّال حسینی' دو پر سیّد شاہ محمد قادری نور دریا' دو پر صرف شاہ محمد قادری اور ایک پر نور اللہ پاشا' لکھا ہے۔ بقیہ پانچ نسخوں پر مصنّف کا نام درج نہیں ہے۔ قرینہ اس کا ہے کہ یہ رسالہ شاہ محمد قادری نور دریا کی تصنیف ہو' اس لئے کہ چار نسخوں پر ان کا نام ملتا ہے۔ (ان میں سے دو ایسے ہیں جن پر ان کا لقب نور دریا نہیں ہے) اور ان میں ایک نسخہ ایسا ہے جو ان کے سلسلے کے ایک سجّادے کا نقل کیا ہوا ہے اور خود ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔

اگر یہ رسالہ شاہ محمد قادری نور دریا کی تصنیف نہ بھی ہو تو بھی شاہ راجو سے اس کا انتساب غلط ہو جاتا ہے"[2]

نور دریا شاہ محمد قادری شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۸۵ھ میں ہوا۔ مبیّنہ رسالۂ شاہ راجو کی زبان نیز چار نسخوں پر ان کا نام دیکھتے ہوئے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ شاہ محمد قادری نے گیارھویں صدی ہجری میں لکھا۔

خواجہ سیّد محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز:

خواجہ بندہ نواز کی سوانح پیچھے چند تھے باب میں دی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء' میں' عبدالقادر سروری نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں ڈاکٹر ثمینہ

---

[1] مقدمۂ شکارنامہ ص ۱۴

[2] نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۱

Marfat.com

شوکت نے شکار نامے کے مقدمے میں ان کی سوانح دی ہے۔ ان کی مدد سے اہم واقعاتِ زندگی کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

ان کا نام سیّد محمد تھا، کُنیّت ابوالفتح اور القاب صدرالدین، گیسو دراز، بندہ نواز۔ ان کی تاریخِ ولادت متفقہ طور پر ۴ رجب ہے لیکن سنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کئی تذکروں میں ۷۲۰ھ لکھا ہے لیکن ان کے سوانح نگار سیر محمدی کے مولف محمد علی سامانی نے ۷۲۱ھ لکھی ہے اور کئی واقعات و بیانات کی بنا پر اسے صحیح قرار دیا ہے۔ تاریخِ حبیبی و تذکرۂ مرشدی میں مولانا عبدالعزیز نے ۷۲۳ھ درج کی ہے۔ دلائل ۷۲۰ھ یا ۷۲۱ھ کے حق میں ہیں۔ جب محمد تغلق نے دلّی کی آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا تو سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے کئی مرید بھی دکن چلے گئے۔ ان میں بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتّال بھی تھے جو ۷۲۶ھ میں دولت آباد پہنچے۔[1] ان کے ساتھ ان کے دو لڑکے سیّد حسین عرف شاہ چندن اور سیّد محمد بھی تھے۔ بیشتر تذکروں کے مطابق شاہ راجو کا انتقال ۷۳۱ھ میں ہوا۔ ان کے انتقال کے کچھ عرصے بعد خواجہ بندہ نواز کی والدہ بی بی رانی اور ان کے بھائی میں کچھ رنجش ہو گئی جس کی وجہ سے وہ اپنے بیٹوں کو لے کر ۷۳۶ھ میں دلّی واپس چلی گئیں۔ سیرِ محمدی میں حضرت گیسو دراز کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"دراں ایّام کہ از دولت آباد جانبِ دہلی رواں شدیم والدِ ما چہار سال پیش ازاں نقل کردہ بودند" (شکار نامہ مرتبۂ تمینہ شوکت ص ۱۵)

دلّی جا کر انھوں نے خواجہ نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی سے بیعت کی ان کے گیسو بہت لمبے تھے جس کی وجہ سے ان کے مرشد چراغ دہلی نے انھیں گیسو دراز کا لقب دیا۔ ۷۵۷ھ میں انتقال سے پہلے حضرت نصیرالدین نے اُنھیں اپنا سجادہ نشین مقرر کیا۔ چار سال بعد ۷۶۱ھ میں خواجہ صاحب نے اپنی شادی کرلی جب دلّی پر تیمور کے حملے کی خبر گرم ہوئی تو خواجہ صاحب اپنے اہل خاندان کے ساتھ ۸۰۱ھ میں دہلی سے دکن کے لیے روانہ ہو گئے۔ دولت آباد اور دوسرے مقامات پر ہوتے ۸۰۳ھ میں گلبرگہ پہنچے۔ وہیں ۸۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں آپ کا روضہ ہے۔

تصانیف: ان کی تصانیف پر سب سے اچھی تحقیق ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے کی۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ہے 'خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل'۔

---

[1] دیباچۂ دیوان انیس العشاق از بندہ نواز ص ۹ بحوالہ مقدمہ شکار نامہ ص ۱۱

Marfat.com

انھوں نے اپنا غیر مطبوعہ مقالہ مجھے دیکھنے کے لئے دے دیا. ذیل میں دوسرے ماخذ کے علاوہ نورالدین کے مقالے سے بطورِ خاص مدد لی گئی ہے۔

۱۔ سیرتِ بندہ نواز کے مصنّف سیّد عطا حسین لکھتے ہیں۔

'عام طور سے مشہور ہے کہ ان کی عمر ایک سو پانچ سال تھی اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی ایک سو پانچ ہے'[1]

لیکن انھوں نے کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس میں ۳۵ فارسی اور دو عربی تصانیف ہیں اور بس۔

عطا حسین کی ۱۰۵ کی روایت کو بہتوں نے دہرا دیا ہے مثلاً نظامی بدایونی[2] نے۔ اکبر الدین صدیقی[3] نے تعداد ۱۰۴ لکھی ہے۔ اب خواجہ صاحب کے قریب العصر مصنفین کے بیان دیکھئے۔

۲۔ ان کے مرید سیّد محمد علی سامانی دلّی میں بھی ان کے ساتھ رہے، گلبرگہ میں بھی۔ ان سے زیادہ مستند کس کا بیان ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ۸۳۱ھ میں سیر محمدی لکھی۔ یہ ۱۳۴۷ھ میں سبزی منڈی الہ آباد سے شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر اس کا گلبرگہ کا ایڈیشن ہے جسے مولانا سیّد شاہ نذیر احمد قادری سکندرپوری نے مرتب کیا۔ اس کے ایک کالم میں اصل فارسی متن ہے دوسرے کالم میں اردو ترجمہ۔ مترجم کا مقدمہ ۱۳۴۷ھ کا ہے۔ اس کے باب پنجم میں تصانیف کی فہرست دی ہے جو ۳۶ ہے[4]۔ ان میں پانچ عربی خلافت نامے بھی شامل ہیں جنھیں تصانیف میں شمار نہیں کرنا چاہیئے۔ اس طرح کتابوں کی تعداد ۳۱ رہ جاتی ہے۔ یہ سب عربی فارسی میں ہیں۔ اردو کی کوئی تصنیف نہیں۔

۳۔ ان کے دوسرے مرید عبداللہ بن عبدالرحمٰن چشتی نے ایک کتاب عشق نامہ لکھی۔

شمس اللہ قادری کے مطابق اس میں خواجہ صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں معراج العاشقین اور ہدایت نامہ کا بھی ذکر ہے[5]۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل لکھتے ہیں کہ باوجود سعیِ بسیار کے انھیں رسالہ

---

[1] سیرتِ بندہ نواز ص ۵۰۔ بحوالہ اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۷۹ و بحوالہ ڈاکٹر نورالدین سعید ص ۱۷

[2] قاموس المشاہیر ص ۲۰۰ بحوالہ ڈاکٹر نورالدین سعید ص ۲۹۔

[3] اکبر الدین صدیقی: اصحابِ سلسلۂ بندہ نواز کی علمی و ادبی خدمات۔ مشمولہ گنجینۂ چراغ ص ۲۳ حیدرآباد ۱۹۷۵ء

[4] سلسلۂ مطبوعات سیّد محمد گیسو دراز اکادمی سری گلبرگہ۔ طبع ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۶۔

[5] اردوئے قدیم ص ۱۳۔

Marfat.com

عشق نامہ نہ مل سکا. انھیں کراچی سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق کے ذاتی کتب خانے میں ایک نسخہ ہے لیکن کہنگی کے سبب اس کے اوراق اس طرح چپک گئے ہیں کہ عبارت پڑھنا مشکل ہے. ڈاکٹر حفیظ قتیل مزید لکھتے ہیں کہ اس میں معراج العاشقین کا ذکر بھی ہو تو گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ رسالہ فارسی میں ہوگا۔[1]

راقم الحروف کی رائے میں شمس اللہ قادری موجودہ طریقِ تحقیق کے لحاظ سے ضروری حزم و احتیاط سے کام نہ لیتے تھے۔ تذکرۂ جیبی کے سلسلے میں آگے دیکھئے۔ ان کے سامنے عشق نامہ کا جو نسخہ تھا معلوم نہیں وہ کہاں تک معتبر ہے۔ قادری کے مطابق اس میں ذیل کا جملہ خواجہ بندہ نواز کے نام سے درج ہے۔

'بھوکوں موئے سوں خدا کچھ انپڑیتا ہے۔ خدا کوں انپڑنے کی استعداد ہو رہے'[2]

جیسا کہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے سلسلے میں لکھا گیا یہ جملہ ان کے ملفوظات بحر الحقائق میں موجود ہے۔ وہاں یہ مزید چند جملوں کے سلسلے میں درج ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جملہ دراصل شاہ وجیہ الدین ہی کا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز کی فارسی تصنیف خطائر القدس کا بھی دوسرا نام عشق نامہ ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ خواجہ بندہ نواز نے شکار نامہ فارسی میں ضرور لکھا تھا۔ اس کا نام برہان العاشقین ہے۔ قادری کہیں برہان العاشقین اور معراج العاشقین میں التباس تو نہیں کر رہے۔

۴۔ عبدالعزیز بن شیر ملک نے بہمنی سلطان علاؤالدین احمد شاہ ثانی (۸۳۸ تا ۸۶۲ھ) کے وزیر نظام الملک کی فرمائش پر خواجہ بندہ نواز کی سوانح "تاریخِ جیبی و تذکرۂ مرشدی" کے نام سے لکھی. ڈاکٹر نورالدین کے مطابق یہ ۸۴۹ھ کی تالیف ہے[3]. مصنف نے اس کے مطالب خواجہ بندہ نواز کے پوتے سید یداللہ حسینی کی سند سے لکھے ہیں۔ انھوں نے کتابوں کی تقسیم تین زمروں میں کی ہے۔

۱۔ قیام دہلی کی تصانیف ۲۔ دہلی سے گلبرگہ کے سفر کے دوران کی تصانیف ــــــ

---

[1] معراج العاشقین کا مصنف (حیدرآباد ۱۹۶۸ء) ص ۳۔

[2] اردوئے قدیم ص ۲۳۔

[3] غیر مطبوعہ مقالہ، خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل. ص ۳۱۔

Marfat.com

۳۔ گلبرگہ کی تصانیف۔

ان کی فہرست میں بعض ایسی کتابیں ہیں جن کا نام محمد علی سامانی نے نہیں دیا اور سامانی کی بعض کتابیں ان کے یہاں غیر حاضر ہیں۔ دونوں فہرستوں کو ملا کر کل تعداد ۵۳ بنتی ہے جن میں سب کتابیں عربی اور فارسی کی ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے مطابق فارسی تاریخِ حبیبی کا ایک مخطوطہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں اور دوسرا حبیب گنج علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ لکھتی ہیں۔

"حکیم شمس اللہ قادری نے اس کا مطالعہ حبیب گنج علی گڑھ کی مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کے سلسلے میں کیا تھا۔۔۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بابِ ہفتم میں جس کا عنوان

'مباحثِ واردات در علوم و نویسانیدنِ تصنیفات

ہے خواجہ صاحب کی تصنیفات کے سلسلے میں اردو رسالوں ہدایت نامہ اور دار الاسرار کے نام بھی دیکھے تھے"[1]

تاریخِ حبیبی فارسی میں نایاب ہے لیکن اس کا اردو ترجمہ ملتا ہے۔ ترجمہ نواب محمد معشوق حسین خاں سلطانی معشوق یار جنگ نے کیا۔ تصحیح حافظ محمد حامد صدیقی چشتی قادری لکچرر عثمانیہ کالج گلبرگہ نے کی۔ حیدر آباد میں ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ کو طباعت ہوئی۔ اس کے کئی مطبوعہ نسخے ابو الکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد میں ہیں۔ ترجمے میں ص ۶۴ سے ص ۶۹ تک تصانیف کی فہرست ہے۔ اس میں ایک بھی اردو کی کتاب نہیں۔ ہدایت نامہ اور دار الاسرار کا کوئی ذکر نہیں۔ خدا معلوم شمس اللہ قادری ان کے مریدوں کی کم یاب فارسی تصانیف میں کہاں سے خواجہ کے اردو رسالوں کا ذکر دیکھ لیتے تھے۔ ڈاکٹر نور الدین سعید نے بھی لکھا ہے کہ تاریخ حبیبی میں کسی اردو رسالے کا نام نہیں۔

شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں روضتہ الاولیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ نمازِ ظہر کے بعد کے جلسوں میں خواجہ صاحب درس و وعظ دیتے تھے۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے، ان کے سمجھانے کے لئے آپ دکنی میں تقریر فرماتے تھے۔[2]

---

[1] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا

[2] اردوئے قدیم ص ۲۳

Marfat.com

سیّد شاہ سیف اللہ قادری کی کتاب روضتہ الاولیائے بیجاپور دورِ حاضر کی تالیف ہے. اس بیان کی کوئی قدیم سند چاہیئے۔

مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے کہ جو لوگ عربی فارسی سے ناواقف تھے ان کے لئے خواجہ صاحب ہندی میں بھی تقریر فرماتے تھے۔[1]

لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ سیرِ محمدی یا تاریخ جیبی میں کہیں ذکر نہیں کہ خواجہ صاحب ہندی میں تقریر کرتے تھے. خواجہ صاحب کے ملفوظات کے تین مجموعے جوامع الکلم کے نام سے مرتب ہوئے تھے۔[2] ان میں سے دو کے مرتب ان کے بیٹے سیّد اکبر حسینی ہیں۔ان میں بھی اہم تر وہ ہے جس میں دہلی سے گجرات تک کے دو سالہ سفر کے ملفوظات ہیں. ڈاکٹر نورالدین کے مطابق ان میں کہیں نہیں لکھا کہ خواجہ صاحب ہندی یا اردو میں تقریر کرتے تھے۔[3]

۵. خواجہ صاحب کے خاندان کے بزرگ سیّد من اللہ حسینی نے اپنی کتاب تبصرۃ النحوارقات میں لکھا ہے.

"حضرت بندگی مخدوم رضی اللہ عنہ صد و بست و پنج کتاب ساختہ امّا ہیچ کتاب بے نیند یشند و نہ سوادے کردند، چہ تفسیر، چہ کلام، چہ ابیات، چہ فارسی، چہ عربی فی الحال می گفتند و می نویسانیدند۔۔۔۔۔ امّا کسے کہ دہلوی بود کتابے عربی و فارسی و نیز آں بے تامّل، بے تفکّر بے سواد چناں کند کہ حل نہ شود مگر کسے را کہ در عربی و فارسی و تصوّف دخلِ تام باشد"[4]

انھوں نے جملہ کتابوں کی تعداد ۱۲۵ لکھی ہے لیکن قابلِ ذکر یہ ہے کہ صرف عربی و فارسی کتابوں کا ذکر کیا ہے اردو کا قطعاً نہیں۔ان سب بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نہ اردو میں تقریر کرتے تھے نہ اردو میں کوئی کتاب لکھی۔

---

[1] اردو کی ابتدائی نشو ونما ص ۱۹

[2] ڈاکٹر ثمینہ شوکت: مقدمہ شکار نامہ ص ۵۳

[3] جوامع الکلم مرتبہ سیّد حسین عرف سیّد محمد اکبر حسینی بہ تصحیح تحشیہ حافظ محمد حامد صدیقی بکجر دینیات عثمانیہ کالج گلبرگہ ۱۳۵۶ھ طبع کانپور بحوالہ مقالہ ڈاکٹر نورالدین ص ۳۳۶ ،

[4] تبصرۃ النحوارقات ص ۳۹ بحوالہ نورالدین سعید ص ۳۳۶

Marfat.com

۴۔ جہاں نما علی شاہ چشتی نے ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء۔۱۹۰۰ء میں اردو میں تاریخِ محمدی لکھی جو ۱۳۲۰ھ میں حیدر آباد میں طبع اور گلبرگہ سے شائع ہوئی۔ اس میں خواجہ صاحب کی تصانیف کی فہرست دو قسموں میں ہے اوّل دہلی اور دہلی تا گلبرگہ کے سفر کی تصانیف دوم گلبرگہ کی تصانیف[1]۔ ان میں کوئی اردو تصنیف نہیں ہے۔

اب خواجہ صاحب کی اردو نثری تصانیف کے بارے میں بیسویں صدی کے اردو محققین کے بیانات دیکھئے۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو (پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء) طبعِ ثانی ۱۹۳۶ء میں تین اردو کتابوں معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور سہ بارہ کا ذکر کیا۔ طبعِ چہارم میں تلاوت الوجود اور شکار نامہ کا اضافہ کیا اور نمونوں میں در الاسرار کا اقتباس دیا۔

۲۔ مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام' میں لکھا ہے

"علاوہ اس رسالے (معراج العاشقین) کے میرے پاس آپ کے متعدد اور رسالے ہیں زبان میں ہیں تلاوت الوجود۔ در الاسرار۔ شکار نامہ۔ تمثیل نامہ۔ ہشت مسائل وغیرہ۔ اگرچہ زبان ان کی قدیم ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصانیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں؟"[2]

۳۔ ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں معراج العاشقین اور سہ بارہ کا ذکر کیا۔ دکنی ادب کی تاریخ (طبعِ اوّل ۱۹۶۰ء) میں معراج العاشقین اور ہدایت نامے کا ذکر کیا ہے[3] لیکن ادارۂ ادبیات اردو کے نذکرۂ مخطوطات جلد پنجم کی ابتدا میں جو فہرست دی ہے اس میں در الاسرار[4] اور شکار نامہ[5] کا اضافہ کیا۔ اسی جلد میں صفحہ ۱۸۸-۱۸۷ پر شکار نامہ کی تفصیل دی۔

۴۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اردو نثر کا آغاز اور ارتقا میں ان کی تصانیف پر تفصیل سے غور کیا۔ انھوں نے ذیل کے مبیّنہ اردو رسالوں کے نام گنائے۔

۱۔ معراج العاشقین ۲۔ سہ بارہ ۳۔ ہدایت نامہ ۴۔ ہفت اسرار ۵۔ خلاصۃ التوحید۔
۶۔ تمثیل نامہ ۷۔ تلاوت المعراج ۸۔ رسالۂ تصوّف ۹۔ شکار نامہ ۱۰۔ در الاسرار
۱۱۔ وصیت الہادی[6]

۵۔ علی گڑھ تاریخِ ادب اردو میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے ذیل کے رسالوں سے بحث کی ہے۔

---

[1] ص ۵۲-۵۱
[2] ص ۲۱
[3] طبعِ سوم حیدر آباد ۱۹۸۲ء ص ۹۔
[4] ص ۹
[5] ص ۱۴
[6] ص ۸۶ تا ۹۰

Marfat.com

۱۔معراج العاشقین یا تلاوت المعراج ۲۔ رسالہ شرحِ کلمۂ طیبہ ۳۔ خلاصۂ توحید ۴۔ شکار نامہ ۵۔ درالاسرار ۶۔ سہہ بارہ ۷۔ ہفت اسرار ۸۔ ہشت مسائل ۹۔ تلاوۃ الوجود ۱۰۔ تمثیل نامہ[1]

ان کے علاوہ انھوں نے انجمن ترقیِ اردو ہند کے کتب خانے میں خواجہ صاحب سے منسوب ذیل کے رسالوں کی خبر دی۔

۱۱۔ وجود نامہ ۱۲۔ رسالۂ وجودیہ ۱۳۔ مجموعۂ رسائل جس میں ایک نثری حصہ ہے۔ ۱۴۔ مشاہدۃ الاکبر ۱۵۔ مراۃ المعرفت ۱۶۔ اعتقاد الحق۔

ان چھ رسالوں میں وہ وجود نامہ اور مشاہدۃ الاکبر کے علاوہ بقیہ کو خواجہ صاحب کی تصنیف ماننے کو تیار نہیں۔

۶۔ شکار نامہ کے مقدمے میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ذیل کے اردو رسالوں کا ذکر کیا ہے[2]

۱۔ معراج العاشقین ۲۔ ہدایت نامہ ۳۔ سہہ بارہ ۴۔ تمثیل نامہ ۵۔ درالاسرار ۶۔ تلاوت الوجود ۷۔ خلاصۃ التوحید ۸۔ ہشت مسائل ۹۔ تشریحِ کلمۂ طیبہ ۱۰۔ وجود نامہ ۱۱۔ مجموعۂ رسالۂ تصوّف ۱۲۔ وجود العاشقین ۱۳۔ رسالہ حدیثِ قدسی ۱۴۔ مشاہدۃ الاکبر ۱۵۔ ہفت اسرار ۱۶۔ شکار نامہ

ان میں سے مشاہدۃ الاکبر کے بارے میں ان کا قیاس ہے کہ یہ خواجہ صاحب کے فرزند سیّد اکبر حسینی کی تصنیف ہے[3]۔ قیاس کی کوئی وجہ نہیں دی۔ شاید کتاب کے نام میں 'اکبر' کا لفظ دیکھ کر یہ گمان ہوا ہوگا۔

۷۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے شکار نامہ ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ اسی سال میں مبارزالدین رفعت نے بھی شکار نامہ کی اشاعت کی۔ ان کا مقدمہ ڈاکٹر ثمینہ کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ انھوں نے مقدمے میں خواجہ کے سات اردو رسالوں کا ذکر کیا ہے۔

معراج العاشقین۔ شکار نامہ۔ رسالہ سہہ بارہ۔ ہدایت نامہ۔ تلاوت الوجود۔ ہشت مسائل اور تمثیل نامہ[4]۔

---

[1] ص ۱۵۹ تا ۱۷۵ [2] ص ۵۹۔۵۸

[3] مقدمہ ص ۵۹ [4] ص ۹ حیدرآباد ۱۹۶۲ء

Marfat.com

۸۔ تاریخ ادبیاتِ مسلماناں میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے ذیل کی اردو کتب کا ذکر کیا

۱۔ معراج العاشقین ۲۔ ہدایت نامہ ۳۔ عشق نامہ ۴۔ تلاوت الوجود ۵۔ دارالاسرار ۶۔ شکار نامہ ۷۔ تمثیل نامہ ۸۔ ہشت مسائل ۹۔ سہ بارہ وغیرہ۔

انھوں نے یہ کہاں کیا کہ دکنی کتابوں میں 'عشق نامہ' کو بھی شامل کر دیا جو فارسی خطائر القدس کا دوسرا نام ہے[1]۔

اب چار ایسے حضرات کے بیان ملاحظہ ہوں جو اس سے انکاری ہیں کہ خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کچھ لکھا۔

۹۔ اکبر الدین صدیقی نے جولائی ۱۹۶۱ء میں برہان الدین جانم کا رسالہ کلمتہ الحقائق مرتب کر کے شایع کیا۔ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"حضرت خواجہ بندہ نواز اور ان کے بعد کی بھی کوئی تصنیف مصنّف کے شک و شبہہ سے خالی نہیں ہے۔ کلمتہ الحقائق ایک ایسا رسالہ ہے کہ اس کے مصنّف کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں" ص ۱۲

۱۰۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے نوائے ادب بمبئی بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں مضمون لکھا۔

"کلمتہ الحقائق۔ اردو نثر کا پہلا مستند نقش"

عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ وہ کلمتہ الحقائق سے پہلے کسی اردو نثری رسالے کے قائل نہیں۔ لکھتے ہیں۔

"جانم کے پیشروؤں سے جو نثری رسائل منسوب کئے جاتے ہیں اُن کا انتساب شبہہ سے خالی نہیں" ص ۹۔

مضمون میں انھوں نے بطورِ خاص معراج العاشقین اور شکار نامہ کا جائزہ لے کر انھیں خواجہ کی تصانیف سے خارج کیا۔

۱۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی مرتبہ کدم راؤ پدم راؤ کے مقدمے میں شاہ علی محمد سامانی کی سیرِ محمدی سے خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کی فہرست دی[2]۔ چونکہ ان میں کوئی اردو تصنیف نہیں۔

---

[1] ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ص ۲۵۵۔

[2] مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ۔ اشاعتِ اوّل ۱۹۷۳ء۔ دلّی ایڈیشن ۱۹۷۹ء ص ۳۴۔

Marfat.com

اس لئے انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ بندہ نواز نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ انھوں نے اپنی تاریخ ادب میں بھی اس خیال کا اعادہ کیا۔[1]

۱۲۔ ڈاکٹر محمد نورالدین سعید ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے بھائی اور گورنمنٹ کالج بنگلور میں اردو کے استاد ہیں۔ انھوں نے نومبر ۱۹۸۲ء میں میسور یونیورسٹی سے حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل، کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ ان کا مقالہ تحقیقی حزم و احتیاط اور تحقیقی تجزیئے کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ انھوں نے ایک ایک اردو رسالے کو جانچ کر یہ طے کیا کہ خواجہ صاحب نے اردو میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

ان سے پیشتر کے محققین نے بھی خواجہ صاحب کی جن اردو نثری تصانیف کی فہرست دی ہے وہ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مطمئن نہیں کہ یہ انھیں کی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین طبع اوّل ۱۹۲۴ء کے مقدمے میں لکھا۔

"میرے پاس حضرت کے متعدد رسالے اس زبان میں تصنیف کئے ہوئے موجود ہیں لیکن مجھے ان کے شائع کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لئے کہ ہمارے یہاں قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگانِ دین سے منسوب کر دیتے ہیں چنانچہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری، غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانی کے نام سے فارسی دیوان شائع اور رائج ہیں۔ اس بنا پر مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں وہ حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں کیونکہ بعض رسالے جن کی نسبت متعدد ذرائع سے اور متواتر روایتوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت نے دکھنی میں لکھے تھے تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ اصل فارسی میں موجود ہیں اور یہ ان کا ترجمہ ہیں۔"[2]

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ ۱۹۳۳ء میں کئی رسالوں کا تذکرہ کرکے لکھا "لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں؟"[3]

ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو جلد پنجم میں لکھا۔

---

[1] ص ۱۶۰۔

[2] معراج العاشقین تاج پریس حیدرآباد ۱۳۴۳ھ ص ۴۔ اس کی اطلاع پہلی بار جمیل جالبی کے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مقدمے ص ۳۲ سے ملی۔ [3] ص ۲۱

Marfat.com

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ (شکار نامہ) محمود خواجہ بندہ نواز نے اردو میں نہیں لکھا بلکہ ان کے کسی مرید یا معتقد نے قلم بند کیا ہے۔ خود رسالہ معراج العاشقین کے بارے میں بھی مجھے یہ شبہہ ہے کہ ان کا مولفہ نہیں بلکہ ان کے کسی مرید نے اسی زمانے میں اس کو اردو میں منتقل کیا ہے۔" ص ۱۸۷

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقا' میں لکھا

"اُن میں سے بعض رسالوں کے بارے میں تو شبہہ نہیں کہ وہ خواجہ صاحب ہی کی تصنیف ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں صرف قیاس یہ ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی تصنیف ہو سکتے ہیں۔ اصل میں جو لٹریچر خواجہ صاحب سے منسوب ہوتا ہے وہ نہایت احتیاط سے مطالعہ کئے جانے کے قابل ہے کیونکہ ان سارے رسالوں کے مطالعے کے بعد مرتب کو ایسا محسوس ہوا کہ کچھ رسالے تو یقیناً آپ کے مصنفہ ہیں لیکن کچھ رسالے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں قیاس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے ارشادات کو ان کے مریدین اور معتقدین نے نقل کر لیا تھا۔ کچھ رسالے تو غالباً آپ کے مواعظ میں نقل ہوئے تھے لیکن بعض شاید عرصہ تک ذہنوں میں محفوظ چلے آئے اور بعد کو ضبط تحریر میں لائے گئے۔ تذکروں سے یہ بات ثابت ہے کہ خواجہ صاحب اپنے ملفوظات کو معتقدین سے لکھواتے تھے" ص ۸۵

"ایک آدھ رسالہ ایسا بھی ہے جو شاہ میراں جی شمس العشاق اور شاہ برہان کے زمانے میں ان کے معتقدین نے بعد میں لوگوں کی زبانی سن کر قلم بند کیا" ص ۹۱

علی گڑھ تاریخ ادب اردو سے پروفیسر سروری کے چار بیانات ملاحظہ ہوں۔

"یہ صحیح ہے کہ جو رسالے اردو میں آپ کے نام سے منسوب ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ان میں سے بھی کچھ مشتبہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ کی فارسی تصانیف بہت بلند پایہ اور بسیط کارنامے ہیں۔" ص ۱۵۸

"کچھ رسالے تو ضرور ایسے ہیں جنھیں مستملی اور معتقدین نے براہ راست نقل کر لیا تھا لیکن بعض رسالے ایسے بھی ہیں جن میں بعد کو لکھنے والوں نے غالباً کچھ اضافے کر دیئے ہیں۔" ص ۱۷۶

"خواجہ صاحب کی تصانیف کے بارے میں عطا حسین، مرحوم نے آپ کی تصنیف 'خاتمہ

Marfat.com

کے مقدمے میں لکھا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں لکھتے تھے بلکہ کاتب (منشی) سے لکھوایا کرتے تھے اور کسی کتاب کو لکھوا لینے کے بعد اس کی نظر ثانی کبھی نہیں کی اور کبھی دوبارہ پڑھوا کر نہیں سنا۔"[1]

"فارسی رسالوں میں آپ اکثر اقوال اور ملفوظات کو اس طرح بیان کرتے ہیں

'محمد یوسف الحسینی می گوید' ۔ 'محمد یوسف حسینی گفت'

لیکن بعض اوقات مریدین جنھوں نے ان رسالوں کو لکھا تھا یا بعد میں کاتب احترام کے لئے آپ کے نام کے ساتھ القاب بھی لگا دیتے ہیں اردو کے رسالوں میں اکثر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے۔ اس طرح کے القاب کو پڑھ کر ایسے اصحاب کو جنھیں خواجہ صاحب کے اندازِ ارشاد کا علم نہیں یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ اندازِ تحریر آپ کا نہیں ہو سکتا۔" ص ۱۷۷)

پیچھے تبصرۃ الانوار قات سے مِن اللہ حسینی کا اقتباس درج کیا جا چکا ہے کہ خواجہ صاحب کسی تصنیف کے لئے پہلے سے غور و فکر نہیں کرتے تھے بلکہ برجستہ بول کر لکھوا دیتے تھے لیکن مِن اللہ حسینی کا یہ بیان محض عربی فارسی کی حد تک ہے کسی قدیم راوی نے یہ نہیں لکھا کہ خواجہ صاحب اردو میں بھی بول کر لکھواتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مخطوطوں میں کاتبوں کے انتساب کے علاوہ بیسویں صدی سے پہلے کسی تذکرہ نگار یا محقق نے خواجہ صاحب سے کوئی اردو رسالہ منسوب نہیں کیا۔ اگر فارسی کتابوں میں خواجہ صاحب کا نام بغیر تعظیمی القاب کے ہے تو اردو کتابوں میں جہاں یہ القاب ہیں ان کے بارے میں سروری صاحب کی تاویل کو عذرِ لنگ کیوں نہ قرار دیا جائے۔ کیوں نہ یہ مانا جائے کہ یہ خواجہ صاحب نے نہیں لکھائے بلکہ کسی اور نے لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے بعض کے مطالب خواجہ صاحب کی فارسی تصانیف یا ان کے درس سے لئے گئے ہوں۔ ان صورتوں میں خواجہ صاحب کو ان کتابوں کا مصنّف نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اردو میں لکھنے والے کو ان کا مولف مانا جائے گا۔

ذیل میں ان پر فرداً فرداً غور کیا جاتا ہے۔

۱۔ معراج العاشقین: اسے سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ۱۳۴۳ھ میں تاج پریس حیدر آباد سے شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے الگ الگ ۱۹۵۷ء میں دلّی سے شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے نثر کے آخر میں خواجہ صاحب سے منسوب

---

[1] مقدمہ 'خاتمہ' ص ۱۵۔ درگاہ کمیٹی روضۂ بزرگ گلبرگہ۔ بحوالہ علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۶

Marfat.com

کچھ کلام بھی شامل کیا. پاکستان میں تحسین سروری نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا.

ڈاکٹر حسینی شاہد نے ۱۹۶۵ء کے آخر میں اپنا مقالہ سیّد شاہ امین الدین علی اعلیٰ' حیات اور کارنامے مکمّل کیا اور نومبر ۱۹۶۶ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا. یہ مقالہ اگست ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا. اس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں. اس موضوع پر ان کے نگراں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ایک مفصّل کتاب "معراج العاشقین کا مصنّف" ۱۹۶۸ء میں شائع کی. بنیادی تحقیق ڈاکٹر حسینی شاہد کی ہے لیکن چونکہ ڈاکٹر قتیل کی کتاب پہلے شائع ہوئی اس لئے اس انکشاف کا سہرا انھیں کے سر باندھا جاتا ہے. بہرحال جس مدلّل طریقے اور جس سلیقے سے انھوں نے اپنا دعویٰ ثابت کیا ہے اس کی وجہ سے ان کی کتاب آزادی کے بعد کی اہم ترین تحقیقی کتابوں میں شامل کی جائے گی. اب عام طور سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ معراج العاشقین خواجہ کی تصنیف نہیں. گو ان کے دلائل کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے پھر بھی ذیل میں انھیں مختصراً درج کیا جاتا ہے. تفصیل کے لئے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کتاب ملاحظہ ہو.

۱۔ اسلامی تصوّف میں چار عناصر کا ذکر کیا جاتا ہے: آب، آتش، خاک، باد. ہندو فلسفے میں پانچ عناصر ہیں جن میں آکاش یا خلا بھی شامل ہے. شاہ برہان الدین جانم تک کے یہاں صرف چار عناصر کا ذکر ہے اور نظم و نثر میں بار بار ہے. شاہ امین الدین علی اعلیٰ نے ہندو فلسفے سے لے کر پانچویں عنصر آکاش کا اضافہ کیا اور ہر عنصر کے پانچ گن یعنی اوصاف قرار دیئے. ان کے رسالۂ وجودیہ کے مطابق ان پانچ عناصر اور ان کے پانچ پانچ گنوں کا نقشہ ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے[1]. معراج العاشقین میں بار بار پانچ عناصر بشمول عنصر خالی کا ذکر آتا ہے. اگر بندہ نواز کے مسلک میں پانچ عناصر ہوتے تو ان کے سلسلے کے خلفاء بھی اس کا ذکر کرتے لیکن حضرت امین الدین علی اعلیٰ سے پہلے ان کے والد جانم تک محض چار عناصر کا ذکر کرتے ہیں. اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں جن تنوں اور ان کے جن خواصوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ فلسفۂ امینیہ کے مطابق اور تصوّفِ بندہ نواز سے مختلف ہیں.

۲۔ معراج العاشقین کسی کتاب کا ناقص بے ربط خلاصہ ہے جس میں جگہ جگہ جملے بے معنی

---

[1] شاہ امین الدین علی اعلیٰ' حیات اور کارنامے ص ۱۸۹

Marfat.com

ہو گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اعتراف کیا ہے کہ تصحیح کی ہزار کوششوں کے باوجود "اب بھی بعض مقامات مشکوک اور قابلِ تصحیح رہ گئے ہیں"۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے دکھایا ہے کہ معراج العاشقین کی عبارت کس طرح غلط اور گنجلک ہے اور عبدالحق کس طرح ان کو سمجھنے میں ناکام رہے یا غلط سمجھے۔

۳۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل نے وہ بنیادی رسالہ ڈھونڈھ نکالا جس کی مسخ شدہ تلخیص معراج العاشقین ہے۔ یہ نسخہ مخدوم شاہ حسینی کی تلاوت الوجود ہے۔ اس کے بعد کے ابواب کو لے کر تقریباً سو صفحات کا ایک نسخہ مرتب کیا گیا۔ اس کے مرتب بھی مخدوم شاہ حسینی ہیں۔ اسی سے معراج العاشقین ماخوذ ہے کیونکہ دونوں میں جملے اور پیراگراف تک مشترک و مماثل مل جاتے ہیں۔ تلاوت الوجود اور معراج العاشقین کے اشتراک کو حفیظ قتیل کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے میں بندہ نواز کے مستند ملفوظات جوامع الکلم اور معراج العاشقین سے معراج کے بیانات کا اختلاف دکھایا اور ثابت کیا کہ یہ دونوں ایک شخص کی تصنیف نہیں ہو سکتے۔ (مقالہ ص ۲۱۱)

ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطاتِ اردو میں لکھا تھا

"خود رسالہ معراج العاشقین کے بارے میں بھی مجھے یہ شبہہ ہے کہ ان کا مؤلفہ نہیں بلکہ ان کے کسی مرید نے اسی زمانے میں اس کو اردو میں منتقل کیا ہے"[1]

ڈاکٹر حفیظ قتیل نے تلاوت الوجود اور اس کے مصنف کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی ہیں۔

تلاوت الوجود کے مصنف کا نام سیّد مخدوم شاہ حسینی ہے۔ ایک نسخے میں انھوں نے خود اپنے وطن کی صراحت کی ہے کہ وہ بیجاپور کے ضلع رائچور، پرگنہ کوتال، قصبہ بلگانور کے رہنے والے تھے۔ ان کے پیر کا نام پیراللہ حسینی تھا۔ مخدوم شاہ حسینی کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کا آخر اور بارہویں صدی ہجری کا اوائل قرار پاتا ہے۔ چونکہ فقرا کے نام کے ساتھ تعظیمی لاحقہ 'مخدوم' لگانے کا عام رواج ہے اس لئے سیّد محمد حسینی گیسو دراز کو مخدوم سیّد محمد حسینی کہا جاتا تھا۔ تلاوت الوجود کے مصنف کا نام ہی 'مخدوم شاہ' تھا۔ ناموں کی مماثلت کی وجہ سے کاتبوں اور راویوں کو التباس ہوا اور انھوں

---

[1] جلد پنجم ص ۱۸۷۔

Marfat.com

نے مخدوم شاہ حسینی کو مخدوم سید محمد حسینی گیسو دراز سمجھ لیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کا معراج العاشقین کا نسخہ مولوی عبدالحق کے مطبوعہ نسخے کی نسبت کہیں زیادہ مکمّل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خاتمے میں لکھا ہے۔

"اے مخدوم توں پیر اللہ حسینی کے کرم سے اس راز کی خبر پایا"[1]

اس نسخے میں مصنّف اور اس کے پیر کے صریح نام کے باوجود کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ پیر اللہ حسینی خلیفہ تھے شاہ میراں جی خدانما کے اور خدانما خلیفہ تھے حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے۔ اس طرح مخدوم شاہ حسینی تک خواجہ بندہ نواز کا سلسلۂ خلافت یوں قائم ہوتا ہے۔

خواجہ بندہ نواز۔ شاہ جمال الدین مغربی۔ شاہ کمال الدین بیابانی۔ شاہ میراں جی شمس العشاق۔ شاہ برہان الدین جانم۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ شاہ میراں جی خدانما۔ شاہ پیر اللہ حسینی۔ مخدوم شاہ حسینی معراج العاشقین کے خواجہ بندہ نواز سے انتساب کے دو دلائل بچتے ہیں۔

ا۔ شمس اللہ قادری کے مطابق خواجہ بندہ نواز کے مرید عبداللہ چشتی کی تصنیف عشق نامہ میں خواجہ کی تصانیف میں معراج العاشقین کا بھی نام ہے[2]

عشق نامہ دستیاب نہیں۔ اسے دیکھے بغیر کیا کہا جائے۔ اوّل تو عشق نامہ معتبر کتاب نہیں۔ اس میں وجیہ الدین علوی کے قول کو بندہ نواز سے منسوب کیا ہے، دوسرے عشق نامہ اور تاریخِ حبیبی کے تعلق سے شمس اللہ قادری معتبر راوی نہیں۔

ب ، مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کو دو نسخوں کی مدد سے ۱۳۴۳ھ میں شائع کیا۔ ان میں سے ایک نسخہ ڈاکٹر محمد قاسم ناظم سمیّات حیدرآباد کے کتب خانے میں تھا۔ اس نسخے کے آخر میں صراحت تھی کہ یہ ۹۰۶ھ کے مکتوبہ ایک نسخے کی نقل ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے کئی مثالیں دی ہیں جب کاتبوں نے مخطوطوں کی تاریخ کتابت سنہ تصنیف سے بھی قدیم تر لکھ دیں۔ رسالۂ جنونیہ کے معاملے میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ایک نسخے کی تاریخ کتابت کئی سو سال پہلے کی قرأت کر لی[3]

---

[1] عبدالقادر سروری، علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو ص ۱۶۱ ۔

[2] اردوئے قدیم ص ۴۱

[3] ڈاکٹر حسینی شاہد، شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ ص ۲۲۱۔ ۲۲۰

Marfat.com

ڈاکٹر قاسم کے نسخے کی اصل موجود نہیں۔ جب تک اسے دیکھ نہ لیا جائے کیونکر کہا جائے کہ اس میں واقعی ۹۰۶ھ ہی لکھی تھی۔ وہ نسخہ اب ناپید ہے۔

معراج العاشقین میں پانچ عناصر کا ذکر سب سے بڑی شہادت ہے کہ یہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ اس کی اور تلاوت الوجود کی داخلی اور خارجی شہادتوں کے ہوتے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تلاوت الوجود مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے اور معراج العاشقین اس کی ایک ناقص اور ژولیدہ تلخیص ہے جس کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا نصفِ اوّل ہونا چاہیئے۔

۲۔ تلاوت الوجود:

سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کئی رسالوں کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا۔

"یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں"[1]

ان کے بعد ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات میں ادارۂ ادبیات اردو کے نسخے کا اس عنوان سے ذکر کیا۔

تلاوت الوجود قریب ۱۱۲۵ھ۔ شاہ علی ابنِ باباشاہ[2]

ان کا شجرہ یوں لکھتے ہیں

شاہ علی ابنِ باباشاہ ابنِ شاہ امین ابنِ شاہ برہان الدین جانم ابنِ شاہ امیر الدین میراں جی شمس العشاق۔

نسخے کی پیشانی پر لکھا ہے

"وجودیہ تصنیفِ علی صاحب ابنِ بادشاہ صاحب قدس سرہٗ"

ترقیمے میں ہے

یہ تلاوت الوجود سالکان و عاشقانِ محبوب را تسلّی نمایدٔ انشاءاللہ۔ تصنیفِ سید ابوالفتح صدرالدین خواجۂ خواجگان مخدوم سیّد محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز عاشق شہباز سرانوار خاک پا نیاز قدس سرہٗ۔

ڈاکٹر زور نے لکھا ہے

"یہ غالباً خواجہ بندہ نواز کے فارسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے"[3]

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۲۱

[2] جلد پنجم ص ۱۸۳ - ۱۸۲

[3] مخطوطات ادبیات اردو ص ۱۸۳

Marfat.com

چونکہ اس میں شاہ برہان الدین کا نام لکھ کر ان کے کچھ اشعار درج ہیں اس لئے اس رسالے کو ڈاکٹر زور نے شاہ علی کی تالیف قرار دیا ہے۔

انجمن ترقیِ اردو ہند میں تلاوت الوجود کا نسخہ مجموعہ نمبر ۲۹۷ میں شامل ہے۔ وہاں لکھا ہے

تصنیفِ سید ابوالفتح صدر الدین خواجۂ خواجگان مخدوم سیّد محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز عاشق شہباز سرافراز۔

کاتب کا نام فقیر حقیر ولایت علی شاہ ہے۔

پروفیسر عبد القادر سروری نے علی گڑھ تاریخ ادب میں اسے بندہ نواز سے منسوب کرتے ہوئے بتایا کہ سالار جنگ لائبریری میں اس کے تین نسخے ہیں۔ انھوں نے اس پہلو پر بطور خاص دھیان دیا کہ تلاوۃ الوجود اور معراج العاشقین کافی مشابہہ ہیں۔[1]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے میں مخدوم شاہ حسینی کے تلاوت الوجود کا ذکر کیا ہے۔ لکھتی ہیں کہ سالار جنگ کے مخطوطے میں اسے بندہ نواز کی اور آصفیہ لائبریری کے مخطوطے میں مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیا ہے۔[2]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے مرتبہ شکار نامہ کے مقدمے میں ایک طرف اسے بندہ نواز سے منسوب کیا دوسری طرف یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ شاہ علی نے اپنے پردادا شاہ برہان الدین جانم کے اشعار بھی نقل کئے ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ علی کا رسالہ محض ترجمہ نہیں ہو سکتا۔[3]

واضح نہیں کہ ان کے نزدیک شاہ علی مصنّف ہیں یا بندہ نواز۔ اگر شاہ علی پوری طرح مترجم نہیں بلکہ انھوں نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے تو بندہ نواز فارسی رسالے کے مصنّف رہ گئے اردو رسالے سے بے دخل ہو گئے۔

جیسا کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے تحقیقی مقالے میں اور ڈاکٹر حفیظ قتیل نے 'معراج العاشقین کا مصنّف' میں واضح کیا ہے تلاوت الوجود کے مصنّف مخدوم شاہ حسینی ہیں۔[4] سالار جنگ لائبریری میں تلاوت الوجود کے متعدد نسخے ہیں ان میں سے ایک میں مصنّف کا نام مخدوم شاہ ساکنِ بلگانو

---

[1] ص ۱۷۰

[2] ص ۲۲۳۔

[3] مقدمۂ شکار نامہ ص ۱۳

[4] ص ۷۷ تا ۸۳ نیز ص ۱۲

Marfat.com

درج ہے۔ متن میں سیّد محمد مخدوم یا سیّد مخدوم حسینی لکھ کر گیسو دراز بندہ نواز کے القاب کا اضافہ ہے جو کاتب کا کارنامہ ہے۔ بزرگوں کے نام کے پہلے تعظیمی لقب مخدوم لگایا جاتا ہے لیکن 'مخدوم شاہ حسینی' کے نام ہی میں مخدوم شامل ہے

اب یہ مسلمہ ہو چکا ہے کہ تلاوت الوجود مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے بندہ نواز کی نہیں۔ اس نسخے کا ذکر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر سروری نے کیا ہے۔

۳۔ تلاوت المعراج:

سروری صاحب نے معراج العاشقین کے ذکر میں عنوان ہی 'معراج العاشقین یا تلاوت المعراج' رکھا ہے[1]۔ لکھتے ہیں کہ سالار جنگ لائبریری میں گو ایک نسخہ تلاوت المعراج کے نام سے ہے لیکن اس کے اور معراج العاشقین کے مطالب یکساں ہیں[2]۔ اس میں یہ جملہ بھی ملتا ہے۔

"تلاوت المعراج میں کتیک باتاں حضرت مخدوم حسینی بندہ نواز گیسو دراز باطن فرمائے ہیں"[3]۔

ڈاکٹر رفیعہ اپنے مقالے میں لکھتی ہیں کہ سالار جنگ لائبریری میں اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک مجموعہ چہار دہ رسائل میں شامل ہے دوسرا الگ سے ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے اس کا جو اقتباس دیا ہے وہ معراج العاشقین ہی کا ہے۔ اس میں وہ فارسی شعر بھی ہے۔

طبیبِ عشق را دکّاں کدام است علاجِ جاں کند او را چہ نام است[4]

یہ بھی تلاوت الوجود اور معراج العاشقین کا ایک روپ ہے اور اس میں بھی وہی فلسفہ اور وہی مطالب ہیں اس لئے اس کے مصنف بھی مخدوم شاہ حسینی ہیں نہ کہ مخدوم سیّد محمد حسینی۔

۴۔ رسالۂ تصوّف یا تشریحِ کلمہ طیّبہ:

یہ رسالہ سالار جنگ لائبریری کے مجموعے 'چہار دہ رسائل' میں شامل ہے۔ رسالے کے سرورق پر 'رسالہ جاتِ بندہ نواز' لکھا ہے لیکن اس میں بیشتر رسالے دوسروں کے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر سروری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اس کی ابتداء کا اقتباس دے کر صراحت کرتی ہیں۔

'یہ عبارت نسخہ معراج العاشقین' مخزونہ انجمن ترقیِ اردو علی گڑھ کے بھی آغاز کی ہے'[5]

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۶۰
[2] ایضاً ص ۱۶۲
[3] اردو نثر کا آغاز ص ۱۰۱
[4] علی گڑھ تاریخ ص ۱۶۲
[5] اردو نثر کا آغاز ص ۱۰۰

Marfat.com

سرُوری صاحب لکھتے ہیں

"یہ دراصل کلمۂ طیبہ کی متصوفانہ تشریح ہے۔ اس کا آغاز بھی قرآن کی اس آیت سے ہوتا ہے جو انجمنِ ترقی اردو کے مخطوطہ معراج العاشقین کی پہلی آیت ہے۔ کچھ اور جملے بھی ملتے جلتے ہیں لیکن آگے دونوں میں بڑا اختلاف ہے"[1]

اس رسالے کے متن میں اسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب نہیں کیا گیا۔ معراج العاشقین سے جزوی مماثلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی مخدوم شاہ حسینی کے عہد کی یا اس سے بعد کی تصنیف ہے۔

۵۔ شکارنامہ: اس میں وجود کے پانچ مقاموں کا ذکر ہے یعنی واجب الوجود، ممکن الوجود ممتنع الوجود عارف الوجود اور واحد الوجود۔ میراں جی شمس العشاق اور جانم کے یہاں ابتدائی چار وجودوں کا ذکر ہوتا ہے، واحد الوجود کا نہیں۔ پانچ وجودوں کا ذکر امین الدین اعلیٰ یا انکے خانوادے ہی میں ملتا ہے[2]۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف امین الدین علی اعلیٰ کے بعد کا ہے بلکہ مخدوم شاہ حسینی سے پہلے کا نہیں۔

سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے 'اردو کی ابتدائی نشوونما' میں اس رسالے کو بندہ نواز کی تصانیف میں شامل کیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات کے تذکرۂ مخطوطات[3] میں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے میں، پروفیسر سروری نے ملی گجرہ تاریخ میں اور ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے تاریخ ادبیاتِ مسلماں چھٹی جلد میں اس کا ذکر کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر تمنیہ شوکت اور مبارز الدین رفعت دونوں نے اسے الگ الگ شائع کیا۔

فارسی ہو کہ اردو یہ رسالہ محض ایک صفحہ کو محیط ہے۔ خواجہ بندہ نواز نے اسے فارسی میں بالیقین لکھا ہے۔ اس کے چار فارسی مخطوطے ملتے ہیں۔

۱۔ کتب خانۂ روضتین گلبرگہ کے مجموعہ یازدہ رسائل میں ۲۔ انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں

---

[1] ملی گجرہ تاریخ ص ۱۶۳

[2] حسینی شاہد: شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص، ۱۷۳ - ۱۷۲

[3] تذکرۂ مخطوطات جلد سوم ص ۸۰ - ۷۹ نیز جلد پنجم ص ۱۸۸ - ۱۸۷

Marfat.com

۳۔ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میسور میں۔ اس کے آخر میں ۲۰ صفحات پر سیّد والہ موسوی نے فارسی میں شرح کی ہے۔ ۴۔ ڈاکٹر محمد نورالدین سعید کے ذاتی کتب خانے میں جو نہایت خستہ حالت میں ہے۔

مجموعہ یازدہ رسائل میں خواجہ بندہ نواز کے ۱۱ رسائل ہیں۔ اس مجموعے کو سلسلۂ مطبوعاتِ کتب خانۂ روضتین گلبرگہ میں حافظ سیّد عطا حسین کی تصحیح سے شائع کیا گیا۔ سنہ اشاعت درج نہیں لیکن دیباچہ پر ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ حیدر آباد لکھا ہے۔ اس کے ص ۱۴۳-۱۴۲ پر برہان العاشقین معروف بہ قصۂ چہار برادر و مشہور بہ شکار نامہ از تصنیفاتِ خواجہ بندہ نواز چھپا ہے۔ اس کے فوراً بعد فارسی کی سات شرحیں شامل ہیں جو سیّد والہ موسوی، ابوصالح، محمد حسن چشتی، سیّد محمد عبدالواحد بلگرامی، سیّد میر محمد کالپوری، شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی، حکیم مرزا قاسم علی بیگ اور ایک اور صاحب کی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سیّد والہ موسوی اور میر محمد کالپوری دونوں نے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے کہ دو درویش ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر لائے کہ یہ حضرت بندہ نواز کے ملفوظات ہیں۔ ان کے معنی سمجھ میں نہیں آتے، آپ بتائیے۔ شارح نے ان سے دو دن بعد آنے کو کہا اور اپنی سمجھ کے مطابق معنی بتائے جو انؒ کی شرح میں درج ہیں۔

دونوں حضرات نے یہ واقعہ خود سے منسوب کر کے لکھا ہے۔

مبارز الدین رفعت نے اپنے اردو شکار نامہ کے مقدمے میں (ص ۱۴-۱۵) مطبوعہ یازدہ رسائل سے لے کر فارسی برہان العاشقین کو دوبارہ شائع کر دیا۔ تیسری بار اکبر الدین صدیقی نے رسالہ اردو کراچی بابت جنوری ۶۸ء میں اپنے مضمون جان محمد فخری میں (ص ۱۰۲ تا ۱۰۴) شامل کر کے چھاپ دیا۔ یہ مضمون اکبر الدین صدیقی کے مجموعے بجھتے چراغ ۱۹۷۵ء حیدر آباد میں بھی شامل ہے

اردو نثر میں اس کے ذیل کے نسخے ملتے ہیں۔

سالار جنگ میوزیم ایک نسخہ۔ آصفیہ لائبریری ۲ نسخے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو ۲ نسخے۔ روضتین گلبرگہ دو نسخے۔ انجمن ترقیِ اردو ہند دلّی ۲ نسخے۔ مجلسِ تحقیقاتِ اردو حیدر آباد ایک نسخہ۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون میسور ایک نسخہ۔ برٹش میوزیم ایک نسخہ۔ ڈاکٹر نورالدین سعید ایک نسخہ۔ جملہ ۱۳ نسخے۔

اردو شکار نامہ چار مرتبہ چھپا ہے۔

Marfat.com

۱۔ ضمیر احمد ضمیر نے مختلف بزرگوں کے گیارہ رسائل کا مجموعہ 'مجموعہ سیزدہ رسالہ فقرا' کے نام سے شائع کیا۔[1] دوسرا ایڈیشن مطبعِ کریمی بمبئی سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا۔ اس میں پانچویں رسالہ کا عنوان ہے "رسالہ پنجم مخدوم حسینی"۔ یہ شکار نامہ ہے اور اس عبارت سے شروع ہوتا ہے۔

"یہ رسالہ حضرت مخدوم سیّد حسینی گیسو دراز قدس سرہٗ سے ایجاد ہے"

مرتب نے قدیم الفاظ کو بدل کر مروجہ الفاظ اور جدید اسلوب میں لکھ دیا ہے۔

۲۔ آمنہ خاتون اور ان کے شوہر نے ستمبر ۱۹۶۰ء میں 'ریاستِ میسور میں اردو' نام کی کتاب چھاپی۔[2] اس میں اپنے کتب خانے کے بعض نادر متون بھی چھاپ دیئے۔ ان میں ایک نسخہ "رسالہ من ہرن" بھی ہے جو دراصل شکار نامہ ہے۔ ابتدا ہے۔

"یہ رسالہ من ہرن حضرت مخدوم سیّد حسینی گیسو دراز سے ایجاد ہے"

اس کی زبان بھی جدید ہے

۳۔ ۱۹۶۲ء میں سید مبارز الدین رفعت نے مرتب کر کے اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد سے چھپوایا۔

۴۔ ۱۹۶۲ء ہی میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مرتب کر کے مجلسِ تحقیقاتِ اردو حیدر آباد سے شائع کیا۔

شکار نامہ کے اردو نظم میں تین نسخے ہیں

۱۔ برٹش میوزیم کا نسخہ: اس کی تفصیلات ڈاکٹر نور الدین سعید کے مقالے میں دی ہیں۔ اس مثنوی کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ کسی نامعلوم شاعر کی تخلیق ہے۔ وہ ایک شعر میں بابا شاہ حسینی کا ذکر کرتا ہے۔ ۴۵ ویں شعر سے بحر بدل جاتی ہے اس حصے کے مصنّف 'میراں جی' ہیں جنہوں نے اپنے مرشد کا نام شاہ جمال لکھا ہے۔ نور الدین کا خیال ہے کہ شکار نامہ کے دو منظوم نسخے گڈ مڈ ہو کر لکھ دیئے گئے ہیں۔ وہ دوسرے حصے کا مصنّف میراں جی شمس العشاق کو قرار دیتے ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ میراں جی کے مرشد کمال بیابانی تھے اور ان کے مرشد جمال الدین مغربی۔ اس میں یہ عجیب سا شعر ہے۔

اول ہوں سن گیسو محمد کیے دوم ہوں تن فنا محمود ہے (کذا)

---

[1] [2] ان کی تفصیلات مبارز الدین رفعت کے شکار نامہ ص ۲۰۔ ۱۹ سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

تیسرا منظوم نسخہ جان محمد محری کا ہے۔ یہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے خلیفہ تھے اور بیجاپور میں ۹۲-۱۰۹۱ھ میں انتقال کیا۔ ان کی مثنوی کا نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ہے غالباً گفتارِ خواجہ جان محمدؒ کے نام سے۔ مثنوی میں شکار نامہ کے ساتھ ساتھ اس کی شرح بھی نظم کی گئی ہے۔ دونوں کو اکبر الدین صدیقی نے رسالہ اردو کراچی بابت جنوری ۱۹۶۸ء میں اپنے مضمون 'جان محمد محری' میں چھاپ دیا۔ یہ مضمون صدیقی کے مجموعے 'بجھتے چراغ' میں بھی شامل ہے' محری اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں۔

سنو عاشقاں ہور و اصل تمام — کہ کیسا خوب ہے یہ معمّا کلام
اصل میں اتھا فارسی میں اول — کیا ہوں میں دکھنی میں اس کو بہ حل
کہ یک دن محمد حسینی سو جیوں — کہے یو معمّا جو سب سات یوں

محری کے مطابق ان سے پہلے شکار نامہ محض فارسی میں تھا انھوں نے پہلی بار دکھنی میں لکھا۔ فارسی میں لکھنے والے محمد حسینی (حضرت بندہ نواز) تھے۔ محری کے بیان سے یہ واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ بندہ نواز نے صرف فارسی میں شکار نامہ لکھا تھا اردو میں نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے زمانے تک کسی نے شکار نامہ کو اردو میں نہیں لکھا۔ اس سے برٹش میوزیم کے نسخے کے دوسرے حصے کا انتساب میراں جی شمس العشاق سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ میراں جی صوفیوں میں ایک عام لقب ہے۔ معلوم نہیں کس شاہ جمال کے مرید کون سے میراں جی تھے۔

اردو شکار نامہ کے دونوں مطبوعہ نسخوں میں محض ۲۵ سطریں ہیں۔ ایک صفحہ کے برابر اس عبارت کو کسی طرح ایک کتاب یا رسالہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک شرح شامل رہتی ہے۔ اس کے مصنّف کا علم نہیں۔ اردو شکار نامہ کا ایسا کوئی نسخہ نہیں جس میں یہ شرح موجود نہ ہو۔ شرح کی آخری سے پہلے کی سطر میں لکھا ہے۔

'حضرت بندگی مخدوم فرماتے ہیں۔۔۔

یہ ثابت ہو گیا کہ شرح خواجہ بندہ نواز نے نہیں ان کے کسی معتقد نے لکھی ہے۔ کیوں نہ یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ اردو شکار نامہ اور شرح کا مولف ایک ہی شخص ہے۔ پہلے اس نے فارسی شکار نامہ کا اردو ترجمہ لکھا۔ اس کے بعد اس کی شرح لکھی۔ ورنہ اس شرح کا دُم چھلّا شکار نامہ کا لابدی جزو کیوں ہوتا۔ اس کے مانع کوئی قرینہ نہیں۔

ظاہرا روضتین گلبرگہ میں شکار نامہ کے تین نسخہ ہیں۔ دو نسخے وہ ہیں جن کی مدد سے

Marfat.com

مبارز الدین رفعت نے اپنا مطبوعہ متن تیار کیا۔[1] کیا ان کے علاوہ ایک تیسرا نسخہ یا اردو شرح بھی ہے؟ ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنے مقدمے میں لکھتی ہیں

"روضۂ حضرت گیسو دراز کے کتب خانے کا نسخہ حضرت شاہ برہان الدین جانم کے کئی رسالوں کے ساتھ منسلک ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شرح خود حضرت برہان الدین جانم کی لکھی ہوئی ہوگی۔ اس طرح شکار نامہ کی شرح کی بھی ایک اہمیت ہو جاتی ہے۔ شرح کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

'توحید کے باب میں حضرت بندہ نواز حسینی قدس سرہٗ فرماتے ہیں سو بغور گوشِ جاں سے سن'

غالباً یہ شکار نامہ کی سب سے قدیم شرح ہے جو اصل شکار نامہ کا جز بن گئی ہے۔"[2]

راقم الحروف کی نظر سے یہ نسخہ نہیں گزرا۔ ڈاکٹر ثمینہ نے شرح کا جو جملہ نقل کیا ہے وہ شکار نامہ کے ساتھ کی عام شرح سے مختلف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کوئی مختلف شرح ہے تبھی تو وہ کہتی ہیں۔

'یہ شکار نامہ کی سب سے قدیم شرح ہے'

اگر برہان الدین جانم کے رسائل کے ساتھ مجلّد ہونے کی وجہ سے اس شرح کو جانم کی تصنیف مان لیا گیا تو شرح سے قبل کے شکار نامہ کو بھی جانم سے کیوں منسوب نہ کر دیا۔ لیکن کسی کے رسالوں کے ساتھ ایک جلد میں مجلّد ہونا ضعیف استدلال ہے۔ روضتین کے اس شکار نامہ یا شرح کی مزید کیفیت اکبر الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ کلمتہ الحقائق کے دیباچے میں دی ہے۔ لکھتے ہیں

"کتب خانۂ روضتین گلبرگہ شریف میں ایک رسالہ موسومہ شکار نامہ ہے جو غلط طور پر خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہے اس میں ایک جگہ مصنّف نے اپنے بیان کی تائید میں لکھا ہے

ارشاد نامہ کی ترتیب سوں شکار نامہ نو باپ اور سات ماکے ہم چہار فرزند تھے۔

- - - اگر کوئی غلط کہیں تو دیکھو حضرت شاہ برہان الدین اپنے کلمتہ الحقائق میں کیوں فرمائے"[3]

معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے میں شکار نامہ کا متن اور شرح ملا جلا کر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ

---

[1] مبارز الدین رفعت۔ شکار نامہ ص ۲۲

[2] مقدمۂ شکار نامہ ص ۲۲۔

[3] اکبر الدین صدیقی: کلمتہ الحقائق کا مقدمہ ص ۱۲۔ حیدر آباد۔ ۱۹۶۱ء

Marfat.com

اسی کو برہان الدین جانم کی تصنیف اور شکار نامہ کی قدیم ترین شرح کہہ رہی ہوں گی۔ چونکہ اس میں خود جانم اور کلمتہ الحقائق سے حوالہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے اس کا مصنف جانم کا کوئی معتقد ہے، خود جانم نہیں۔

مبارز الدین رفعت لکھتے ہیں کہ روضتین گلبرگہ میں شکار نامہ کے جو دو نسخے ہیں نیز حیدرآباد کے کتب خانوں میں جتنے نسخے ہیں ان میں سے کسی میں مندرجہ بالا عبارت موجود نہیں[1] یعنی اس عبارت والا نسخہ روضتین کے دو موجود نسخوں سے مختلف کوئی نسخہ ہے یا کسی نے شکار نامہ کی شرح لکھی ہے۔

اردو شکار نامہ کے جتنے نسخے ملتے ہیں ان سب کے سرنامہ میں مصنف کا نام خواجہ بندہ نواز ظاہر کیا گیا ہے لیکن کسی ایک نسخے کے متن میں ان سے انتساب نہیں۔ بعض نے اسے حضرت کی گفتار کہا ہے اور بعض نے ان کا مسئلہ۔ اس کے باوصف ذیل کے بیانات ملاحظہ ہوں۔

ڈاکٹر زور۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ (شکار نامہ) خواجہ بندہ نواز نے اردو میں نہیں لکھا بلکہ ان کے کسی مرید یا معتقد نے قلم بند کیا ہے"[2]

ڈاکٹر حسینی شاہد کلمتہ الحقائق پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں

"شکار نامہ کا بندہ نواز سے انتساب معراج العاشقین کے انتساب سے زیادہ کمزور ہے۔ معراج العاشقین کے تعلق سے مولوی عبدالحق کا دیا ہوا سنہ کتابت ایک قوی ثبوت بن کر سامنے آتا ہے لیکن شکار نامہ کے انتساب کے سلسلے میں ایسا کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا جا سکتا"[3]

ڈاکٹر محمد نور الدین سعید نے بندہ نواز کے رسالوں کا بہ امکانِ نظم مطالعہ کیا ہے اور ان کی رائے ہے کہ اردو شکار نامہ خواجہ کی تصنیف نہیں۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں

ا۔ خواجہ بندہ نواز کے معاصر یا قریب العصر مصنفوں نے کہیں نہیں لکھا کہ خواجہ نے اردو میں بھی کوئی رسالہ لکھا۔

---

[1] مقدمہ شکار نامہ ص ۲۲

[2] تذکرۂ مخطوطات اردو جلد پنجم ص ۱۸۷

[3] حسینی شاہد: کلمتہ الحقائق، اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۰۔

Marfat.com

۲۔ شکار نامہ کی زبان بندہ نواز کے عہد کی زبان نہیں۔ اسے نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سے ملا کر دیکھئے تو ایک زماں کا فرق ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کی کلمتہ الحقائق خواجہ بندہ نواز سے کوئی پونے دو صدی بعد لکھی گئی۔ اس کی زبان شکار نامہ سے زیادہ فرسودہ ہے۔ شکار نامہ میں صرف چند الفاظ دکنی یا نامانوس ہیں ورنہ عام طور سے یہ کافی صاف زبان میں ہے۔

۳۔ اردو کے کئی نسخوں کو خواجہ کی گفتار کہا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر میں خواجہ صاحب کے لئے جس طرح تعظیمی الفاظ لائے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مصنّف کوئی دوسرا شخص ہے۔ مقابلے کے لئے فارسی شکار نامہ میں دیکھئے۔ حضرت اپنا ذکر کس طرح تعظیمی الفاظ کے بغیر کرتے ہیں۔

راقم السطور کو تیسری فتق کے آخری جملے سے اتفاق نہیں۔ مجموعۂ یازدہ رسائل میں مشمولہ شکار نامہ میں خواجہ نے اپنا نام ہی نہیں لیا۔ اکبر الدین صدیقی نے رسالہ اردو میں جو فارسی شکار نامہ نقل کیا ہے اس کے عنوان میں ہے

'رسالہ مِن تصنیفِ عشق باز بلند پرواز سید محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہٗ العزیز'[1]

اس سے قطع نظر ڈاکٹر نور الدین کی دلیلیں درست ہیں۔ ان میں اس دلیل کا اضافہ اور کیا جانا چاہیئے کہ جان محمد محرمی نے اپنے اردو منظوم شکار نامہ میں لکھا ہے کہ خواجہ گیسو دراز نے اسے فارسی میں لکھا وہ پہلی بار دکھنی میں لکھ رہا ہے۔ حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ خواجہ سے بہت بعد میں کسی شخص نے فارسی شکار نامہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسی نے شرح لکھی۔ عنوان میں اس کے خواجہ صاحب سے انتساب کی وجہ یہ ہے کہ فارسی میں اس کے مصنّف خواجہ بندہ نواز ہیں مثلاً میرے سامنے مقبول حسن خاں کی کتاب تین یونانی المیے۔ علی گڑھ ۱۹۷۷ء ہے۔ اس میں دو ڈراموں کے اردو ترجمے اس سرنامہ کے ساتھ ہیں۔

ص ۳۹ پابستہ بہ رومیتھیوس از ایسکیلیس

ص ۱۷۷ میڈیا از یوری پڈیز

ساہتیہ اکادمی سے دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب پاروں کے اردو ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ میرے سامنے ایسی چند کتابوں کے سرورق پر لکھا ہے

سنجوگ از رابندر ناتھ ٹیگور۔ مٹی کا پتلا از کالیندی چرن پانیگراہی۔ دو سیر دھان از تکشی

---

[1] اردو جنوری ۱۹۷۰ء ص ۱۰۲

Marfat.com

اردو ترجموں پر اصل زبان کے مصنّفوں کے نام کے یہ معنی نہیں کہ اردو متن انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ شکار نامہ کے اردو ترجمے کے قبل خواجہ بندہ نواز کے نام کے بھی اس سے زیادہ کوئی معنی نہیں۔

اردو شکار نامہ کے مصنّف یا مترجم کی بحث ختم ہوئی۔

شکار نامہ کا معمّہ نما انداز مراٹھی سنتوں گیانیشور وغیرہ کے ابھنگوں کی تقلید ہے دراصل یہ انداز آٹھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک کے بودھ سدھوں اور ناتھ پنتھی جوگیوں کا تھا جسے مراٹھی میں نام دیو، گیانیشور اور ایک ناتھ وغیرہ نے اپنایا۔ گیانیشور خود گورکھ ناتھ کے سلسلۂ ارشاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس انداز کے معمّے ابھنگ یا بھاروڈ کوٹ کہلاتے تھے۔ پیچھے جس رسالۂ جنونیہ کا ذکر کیا گیا تھا اس کے اردو اقوال مل کر اسی انداز کا ابھنگ بنتے ہیں۔ اردو شکار نامہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

'نو باپاں ہور سات مانواں کے ہمیں چار فرزند، تین ننگے، یکس کوں کپڑیچ نین۔
جسے کپڑیچ نیں اس کی آستین میں پیکے تھے'۔[1]

ڈاکٹر ثمینہ لکھتی ہیں

'اس مخصوص طرز نگارش کا مقصد یہ تھا کہ حقّانیت کے رموز اور مسائل کی تشریح طالب من مانے طور پر نہ کرے، اس لئے اسے گرو کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دلائی جاتی تھی''[2]

علامت اور موضوع میں اگر کوئی رشتہ نہ ہو تو قاری یا سامع اس علامت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ابھنگوں کا اظہار مطالب کا انداز جدید شاعری سے بھی زیادہ مبہم ہے۔ دیکھیں شکار نامہ کے نو باپ، سات ماؤں اور چار فرزندوں کی کیا تفسیر کی گئی ہے۔ صرف نسخۂ روضتین اور شکار نامہ کے ساتھ کی شرح کے مختلف مطالب کو لیجئے۔

نو باپ: نورِ ذاتی۔ نورِ محمدی۔ سر۔ روح۔ ضمیر۔ فواد۔ قلب۔ مضغتہ۔ تن

یا

مقامِ ناسوت۔ مقام ملکوت۔ مقام جبروت۔ مقامِ لاہوت۔ مقامِ یاہوت۔ مقامِ ماہوت

---

[1] ڈاکٹر ثمینہ شوکت: شکار نامۂ حضرت گیسو دراز (حیدر آباد ۱۹۶۲ء) ص ۹۲-۹۱

[2] ایضاً ص ۷۵

Marfat.com

مقامِ ہاہوت۔ مقامِ نصیرا۔ مقامِ محمودا

یا

سات طبقِ آسماں اور عرش و کرسی

یا

دہن۔ ہر دو چشم۔ بینی۔ ہر دو گوش۔ تارکہ۔ جائے میدان۔ جائے بول

سات ماں: نور۔ صفا۔ ہوا۔ بارا۔ نار۔ پانی۔ ماٹی

یا

سات طبقِ زمیں

یا

دل۔ جگر۔ پھیپھسا۔ پِتّا۔ بھیجا۔ اوجھڑی۔ انتری

چار فرزند: عقلِ قیاس۔ عقلِ وہم۔ عقلِ گمان۔ عقلِ آگاہ

یا

نفسِ امّارہ۔ نفسِ لوّامہ۔ نفسِ ملہمہ۔ نفسِ مطمئنہ

یہ تفسیریں صرف دو شرحوں یعنی روضتین کے نسخے اور شکار نامہ کے ساتھ کی شرح سے لی گئی ہیں۔ بعض نے چار فرزند سے مراد چار عناصر یعنی جمادی، نباتی، حیوانی اور انسانی بتائے ہیں جملہ شرحوں کو سامنے رکھا جائے تو اتنے ہی مفاہیم نکل آئیں گے جتنی شرحیں ہیں۔ مصنّف کہے گا۔

ع شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

اگر بنیادی کرداروں یعنی چار بھائیوں اور ان کے ماں باپ کے معنی پر بھی اتفاق نہیں تو یہ عارفانہ بیان گونگے کا خواب ہو گیا۔ مصنّف اپنے اظہار میں بالکل ناکام رہا۔ کون جانے اس کا عندیہ کیا تھا؟ یہ ابھنگ اور ان کی اردو نقلیں محض بچّوں کی گپّوں اور لطیفوں کے مانند ہیں۔ ان میں روحانیت کا عنصر ہے تو وہ نظروں سے اس حد تک پوشیدہ ہے کہ اسے مفقود کہنا مناسب ہوگا۔ شارحین کو موقع مل جاتا ہے کہ پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند کی مشق کریں۔

۶۔ **سمجھہ بارہ:** اس کا ذکر نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے کیا ہے۔ ہاشمی مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ عنایت جنگ حیدر آباد کے کتب خانے میں موجود ہے۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ کس قرینے کی بناء پر اسے خواجہ صاحب سے

Marfat.com

منسوب کیا ہے۔ اس دور کے دینی رسالوں کی طرح یہ بھی سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ نمونہ

سوال: ذاتی ایمان کون سا اور صفاتی ایمان کون

جواب: اکھنڈا حال ثابتی ہے سو ذاتی ایمان وہ ہے۔ ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان

سوال: ایمان کے جھاڑاں کیا اور ایمان کے ڈالیاں کیا اور ایمان کے پات اور ایمان کا وطن کیا اور ایمان کا بیج کیا اور ایمان کا پوست کیا اور ایمان کا سَر کیا اور ایمان کا جیو کیا۔

جواب: ایمان کا جیو قرآن۔ ایمان کی جڑ توبہ۔ ایمان کی ڈالیاں سو بندگی۔ ایمان کی پات پرہیزگاری۔ ایمان کا تخم سو علم۔ ایمان کا پوست سو شرم۔ ایمان کا وطن سو مومن کا دل ہے۔[1]

یہ زبان اتنی صاف ہے کہ اسے بندہ نواز سے منسوب کرنے کے لئے جسارت کی ضرورت ہے۔ 'جھاڑاں' اور 'ڈالیاں' میں لاحقۂ جمع کے علاوہ پوری تحریر میں کوئی دکنی عنصر نہیں۔

۷۔ **ھدایت نامہ:** خواجہ بندہ نواز کے مرید عبداللہ چشتی نے تصوّف میں ایک کتاب عشق نامہ لکھی تھی۔ شمس اللہ قادری کے مطابق اس میں خواجہ صاحب کے رسالے ہدایت نامہ کا ذکر تھا۔[2]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا بیان ہے کہ شمس اللہ قادری نے کتب خانۂ حبیب گنج علی گڑھ میں مولانا عبدالعزیز کی تاریخِ حبیبی دیکھی تھی۔ اس کے بابِ ہفتم میں خواجہ صاحب کے دو اردو رسالوں ہدایت نامہ اور دارالاسرار کے نام دیکھے تھے۔[3] شمس اللہ قادری نے یہ بات کہیں لکھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ کو زبانی ملاقات میں بتائی ہوگی۔

فارسی عشق نامہ اور فارسی تاریخِ حبیبی تقریباً نایاب ہیں لیکن تاریخِ حبیبی کا مطبوعہ اردو ترجمہ عام ملتا ہے۔ اس میں کہیں بھی کسی اردو رسالے کا ذکر نہیں۔ شاید قادری صاحب کو تسامح ہوا ہوگا جس طرح تاریخِ حبیبی کے بارے میں انھیں غلط یاد رہا اسی طرح عشق نامے کے سلسلے میں بھی سہو ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر رفیعہ لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی کی تصانیف میں اس رسالے کا ذکر نہیں ملتا۔[4] ہاشمی کی حد تک یہ صحیح نہیں۔ دکن میں اردو طبعِ سوم ص ۳۶ پر اس کا نام موجود ہے

---

[1] اردو شہ پارے ص ۳۲۰ نیز ڈاکٹر رفیعہ ص ۸۹

[2] اردوئے قدیم ص ۴۱

[3] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۵۴

[4] اُردو نثر کا آغاز اور آثار ص ۹

Marfat.com

اس کے علاوہ مولوی عبدالحق نے معراج العاشقین کے دیباچے میں' پروفیسر سروری نے علی گڑھ تاریخ میں' مبارزالدین رفعت اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے اپنے شکار نامہ کے مقدمے میں اس رسالے کا ذکر کیا۔ شمس اللہ قادری یا عبدالحق یا کسی اور نے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی کیونکہ کسی نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ کسی کتب خانے میں اس کا پتا نہیں چلتا۔ اب ناپید ہے۔ ممکن ہے کبھی وجود ہی میں نہ آیا ہو۔ اگر ہو بھی تو فارسی میں رہا ہوگا اردو میں نہیں۔

۸۔ **دُرالاسرار**: جس طرح معراج العاشقین کی حقیقت دریافت کرنے کا سہرا ڈاکٹر حسینی شاہد کے سر ہے اسی طرح درالاسرار کی پول کھولنے کا اعزاز ڈاکٹر محمد نورالدین سعید کو دیا جائے گا۔ ذیل کی تحریر میں بیشتر مواد انھیں کے مقالے سے ماخوذ ہے۔

جن لوگوں نے اس رسالے کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا اُن میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالحق' اردو کی ابتدائی نشوونما' میں۔ ۲۔ نصیرالدین ہاشمی آصفیہ لائبریری کی فہرستِ مخطوطات جلد دوم میں۔ ۳۔ ڈاکٹر زور تذکرۂ مخطوطات جلد اوّل میں۔ ۴۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ' اردو نثر کا آغاز' میں۔ ۵۔ پروفیسر سروری علی گڑھ تاریخ میں۔

ڈاکٹر زور نے ۱۹۴۳ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد شائع کی۔ اس کے ص ۲۰۱ پر درِ اسرار کے نسخے کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا اور ص ۱۶۱ پر ایک دوسرے نسخے کو 'مریدِ سلطاں' سے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ انھوں نے دونوں جگہ ابتدا کا جو پیراگراف نقل کیا ہے وہ یکساں ہے۔

نصیرالدین ہاشمی نے سالارِ جنگ کے مخطوطات کی فہرست (ص ۱۸۴) میں اسے گولکنڈہ کے شاعر سلطان سے منسوب کیا۔ یہ فہرست ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۱ء میں انھوں نے آصفیہ لائبریری کے مخطوطات کی فہرست شائع کی تو اس کی جلد دوم میں اسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا۔ اس کتاب کے ذیل کے نسخے ملتے ہیں۔

سالارجنگ لائبریری ۴ نسخے۔ آصفیہ لائبریری ۴ نسخے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں ۳ نسخے لیکن ان میں سے ایک کے بارے میں ڈاکٹر نورالدین کا خیال ہے کہ یہ درالاسرار نہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند میں دو نسخے۔ روضتین گلبرگہ میں ایک نسخہ۔ ڈاکٹر نورالدین کے ذاتی کتب خانے میں ایک نسخہ۔ ادارۂ ادبیات کے مشکوک نسخے کو خارج کر دیں تو ۱۴ نسخے بچتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے

Marfat.com

دونوں نسخے اور حیدر آباد کے بعض نسخے راقم الحروف کی نظر سے گزرے۔

معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہمیشہ اس کا نام دار الاسرار لکھتی ہیں جو صحیح نہیں۔ سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ میں اس کا نام دُر الاسرار دے کر واضح کیا کہ بعض نسخوں میں اس کا نام دُر اسرار اور دُرِ اسرار بھی ملتا ہے۔[1] اس کی ابتدا میں یہ عبارت ملتی ہے۔

'اے بھائی! حق کی توفیق سوں ہور اس ہادی شاہ سلطان کی مدد سوں سالکاں ہور طالباں کے واسطے اس بقا کے موتیاں کے گنج میں سوں کتیک موتیاں چن کر لیا یا ہوں ہور راز کے معنی کے تاگے میں پرویا ہوں تب اس رسالے کا نام دُر الاسرار رکھیا ہوں۔'[2]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخے کا نام دُر الاسرار ہے جس میں دُر بمعنی موتی ہے۔ 'دار' کا کوئی مقام نہیں۔ مخطوطے میں نو ابواب نو دُر کے نام سے ہیں۔ بعض مخطوطے ناقص الآخر ہیں۔

کسی نسخے کے متن میں اسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب نہیں کیا گیا۔ صرف تین کے سہرنامہ میں اسے خواجہ صاحب کی تصنیف فرض کیا ہے۔ وہ ہیں ادارۂ ادبیات کا نسخہ ۹۵ء، آصفیہ کا نسخہ ۱۰۵۶ء اور نور الدین کا ذاتی نسخہ۔ کسی نسخے کے ترقیمے میں بھی اسے خواجہ صاحب سے منسوب نہیں کیا۔ آصفیہ لائبریری میں ایک نسخے کا نام 'ترجمۂ دو الاسرار' ہے۔ اس میں متن کے ساتھ ساتھ کسی نعمت اللہ شاہ نے اس کی شرح بھی درج کی ہے۔ یہ بہت اہم نسخہ ہے۔ صرف اس میں ترقیمہ ہے جو اس طرح کا ہے۔

'یو در الاسرار از حضرت سلطان شاہ ثانی صاحب فرماتے ہیں سو اس کا شرح فقیر حقیر نعمت اللہ شاہ اپنی سمجھ کے موافق کیے ہیں، مرشد خواجہ بدر الدین حسینی کے صدقے سوں کیا۔ اگر شرح میں تفاوت آوے تو اپنی پرورش کی نگاہ سوں پرورش کرو'[3]

یعنی مصنّف کا نام حضرت سلطان شاہ ثانی ہے۔ دراصل کسی نے در الاسرار کا متن پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے۔

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۶۸

[2] مخطوطہ ۴۸ سالار جنگ لائبریری بحوالہ ڈاکٹر نور الدین ص ۲۸۷

[3] ڈاکٹر نور الدین کا مقالہ۔ نیز آصفیہ لائبریری کے مخطوطات کی فہرست جلد دوم ص ۲۱۰۔ راقم الحروف نے بھی یہ نسخہ اور ترقیمہ دیکھا۔ ہاشمی نے 'اپنی پرورش' کو 'اپنے پرورشی' پڑھا ہے لیکن مخطوطے میں 'پرورش' ہی ہے

Marfat.com

"اوّل سالک۔ کے پانچ عناصر پچیس گن ہور چہار نفس ہور چہار دل ہور چہار روح ہور چہار ذکر۔"

معراج العاشقین کے سلسلے میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ پانچ عناصر پچیس گن کا تصوّف شاہ امین الدین علی اعلیٰ سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ بندہ نواز کے وقت میں صرف چار عناصر تھے۔

ڈاکٹر نور الدین نے ایک اور شافی دلیل تلاش کر لی۔ انھوں نے آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں رسالہ کشف الاسرار مصنفۂ خواجہ معروف چشتی کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا نمبر شاملات ۱۹ ہے۔ یہ رسالہ در الاسرار کے جواب میں لکھا گیا ہے اور اس میں ہر جگہ طعن و تشنیع سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں اپنا نام یوں لکھتے ہیں۔

"پس فقیر حقیر خواجہ معروف چشتی بعدِ حضرت فردِ حقیقت اکمل الاولیاء خواجہ عارف باللہ چشتی قدس اللہ سرہٗ۔۔۔"

اور آگے لکھتے ہیں

"ہور اس رسالے کا نانوں کشف الاسرار رکھیا ہوں جواب سلطان کے نو در الاسرار کا دیا ہوں تا مریدکوں مراد حاصل ہووے۔"

"صفحے کے اس رسالہ کی ابتدا یوں ہے

"کنت۔۔۔ یعنی او ذاتِ سبحانہ، جلّ شانہٗ اپنی ہستی سوں اپے ایسا محفوظ تھا کہ کسی چیز کی خبر سوں کام نہیں رکھتا تھا، نہ اپنے سے نہ اپنے غیر کے واسطہ کہ خبر کا تعلق صفات سوں"

ڈاکٹر نور الدین نے حضرت شاہ سلطان ثانی کا پتا لگا لیا۔ یہ خواجہ بندہ نواز کے خانوادے میں چودھویں منزل پر آتے ہیں۔ تیرھویں درجے پر حضرت خواجہ سیّد فخر شاہ سلطان حسینی چشتی ہیں۔ شاہ سلطان ثانی کی درگاہ تامل ناڈ کے شہر روڈی گرا پاڈی میں ہے۔ موجودہ سجادہ نشیں سیّد ببر حسینی ہیں۔ ان کے مطابق شاہ سلطان ثانی فخر شاہ سلطان کے بیٹے اور مرید تھے۔ سلطان ثانی کا انتقال ۱۱ رمضان ۱۰۹۷ھ کو ۸۹ سال کی عمر میں ہوا جس کے معنی یہ ہیں کہ "در الاسرار" گیارھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ شاہ سلطان ثانی کے مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر رضیہ صدیقی کا مضمون "شاہ ثانی سلطان کی حیات اور تصانیف" سب رس، حیدر آباد، نومبر ۸۳ء۔

۱۔ **ہشت مسائل**: مولوی عبدالحق نے 'اردو کی ابتدائی نشو و نما' میں لکھا ہے کہ ان کے پاس حضرت بندہ نواز کے کئی رسالے ہیں۔ اس فہرست میں ہشت مسائل کا نام بھی

Marfat.com

ہے۔ مولانا نے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی۔ بعد والوں نے انھیں کے حوالے سے اس کا نام لکھا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے لکھا ہے کہ آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں اس کا ایک مخطوطہ ہے اور وہ شاہ برہان سے منسوب ہے۔ اس رسالے میں کائنات کے آغاز، ذاتِ خدا، معراجِ رسول وغیرہ کا بیان ہے۔ پورا رسالہ سوال جواب کے انداز میں لکھا گیا ہے[1]

اس تفصیل کے بعد یہ ماننا مناسب ہوگا کہ یہ رسالہ خواجہ بندہ نواز کی نہیں شاہ برہان کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے وہ جملہ یا عنوان نہیں لکھا جس کی بناء پر اسے شاہ برہان کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ایک تو مشہور شاہ برہان الدین جانم ہیں۔ حسینی شاہد نے ایک اور برہان الدین رازِ الٰہی کا ذکر کیا ہے جن کا زمانہ ۹۹۸ھ تا ۱۰۸۳ھ تھا۔[2] معلوم نہیں یہ کون سے شاہ برہان کی تصنیف ہے۔ زبان بہت صاف ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

پیغمبر صاحب صلی اللہ وعلیہ وسلّم کوں معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السلام نے سوال کئے سات طبق آسمان اور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید۔

جواب: خدا کہیا اے حبیب من ایں ہمہ جدید آفریدہ شد

سوال: تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا

جواب: تجہ سوں میں تھا"

۱۰ **خلاصۃ التوحید**: اس رسالے کا ذکر سب سے پہلے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے کیا۔ پروفیسر سروری کو بندہ نواز کے سلسلے کے تیسرے خلیفہ شاہ صدرالدین نیز برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ وغیرہ کے ۱۹ رسالوں کا ایک مجموعہ ملا۔ اس میں چھٹے نمبر کا رسالہ خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ کے مطابق اس رسالے کے سرنامہ پر لکھا ہے

ایں رسالہ خلاصۃ التوحید تصنیفِ حضرت خواجہ بندہ نواز (ص ۹۵)

سروری صاحب نے اس مجموعے کی یا صرف اس رسالے کی ایک نقل لے لی تھی اسی کو ڈاکٹر رفیعہ نے دیکھا۔ سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ میں اس کا نام خلاصۂ توحید لکھا ہے۔ حالانکہ عربی کے لحاظ سے خلاصۃ التوحید صحیح ترکیب ہے۔ میسور کی ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کے پاس

---

[1] اردو نثر کا آغاز ص ۱۷۶

[2] شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ ص ۴۲۳

Marfat.com

ایک بیاض ہے۔ اس میں بھی رسالہ خلاصۃ توحید تصنیف خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہے[1]۔ ڈاکٹر حبیب النسا نے اس کا جو اقتباس دیا ہے وہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے اقتباس ہی کا ایک جزو ہے جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی نسخے کا ذکر کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ اور سروری صاحب دونوں کے مطابق رسالے کا موضوع نو بطون، حقیقتِ محمدی اور اسمِ اعظم ہے۔ دونوں نے نو بطون کی یہ تفصیل دی ہے[2]۔

ہستیِ مطلق	ہستیِ مجمل	ہستیِ مفصل
۱۔ امین دیکھ	۱۔ روحِ مقیم	۱۔ روحِ جاری
۲۔ امین شاہد	۲۔ انا نور	۲۔ من نور
۳۔ امین نور	۳۔ ممکن الوجود	۳۔ واجب الوجود

انجمن ترقی اردو ہند میں مجموعہ نمبر ۲۹۷ میں کئی رسالے ہیں۔ پہلا دُر الاسرار ہے۔ اس کے بعد امین دیکھ رسالہ ہے جو ممکن ہے خلاصۃ التوحید ہی ہو۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے نجور کے نور دریا خاندان کے نور دریا شاہ محمد قادری م ۱۰۸۵ھ کے رسالہ نو بطون کا ذکر کیا ہے جو کتب خانۂ رونقین گلبرگہ میں ملا۔ اس کے سرنامے پر رسالہ نو بطون شاہ محمد قادری درج ہے[3]۔

شاہ محمد قادری کے بعد اسی قسم کا رسالہ نو بطون شاہ میر رائچوٹی سے منسوب ملتا ہے[4]۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک جلد میں چار چھوٹے چھوٹے مخطوطات مجلد ہیں۔ سروری صاحب نے فہرستِ مخطوطاتِ اردو جامعہ عثمانیہ مرتبہ کی تو چاروں کو، اوراق کا ایک رسالہ سمجھ لیا۔ اس کے پہلے رسالے کی لوح پر لکھا ہے۔

رسالۂ قادریہ حضرت داد امرشد سید محمد شاہ میر قدس سرہٗ...

سروری صاحب نے چاروں کو ایک سمجھا لیکن قدرے شبہہ کے ساتھ لکھا کہ چونکہ صوفیا کے ارشادات ان کے مریدین جمع کرتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ یہ شاہ میر کے کسی مرید نے مرتب کیا ہو۔ شاہ میر کا انتقال ۱۱۸۷ھ میں ہوا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے مخطوطے کو دیکھ کر سروری صاحب کی

---

[1] ڈاکٹر حبیب النسا بیگم: ریاست میسور میں اردو کی نشوونما (بنگلور ۱۹۷۲ء) ص ۲۲-۲۳

[2] اردو نثر کا آغاز ص ۹۵۔ علی گڑھ تاریخ ص ۱۴۲

[3] اردو نثر کا آغاز ص ۲۲۳ [4] ایضاً ص ۲۲۳-۲۲۴

Marfat.com

غلطی کی نشاندہی کی کہ اس مجلد کے پہلے ڈھائی صفحوں پر رسالۂ قادریہ ہے۔ اس کے آگے دوسری تحریریں ہیں۔[1]

سخاوت مرزا نے رسالہ نوائے ادب اپریل ۱۹۵۳ء میں ایک مضمون لکھا[2]

'سید محمد حسینی الملقب بہ شاہ میر رائچوٹی'

اس میں ان کے دو رسالوں کا ذکر کیا۔ پہلا رسالہ عثمانیہ یونیورسٹی کا مندرجہ بالا رسالہ ہی ہے۔ انھوں نے بھی سروری صاحب کی تقلید میں اسے ۱۷ ورق اور ۳۴ صفحات پر مشتمل بتایا۔ اس کی زبان بہت صاف ہے اور متروکات سے بالکل پاک ہے۔ حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ اس کا کاغذ و کتابت چالیس پچاس سال سے زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں

"زیرِ نظر نسخہ جس کو کاتب نے رسالۂ قادریہ کا نام دیا ہے دراصل گنج مخفی ہی کا ایک جدید نسخہ ہے جس کو غلط فہمی کی وجہ سے شاہ میر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔"[3]

گنجِ مخفی شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا نہایت مختصر رسالہ ہے۔ رسالۂ قادریہ کی ابتدا میں نو بطون کی تفصیل اسی طرز کے نقشے میں لفظ بہ لفظ وہی ہے جو بندہ نواز کے مبینہ رسالے خلاصۃ التوحید میں ہے۔

سخاوت مرزا نے اپنے مضمون میں کتب خانۂ آصفیہ میں مخزونہ شاہ میر سے منسوب ایک اور رسالے نو بطونِ چشتیہ کا ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ سیّد عبداللہ کے فارسی رسالے نو بطون چشتیہ کا ترجمہ ہے۔ وہ اردو رسالے نو بطونِ چشتیہ کو شاہ میر کی تصنیف مانتے ہیں لیکن رسالہ قادریہ کو شاہ میر سے منسوب کرتے ہوئے وہ بھی اظہارِ شک کرتے ہیں۔ اس سے حسینی شاہد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سخاوت مرزا نے اس نسخے کو خود نہیں دیکھا بلکہ سروری صاحب کے بیان ہی پر اکتفا کی ہے۔

حامد اللہ ندوی نے جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست میں ایک اور رسالہ نو بطون کا ذکر کیا جس کے مصنّف کا نام معلوم نہیں۔ وہ قیاس کرتے ہیں کہ ممکن ہے یہ وہی نُہ بطونِ چشتیہ ہو جس کا سخاوت مرزا نے ذکر کیا ہے۔[4]

---

[1] شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۳۴۴

[2] بحوالہ ایضاً ص ۳۴۲

[3] امین الدین علی اعلیٰ ص ۳۴۶

[4] بحوالہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۳۴۷

Marfat.com

حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ دراصل رسالۂ قادریہ اور رسالۂ بطونِ چشتیہ ایک ہی ہیں[1]۔ آخر الذکر کے لئے وہ کہتے ہیں کہ اس کی دکھنی عبارتیں شاہ امین کے گنجِ مخفی سے ملتی ہیں[2]۔

گنجِ مخفی شاہ امین کی تصنیف ہے اس میں کوئی شبہہ نہیں۔ خلاصۃ التوحید، رسالۂ قادریہ اور رسالۂ بطونِ چشتیہ میں الفاظ کے فرق ہے جن نو بطون اور ہستیِ مطلق کی تین شکلوں امین دیکھا امین شاہد اور امین نور کا ذکر ہے وہ شاہد امین کے فلسفے کا جزو ہیں۔ یہ اصطلاحیں پہلی بار انھوں نے استعمال کی ہیں اور بار بار کی ہیں۔ جانم کے یہاں یہ اصطلاحیں نہیں ملتیں۔ پیچھے دیئے ہوئے نقشے میں پہلے کالم 'ہستیِ مطلق' کی "امین دیکھ" 'امین شاہد' اور 'امین نور' کا تعلق خدا کی ذات سے ہے۔ دوسرے کالم ہستیِ مجمل اور اس کی تینوں ذیلی اصطلاحوں کا تعلق حضرت محمد سے ہے اور ہستیِ مفصل اور اس کی تین شقوں کا تعلق ذاتِ انساں سے ہے۔

حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ حضرت امین نے اس فلسفے کو ان اصطلاحوں کے ساتھ بار بار لکھا۔ ان کے سلسلے کے خلفا نے ان تعلیمات کو بار بار نثر کی طرح دہرایا چنانچہ "گفتار شاہ امین، گنجِ مخفی اور رسالۂ وجودیہ (نثر) کے مضامین سے دکھنی نظم و نثر کے رسائل پٹے پڑے ہیں"۔ شاہ امین کے سلسلے کے بزرگ انھیں کے مضامین، مسائل اور اصطلاحیں استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے مواد اور اسلوبِ اظہار دونوں میں مماثلت ہو گئی اور قطعیت کے ساتھ کسی رسالے کے مصنف کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے[3]۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے موضوع کے پیشِ نظر خلاصۃ التوحید کسی طرح بندہ نواز کا رسالہ نہیں۔ یہ امین الدین علی اعلیٰ کے رسالہ گنجِ مخفی سے ماخوذ ہے اور اسے حضرت امین کے کسی مرید نے لکھا ہوگا۔

11. **ہفت اسرار**: سب سے پہلے شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں اس کا ذکر کیا۔ لکھتے ہیں

"خواجہ صاحب نے دکنی زبان میں سات مقولے ارشاد فرمائے تھے۔ آپ کے ایک مرید نے ان کی ایک مبسوط شرح لکھی اور اس کا نام ہفت اسرار رکھا"[4]

اگر اس میں خواجہ صاحب کے محض سات جملے تھے اور بقیہ تمام مبسوط مواد ان کے کسی مرید

---

[1] ایضاً ص ۳۴۲
[2] ایضاً ص ۳۴۷
[3] ایضاً ص ۳۴۸
[4] اردوئے قدیم ص ۴۱

Marfat.com

کا تھا تو اسے ان کے مرید کی تصنیف قرار دیا جائے گا خواجہ صاحب کی نہیں۔ دیوان غالب کی شرح از نظم طباطبائی سید علی حیدر نظم کی تصنیف ہے اور تفسیر غالب ہیچ مدان راقم الحروف کی، غالب کی نہیں۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو خواجہ کی نہیں مرید کی تصنیف قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مشہور ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز کے کسی مرید نے آپ کے ساتھ (کذا) اقوال کی ایک طویل تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ یہ ہفت اسرار کے نام سے موسوم ہے اور غالباً اس وقت بالکل ناپید ہے"[1]

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے شمس اللہ قادری اور ڈاکٹر زور کے بیانات سے یہ نتیجہ نکالا کہ شرح فارسی میں لکھی گئی تھی[2] لیکن ان دونوں حضرات نے یہ کہیں نہیں لکھا۔ سروری صاحب نے بھی علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں اس کتاب کا چند سطروں میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بھی مقدمۂ شکار نامہ میں اس کا مختصراً ذکر کیا۔

شمس اللہ قادری نے اپنا ماخذ نہیں بتایا کہ انھیں ہفت اسرار کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا۔ فی الوقت یہ کتاب ناپید ہے، اگر ہوتی بھی تو یہ خواجہ بندہ نواز کے مرید کی تصنیف مانی جاتی۔ ان وجوہ سے اسے خواجہ صاحب کی تصانیف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔

۱۲۔ **تمثیل نامہ**: مولوی عبدالحق نے جب خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کا ذکر کیا تو اس کا نام بھی لیا لیکن شک کے ساتھ[3]۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو بیجاپور میں امین الدین علی اعلیٰ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ ملا جس کے ساتھ خواجہ بندہ نواز کے دو فارسی رسالے مفاتیح القلوب اور تلاوت الوجود (؟) مجلّد تھے[4]۔ ڈاکٹر رفیعہ نے اس کا اقتباس دیا ہے۔ سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ میں اس کا ذکر ڈاکٹر رفیعہ کے حوالے سے کیا ہے۔ وہی اقتباس دیا ہے لیکن اس کے بعد یہ اضافہ کرتے ہیں۔

"یہ رسالہ ارشاد نامہ اور ذکر نامہ دو اور ناموں سے ذکر ہوا ہے۔ یہ رسالہ بیس عنوان میں منقسم ہے جو پہلے نسخے میں 'بات' اور دوسرے نسخے میں 'سخن' کے نام سے یاد کیا گیا ہے مگر نہ ترقیمے سے اور نہ کسی اور عبارت سے مصنّف کا پتا چلتا ہے البتہ

---

[1] اردو شہ پارے ص ۲۰ [2] اردو نثر کا آغاز ص ۵۵
[3] اردو کی ابتدائی نشو و نما ص ۲۱ [4] اردو نثر کا آغاز ص ۹۷

Marfat.com

انجمن کے فہرست نگار نے اس کو خواجہ بندہ نواز کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ایک نسخہ گلبرگہ کا لکھا ہوا ہے جہاں خواجہ بندہ نواز کا مزار ہے۔

یہ قیاس کافی ضعیف ہے"[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ سروری صاحب نے کتب خانۂ انجمن ترقی اردو میں دو نسخے دیکھے ہیں۔ وہ جو لکھتے ہیں کہ اس رسالے کو 'ارشاد نامہ' اور 'ذکر نامہ' کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے[2] اس سے مجھے خلش ہوتی ہے۔ انجمن ترقیِ اردو میں 'وجود نامہ' نام کا ایک نسخہ ہے جس کے تین نام ذکر نامہ' وجود نامہ' وصل نامہ ہیں اور جو گلبرگہ میں لکھا گیا۔

اس نسخے کی حقیقت ڈاکٹر حسینی شاہد نے دریافت کی[3]۔ وہ لکھتے ہیں کہ کتب خانۂ درگاہِ شریف میں فارسی اور دکھنی رسائل کا ایک مجموعہ ہے جس میں آٹھواں رسالہ دکھنی میں ہے اور ناقص الاوّل و ناقص الاوسط ہے۔ اس کی ابتدا کی عبارت کو انھوں نے ڈاکٹر رفیعہ کے اقتباس سے ملا کے توثیق کر لی کہ وہ اسی نسخے کا ذکر کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کے مطابق اس نسخے میں کہیں بھی اس کا نام تمثیل نامہ درج نہیں نہ اس میں کہیں مصنّف کا نام درج ہے۔ معلوم نہیں کس طرح ڈاکٹر رفیعہ نے اس کا نام تمثیل نامہ اور اسے خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دے دیا۔

حسینی شاہد نے اس رسالے کے بندہ نواز سے انتساب کے خلاف ایک اہم ثبوت یہ دیا کہ اس میں شاہ داول کی نظم کشف الاسرار کے اشعار بھی ہیں[4]۔ داول شاہ برہان الدین جانم کے مرید تھے۔ اس طرح یہ رسالہ جانم کے بعد کا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ یہ امین الدین علی اعلیٰ کے رسالہ وجودیہ کا ناقص الاوّل اور ناقص الاوسط نسخہ ہے جس کے کاتب نے آخری حصے کی بعض عبارتوں کو حذف کر کے مختصر کر دیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ نیز سروری صاحب کے اقتباس میں مستیوں اور حُب کا ذکر ہے جو حضرت امین سے پہلے کسی نے نہیں کیا[5]۔ حُبّوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حسینی شاہد کا مقالہ ص ۱۹۳-۱۹۴

پروفیسر سروری نے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں خواجہ صاحب سے منسوب کچھ

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۲ [2] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۲

[3] ڈاکٹر حسینی شاہد: سیّد شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۲۶۲ تا ۲۶۶

[4]،[5] ایضاً ص ۲۶۶

Marfat.com

مخطوطات دیکھے۔ وہ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو سے ان کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کو راقم الحروف نے بھی انجمن کے کتب خانے میں دیکھا۔

۱۳۔ **وجود نامہ**: انجمن میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ سروری صاحب نے انکی کوئی تفصیل نہیں دی[1]۔ میں نے اس کا نسخہ نمبر ۲۳۳ دیکھا جو گلبرگہ میں یکم رجب بروز جمعہ کو تسوید کیا گیا۔ سنہ ندارد ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہے۔

"مرید اے ارشاد یاد الجنا عارف ہوا کہ پچھانے گا اس کتاب کا ملنا وکیتے باتاں ہیں۔ کتاب کے تین نام ہیں اوّل نام ذکر نامہ، دوسرا وجود نامہ، تیسرا نام وصل نامہ حدیثِ نبوی من عرف نفسہ۔"

رسالے کی زبان خاصی صاف ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے رسالہ وجودیہ نثر کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو ہند کے مخطوطہ نمبر ۷۵ کا ذکر کیا[2]۔ وہاں کتاب کا نام وجودی نامہ اور اس کے مصنّف کا نام شاہ برہان الحق والدین، لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ زیرِ بحث وجود نامے کا ذکر ہے یا آگے آنے والے رسالہ وجودیہ کا یا ان دونوں سے مختلف کسی اور رسالے کا۔

۱۴۔ **رسالۂ وجودیہ**: انجمن کے نسخے کے سرنامہ پر کاتب نے اسے خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیا ہے لیکن انجمن کے فہرست نگار کی رائے میں یہ شاہ میراں جی کا رسالہ ہے۔ یہ میراں جی، بقولِ پروفیسر سروری، برہان الدین جانم کے مرید تھے اور اس سے پہلے عبداللہ قطب شاہ کے عہدہ دار تھے[3]۔ غالباً سروری صاحب کا اشارہ میراں جی خدانما کی طرف ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے یہاں سواروں کے جمعدار تھے اور بیجاپور جاکر شاہ امین کے (جانم کے نہیں) خلیفہ ہوگئے۔ میراں جی صوفیا میں مقبول لقب ہے۔ کیونکر کہا جائے کہ میراں جی سے مراد میراں جی شمس العشاق ہیں یا میراں جی خدانما یا میراں یعقوب؟

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کی فہرست میں رسالہ وجودیہ کا نام نہیں لکھا لیکن ان کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۲

[2] امین الدین علی اعلیٰ ص ۳۶۳

[3] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۲۔

Marfat.com

'رسالۂ وجودیہ میں ایمان اور عقائد سے بحث کی گئی ہے'[1]

رسالے کی زبان جدید ہے سروری صاحب نے یہ نمونہ دیا ہے۔

'یعنی تقدیر میں رہا تو پہاڑ کے بیچ سے ظاہر سامنے آتا ہے اور تقدیر میں نہیں رہا تو دونوں اوٹاں میں سے نکل جاتا ہے۔'

یہ خواہ کسی یراں جی کی تصنیف ہو یا کسی اور کی' اس کی زبان کے پیشِ نظر یہ یقینی ہے کہ بندہ نواز کی نہیں۔

۱۵۔ **مجموعہ رسائل تصوف:** انجمن ترقی اردو ہند میں ایک مجموعۂ رسائل (تصوف ۱۴) ہے۔ سروری صاحب نے اس کی تفصیل دی ہے[2]۔ راقم الحروف کی نظر سے بھی گزرا۔ اس میں چار چیزیں ہیں۔ انجمن کے فہرست نگار نے ان سب کو خواجہ بندہ نواز سے منسوب کیا ہے۔

پہلا رسالہ ایک صفحے کا ہے جس میں مرید کرنے کا طریقہ درج ہے۔ اس میں یہ جملہ موجود ہے۔

"چشتی ہے تو حضرت شاہ بندہ نواز حسینی چشتی سے حضرت لگ پڑھنا' قادریہ ہے تو حضرت محبوبِ سبحانی سے حضرت لگ پڑھنا صحیح ہے۔"

اس جملے سے واضح ہو گیا کہ یہ بندہ نواز سے بعد کی تحریر ہے۔

دوسرے حصے کی ابتدا یوں ہے۔

حدیثِ قدسی۔ انزل القرآن علی سبعۃ الحرف۔ ایسا لکھ کہ اس کا معنی خدا کہا۔

اس میں ۱۲ صفحے ہیں۔ سروری صاحب کی رائے میں اس کے سارے مطالب تلاوۃ الوجود کے ہیں۔ کوئی قرینہ نہیں کہ اس رسالے کو بندہ نواز سے منسوب کیا جائے۔

تیسرا حصہ ایک مثنوی ہے جس کے ساتھ لکھا ہے۔

'یہ ہے بندہ نواز حسینی گیسو دراز سے فقط'

اس مثنوی میں یہ شعر بھی ہے

پانچ عناصرِ پچیس گن　　گن کا اب تو تفسیر سن

چونکہ یہ موضوع شاہ امین سے مخصوص ہے اس لئے یہ مثنوی ان سے پہلے کی نہیں ہو سکتی۔

---

[1] اردو نثر کا آغاز ص ۱۱۰

[2] ملی گولکنڈہ تاریخ ص ۱۷۴-۱۷۳

Marfat.com

چوتھے رسالے کے بارے میں سروری صاحب کا قیاس ہے کہ یہ دوسرے رسالے ہی کا تسلسل ہے، رسالے کے اوراق الگ ہو گئے ہوں گے اور کاتب نے ان کی الگ الگ نقل کر دی۔ لیکن راقم الحروف نے دیکھا کہ اس نسخے کی ابتدا میں 'گنج مخفی' لکھا ہے جو شاہ امین کا رسالہ ہے۔ نسخے کی ابتدا ان الفاظ سے ہے۔

'اس رسالہ میں ہے اس کا عناصر کا بیان ہے کہ میں تجھ خدائی کہوں تو جدائی تیرا'

اور درمیان میں کہتے ہیں۔

'یو امر بہت مشکل ہے۔ پیر سے جانا ہے۔ وہ حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز حسینی سے ہے'

مندرجہ بالا جملے سے ظاہر ہے کہ یہ نثر حضرت بندہ نواز کی نہیں۔ ان نثری رسالوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی رسالے کے سرنامہ پر کاتب کا کسی کو مصنف قرار دینا شاید ہی کوئی معنی رکھتا ہو۔ کاتب آنکھ موند کر الل ٹپ کسی بزرگ کو کسی دوسرے بزرگ کی تخلیق کا مصنف لکھ مارتے ہیں۔ جب تک متن میں مصنف کی صراحت نہ ہو سرنامہ کا انتساب محض قیاس و گمان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

۱۶۔ **مشاہدۃ الاکبر** : اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو ہند میں ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے مطابق اس کے آخر میں مصنف کا نام 'بندہ نواز حسینی' درج ہے۔ خاتمے سے ایک ورق پہلے بھی ایک شعر کے بعد لفظ حسینی آیا ہے۔ راقم الحروف نے آصفیہ لائبریری میں اس کا مخطوطہ دیکھا۔ اس کے آخر میں لکھا ہے

'محبت پر محبت دھرنا سو بندہ نواز حسینی'۔

کیا خواجہ بندہ نواز خود کو 'بندہ نواز' کہہ سکتے تھے! سروری صاحب لکھتے ہیں۔

'اس رسالے کی نسبت خواجہ صاحب کی طرف کی جا سکتی ہے مگر قرینہ بہت ضعیف ہے'[1]

ڈاکٹر ثمینہ شوکت اس کے بارے میں لکھتی ہیں

"ان میں سے مشاہدۃ الاکبر کے بارے میں میرا قیاس یہ ہے کہ یہ حضرت کے فرزند سید اکبر حسینی کی تصنیف ہے"[2]

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۴ [2] مقدمۂ شکار نامہ ص ۵۹

Marfat.com

انھوں نے بنائے قیاس درج نہیں کی۔ شاید اس کے نام میں 'اکبر' کا لفظ دیکھ کر انہیں یہ خیال ہوا ہوگا لیکن کسی کتاب میں اکبر حسینی کے ساتھ اس رسالے کا انتساب نہیں ملتا۔

چونکہ اس میں مصنف کا نام 'بندہ نواز' لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی تصنیف ہے۔

۱۷۔ انجمن میں ایک اور مجموعہ ہے جس میں تین رسالے ہیں

۱۔ رسالۂ تصوّف ع۲۴ ۔ یہ تفسیرِ کشّاف کے عربی جملوں پر مشتمل ایک ورق ہے۔

۲۔ مرآۃ المعرفت (۱۰۵) اس کی زبان خاصی قدیم ہے

۳۔ اعتقاد الحق

سروری صاحب لکھتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے کسی کو خواجہ صاحب سے منسوب کیا جائے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے خواجہ کے رسالوں کی فہرست میں ایک رسالہ 'وصیت الہادی' کا بھی نام لیا ہے[1] لیکن رسالوں کی تفصیل لکھتے وقت اسے بھول گئی ہیں اور اس کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ وصیت الہادی شاہ برہان الدین جانم کی ایک نظم کا نام ہے۔

ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کے پاس بھی کچھ رسالے خواجہ بندہ نواز کے نام سے موسوم ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بیاض میں کئی رسالے ان کے نام سے ہیں۔ لکھتی ہیں۔

"چونکہ ان رسالوں کے آخر میں ان کے نام یا مصنّف کے نام مندرج نہیں ہیں لہٰذا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے"[2]

رسالوں کے مندرجہ بالا جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ ان کے قریب العصر کسی مصنّف نے ان سے کسی اردو کتاب کا انتساب نہیں کیا۔ کاتبوں کا انتساب بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ صرف بیسویں صدی کے اردو محققین یا تذکراتِ صوفیا میں ان سے اردو کتابیں منسوب کی گئی ہیں اس سے پیشتر نہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ اور پروفیسر سروری نے خواجہ بندہ نواز کے رسالوں کے اسلوبِ بیان اور زبان پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے لیکن جب کوئی رسالہ ان کا ہے ہی نہیں تو ان کی نثر نگاری پر بحث غیر ضروری ہے۔

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۷۵ [2] اردو نثر کا آغاز ص ۹۰

[3] ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما ص ۲۲۔۲۲

Marfat.com

یہ خواجہ بندہ نواز کے بیٹے تھے۔ ان کا نام سیّد حسین اور،

سیّد اکبر حسینی م ۸۱۲ھ: عرف سیّد اکبر تھا۔ خواجہ صاحب انھیں 'میاں بڑھ' کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ خواجہ صاحب کے ساتھ گلبرگہ آئے۔ ۸۱۱ھ میں خواجہ صاحب نے انھیں اپنا خلیفہ و جانشین بنایا۔ اگلے ہی سال خواجہ صاحب کی زندگی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب ان کا عرس اس طرح مناتے تھے جیسے اپنے پیر کا عُرس ہو۔ وہ ان کے تقدّس اور عظمت کے اس قدر قائل تھے کہ کہا کرتے تھے کہ 'اگر یہ میرے فرزند نہ ہوتے تو میں ان کی خدمت بجالاتا۔ کوئی مرید پیر سے نہیں بڑھا سوائے دو شخصوں کے: ایک خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جو حضرت معین الدین چشتی سے بڑھے دوسرے محمد اکبر حسینی مجھ سے'[1]

اکبر حسینی نے خواجہ صاحب کے دو سال کے ملفوظات کو جوامع الکلِم کے نام سے فارسی میں مدوّن کیا۔ ان کا اردو ترجمہ اقبال الدین احمد نے کیا۔

محمد عمر یافعی نے تین صفحات پر مشتمل ایک رسالہ دریافت کیا جس میں ۱۵ سطریں نثر کی اور بقیہ کے دو صفحوں پر ۴۸ اشعار تھے۔ انھوں نے اسے مجلّہ مکتبہ جلد ۱، شمارہ ۱ بابت اپریل ۱۹۲۸ء حیدر آباد میں شائع کر دیا۔ اس کے ایڈیٹر سروری صاحب تھے۔ عمر یافعی صاحب نے مضمون کا عنوان یہ دیا۔

آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر اردو کا ایک نمونہ

اس کے سرنامہ پر یہ الفاظ ہیں

'ہذا رسالہ بندہ نواز گیسو دراز

خاتمے پر لکھا ہے 'مِن تصنیفِ سیّد محمد اکبر حسینی بندہ نواز'

ظاہر ہے کہ بندہ نواز کا نام اکبر حسینی نہیں تھا اور اکبر حسینی کا لقب بندہ نواز نہیں تھا۔ رسالے میں بسنہ کتابت یا سنہ تصنیف درج نہیں۔ عمر یافعی صاحب بھی اس کے انتساب میں مذبذب ہیں۔ لکھتے ہیں۔

> "اس رسالے کو حضرت بندہ نواز گیسو دراز یا سیّد محمد اکبر حسینی کا فرض کر کے 'آٹھویں صدی ہجری کی نظم و نثر کا ایک نمونہ' عنوان رکھا گیا تھا لیکن آٹھویں یا نویں صدی ہجری کی نظم و نثر کے جو نمونے سمجھے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی

---

[1] بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ششم ص ۲۵۹ نیز علی گڑھ تاریخ ص ۱۸۱

Marfat.com

زبان ذرا صاف معلوم ہوتی ہے"[1]

اس کے بعد یافعی صاحب نے شمس العشاق کے خوش نامہ اور میراں یعقوب کی شرح مرغوب القلوب کے نمونے دیئے جو واضح طور پر فرسودہ تر تھے۔ اس رسالے کی زبان یہ ہے۔

سنو اے مسلماں، طالب خدا کے بوجھو، زندگی سہل ہے، جیونے کا بھروسہ نہیں موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلو بالصلواۃ قبل الفوت و عجلو بالقوبۃ قبل الموت یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں آگے، ہور شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے یعنی مرید ہو کر توبہ کرنا ہوا کفر و ذلالت سوں اپس کو پاک کرنا"[2] (ضلالت)

یہ صاف زبان کہاں سے آٹھویں صدی ہجری کی ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر حسینی شاہد نے بجا کہا ہے کہ دکنی رسالوں کے سرنامہ یا ترقیمہ میں کسی نام کا ہونا رسالے کو اس مصنّف سے منسوب کرنے کا قطعی ثبوت نہیں ہو سکتا[3] چنانچہ ایسی متعدد مثالیں ہیں کہ ایک ہی رسالے کے مختلف نسخے مختلف حضرات کے نام سے ملتے ہیں۔ کاتب ناموں میں جزوی مماثلت کے سبب ایک مصنّف کو دوسرا سمجھ لیتے تھے۔ اس کی مضحکہ خیز مثالیں یہ ہیں کہ بعض دکنی رسائل محی الدین ابن عربی، غوث اعظم یا عثمان ہارونی کے نام سے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"اہلِ دکن نے دکنی ادب کی تلاش و جستجو کے جوش میں بلا تحقیق تین صفحوں کے اس مختصر رسالے کو نویں صدی ہجری کے دکنی ادب کے دامن میں ٹانک کر یقیناً تحقیقی ستم ظریفی کا ثبوت دیا ہے"[4]

واقعی ایسے مشکوک سرنامہ اور ترقیمہ والی صاف زبان کی ۱۵ سطروں کو اکبر حسینی سے منسوب کرنا تحقیقی خوش فہمی یا غلط فہمی کی بہترین مثال ہے۔

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر حسینی شاہد، کلمتہ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند نقش نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء۔ مجلّہ میں یہ مضمون میں نے بھی دیکھا ہے۔

[2] بحوالہ علی گڑھ تاریخ ص ۱۸۲

[3] کلمتہ الحقائق اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب جولائی ۷۰ء ص ۱۷

[4] تصحیح کدم راؤ پدم راؤ، ص ۳۳

Marfat.com

سیّد عبداللہ حسینی:

چونکہ انھیں خواجہ بندہ نواز کا نبیرہ کہا گیا ہے اس لئے بعض نے انھیں ان کا پوتا اور بعض نے نواسا قرار دیا لیکن خواجہ بندہ نواز سے متعلق سیرِ محمدی میں ان کا جو شجرہ دیا ہے اس میں انھیں خواجہ صاحب کی نواسی کا شوہر ظاہر کیا[1] ہے اور یہی صحیح ہے۔ خواجہ صاحب کے ایک نبیرہ کا نام ید اللہ حسینی تھا۔ شاید کسی کو انھیں کے نام سے التباس ہوا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے عبداللہ حسینی کا عرصۂ حیات ۸۳۸ھ تا ۸۵۲ھ درج کیا ہے[2] جو صحیحاً سہو کتابت ہے کیونکہ ان کی عمر محض ۱۴ سال نہیں ہو سکتی۔

اسٹیوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی جو فہرست بنائی اس میں لکھا ہے کہ عبداللہ حسینی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالہ نشاط العشق کا دکن میں ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی۔ اس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا۔[3]

اب یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ اس کا کوئی نسخہ ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں نہیں ملتا۔ چونکہ یہ کتاب ناپید ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ عبداللہ حسینی سے اس کا انتساب کہاں تک صحیح تھا۔

رسالۂ شاہ قلندر:

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے[4]۔ سالار جنگ لائبریری میں چہار دہ رسائل کا ایک مجموعہ ہے جس میں رسالہ شاہ قلندر بھی شامل ہے۔ اس کے آخری حصّے کی عبارت یہ ہے جس میں مصنّف اور اس کے پیر کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"عشق حالت سب مغلوب۔ طلب طالب وہیں مطلوب۔ عشق نور ہور ظہورِ عشق نظر میں پایا موتی، شاہ ید اللہ دستا جوتی دیکھا جوت دستاروں میں کیا تھا۔ دستا کون تب قلندر دل کے اندر ظاہر ہے۔ شاہ حامی ہے بخت اونچے نامی ہے۔

عرض میرا ہوا تمام۔ فرض تھا میرا کام۔ یقین رہبر یقین جان۔ یقین ثابت وہی ایمان ہے۔ عاشق درود بولیا یک ایمان پر رسولِ خدا۔"[5]

---

[1] اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۱۱۵ [2] ایضاً

[3] ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی فہرست ص ۱۸۴ بحوالہ شمس اللہ قادری: اردوئے قدیم ص ۴۲۔ [4] اردو نثر کا آغاز ص ۱۱۹۔

[5] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۱۲۰۔

Marfat.com

عجب زٹّل قافیہ ہے. مصنّف کا نام 'قلندر دل کے اندر ظاہر ہے' کے فقرے سے ماخوذ ہے مگر یہ سو فیصدی یقینی نہیں کہ 'قلندر' کا لفظ مصنّف کے لئے ہی آیا ہے. یہ بھی کیا یقین ہے کہ شاہ یداللہ مصنّف نہیں بلکہ مصنّف کے پیر ہیں.

شاہ یداللہ حسینی خواجہ بندہ نواز کے پوتے تھے. ان کی تاریخِ وفات ۸۵۲ھ ہے جو ڈاکٹر رفیعہ کے بقول 'شہنشادِ یقینی' سے برآمد ہوتی ہے حالانکہ فقرے سے دراصل ۸۴۱ھ ہی نکلتا ہے.

رسالے کی زبان بے لطف طور پر مسجّع ہے لیکن اس سے یہ تو فائدہ ہوا کہ محض مذہبیت کی طرف سے ادبیت کی طرف کو سفر کا پتا چلتا ہے. زبان میں متروک اور فرسودہ الفاظ بہت کم ہیں جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ واقعی نویں صدی ہجری کا ہے بھی! یہ قابل ذکر ہے کہ سروری صاحب نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب ان کے ماخذ میں تھی.

اردو کی پہلی مستند نثری کتاب

خیر البیان مصنّفہ پیرِ روشاں بایزید انصاری م. ۹۸۰ھ

بایزید انصاری صوبۂ سرحد میں کسی مذہبی تحریک کے بانی تھے. ان کا انتقال ۹۸۰ھ میں ہوا. ان کی سب سے اہم تصنیف خیر البیان ہے جسے حافظ محمد عبد القدّوس قاسمی نے مرتب کر کے ۱۹۶۷ء میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی سے شائع کیا. اس کے بارے میں جملہ معلومات ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو جلد اوّل سے پیش کی جاتی ہیں[1].

پیرِ روشاں نے اس کتاب میں ایک مضمون کو چار زبانوں میں لکھا ہے پہلے عربی میں، پھر فارسی میں، پھر پشتو میں اور آخر میں اردو میں. اگر ترکی کو بھی شامل کر لیتے تو دنیائے اسلام کی بیشتر اقوام تک اپنا پیغام پہنچا سکتے تھے. اردو میں لکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں برِّ صغیر کے ایک دور افتادہ کونے میں بھی اردو کو کتنا اہم سمجھا گیا. جمیل جالبی کے یہاں سے اس کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں. تو سین میں بعض الفاظ کا جدید تلفّظ درج کیا جاتا ہے.

آے بایزید لکھ وہ اکھر جسے سب حبیب سہن جڑ تھیں اس کارن جے نفع پاویں آدمیاں

---

[1] جالبی: تاریخ جلد اوّل ص ۵۸۔۵۷ نیز ص ۴۰۷۔۴۰۳

Marfat.com

کیج کا۔ میں ناہیں جانتا بن قرآن کے اکھر اے سبحان۔ اے بایزید لکھنا اکھر کا تجھے ہے'
دکھلاونا اور سکھلاونا مجھے ہے۔ لکھ میرے فرمان سمھن' جیوں اکھر قرآن کے بھین کے بھین'
لکھ اکھر اور پرتکتا کے جزم اور نشان' جیو اکھر پچھانن آدمیاں لکھ' کوئی اکھر چار چار عیاں
در حال لکھنے (لکھتے) پڑھن آدمیاں"[1]

دوسرا اقتباس

'لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر سہن بسم اللہ' تمام۔ میں نہ گنوانوں گا
مزدوری اِنمن کی جے لکھیں پرن بگارن اکھر کہ تمکنی پرن لکھیں اسی کارن جے سہی
(پڑھن بگاڑن) (تم کئے پڑھن)
ہوئے بیاں۔۔۔ قرآن میں ہے (گاعیاں)۔"[2]

اس زبان میں برج بھاشا کی جھلک نظر آرہی ہے۔ جو کی جگہ جے (جیسے) دکھلاونا' سکھلاونا میں
'ونا' شمول اکثر کو اکھر۔ مصدر کو پڑھن' پچھانن' بگاڑن لکھنا پنجابی اور برج دونوں میں پایا جاتا ہے۔
شمالی ہند کی سولھویں صدی کی یہ زبان معاصر دکنی کے مقابلے میں زیادہ قریب الفہم ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشّاق :

اردو ادب کی تاریخ میں خواجہ بندہ نواز کے بعد شاہ میراں جی شمس العشّاق سب سے بڑے صوفی و درویش ہیں۔ ان کی تصانیفِ شعری تو اہم ہیں ہی' اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ ان کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ دکنی کے اتنے بڑے قلم کار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ شمس العشّاق جیسی درخشندہ ہستی کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں۔ ان کے نسب' تاریخِ ولادت و تاریخِ وفات سب پر اختلافِ رائے ہے۔ دراصل متضاد قدیمی بیانات کی وجہ سے یہ مسائل ایسے لاینحل ہوگئے ہیں کہ قیاس کا سہارا لئے بغیر چارا نہیں۔ کوئی دلیل ایسی مسکت نہیں جسے قولِ فصیل کہا جاسکے۔ مسائل یہ ہیں۔

۱۔ ان کے والد سیّد تھے یا مغل؟
۲۔ وہ مکّے میں پیدا ہوئے یا بیجاپور یا احمد آباد یا احمد نگر یا دلّی میں؟

---

[1] خیر البیان ص ۳ بحوالہ جالبی ص ۵۸
[2] جمیل جالبی تاریخ جلد اوّل ص ۳۷۔

Marfat.com

۳۔ ان کا سنہ ولادت کیا ہے؟

۴۔ وہ بیجاپور کب آئے؟

۵ ان کا سنہ وفات کیا ہے؟

ان مسائل پر بحث کرنے والوں میں ذیل کے اصحاب ممتاز ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالحق : رسالہ اردو اپریل ۲۷ء۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام رسالہ اردو اکتوبر ۳۹ء اور مکتوب بنام سخاوت مرزا مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۵۶ء۔

۲۔ ڈاکٹر زور : یہ جانم کا ارشاد نامہ مرتب کر رہے تھے۔ انھیں صرف ایک نسخہ ملا تھا جسے انھوں نے چھپوا دیا۔ مقدمہ مکمل نہ کر سکے۔ اس نامکمل مقدمے کے اجزا میں شاہ میراں جی کے زمانے کی بحث ہے۔

۳۔ اکبرالدین صدیقی : کلمتہ الحقائق کا مقدمہ ۱۹۶۱ء۔ سب رس حیدرآباد اپریل ۱۹۶۸ء۔ اردو نامہ کراچی اپریل تا جون ۶۸ء۔ مقدمۂ ارشاد نامہ ۱۹۷۱ء۔ بجھتے چراغ ۱۹۷۵ء۔

۴۔ ڈاکٹر محمد ہاشم علی: مغز مرغوب و چہار شہادت کا مقدمہ ۱۹۶۶ء حیدرآباد نیز کتاب میراں جی شمس العشاق. حیدرآباد مئی ۱۹۷۴ء

۵۔ سخاوت مرزا: مولوی عبدالحق سے مراسلت، نیز مضمون اردو نامہ جنوری ۱۹۶۸ء

۶۔ ڈاکٹر حسینی شاہد : شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے ۱۹۷۳ء

ان میں اکبرالدین صدیقی نے ارشاد نامہ کے مقدمے میں، ہاشم علی نے مغزِ مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے نیز کتاب میراں جی شمس العشاق میں اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر مفصل تجزیاتی بحث کی ہے۔

میراں جی کے حالات کے قدیم ماخذ یہ ہیں.

۱۔ دو صفحوں کا نسل نامہ و خود نوشت جس کے مخطوطے ادارۂ ادبیاتِ اردو، خانقاہِ عنایت الٰہی (جدیدِ ڈاکٹر زور) کتب خانۂ آصفیہ اور درگاہِ امینیہ بیجاپور میں ہیں. ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب میں نسل نامہ کو خود نوشت سے علیحدہ کر کے لکھا ہے[1]۔ مکمل متن سخاوت مرزا نے اردو نامہ میں دیا[2]۔ راقم الحروف نے ادارۂ ادبیات کا نسخہ دیکھا ہے۔

---

[1] شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۶۵ تا ۷۰۔ [2] سخاوت مرزا: حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ و سال، اردو نامہ کراچی. شمارہ ۳۰ر جنوری ۶۸ء۔

Marfat.com

۲۔ ایک مرثیہ جس کے اجزا مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ء میں دیئے۔ بعد میں اکبرالدین صدیقی نے کلمتہ الحقائق کے مقدمے میں اسے جزواً اور رسالہ سب رس حیدرآباد اپریل ۱۹۶۸ء میں کلتیہً دیا۔ آخرالذکر مضمون اکبرالدین کے مجموعے بجھتے چراغ ۱۹۷۵ء میں دوبارہ شائع ہوا۔

۳۔ اردو مثنوی شجرۃ الاتقیا از سیّد محمد حسینی معظم۔ یہ قادر لنگا کے مرید اور امین الدین علی اعلیٰ کے تربیت یافتہ تھے۔ اس مثنوی کا مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں ہے۔

۴۔ سیّد علی پیر ابن بابا شاہ حسینی ابن امین الدین اعلیٰ کی فارسی مثنوی سراج العشق۔ یہ بھی سالار جنگ میں ہے۔

۵۔ فارسی مثنوی شرحِ غوثیہ از حالی مریدِ سیّد علی پیر۔ کتب خانۂ درگاہ بیجاپور۔ اکبرالدین صدیقی نے اپنے مجموعۂ مضامین بجھتے چراغ میں اس کا نام تذکرۂ غوثیہ لکھا ہے اور اسی عنوان سے مضمون لکھا ہے۔

۶۔ تذکرۃ الانسابِ سادات سکنۂ بیجاپور۔

۷۔ سیّد محی الدین قادری کا مجمع الانساب۔

ان کے نسب کے سلسلے میں اہم ترین دستاویز نسل نامۂ حاجی شریف دوام الدین یعنی خودنوشت حالاتِ حضرت میراں جی ہے۔ حاجی شریف دوام الدین میراں جی کے والد کا نام تھا۔ اس میں میراں جی اور حضرت علی کے بیچ صرف ۱۷ واسطے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے توجہ دلائی کہ طویل مدت کو دیکھتے ہوئے ۱۷ واسطے کم ہیں۔ عام طور سے کسی شخص کے ۲۰ سے ۵۵ سال کی عمر تک اولاد ہوتی ہے۔ ۲۰ اور ۵۵ کا اوسط ۳۸ لیا جائے تو ۱۷ پشتیں ۶۴۶ برس میں پوری ہو جائیں گی جبکہ شاہ میراں جی اور حضرت علی کے بیچ کا فاصلہ تقریباً نو سو سال کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نسل نامے میں کئی کڑیاں چھوٹ گئی ہیں۔ نسل نامے کے بعد مندرج خودنوشت کا خلاصہ یہ ہے۔

ہمارا مکان مکّہ میں محلّہ قریشہ میں تھا۔ میرے والد نے ہندوستان جاکر قوم چغطیہ (کذا۔ دراصل چغتیہ یا چغتائی) میں شادی کی اور پھر مکّہ واپس آئے۔ میں مکّہ میں پیدا ہوا۔ میرا نام امیرالدین رکھا۔ عرف میراں جی تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں مکّہ سے مدینہ گیا اور درگاہِ قبلہ کونین کے پاس ۱۲ سال تین مہینے پانچ دن ایک ہی کروٹ سے لیٹتا۔ جمعہ کی رات کو سیّد المرسلین میرے خواب میں آئے اور مجھے کہا کہ ہندوستان جاؤ۔ میں نے عذر کیا کہ میں وہاں کی زبان نہیں جانتا۔ ارشاد ہوا کہ تم سب زبانیں

Marfat.com

جان جائوگے۔ وہاں جاکر شاہ کمال الدین بیابانی سے ملاقات کرنا۔ میں ہندوستان آکر شاہ کمال کی خدمت میں رہا اور ہندی زبان سے واقف ہوگیا۔ تب پیر نے حکم دیا کہ شادی کرلو۔ میں نے 'بھنگار' میں شادی کی۔ اس کے بعد پیر کے حکم سے عہدِ علی عادل شاہ میں واپس آگیا اور جس کا نبی نے اشارہ کیا تھا ساکن ہوگیا۔

اس خودنوشت میں ان کا نام امیرالدین دیا ہے۔ مسافر کے منظوم شجرے میں بھی یہی ہے۔

امیرالدین میراں جی شمس العشّاق برہان الدین پھر دو حق کا مشتاق[1]

لیکن انوار الاخیار' سیّد محمد قادری کے مرتبہ شجرے نیز سیّد حسن قادری کے مملوکہ شجرے میں ان کا نام شمس الدین دیا ہے[2]۔ قیاس ہوتا ہے کہ نام کی رعایت سے شمس العشّاق لقب بنا ہو۔

خودنوشت کی روایت قدرے اختلاف سے شجرۃ الاتقیا اور دوسرے تذکروں میں دہرائی گئی ہے۔ شجرۃ الاتقیا کے مطابق رسول نے کہا کہ بیجاپور میں ایک شہر شاہ پور ہے جہاں شہ کمال ہیں۔ ان کے پاس جا۔ سیّد علی پیر کی مثنوی سراج العشق اور مالی کی مثنوی میں بھی شاہ پور کا ذکر ہے۔

تذکرۃ الانساب سادات سکنۂ بیجاپور اور مجمع الانساب دونوں نے یکساں الفاظ میں لکھا ہے کہ بیجاپور میں مشہور تھا کہ شاہ امین الدین کا خاندان سیّد نہیں مغل ہے۔ شاہ جانم کے جد کا نام حاجی دولت مکّی تھا جسے ان کی اولاد نے بدل کر حاجی دوام الدین یا حاجی شریف دوام الدین بنا دیا۔ ان کے چار بیٹے تھے ہیبت خاں' مراتب خاں' تیغ جنگ خاں اور میراں خاں عرف شاہِ میراں جی۔ حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ میراں جی کے خلفا میں دو بزرگ ہیبت خاں اور مراتب خاں تھے۔ شاہ امین کے خلفا میں بھی ایک کا نام مراتب خاں تھا (حسینی شاہد ص ۶۹-۶۸)۔ ڈاکٹر ہاشم علی نے ایک قدیمی شجرۂ خلفا دیکھا جس میں میراجی کے دو خلفا کا نام ہیبت خاں اور تیغ خاں تھا[3]۔ اس طرح میراں جی کے تینوں مبینہ بھائیوں کے نام ان کے خلفا میں بھی مل جاتے ہیں۔ حسینی شاہد اور ہاشم علی دونوں کا خیال ہے کہ تذکروں میں کسی غلط فہمی کے سبب میراں جی کے خلفا کو ان کا بھائی نہ کہہ دیا ہو۔ حسینی شاہد کا یہ بھی خیال ہے کہ چشتیہ سلسلے کی مقبولیت دیکھ کر طریقِ قادریہ نے بربنائے مخاصمت یہ شاخسانہ کھڑا کر دیا ہوگا۔ (حسینی شاہد ص ۶۹)

---

[1] مسافر کا شجرۂ منظوم۔ مخطوطۂ گنجی محل بیجاپور بحوالہ حسینی شاہد ص ۶۴

[2] حسینی شاہد ص ۶۴۔

[3] ڈاکٹر محمد ہاشم علی: میراں جی شمس العشاق (شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد' مئی ۱۹۷۴ء) ص ۱۹۔

Marfat.com

نسب ناموں میں شاہ امین الدین کے خلفا میں میٹھے خاں، مراتب خاں اور دولت خاں بن میٹھے خاں کے نام بھی ہیں۔ مجھے میراں جی اور شاہ امین کے خلفا کے ناموں میں خان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خان لوگ کب سے مشائخ کے خلفا بننے لگے۔

لیکن حاجی مکی کوئی فرضی یا خیالی نام نہیں۔ حسینی شاہد کے مطابق سجادہ نشین گنجی محل کہتے ہیں کہ حاجی مکی وہی بزرگ ہیں جن کا نام روضۃ الاولیاء میں حاجی رومی کے نام سے آیا ہے۔ ان کا مزار بیجاپور کے پاس تکوٹہ میں ہے۔ حاجی مکی کا عرس زمانۂ قدیم سے سجادہ نشین درگاہِ امین الدین اعلیٰ کیا کرتے تھے[1]۔ حسینی شاہد یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ بیجاپور کا ایک خاندان خود کو حاجی مکی کی اولاد کہتا ہے۔ اس خاندان کے مطابق وہ ایک شاخ سے ہیں اور حضرت امین دوسری شاخ سے۔ اس طرح حاجی مکی حضرت امین الدین اعلیٰ کے جد قرار پاتے ہیں۔ خود نوشت کے مطابق میراں جی کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا۔ تذکرۃ الانساب اور مجمع الانساب کے مطابق ان کا نام حاجی دولت مکی تھا۔ حسینی شاہد کو ایک بیاض میں میراں جی کے والد کی یہ تاریخ وفات ملی۔

حاجی دولت دوام دیں شد (شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۸)

۸۸۱ھ

اس میں حاجی دولت مکی اور حاجی شریف دوام الدین دونوں کا امتزاج ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں اور تکوٹہ کی درگاہ والے حاجی مکی میراں جی کے والد ہی ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم علی مغز مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ کتب خانۂ درگاہِ امینیہ کی ایک بیاض میں حاجی رومی اور حاجی مکی کو حضرت محبوبِ الٰہی (نظام الدین اولیاء) کا مرید بتایا ہے۔ حاجی رومی کا مزار بیجاپور کے ڈاک بنگلے میں ہے اور حاجی مکی کا بیجاپور سے دس میل دور تکوٹہ میں۔ اس طرح یہ دو الگ الگ شخصیتیں قرار پاتی ہیں۔

شاہ میراں جی کے والد مکے سے چل کر ہندوستان آئے اور ایک چغتائی مغل لڑکی سے شادی کی۔ خوش نامہ اور خوش نغز کی ہیروئن کے بارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے ایک پرانے کاغذ کی مدد سے انکشاف کیا کہ 'خوش بی بی' حضرت میراں جی کی سالی تھیں[2]۔ ان کے بارے میں میراں جی لکھتے ہیں۔

---

[1] حسینی شاہد: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۷۱ [2] ایضاً ص ۸۳

Marfat.com

ذاتِ ماں کی چغطا جانو باپ ترک افشاق خوش کی ذات علوی جانو جس تھے نام رزاق

یعنی خوش کی ماں چغتائی اور باپ ترک تھے۔ معلوم نہیں پھر خوش کو کس طرح علوی کہہ دیا۔ علوی انھیں کہتے ہیں جو حضرت علی کی اولاد ہوں لیکن حضرت فاطمہ کے بطن سے نہیں۔ غالباً مندرجہ بالا شعر میں علوی لغوی معنی میں ہے یعنی اونچی ذات۔

بہرحال میراں جی کی والدہ اور میراں جی کی ساس، سسر ہندوستانی مغل تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تذکرۃ الانساب اور مجمع الانساب کا قول صحیح ہو کہ میراں جی کا خاندان مغل تھا۔ حسینی شاہد سوال کرتے ہیں کہ اگر ان کے والد مکی تھے تو پھر انھیں مغل کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ نام کے ساتھ مقام کی نسبت، لازماً وطنیت کی دلیل نہیں۔ مرزا ابوطالب لندنی لندن کے باشندے نہ تھے اور حسین احمد مدنی مدینے کے رہنے والے نہ تھے۔ تقسیمِ ملک کے فوراً بعد ۱۹۴۷ء میں دلّی کے ایک تاجر فیروز جاپان والا کا اخباروں میں چرچا تھا۔ وہ جاپان کا باشندہ نہ تھا بلکہ جاپان کا بنا کوئی سامان بیچتا تھا۔ حکومت ہند کے ایک بڑے افسر کا نام کے۔ ایل۔ پنجابی تھا۔ وہ دراصل سندھی تھا پنجابی نہیں۔ ہوسکتا ہے حاجی دولت مکی حج کرنے کی وجہ سے مکی کہلائے ہوں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ میراں جی والدہ کی طرف سے مغل تھے، خواہ والد کی طرف سے سیّد ہوں۔

خودنوشت کی صحت کے بارے میں دو حضرات نے شک کیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے سخاوت مرزا کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۳۰ جنوری ۵۶ء میں لکھا۔

'یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ تحریر خود انھیں کی ہے۔ اس میں مجھے شبہہ ہے'[2]

دوسری طرف اکبرالدین صدیقی نے اپنے مرتبہ ارشاد نامے کے مقدمے میں لکھا۔

'یہ خودنوشت نہیں معلوم ہوتی ممکن ہے حضرت میراں جی نے معتقدین کے سامنے کبھی اپنے حالات بیان کئے ہوں جو سینہ بہ سینہ چلے آئے ہوں اور گیارھویں صدی ہجری میں کسی نے اس وقت لکھ دیئے ہوں جب انکی سیادت کا مسئلہ زیرِ بحث ہو'[3]

---

[1] شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ ص ۶۹

[2] جلیل قدوائی (مرتب)؛ مکتوباتِ عبدالحق۔ مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۶۳ء ص ۳۶۴۔ اس خط کی اطلاع مجھے ڈاکٹر حسینی شاہد کی کتاب سے ملی۔

[3] مقدمۂ ارشاد نامہ ص ۱۳۔۱۴۔ قدیم اردو دورِ دوم جلد اوّل ۱۹۷۱ء۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔

Marfat.com

اب لیجئے میراں جی کے مولد کی بحث۔

عبدالجبّار ملکاپوری نے تذکرۂ محبوب ذی المنن میں انھیں دو شخصیتیں بنا کر پیش کیا ہے۔ ص ۸۳۶۔۸۳۵ پر میراں جی بیجاپوری کا ذکر ہے جو عرب سے آئے۔ ص ۹۹۲۔۹۹۱ پر شاہ میراں جی شمس العشّاق کا ذکر ہے جن کا مولد بیجاپور تھا اور یہ بعد میں حرمین گئے۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے انھیں بیجاپوری قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ء میں لکھا کہ میراں جی نے بیجاپور میں علومِ ظاہری کی تکمیل شہر کے علماء و فضلا سے کی۔ اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لئے گئے (یعنی مکّہ ان کا مولد نہیں تھا) لیکن اردو کی نشو و نما میں مولوی صاحب نے اپنا موقف بدل دیا اور لکھا کہ وہ مکّے میں پیدا ہوئے اور بعد میں ہندوستان آکر شاہ کمال سے بیعت ہوئے۔ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۹ء میں مولانا نے انھیں گجرات کا باشندہ قرار دیا ہے[1]۔ شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں لکھا ہے کہ آپ بیجاپور کے اولیائے کبار سے ہیں۔ مکاشفہ حدیقۂ رحمانی، تذکرۃ القادری، مشکوٰۃ النبوۃ، انوار الاخیار، روضۃ الاولیا اور برکات الاولیا سب میں یہی ہے کہ آپ طلبِ الٰہی کے غلبے سے حرمین شریفین گئے۔ ان میں سے کئی میں صریحاً لکھا ہے کہ وہ بیجاپور سے حرمین گئے۔ ہاشم علی اطلاع دیتے ہیں کہ کتب خانۂ گیجی محل بیجاپور کے ایک مخطوطے بیاض العملیات میں میراں جی کی جائے ولادت دہلی بتائی گئی ہے[2]۔ ہاشم علی مزید لکھتے ہیں کہ خزینۃ الاصفیا میں ان کا وطن مانڈو (مدھیہ پردیش) بتایا گیا ہے[3] لیکن حسینی شاہد نے واضح کیا کہ یہ ایک اور صوفی شاہ میاں جی کا ذکر ہے، شاہ میراں جی کا نہیں[4]۔ یہ میاں جی بہ یک واسطہ شاہ بندہ نواز کے مرید تھے۔

محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

'جو لوگ اپنی زبان کو گوجری یا گجری کہتے ہیں وہ درحقیقت گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر دکن میں یہ اصطلاح کسی مصنّف کے یہاں ملتی ہے تو ہم سمجھ لیں کہ دراصل یہ مصنّف گجرات کا باشندہ ہے اور اسی لئے اپنی زبان کو گجری کہہ رہا ہے۔ اگر شیخ

---

[1] حسینی شاہد ص ۷۳۔ ہاشم علی مقدمۂ مغزِ مرغوب ص ۲۲۔۲۱۔ ہاشم علی نے رسالہ اردو کے شمارے کو اکتوبر ۴۹ء کا لکھا ہے۔

[2] ہاشم علی مقدمہ ص ۱۳۔ حسینی شاہد ص ۸۰۔۷۹۔

[3] مقدمہ ص ۱۳ نیز مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیا جلد اوّل ص ۴۰۱

[4] حسینی شاہد: ص ۶۲

Marfat.com

برہان الدین جانم اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں تو اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے آپ کو گجراتی الاصل تسلیم کرتے ہیں،[1]

ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۸ء میں دکنی ادب کی تاریخ لکھی۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ شمس العشاق اوائل عمر میں عربستان چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مولد ہندوستان ہی تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں۔

"بہر حال شمس العشاق کے متعلق اتنی بات مسلّم ہے کہ علومِ متداولہ کی تکمیل کے بعد زیارتِ حرمین کو گئے۔"[2]

سخاوت مرزا لکھتے ہیں

'آپ کی تصانیف سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا تعلق غالباً احمد آباد، گجرات یا احمد نگر سے رہا۔۔۔ پتا چلتا ہے کہ یہ بیجاپور کا نہایت ذی عزت امرا کا خاندان تھا۔ ممکن ہے کہ میراں جی نے امارت کو خیر باد کہہ دیا ہو،[3]

میراں جی نے اپنی زبان کو گجری نہیں کہا لیکن جانم نے کہا ہے۔ حسینی شاہد قیاس کرتے ہیں[4]

۱۔ شمس العشاق گجرات میں پیدا ہوئے ہوں گے لیکن اس کی تردید خود نوشت سے ہو جاتی ہے۔ چونکہ خود نوشت کے مطابق ان کی ماں ہندوستانی تھیں، ہو سکتا ہے کہ وہ گجرات کی ہوں۔

۲۔ ایک صورت میراں جی کی گجری زبان سے واقفیت کی یہ ہو سکتی ہے کہ بیجاپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے گجرات میں ان کا طویل قیام رہا ہو۔

۳۔ ممکن ہے جانم کی ماں کا وطن گجرات ہو۔ میراں جی نے بھنگار میں شادی کی تھی۔ بھنگار وہ مقام ہے جس کے قریب احمد نظام شاہ نے اپنا پایۂ تخت احمد نگر تعمیر کیا تھا۔ احمد نگر اور احمد آباد کے درمیان خوشگوار تعلقات کی وجہ سے احمد نگر کی (جو مہاراشٹر میں ہے) زبان پر گجراتی کا اثر تھا۔

۴۔ شاہ کمال الدین بیابانی کا تعلق گجرات سے تھا۔ ان کی خانقاہ بھروچ میں تھی۔ میراں جی نے پیر کی زبان کا اثر قبول کیا ہوگا۔

---

[1] شیرانی، گوجری یا گجراتی اردو سولھویں صدی عیسوی میں۔ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء و فروری ۱۹۳۱ء بازطباعت مقالات شیرانی جلد اوّل ص ۱۸۳ [2] علی گڑھ تاریخ ص ۲۰۹

[3] سخاوت مرزا، حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال۔ اردو نامہ شمارہ ۳۰۔ جنوری ۱۹۶۸ء ص ۴۵۔

[4] شاہ امین الدین اعلیٰ۔ ص ۴۸۵۔ ۴۸۴۔

Marfat.com

ان بیانات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی ہندوستان میں کسی مقام پر پیدا ہوئے بعد میں حرمین گئے۔

اب آیئے میراں جی کی تاریخ وفات کی لایخل بحث پر۔ اس کے لئے دو کاغذات اہم اور بنیادی ہیں۔ اوّل میراں جی کا مرثیہ، دوئم میراں جی کی خود نوشت سوانح۔ ان متضاد دستاویزوں کی صحت کا جائزہ لینا ہے۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں لکھا کہ شمس العشاق سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے جو ۹۰۲ھ ہوتی ہے[۵]۔ یہ مادۂ تاریخ شاہ حسین ذوقی کا کہا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی مزید تائید میں لکھا کہ انھیں ایک پرانا مرثیہ ملا ہے جس کے مصنّف کا نام معلوم نہیں اور جس سے میراں جی کی تاریخِ وفات ۲۵ر شوال ۹۰۲ھ معلوم ہوتی ہے۔ عبدالحق نے ایک مصرع کے دو دو مصرعے بنا کر ہر شعر کو مربّع کا ایک بند بنا دیا۔ انھیں جوڑ کر تاریخ سے متعلق اشعار یوں بنتے ہیں۔

تاریخِ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو — دو دین مدت وفا شو جے کچھ حکم الٰہی کا
اربع سوں یو سال ہے، ماہے کوں شوال ہے — رحلت کئے اس حال ہے جے کچھ حکم الٰہی کا
تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج بود — دو سال واصل گنج خود جے کچھ حکم الٰہی کا
شب پنج شنبہ روشن کیا، ہجرت منور پور کیا — جیوڑا قبض کر اُن لیا جے کچھ حکم الٰہی کا

ظاہرا اس مرثیے کی بحر رجز مثمّن سالم یعنی مستفعلن چار بار ہے لیکن ردیف اس سے الگ جا رہی ہے۔ اگر اس میں حکم کو بہ حرکت ک اور الٰہی کو بہ تشدید لام پڑھیں تو یہ جزو بھی موزوں ہو سکتا ہے۔ جے کچھ حُکمَ مستفعلن۔ ال لاہِ کا مستفعلن۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ جے کچھ الٰہی کا حُکمَ (بہ فتح ک) کہا جاتا۔ اس طرح کم از کم لفظ الٰہی کی شکست و ریخت تو نہ ہوتی۔ اشعار کے دوسرے اجزا میں بھی کبھی کبھی سکتہ آجاتا ہے۔

اس مرثیہ سے مولوی عبدالحق نے یہ نتیجہ نکالا کہ میراں جی کا انتقال ۲۵ر شوال ۹۰۲ھ کو ہوا۔ مولوی عبدالحق نے شاہ حسین ذوقی کا وہ شعر نہیں دیا جس میں "شمس العشاق" کو ان کی وفات کا مادہ کہا ہوگا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ یہ لقب میراں جی کی زندگی میں مشہور ہو گیا ہوگا۔ شاہ حسین ذوقی نے سب رس کا منظوم ترجمہ وصال العاشقین کے نام سے ۱۱۰۹ھ میں کیا اس سے ذوقی کے زمانے کا

۵۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء۔ بازطباعت قدیم اردو۔ ص ۷۔ کراچی ۱۹۶۱ء

Marfat.com

اندازہ ہوتا ہے۔ ان سے بہت پہلے یہ لقب سننے میں آتا ہے۔ برہان الدین جانم ارشاد نامے میں کہتے ہیں:

پیر میراں جی شمس عشاق[1]

شیخ محمود خوش دہاں، خلیفہ شاہ برہان الدین جانم نے معرفت السلوک میں اپنا سلسلۂ بیعت لکھتے ہوئے ان کا نام 'حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق' لکھا ہے۔ ان کے علاوہ شاہ امین الدین اعلیٰ کے تربیت یافتہ معظم بیجاپوری نے اپنی مثنوی شجرۃ الاتقیا میں لکھا ہے

میراں جی اتھا نام ان کا اول　　لقب شمسِ عشاق کا کر فضل

شاہ امین الدین اعلیٰ کے پوتے سید علی پیر کی مثنوی سراج العشق میں ہے

بنی گفتا نہ ماہست از تو مشتاق　　کہ برخیز اے میراں جی شمس العشاق

اور ان علی پیر کے مرید حالی کی مثنوی شرحِ غوثیہ یا تذکرۂ غوثیہ میں حضرت علی کہتے ہیں۔

گفت خیزاے شمسِ عشاق آمدم　　ہر چہ تو خواہی بگو آں می دہم

یہ ممکن ہے کہ شمس العشاق ان کی ولادت پر رکھا ہوا تاریخی نام ہو جس سے ۹۰۲ھ نکلتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے ارشاد نامۂ جانم کا متن چھپوا دیا تھا۔ مقدمہ جزواً چھپا تھا لیکن یہ کبھی شائع نہیں ہوا۔ اس مقدمے کو ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر حسینی شاہد اور اکبر الدین صدیقی نے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے مقدمے میں مولوی عبدالحق کی طے شدہ ۹۰۲ھ تاریخِ وفات کا تجزیہ کیا اور اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے[2]۔

۱۔ مرثیہ نامعلوم شخص کا ہے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ میراں جی کی وفات سے متعلق ہے۔

۲۔ عبدالجبار ملکاپوری کے تذکرۂ اولیائے دکن میں ص ۸۳۶ پر میراں جی کا سنہ وفات ۹۷۰ درج ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ تذکرے متفق ہیں کہ میراں جی علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور تشریف لائے۔ علی عادل شاہ کا عہدِ حکومت ۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ ہے۔ تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میراں جی بیجاپور میں مقیم ہونے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔

---

[1] ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ میں ص ۲۲۳ پر اس مصرع میں شمس العشاق لکھا ہے لیکن اکبر علی صدیقی کے مرتبہ ارشاد نامے میں شمس عشاق ہے۔ جب مصنف خود اپنا نام شمسِ عشاق لکھتا ہے تو یہی صحیح ہے جسطرح فخرِ دین نظامی۔

[2] بحوالۂ حسینی شاہد، سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۸۶ تا ۹۰۔

Marfat.com

۴۔ تمام تذکرے اس پر متفق ہیں کہ عرب سے واپسی پر حضرت نے بیجاپور کے حصار کے باہر قیام کیا۔ قلعہ ۹۱۸ھ میں تعمیر ہوا۔

۵۔ مولوی عبدالحق نے خود تسلیم کیا ہے کہ شاہ برہان الدین جانم کا ایک رسالہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور انھوں نے اسی سال انتقال کیا۔ جانم اپنے والد میراں جی کے نہ صرف خلیفہ تھے بلکہ اس وقت سلوک و عرفان کے مسائل بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ اگر والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال فرض کی جائے تو ۹۹۰ھ میں ۱۰۸ سال کے ہوں گے۔ یہ بھی مسلّمہ ہے کہ ان کے انتقال کے وقت ان کی بیوی حاملہ تھیں اور شاہ امین الدین علی اعلیٰ والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔ ۱۰۸ برس کی عمر میں تو الد و تناسل کا سلسلہ جاری رکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کہ یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے جانم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

غرض ان کی تاریخِ وفات ۹۷۰ھ ماننی ہوگی۔ شمس العشاق مادۂ تاریخ پیدائش ہوگا جو ان کی زندگی میں مشہور ہوگیا جس کو شاہ حسین ذوقی اور عبدالحق نے تاریخِ وفات سمجھ لیا۔

ڈاکٹر زور کے دلائل کا خلاصہ ختم ہوا۔ ادھر سخاوت مرزا نے مولوی عبدالحق سے خط و کتابت کی۔ بساتین السلاطین مولفۂ غلام مرتضیٰ مطبوعہ میں شاہ میراں جی کے وردِ بیجاپور کا ذکر نہیں لیکن سخاوت مرزا کے پاس اس کتاب کا ایسا قلمی نسخہ ہے جس میں علی عادل شاہ اوّل کے عہد کے اہم واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"وردِ میراں جی صاحب در سنہ صد و شصت و شش"..... بناء شاہ پور منتقل بیجاپور در سنہ نو صد و شصت و ہفت" [2]

گویا شاہ پور جہاں میراں جی کا مقبرہ ہے ۹۶۷ھ میں آباد ہوا۔

ڈاکٹر زور کے اعتراضات اور سخاوت مرزا کے دلائل کے بعد مولوی عبدالحق نے مان لیا۔

"موجودہ حالات میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میراں جی علی عادل شاہ اوّل کے عہد میں آئے۔ آپ کے قلمی نسخے بساتین السلاطین کا قول صحیح معلوم

---

[1] قدیم اردو ص ۲۵۔ حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق شاہ جانم ۱۰۰۷ھ میں فوت ہوئے۔ ملاحظہ ہو کتابیات ص ۱۴

[2] بساطین السلاطین قلمی ص ۵۸ بحوالہ سخاوت مرزا، حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخِ وصال۔ اردو نامہ شمارہ ۳۰، جنوری ۱۹۶۸ء ص ۴۱۔ اس مضمون کی نشاندہی حسینی شاہد ص ۹۰ سے ہوئی۔

Marfat.com

ہوتا ہے کہ وہ ۹۶۶ھ میں وارد بیجاپور ہوئے اور اس لحاظ سے ۹۷۰ھ انکا سنہ وفات ہوگا۔[1]

سخاوت مرزا نے اردو نامہ جنوری ۱۹۶۸ء میں اپنے مضمون حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال میں بھی یہ دلائل دہرائے۔ ڈاکٹر زور کے اعتراضات کو دیکھ کر ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی انکی تائید کی۔

۱۹۶۱ء میں اکبر الدین صدیقی نے جانم کی کلمتہ الحقائق شائع کی۔ اس وقت تک انھیں ڈاکٹر زور کے اعتراضات کا علم نہ ہوگا۔ انھوں نے اس کے مقدمے میں مرثیے کے ۱۹ اشعار درج کئے۔ اس میں انھوں نے پھر ۲۵ شوال ۹۰۲ھ کو تاریخ وفات قرار دیا اور یہ بھی انکشاف کیا کہ یہ مرثیہ میراں جی شمس العشاق کا ہے اور اسے ان کے بیٹے جانم نے لکھا ہے۔ میراں جی کا نام ان دو اشعار میں ہے۔

شاہ میراں جی جگ رتن[2] سو ہے رتن منج دل کندن　　لیتا چھ نا اپنی اذن، جے کچ حکم الٰہی کا
سو ہی میراں مج پیر ہے، اس روز کا دستگیر ہے　　تج بن میں میر[3] ہے، جے کچ حکم الٰہی کا

مرثیے کا مصنف میراں جی کا بیٹا ہے یہ ذیل کے اشعار سے ترشح ہوتا ہے۔

دنیا کا منج پدرا ہے اور دین منج لنگرا ہے　　اس دکھ کا منج غدرا ہے، جے کچ حکم الٰہی کا
دنیاں تھے منج فاضل کیا اور دین منج حاصل کیا　　باحق منج واصل کیا، جے کچ حکم الٰہی کا

اس میں دو جگہ منوّر پور اور شاہ پور کا ذکر ہے

ع　شب پنج شنبہ روشن کیا، ہجرت منوّر پور کیا
ع　روضہ منوّر پور ہے، مقام تج شہ پور ہے

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کے بارے میں ہے کسی دوسرے میراں جی کے نہیں۔

میراں جی کے تین یا اس سے زیادہ بیٹے تھے۔ ان میں سب سے بڑے برہان الدین جانم تھے۔ دوسرے بیٹوں کے بارے میں علم نہیں کہ وہ اردو میں شعر کہتے تھے یا نہیں۔ اکبر الدین صدیقی نے جانم کو اس مرثیے کا مصنف مانا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے ۱۹۶۲ء میں میراں جی کے منظوم رسالے مغزِ مرغوب و چہار شہادت شائع کئے۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے میراں جی کی ولادت و وفات کی تفصیلی بحث کی۔ مولوی عبدالحق نے

---

[1] مکتوب بہ نام سخاوت مرزا ص ۴۶۷۔ مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی۔

[2] بجھتے چراغ میں اس مصرع میں 'جگ رتن' کے بجائے 'چک رتن' ہے۔ چک کے معنی ہیں آنکھ۔ بجھتے چراغ ص ۲۸۔

[3] بجھتے چراغ میں اس مصرع میں 'تج بن میں بے سیر ہے' لکھا ہے۔ 'بے سیر' کے معنی بے سہارا لکھے ہیں۔ ص ۲۹۔

Marfat.com

رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں اور اکبر الدین صدیقی نے مقدمہ کلمتہ الحقائق ۱۹۶۱ء میں مرثیے کے ایک مصرع کا متن یوں لکھا تھا

ع اربع سوں یو سال ہے ماہے کوں شوّال ہے

ہاشم علی کو کتب خانہ گچّی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں اس مرثیے کے پانچ اشعار ملے جن میں مندرجہ بالا مصرع یوں تھا ع اربع تسوں یو سال ہے ماہ کوں شوّال ہے۔ ہاشم علی نے طے کیا کہ یہ 'اربع تسعوں' بمعنی ۹۴ ہے[1]۔ یعنی وفات کے وقت حضرت کی عمر ۹۴ سال تھی۔ انھوں نے کہا کہ تاریخ کے مصرع کو ذیل کے حضرات نے یوں لکھا ہے۔

عبدالحق — تاریخِ حضرت سال نوسو' اس پہ اگلے بھی دو

اکمل الدین صدیقی — تاریخِ حضرت سال نوسو دو (۱۹ ویں) اس پر اگلے بھی دو

ہاشم علی کے مطابق دونوں جگہ دو (دال واو) ہے اور مصرع یوں ہے

تاریخِ حضرت سال نوسو دو' اس پر اگلے بھی دو[2]

۹۰۲ + ۲

یعنی ۹۰۴ ہے۔ اس طرح میراں جی کا انتقال ۲۵ شوال ۹۰۴ھ شب پنج شنبہ یعنی چہار شنبہ کو ہوا۔ ہاشم علی نے ان کی تاریخِ پیدائش کے دو مادّے لکھے[3]۔ گچّی محل بیجاپور کے کتب خانوں میں ایک مخطوطہ 'بیاض العملیات' ہے جس میں مادّہ "شمس الشموس" لکھا ہے۔ درگاہِ حضرت شاہ امین الدین علی اعلیٰ بیجاپور کی ایک بیاض میں مادہ ۸۳۷ھ

میر میراں قبلۂ دیں پناہ

درج ہے۔ ہاشم علی اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ اگر ۹۰۴ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا تو سنہ پیدائش ۸۱۰ھ ہونا چاہیئے جو مندرجہ بالا مادّے کے مطابق ہے۔ اب باقی رہا ڈاکٹر زور کا اعتراض کہ اگر برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۸ سال کی عمر میں ہوا تو اس وقت توالد و تناسل کا سلسلہ کیونکر ممکن تھا ہاشم علی لکھتے ہیں کہ گچّی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں حضرت جانم کی وفات کا مادہ 'برہان گوشہ نشین' درج ہے جس سے ۹۹۹ھ نکلتے ہیں۔ اس طرح انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۱۸ سال ہونی چاہیئے۔ 'خوارق حیدری' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ غوّاصی کے مرشد سیّد شاہ حیدر ولی متوفی ۱۰۸۴ھ کے

---

[1] مقدمہ مثنوی مرغوب و چہار شہادت۔ ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۲۸ [3] ایضاً ص ۱۵

Marfat.com

۱۰۰ سال کی عمر میں اولاد ہوئی۔ اگر ان کے ۱۲ سال کی عمر میں ہو سکتی ہے تو جانم کے ۱۰۸ یا ۱۱۸ سال کی عمر میں کیوں نہیں ہو سکتی۔[1]

آخر الذکر دلیل کے بارے میں حسینی شاہد لکھتے ہیں۔

"خوارقِ حیدر کا اسم بامسمّٰی ہے اس میں بعض ایسے واقعات لکھے ہیں جن کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اس بیان کو بھی کسی مزید ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ حیدر ولی نے سو سال کی عمر میں شادی، ۱۲۰ سال کی عمر میں صاحبِ اولاد ہوئے اور ۱۵۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔[2]

اکبر الدین صدیقی نے کھوج جاری رکھی اور پھر سے تین بار اس مرثیے کے بارے میں لکھا۔

۱۔ مضمون کتبۂ امین درگاہ بیجاپور۔ اردو نامہ اپریل تا جون ۶۸ء

۲۔ مرثیۂ حضرت برہان الدین جانم۔ سب رس حیدر آباد۔ اپریل ۶۸ء

بازطباعت: بکھتے چراغ حیدر آباد۔ نومبر ۷۵ء

۳۔ شکارنامہ از جانم مرتبہ اکبر الدین صدیقی حیدر آباد ۱۹۷۱ء

ارشادنامے کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ نسخے پر اربع تسوں کے اوپر کسی نے اربع تسعون لکھا ہے۔ کسی دوسرے شخص نے دوسرے خط میں لکھا ہے

۹۰۴ھ تاریخ ۲۵ شوال المکرّم شب پنج شنبہ[3]

مرثیے کا پورا متن سب رس اپریل ۶۸ء میں چھپا ہے۔ اسی کو دوبارہ ان کے مجموعے بکھتے چراغ میں چھاپا گیا۔ اس میں 'ماہے کوں شوّال ہے' کا دوسرا نسخہ 'ماہے کہوں شوّال ہے' نوٹ نوٹ میں دیا ہے اور وزن کے پیشِ نظر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پورے مرثیے میں نو بند ہیں۔ ہر بند میں بحرِ رجز مثمن سالم میں پانچ شعر ہیں۔ اس کے بعد دوہے کے عنوان سے ظاہرا دو دوہے ہیں لیکن یہ کاتب کا سہو ہے۔ دراصل ان دو مبیّنہ دوہوں میں پہلا شعر اسی اردو وزن رجز سالم میں ہے۔ دوسرا شعر نہدی کا دوہا ہے۔ اس طرح ہر بند میں پانچ شعر قطعہ بند ان کے بعد ایک ٹیپ کا شعر اور ایک دوہا ہے۔ اس نظم کو ترکیب بند کہیں گے۔ آخری بند کے بعد ٹیپ کا شعر اور دوہا نہیں۔ شاعر

---

[1] مقدمہ مغزم مرغوب دچہار شہادت ص ۳۲ [2] سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۹۳

[3] مقدمۂ ارشادنامہ مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۱۷۔

Marfat.com

نے ضرور لکھے ہوں گے لیکن وہ تلف ہو گئے؟ بہ صورت موجودہ آٹھ بند ایسے ہیں جن میں چھ شعر اور ایک دوہا ہیں۔ آخری بند میں محض پانچ شعر ہیں یعنی جملہ ۵۳ شعر اور آٹھ دوہے ہیں۔ مرثیے کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے۔

شاہ میراں جی جگ رتن سوہے رتن منج دل کندن

ایک بند میں ایک مصرع ہے۔

تیوں تو منجے تھا پشتی شہ میراں جی چیشتی

جیوں بحر ماں تو کیشتی

اردو نامے کے مضمون میں سخاوت مرزا نے کہا تھا کہ بساتین السلاطین قلمی کے مطابق شاہ پور ۹۶۷ھ میں بسایا گیا۔ اُدھر دیوی سنگھ چوہان نے اپنے مضمون کلمتہ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ" میں لکھا

"محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا کہ علی عادل شاہ اوّل نے اپنی تخت نشینی کی یاد میں قصبہ شاہ پور کی بنیاد رکھی تھی (دیکھئے ترجمہ برگز حصہ سوم ص ۱۱۶) اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ پور کا وجود ۹۶۸ھ کے قبل ممکن ہی نہیں تھا جب خود شاہ میراں جی نے شاہ پور کا ذکر کیا ہے تو یہ ان کے سنہ ۹۶۸ھ کے لگ بھگ زندہ ہونے کی دلیل ہے"[1]

اکبر الدین صدیقی مرثیے والے مضمون میں کہتے ہیں کہ یوسف عادل شاہ نے ۹۰۵ھ م ۱۴۹۰ء میں عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت شاہ پور کا علاقہ آباد تھا۔ یہاں کشور خاں کا باغ بھی تھا جو بہمنی سلطنت کا ایک سردار تھا۔ شاہ پور کی بنیاد ڈالنے یا آباد کرنے کا جو ذکر ملتا ہے یہ ممکن ہے کہ شاہ پور ہی سے متصل کوئی دوسرا علاقہ ہو[2]۔

یہ اکبر الدین صدیقی کا قیاس محض ہے۔ بساتین السلاطین اور تاریخ فرشتہ کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں کہ شاہ پور ۹۶۷ھ سے پہلے آباد ہو گیا تھا۔

دوسرا مسئلہ جانم کی عمر کا ہے۔ اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں کہ گنجی محل کی بیاض میں جانم کی

---

[1] دیوی سنگھ چوہان: کلمتہ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ۔ نوائے ادب۔ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۲۹-۲۸

[2] سب رس اپریل ۱۹۶۸ء ص ۲۱

Marfat.com

وفات کا مادۂ تاریخ 'عزیز جانِ چشتیاں جانم' دیا ہے جس سے ۱۰۰۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہی سال امین الدین اعلیٰ کی ولادت کا ہوگا۔ اگر میراں جی کی وفات ۹۰۴ھ کے وقت جانم کی عمر ۱۸ تا ۲۰ سال ہو تو حضرت امین کے شکم مادر میں نزول کے وقت جانم کی عمر ۱۲۰ یا ۱۲۲ سال ہوگی۔ صدیقی صاحب نے اردو نامہ میں اس مشکل کو یہ کہہ کر رد کر دیا۔

"اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔"[1]

سب رس اپریل ۱۹۶۸ء میں مرنجے والے مضمون میں اور زیادہ مزے کی بات کہی ہے۔

"اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ میں نے ایک مثنوی میں حضرت امین الدین اعلیٰ کے بارے میں پڑھا ہے کہ آپ بارہ سال ماں کے پیٹ میں رہے اور اس کے بعد ولادت ہوئی۔"[2]

اگر آپ بارہ سال شکم مادر میں رہے تو حمل ۹۹۵ھ میں قائم ہوا ہوگا جس وقت جانم کی عمر تقریباً ۱۱۱ سال رہی ہوگی۔ اولیاء کی کرامات کے نام پر ہم سے کیا کیا مطالبات کئے جا رہے ہیں کہ والد صاحب تقریباً ۱۲۰ سال کی عمر میں تناسل کرتے ہیں اور فرزندِ محترم ۱۲ سال شکمِ مادر میں قیام کرتے ہیں۔ ان مفروضوں کے لئے جس ایمان و عقیدہ کی ضرورت ہے راقم السطور اس سے محروم ہے۔

حیرت ہے کہ اس اہم نکتے سے کیونکر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ اوّل تو یہ بعید از امکان ہے کہ مرد میں ۱۲۰ سال کی عمر میں تناسل کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے دوسرے یہ کہ کیا ایک خدا رسیدہ درویش کو ۱۲۰ سال کی عمر میں اس شغل کا شوق رہا ہوگا۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ توالد کے لئے دو فریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد میں یہ صلاحیت کافی عمر تک رہ سکتی ہے لیکن اناث میں ماہواری کا سلسلہ بند ہونے کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کیونکہ اس کے بعد ان کے اندر بیضہ موجود نہیں رہتا۔ یہ سلسلہ ۴۵ سے ۴۸ سال کی عمر کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ حضرت جانم نے بہت بڑی عمر میں کسی کم سن لڑکی سے عقدِ ثانی کیا تھا۔

حسینی شاہد لکھتے ہیں کہ ۹۰۲ھ کو سنہ پیدائش تسلیم کرنے سے کمال الدین بیابانی سے

---

[1] اردو نامہ اپریل تا جون ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۷

[2] سب رس اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۵۔

Marfat.com

ان کی بیعت اور ملاقات معرضِ بحث میں پڑ جاتی ہے۔ خود نوشت کے مطابق وہ ۲۲ برس کی عمر میں حرمینِ شریفین کی زیارت کو گئے۔ سوا بارہ سال مدینے میں رہے، اس کے بعد ہندوستان آئے۔ اس طرح یہاں آنے کے وقت ان کی عمر ۳۵ سال ہونی چاہیئے۔ اگر وہ ۹۰۲ھ میں پیدا ہوئے تو تقریباً ۹۳۷ھ میں ہندوستان پہنچے۔ کمال الدین بیابانی کا سنہ وفات متفقہ طور پر معلوم نہیں لیکن گچی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں ان کا مادۂ تاریخِ وفات

ع کمال الدین بیابانی خدا یا یا

۸۸۱ھ

دستیاب ہوا ہے۔ اس سنہ میں میراں جی کے ان سے بیعت کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ۹۷۰ھ کو میراں جی کا سنہ وفات تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ اس دن ۲۵ شوال کو پنج شنبہ تھا جب کہ مرثیے کے مطابق ان کا انتقال پنج شنبہ کو نہیں شبِ پنج شنبہ کو ہوا تھا۔

حسینی شاہد اس مصرع کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

تاریخِ حضرت سال نوسو دو اس پر اگلے بھی در

کہتے ہیں کہ اس کے معنی نوسو کے ساتھ ۲ اور ۲ یعنی ۲۲ کے عدد کے ہیں اور یہ مصرع ۹۲۲ھ کی طرف اشارہ کرتا ہے[1]۔ حضرت کے معنی نہ پیدائش کے ہیں نہ رحلت کے بلکہ حاضر ہونے کے، مصرع یہ بیان کرتا ہے کہ شاہ میراں جی کے ہندوستان میں آکر شاہ کمال کے حضور حاضر ہونے کی تاریخ ۹۲۲ھ ہے۔ اگر وہ ۹۲۲ھ میں ۳۵ سال کے تھے تو ۸۸۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر انھوں نے ۹۴ سال کی عمر میں انتقال کیا تو ان کا سنہ وفات ۸۸۷+۹۴ یعنی ۹۸۱ھ ہوگا اس سال ۲۵ شوال کو چہار شنبہ کا دن تھا۔

حسینی شاہد کہتے ہیں اس طرح جانم کی عمر کو غیر ضروری طول دینے کی ضرورت نہیں۔ ساتھ ہی خود نوشت کی تفصیلات اس سے میل کھاتی ہیں اور ان کا دورِ بیجاپور علی عادل شاہ اوّل کے عہد میں ثابت ہوتا ہے لیکن کمال الدین بیابانی سے بیعت کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ۹۰۲ھ کو میراں جی کا سنہ پیدائش تسلیم کرنے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس سے کمال الدین

---

[1] سید شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۷۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنا نظریہ کتاب کے ص ۹۱ سے ص ۹۷ تک میں بیان کیا ہے۔

Marfat.com

بیابانی سے بیعت معرضِ بحث میں پڑجاتی ہے کیونکہ ایک بیاض کے مادۂ تاریخ کے مطابق بیابانی کا انتقال ۸۸۱ھ میں ہوا۔[1]

لیکن ۹۲۲ھ میں بیعت قرار دینے کے وقت وہ اس اعتراض کو بھول جاتے ہیں اور کمال الدین بیابانی کی عمر کو ربڑ کی طرح کھینچنا شروع کرتے ہیں. لکھتے ہیں مولوی علیم الدین کی بیاض کے مطابق شاہ کمال کے پیر شاہ جمال ۸۱۹ھ میں فوت ہوئے. اگر شاہ کمال نے ان سے ۲۰ سال کی عمر میں بیعت کی ہو تو ان کی تاریخ پیدائش تقریباً ۸۰۰ھ ہوئی. اگر میراں جی نے ان سے ۹۲۲ھ میں بیعت کی تو اس وقت شاہ کمال کی عمر ۱۲۲ سال ہوئی. قدما میں یہ عمر حیرت انگیز نہیں۔

سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی یہ اچھی مثال ہے۔ انھیں بیاضوں میں کمال الدین بیابانی کے یہ مادۂ تاریخِ وفات ملے۔

کمال الدین بیابانی خدا پایا

۸۸۱ھ

کمال اسکا ملیں عزلت گزیں[2]

۸۶۷ھ

حسینی شاہد نے ص ۹۷ پر 'کمال الدین خدا پایا' مادہ لکھ کر ۸۸۱ھ لکھا ہے جو سہو کتابت ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے محض ۸۰۵ھ نکلتا ہے۔ کمال الدین بیابانی خدا پایا (ص ۹۲) سے ۸۸۱ھ نکلتا ہے. حسینی شاہد کمال بیابانی کی وفات کو ان مادوں سے مستخرج نہیں کرتے کیونکہ ان سے بیعت کا سوال کھٹائی میں پڑجاتا۔ وہ شاہ جمال کے انتقال سے شاہ کمال کے انتقال کا قیاس کرنا چاہتے ہیں. انھیں مان لینا چاہیئے کہ ۹۲۲ھ میں شاہ میراں جی کی بیعت شاہ کمال سے نہیں ہو سکتی۔

'حضرت' کے معنی 'حاضر ہونا' کب سے ہو گئے. حضرت کے معنی 'حضرت میراں جی' کیوں نہیں۔

'تاریخ حضرت' کے معنی پیر کے پاس حاضر ہونا اور اس سے بیعت کرنا محض ایجادِ بندہ ہیں. لو سو وہ اس پر اگلے بھی دو کے معنی ۹۲۲ نہیں ہو سکتے۔ ان کے طریق سے ۹۰۲۲ ہوں گے کیونکہ ۹۰۲ کے ساتھ ۲ کے عدد کا اضافہ ہے۔

مرثیہ ہو یا خود نوشت یا مختلف بیاضوں میں دیئے ہوئے مادہائے تاریخ ان میں سے

---

[1] شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۹۲ [2] ایضاً ص ۹۷، ۹۲

Marfat.com

کسی کو غیر ضروری اہمیت نہیں دینی چاہیئے کیونکہ ان میں ایک دوسرے کے متناقض بیانات ملتے ہیں. حسینی شاہد کو گجی محل بیجاپور اور ذخیرۂ مولوی علیم الدین تاجرِ کتب حیدر آباد کے مجہول الاسم، غیر مصدقہ بیاضوں سے مختلف مادّے ملے[1]. ہاشم علم کو بھی کچھ مادّے ملے. ان کا اختلاف ملاحظہ ہو.

۱۔ وفاتِ جمال الدین مغربی (مرشدِ شاہ کمال بیابانی)

اتھے سات پوّاسی چھ برس زمانے ستی گم ہوا یو برس

۷۸۶ھ

دہم ماہِ رجب وفاتِ حضرت مغربی قدس اللہ سرہ شبِ جمعہ ۷۸۶ ہجری
(انجمن کی تقویم کے مطابق ۱۰ رجب کو اتوار کا دن تھا)

جمال بخدا واصل

۸۰۸ھ

ابداللہ فی جناں متواہ

۸۱۹ھ

زاہدِ پاک جمال چشتی

۸۲۷ھ

۲۔ وفاتِ کمال الدین بیابانی

کمال ا لکاملیں عزلت گزیں

۸۶۷ھ

کمال الدین بیابانی خدا پایا

۸۸۱ھ

۳۔ ولادتِ حاجی شریف دوام الدین
شمعِ منوّر

حسینی شاہد نے صـ۱۹ پر یہ تاریخ دے کر اس کے نیچے ۷۰۶ھ لکھا ہے. دراصل ۷۴۲ھ نکلتا ہے.

---

[1] شاہ امین الدین اعلیٰ ۔ صـ۹۷ فٹ نوٹ ۔

Marfat.com

وفاتِ حاجی شریف دوام الدین

حاجی دولت دوام دیں شد

۸۸۱ھ

مندرجہ بالا تمام تاریخیں حسینی شاہد کی کتاب کے ص۹۸ سے لی گئی ہیں

۴۔ ولادتِ شاہ میراں جی

کتب خانہ، امین درگاہ کی بیاض کے مطابق

میرِ میراں قبلۂ دیں پناہ

۸۱۰ھ

گنجی محل کی بیاض العملیات کے مطابق 'شمس الشموس'

۸۲۷ھ

وفاتِ شاہ میراں جی شمس منور پور (حسینی شاہد ص۹۸)

۹۰۴ھ

مرقدِ ولی شاہ پور (مقدمۂ ارشاد نامہ مرتبۂ اکبر الدین صدیقی ص۲۳)

۹۰۴ھ

ہاشم علی نے مغزِ مرغوب و چہار شہادت کے مقدمے میں لکھا ہے کہ خزینۃ الاصفیا میں میراں جی کا سنہ وفات ۸۹۹ھ دیا ہے جو ذیل کے قطعے سے نکلتا ہے۔

میراں جی شاہ شہنشاہ عالی — چو رفت از دارِ دنیا سوئے جنّت
رقم کن کاشفِ ممتاز سالش — وگر فرماں دہی بدرِ کرامت

اس میں 'کاشفِ ممتاز' مادہ ہے۔ اس سے ۸۹۹ھ نہیں ۸۸۹ھ نکلتا ہے 'بدرِ کرامت' سے ۸۶۷ھ اور 'فرماں دہی بدرِ کرامت' سے ۱۲۲۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس قطع کا پہلا مصرع یوں لکھا۔

میاں جی شاہ شاہنشاہِ عالی[1]

اب اس کا وزن صحیح ہوا۔ انھوں نے بندہ نواز کے مرید شاہ میاں چشتی مانڈو والے کو شاہ میراں جی

---

[1] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا۔ ص ۱۲۹

Marfat.com

سمجھ لیا تھا. انھیں کے سلسلے میں یہ قطعہ لکھا ہے. اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ میاں جی کا قطعۂ تاریخ وفات ہے میراں جی شمس العشاق کا نہیں۔

۵۔ وفاتِ اہلیہ شاہ میراں جی

خواب گاہِ حرمِ پاک (مقدمۂ ارشاد نامہ مرتبۂ اکبر الدین صدیقی. ص ۲۳)

۹۰۶ھ

یہی کیفیت شاہ برہان الدین جانم اور شاہ امین الدین اعلیٰ سے متعلق مادّوں کی ہے۔ مندرجہ بالا مادوں میں بہتوں میں متعلقہ صوفی کا نام نہیں. بہتوں میں یہ مذکور نہیں کہ یہ کس واقعے کی تاریخ ہے ولادت کی ؟ وفات کی ؟ یا زندگی کے کسی اور واقعے کی ؟ دکن اور گجرات کے صوفیاء میں 'میراں' عام لقب ہے. کیا معلوم کس میراں جی کی تاریخ ہے. جب تک بیاضوں کے دوسرے اندراجات کو دیکھ کر ان کا پایۂ استناد طے نہ ہو کیونکر کہا جائے کہ کسی کم سواد نے غلط حساب کر کے غلط مادّہ تو نہیں لکھ دیا۔ بہتر یہ ہے کہ ان مادوں اور تاریخوں کو نظر انداز کر کے خود نوشت اور مرثیے پر مرکوز رہا جائے. خود نوشت کے تعلق سے ذیل کے سوالات ابھرتے ہیں۔

۱۔ شاہ میراں جی سے حضرت علی تک مخمض ۷ واسطے دیئے ہیں. جیسا کہ پیچھے لکھا گیا فصلِ زمانی کو دیکھتے ہوئے یہ کم ہیں۔

۲۔ شاہ میراں جی کے والد مکّہ سے چل کر ہندوستان آئے اور ایک مغل لڑکی سے شادی کر کے واپس ہو گئے. شاہ میراں جی کی سسرال بھی مغل تھی. کیا وہ سیّد نہ تھے ؟ کیا یہ خود نوشت بعد میں کسی معتقد نے ان کی سیادت ثابت کرنے کے لئے لکھ دی ہے ؟

۳۔ ان کی جائے ولادت مکّہ ظاہر کی گئی ہے لیکن بیشتر تذکروں سے ان کا مقام بیجاپور معلوم ہوتا ہے نیز یہ کہ ان کا خاندان گجرات سے آکر بیجاپور میں بسا تھا. اس سلسلہ میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ شاہ میراں جی نے کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی۔

۴۔ خود نوشت کے بیان کے مطابق یہ پہلے شاہ کمال بیابانی سے ملے، اس کے بعد شادی کی اور دونوں بیجاپور آئے۔ معظّم بیجاپوری کی مثنوی شجرۃ الاتقیا کے مطابق رسول نے خواب میں بشارت دی کہ تم بیجاپور میں شاہ پور جا کر شاہ کمال سے ملو. چنانچہ وہ شاہ کمال سے پہلی بار شاہ پور میں ملے. سیّد علی پیر نے مثنوی سراج العشق میں لکھا ہے کہ وہ پہلے شاہ کمال سے ملے، بعد میں شاہ پور آئے۔

Marfat.com

۵۔ خود نوشت کے مطابق وہ علی عادل شاہ کے عہد (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) میں بیجاپور آئے۔ اس سے پہلے کی طویل مدت انھوں نے کہاں بتائی، خود نوشت اس کے بارے میں خاموش ہے۔

بہرحال خود نوشت کا سب سے اہم بیان یہی ہے کہ وہ علی عادل شاہ اوّل کے عہد میں بیجاپور آئے۔

مرثیے کے ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں

شب پنج شنبہ روشن کیا ہجرت منوّر پور کیا۔

روضہ منوّر پور ہے مقام تج شہ پور ہے

اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ بیجاپور سے ڈھائی میل دور ٹیلہ منوّر پور کہلاتا ہے[1]

مرثیے میں شاہ پور کا ذکر اہم ہے۔ خود میراں جی نے مثنوی خوش نامہ میں خوش بی بی کے سلسلے میں لکھا:

تھان کیا شاہ پور ما نہیں، وہ تو پیارا تھام پیروں کیرا قول ہوا کہ تجھ سوں ہمیں تمام[2]

جیسا کہ پیچھے لکھا جا چکا ہے تاریخِ فرشتہ کے مطابق علی عادل شاہ اوّل (سنہ جلوس ۹۶۵ھ) نے اپنی تخت نشینی کی یاد میں شاہ پور کو بسایا۔ بساتین السلاطین قلمی مملوکہ سخاوت مرزا میں اس کی بنیاد کی تاریخ ۹۶۷ھ لکھی ہے۔ اس لئے شاہ میراں جی کے ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ میں انتقال کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جو لوگ مرثیے میں اس سنہ والے مصرع پر ایمان رکھتے ہیں انھیں شاہ پور کے ذکر کو دیکھ کر مان لینا چاہیئے کہ یہ سنہ وفات سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں یہ ولادت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تاریخ حضرت سال نوسو دو اس پر اگلے بھی دو

سے مراد تاریخ ولادت حضرت ہے، اسے خواہ ۹۰۲ پڑھئے خواہ ۹۰۴ھ۔ اس کے بعد کا مصرع مولوی عبدالحق نے یوں لکھا تھا۔

دو دین مدّت وفا شو جے کچ حکم الٰہی کا

اکبرالدین صدیقی نے کلمتہ الحقائق کے مقدمے میں لکھا 'دو دن مدّت وفا شو۔۔۔'

اب بھی مصرع کا یہ جز بے معنی رہا۔ انھوں نے مرثیے کا قدیم مخطوطہ دیکھ کر اس مصرع کو یوں لکھا۔

---

[1] اکبرالدین صدیقی، کچھتے چراغ فٹ نوٹ ص ۴۴

[2] مولوی عبدالحق: حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق۔ رسالہ اردو جولائی ۴۷ء۔ بازطباعت قدیم اردو۔ ص ۱۵۔

Marfat.com

ویں مدتِ وفات یو سنو جے کیج حکم الٰہی کا

پہلے مصرع میں ولادت کی تاریخ بیان کر کے دوسرا مصرع میں لکھتے ہیں "وایں مدتِ وفات یو سنو" یعنی وفات کی مدت کے بارے میں آگے سنو۔

ع اربع تسعوں یو سال ہے ماہے کوں شوّال ہے

اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ

'یہ ان کی عمر کا ۹۴ واں سال ہے اور شوّال کا مہینہ ہے'۔

عمر کے بعد سنہ کا ذکر کئے بغیر صرف مہینہ لکھنے کی کیا تک تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ۹۴ کا عدد عمر کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے! اس سے پہلے سینکڑے کے اعداد حذف ہیں جیسا کہ ہم اپنے عہد میں ۴۷ء، ۸۴ء وغیرہ بغیر ۱۹ سو کے اضافے کے بولتے اور لکھتے ہیں۔ چونکہ شاعر پہلے شعر میں 'سال نو شو' لکھ ہی چکا ہے اس لئے دوبارہ اسے نہ لکھنے میں اسے تکلّف نہیں ہوا۔ اس مصرع کے معنی یہ ہیں

'سنہ ۹۴ ہے اور مہینہ شوّال کا ہے

اب دونوں شعروں کو ملا کر دیکھئے

تاریخِ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو ویں مدتِ وفات یو سنو جے کیج حکم الٰہی کا

اربع تسعوں یو سال ہے ماہے کوں شوّال ہے رحلت کیے اس حال ہے جے کیج حکم الٰہی کا

ردیف کو بھلا کر ان دو شعروں کے معنی (کہوں) یہ ہیں

حضرت کی ولادت کی تاریخ ۹۰۴ھ (یا ۹۰۲ھ) تھی اور ان کی وفات کی مدت یہ سنو کہ سنہ ۹۴ھ (۹۹۴ھ) ہے اور شوّال کا مہینہ ہے

آگے کے اشعار میں لکھا ہے

تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج بود دو سال واصل گنج خود جے کیج حکم الٰہی کا

شب پنج شنبہ روشن کیا ہجرت منوّر پور کیا جیوڑا قبض کران لیا جے کیج حکم الٰہی کا

اس میں کہا گیا ہے کہ ۲۵ شوّال کی تاریخ تھی اور جمعرات کی رات تھی۔ انجمن ترقی اردو کی تقویم ہجری و عیسوی از ابو النصر محمد خالدی اور ترقی اردو بورڈ کی مفتاح التقویم ص ۲۴۷ کے مطابق ۲۵ شوال ۹۹۴ھ کو جمعرات تھی۔ واضح ہو کہ اسلامی تقویم میں تاریخ اور دن دونوں غروبِ آفتاب کے بعد شروع ہو کر اگلے دن غروبِ آفتاب تک چلتے ہیں۔ ہندوؤں میں صبح تڑکے سے اگلی رات کے آخر تک دن کا شمار ہوتا ہے اور مغربیوں میں رات کے بارہ بجے سے اگلی رات کے بارہ بجے تک۔ جیسے نتیجے میں ۵ شوال

Marfat.com

جمعرات کی رات کہا ہے وہ دورِ حاضر کے لحاظ سے بدھ کے دن کے بعد والی رات ہو گی۔ اسلامی قاعدے سے اس وقت ۲۵ شوال اور جمعرات دونوں آچکی ہوں گی۔

شعر میں لکھا ہے 'ہجرت منوّر پور کیا'۔ اسی مرثیے کے ایک اور شعر میں ہے۔

'روضہ منوّر پور ہے مقام تجھ شہ پور ہے'

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شاہ پور میں رہتے تھے اور منوّر پور میں دفن ہوئے۔

'دو سال واصل گنج خود' کے کیا معنی ہیں۔ غالباً یہ کہ خزانہ دو سال سے واصلِ حق ہے۔ یعنی انھیں انتقال کئے دو سال ہو گئے۔ اس طرح مرثیہ وفات کے دو سال بعد یعنی ۹۹۶ھ میں لکھا گیا۔

'گنج خود' کے بجائے 'گنج بود' کے ہونے کا بھی امکان ہے

ان کی تاریخِ پیدائش ۹۰۲ھ ہے کہ ۹۰۴ھ۔ مصرع ۹۰۴ سے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔

تاریخ حضرت سال نو سو دو اس پر اگلے بھی دو (اکبر الدین صدیقی کا متن)

بہ نسبت تاریخِ حضرت سال نو سو اس پر اگلے بھی دو (عبدالحق کا متن)

لیکن 'شمس العشاق' سے ۹۰۲ برآمد ہونا بھی اتفاقی نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی وفات کی جو تاریخیں 'شمس منوّر پور' اور 'مرقدِ ولیِ شاہ پور' میں ہو سکتا ہے کہ صدیوں بعد میں معتقدین نے کہی

۸۰۴ھ ۹۰۴ھ

ہوں۔ انھیں بھی آج کے محققین کی طرح مرثیے کے پہلے شعر کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہو کہ اس میں ۹۰۴ھ وفات کی تاریخ ہے۔

اب رہا شاہ کمال سے بیعت کا سوال۔ شاہ کمال کی وفات کی جو دو تاریخیں ملتی ہیں وہ ۸۶۷ھ اور ۸۸۱ھ ظاہر کرتی ہیں جب کہ حسینی شاہد نے ان سے بیعت کی تاریخ ۹۲۲ھ قرار دی تھی۔ اگر ولادت ۹۰۲ یا ۹۰۴ میں ہو تو بیعت ۹۲۲ میں ہو سکتی ہے لیکن ہمیں بیعت کی تاریخ کا علم ہی نہیں۔ شاہ کمال کی وفات کا ایک مادّہ غلط ہو سکتا ہے تو دوسرا بھی غلط ہو سکتا ہے۔ وہ اس سنہ تک زندہ رہے ہوں گے کہ شمس العشاق میں ان سے بیعت کا شعور آچکا ہو۔

مجھے یقین ہے کہ شاہ میراں جی کی ولادت ۹۰۲ یا ۹۰۴ھ میں ہوئی اور وفات ۲۵ شوال ۹۹۴ھ سبعِ سنابل میں۔ اس صورت میں برہان الدین جانم کا انتقال ۱۰۰۷ھ میں قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں۔

تصانیفِ نثر: ان کا حال بھی خواجہ بندہ نواز کا سا ہے یعنی ان کی بھی کوئی مصدقہ نثری

Marfat.com

تصنیف دستیاب نہیں. ان سے ذیل کی کتب منسوب کی گئی ہیں۔

۱، ۲ جل ترنگ اور گل باش : شمس اللہ قادری نے پہلی بار ذکر کیا کہ انھوں نے یہ رسالے دیکھے تھے. لکھتے ہیں

"چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور شاہ صاحب نے ان میں تصوّف کے اسرار و نکات تمثیل کے پیرائے میں بیان کئے ہیں"[1]

اس کے بعد ان رسالوں کا کہیں پتا نہیں چلا. اب ناپید ہیں. اس لئے کیونکر تصدیق کی جائے کہ یہ شاہ میراں جی کی تصنیف تھے۔

۳۔ شرحِ مرغوب القلوب : مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں اس کی تفصیل دی. شمس اللہ قادری اردوئے قدیم میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہرِ سِمکیات کے پاس اس کا نسخہ دیکھا جس کے خاتمے میں لکھا تھا کہ یہ حضرت میراں جی خدانما کی تصنیف تھا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے (ص ۲۶) میں اسے شاہ میراں جی سے ہی منسوب کیا ہے. ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کارنجان بھی اسے شمس العشاق سے منسوب کرنے کا ہے لیکن انھوں نے شمس اللہ قادری کی رائے بھی دی ہے (ص ۳۷ ـ ۱۳۶) ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ میں (ص ۲۱۶) اسے بے تامل شمس العشاق سے منسوب کر دیا ہے. ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب میراں جی خدانما میں میراں جی خدانما کی کتاب شرحِ تمہیدات اور زیرِ بحث شرحِ مرغوب القلوب کے جملے دے کر ثابت کیا کہ موخر الذکر میراں جی خدانما ہی کی تصنیف ہے[2]. ڈاکٹر حسینی شاہد کی بھی یہی رائے ہے[3]۔

۴۔ سب رس : سالار جنگ لائبریری میں ایک مخطوطہ 'سب رس' کے نام سے ہے جس کے آغاز میں لکھا ہے 'کلامِ میراں جی شمس العشاق'۔ اس کی تفصیل نصیر الدین ہاشمی نے مطبوعہ فہرست میں صفحہ ۱۰ تا ۱۴ پر دی ہے. کئی مصنفوں نے اسے میراں جی سے منسوب کر دیا ہے. دراصل یہ وجہی کی تصنیف تاج الحقائق ہے اس کے بارے میں تفصیلی بحث دسویں باب میں وجہی کے تحت ملاحظہ ہو۔

---

[1] اردوئے قدیم ص ۱۱۶ [2] اردوئے قدیم دوسرا حصہ ص ۵۹

[3] میراں جی خدانما ص ۸۵ ـ ۸۴۔ بہ حوالہ ڈاکٹر ہاشم علی مقدمہ مغزِ مرغوب و چہار شہادت ص ۵۵ ـ ۵۴

[4] کلمتہ الحقائق، اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۲۔

Marfat.com

۵. سبع صفات : پانچ صفحوں کا یہ رسالہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں ہے۔ چونکہ اس کے سرورق پر مصنف کا نام میراں جی لکھا ہے اس لئے ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھا لیکن میراں جی نام کے گجرات و دکن میں متعدد بزرگ ہوئے ہیں مثلاً میراں سید محمد جونپوری، میراں جی شمس العشاق، میراں جی خدانما، میراں یعقوب، میراں حسینی ولی اللہ وغیرہ۔ محض "میراں جی" کی بنا پر کیونکر اسے شمس العشاق سے منسوب کر دیا جائے۔ دیکھئے اس کی زبان کتنی صاف ہے۔

"اے عزیز یہاں سا تو صفتاں ذات کی بولتا ہوں۔ خوب سن ہور تمام عالم میں یو صفتاں ۔ کہ۔ تو سات صفتاں حق تعالیٰ کی ذاتی ہیں۔ جہاں یو صفتاں ہے وہاں ذات خدا کی موجود ہے۔"[2] (ایضاً ص ۲۱۷)

اس کے مقابلے میں شاہ برہان الدین جانم کے کلمتہ الحقائق کی اکھڑی اکھڑی فارسی آمیز زبان دیکھئے۔ صاف ظاہر ہے کہ سبع صفات بہت بعد کا رسالہ ہے۔

سبع صفات نام کا ایک اور طویل تر رسالہ ملتا ہے جو سالار جنگ لائبریری میں سبع صفات کے نام سے (فہرستِ مخطوطات ص ۲۷۸) اور آصفیہ لائبریری میں خلاصتہ الردیتہ (فہرست جلد دوم ص ۲۰۶) کے نام سے موجود ہے۔ ڈاکٹر ہاشم علی لکھتے ہیں کہ اس رسالے کا تیسرا نام مرات الانسان بھی ہے۔ انھوں نے اس کے چار نسخوں کا ذکر کیا ہے جن سے مصنف کا نام حاجی الحرمین شاد عبدالقادر عرف شاہ میراں حسینی ولی اللہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی مقامی نسبت دو نسخوں میں منزوی الجبلین، ایک میں جبلی الادری اور چوتھے میں محض الادری (الادری) ہے۔ پہاڑوں میں رہنے کی وجہ سے انھیں یہ لقب ملا۔ یہ میسور کے شاہ صدرالدین کے والد تھے۔ اس طرح سبع صفات نام کا انجمن ترقی اردو ہند کا پانچ صفحوں کا رسالہ یا سالار جنگ و آصفیہ کا بالترتیب ۲۶ اور ۴۵ صفحوں کا رسالہ، دونوں میں سے کوئی بھی میراں جی شمس العشاق کی تصنیف نہیں۔

ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمس العشاق سے کسی اردو نثری رسالے کا انتساب غلط ہے۔

---

[1] ڈاکٹر ہاشم علی، میراں جی شمس العشاق (حیدرآباد ۱۹۷۴ء) ص ۶۳

[2] نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۲

Marfat.com

نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کی بھی یہی رائے ہے[1]۔ ڈاکٹر محمد ہاشم کو بھی اس سے اتفاق ہے[2]۔ اپنی دو کتابوں میں کہتے ہیں۔

"سچ تو یہ ہے کہ میراں جی شمس العشاق سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں' ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے"[3]

مجھے بھی اس سے اتفاق ہے۔

شاہ برہان الدین جانم : یہ شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ شاہ معظم کی نظم شجرۃ الاتقیا کے مطابق جب برہان الدین سے پندرہ سال کے ہوئے تو والد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر والد کے حکم سے سفر پر چلے گئے۔ تین سال بعد واپس آئے تو شاہ میراں جی نے سب پوشیدہ راز ان پر ظاہر کئے اور کچھ عرصے کے بعد انتقال کر گئے[4]۔ اس وقت شاہ برہان کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال رہی ہو گی۔ اگر ۹۹۴ھ شاہ میراں جی کا سنہ انتقال ہو تو شاہ برہان تقریباً ۹۷۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے لیکن چونکہ شاہ میراں جی کی تاریخ وفات پر ہی اتفاق نہیں اس لئے شاہ برہان کی تاریخ ولادت بھی وثوق سے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔

ڈاکٹر زور نے جانم کی مثنوی ارشاد نامہ کو مرتب کیا' اس کا مقدمہ لکھا۔ اس کے کچھ اجزا چھپوائے تھے کہ پھر کام روک دیا۔ اس نا تمام مقدمے میں انھوں نے شاہ میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وفات ۹۷۰ھ تسلیم کی۔ چونکہ عام قیاس یہ ہے کہ والد کے انتقال کے وقت شاہ برہان کی عمر محض ۲۰ سال رہی ہو گی اس بنا پر ڈاکٹر زور نے قطعیت کے ساتھ ۹۵۰ھ کو شاہ برہان کی تاریخ ولادت قرار دیا[5]۔ قیاس کو اتنی قطعیت دینا مناسب نہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مرتبہ کلمتہ الحقائق میں ڈاکٹر زور کے مندرجہ بالا بیان کے حوالے سے جانم کی تاریخ ولادت ۹۵۰ھ لکھی ہے۔ ان سب کے برعکس اکبر الدین صدیقی نے لکھا ہے کہ جانم ۸۸۴ھ یا ۸۸۶ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔

---

[1] نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء ص ۲۲

[2] مقدمہ مغز مرغوب و چہار شہادت ص ۸۹' میراں جی شمس العشاق ص ۶۲۔

[3] حسینی شاہد: سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۱۰۴۔

[4] زور: تذکرۂ مخطوطات اردو جلد ۵' ص ۵۴۔

Marfat.com

انھوں نے یہ سنین میراں جی کی تاریخِ وفات ۹۰۲ھ یا ۹۰۴ھ فرض کرکے ان میں سے ۱۸ سال منہا کرکے حاصل کئے۔[1]

شاہ برہان الدین اپنے دور کے بڑے صوفی تھے۔ شاہ میراں جی اور ان کے پوتے شاہ امین الدین علی اعلیٰ مجذوب تھے اس لئے قدرے تیز مزاج کے تھے لیکن عبدالجبار ملکاپوری کے تذکرہ محبوبِ ذی المنن کے مطابق جانم نیک سیرت اور حلیم الطبع تھے۔[2]

حسینی شاہد کو کتب خانۂ گنجی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں ان کی اہلیہ کا نام بی بی میمونہ عرف چاندہ صاحب بی ملا[3] لیکن یادداشتِ قبور میں اہلیہ کا نام ولی بی جان صاحبہ لکھا ہے[4] جس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو ان کے دو بیویاں تھیں یا دونوں نام اور لقب ایک ہی خاتون کے تھے۔ ان کے ایک ہی بیٹے شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا پتا چلتا ہے۔ مجمع الانساب اور تذکرۃ الانساب ساداتِ سکنۂ بیجاپور میں مزید تین بیٹوں کے نام ہیں لیکن دوسرے ذرائع سے توثیق نہیں ہوتی۔[5] ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن ان میں زیادہ نامور شیخ محمود خوش دہاں تھے۔

شاہ معظم کی مثنوی شجرۃ الاولیا میں ان کی وفات کے بارے میں ایک عجیب روایت درج ہے۔ جب شاہ برہان کو معلوم ہوا کہ ان کی بیوی حاملہ ہیں تو انھوں نے کہا کہ ایک بیشے میں دو شیر اور ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اس لئے ہم وداع ہوتے ہیں۔[6] مشکوۃ النبوۃ میں اخبار الانوار کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب حضرت امین الدین شکم مادر میں تھے شاہ برہان نے اپنی کلاہ اہلیہ کے شکم پر رکھ کر کہا کہ یہ خرقۂ امانت اس کو پہنچا دینا۔ شاہ امین حمل میں چھ ماہ کے تھے کہ شاہ برہان نے انتقال کیا۔[7]

شاہ برہان کی منطق عجیب ہے گویا کسی قابل بیٹے کی پیدائش سے پہلے والد کو مرجانا چاہئے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ شاہ برہان نے جوانی ہی میں انتقال کیا ہوگا کیونکہ شادی کے بعد تو ولد کو زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔ تذکرۂ اولیائے دکن میں ان کی وفات کی تاریخ ۹۵۰ھ لکھی ہے لیکن

---

[1] صدیقی: کلامِ حضرت بندہ نواز و جانم ص ۱۱۔ بھتیے چراغ۔ حیدرآباد۔ نومبر ۱۹۷۵ء

[2] بحوالہ سید شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۱۰۴۔

[3] ایضاً ص ۸۳

[4] ایضاً ص ۵۶

[5] ایضاً ص ۱۱۱

[6] ، [7] ایضاً ص ۱۱۱

Marfat.com

مولوی عبدالحق نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ان کے مطابق ان کا رسالہ ارشاد نامہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے۔ مولوی صاحب کے خیال میں یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اسی سال انھوں نے انتقال کیا۔[1] اپنے ان دونوں مفروضات کی انھوں نے کوئی وجہ نہیں بیان کی۔ نہ ارشاد نامہ جانم کی آخری تصنیف ہے نہ انھوں نے ۹۹۰ھ میں انتقال کیا۔ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین اعلیٰ پر اپنے مقالے میں جانم کی تاریخِ وفات کے سلسلے میں دوسروں کے اقوال دے کر اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ان کے نشان زدہ ماخذ اور بعض دوسرے حوالوں کی مدد سے اس ضمن میں مختصراً کچھ لکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو شہ پارے میں لکھا۔

"ارشاد نامہ کے ختم پر شاہ برہان الدین جانم نے منظوم کرنے کی تاریخ ۹۹۹ھ درج کی ہے۔ان کی وفات کی تاریخ بھی غالباً یہی ہے"[2]

پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب اردو مثنوی کا ارتقا میں بھی بغیر کسی حوالے کے ۹۹۹ھ لکھی ہے[3] جو ظاہر ہے اردو شہ پارے ہی سے ماخوذ ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے مقالے میں اس سلسلے میں عجیب خلفشار ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"منفعت الایمان کے نیچے ۹۹۰ھ اپنے قلم سے درج کیا ہے اس بنا پر مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ شاہ برہان کا سنہ وفات ۱۰۶۸ھ ہے۔ڈاکٹر زور کو اس سے اتفاق نہیں وہ سنہ وفات ۹۹۰ھ بتاتے ہیں"[4]

عبدالحق کے بقول ۹۹۰ھ ارشاد نامہ کے آخر میں لکھا ہے، منفعت الایمان کے آخر میں نہیں۔ عبدالحق نے کہیں شاہ برہان کا سنہ وفات ۱۰۶۸ھ نہیں لکھا۔اس بیان کے لئے ڈاکٹر رفیعہ نے مولوی عبدالحق کے مضمون رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء کا حوالہ دیا ہے۔حالانکہ اس مضمون میں مولوی صاحب نے سنہ وفات ۹۹۰ھ لکھا ہے ۱۰۶۸ھ نہیں۔ پھر ڈاکٹر زور نے سنہ وفات ۹۹۰ھ نہیں ۹۹۹ھ[5] لکھا ہے۔

محمد اکبرالدین صدیقی نے اپنے مرتبہ کلمتہ الحقائق میں صرف یہ کہا

---

[1] عبدالحق: حضرت شاہ برہان الدین جانم۔ رسالہ اردو، جولائی ۱۹۲۷ء بازطباعت قدیم اردو ص ۲۵

[2] اردو شہ پارے ص ۳۳

[3] ایڈیشن علی گڑھ ۱۹۶۸ء ص ۴۱

[4] اردو نثر کا آغاز ص ۱۶۱

[5] اردو شہ پارے ص ۲۳

Marfat.com

"آپ کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات کا صحیح پتہ نہ چل سکا لیکن چونکہ حضرت جانم کی ایک کتاب ارشاد نامہ کی تصنیف کا سنہ ۹۹۰ھ ہے اس لئے اس کے بعد ہی ان کی وفات قرار دی جا سکتی ہے"[1]

لیکن اپنے مضمون کتبۂ امین درگاہ میں انھوں نے کتب خانۂ گنجی محل بیجاپور کی ایک بیاض سے جانم کی وفات کا مادّہ 'عزیزِ جانِ چشتیاں جانم' لکھا ہے۔[2]

۱۰۰۶ھ

مختلف بیاضوں میں ان کی تاریخِ وفات کے یہ مادّے ملتے ہیں[3]

۱۔ گوشہ نشیں ۲۔ برہانِ گوشہ نشیں ۳۔ برہان خلد منے ۴۔ برہان رازِ حقیقت

۷۴۱ھ ۹۹۹ھ ۹۹۲ھ ۱۰۸۴ھ

یہ آخری تاریخ برہان الدین رازِ الٰہی کی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کو سید شاہ مرتضیٰ قادری سجّادہ نشینِ گنجی محل بیجاپور کے کتب خانے سے جانم کا مادّۂ وفات یہ ملا۔[4]

عزیزا' جانِ چشتیاں جانم

۱۰۰۷ھ

اس مادّے میں عزیزا عجیب لفظ ہے۔ شاید اس کے معنیٰ 'اے عزیز' ہیں۔
شیخ محمود خوش دہاں نے بھی ایک قطعے میں یہی سنہ برآمد کیا ہے

کردم چو فکرِ تاریخ ہاتف بہ آہ ایں گفت دل خوش نبڑاغِ جانم دُرِ یتیم گشتہ[5]

۱۰۰۷ھ

اس مادّے میں محض 'بداغ' سے ۱۰۰۷ھ برآمد ہوتے ہیں لیکن مصرع کی ساخت میں صرف اس ایک لفظ کو تاریخ قرار دینے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اکبر الدین صدیقی نے اپنے مضمون 'کتبۂ امین درگاہ' میں یہ مادّہ 'عزیزِ جانِ چشتیاں جانم' پڑھ کر ۱۰۰۶ھ اخذ کیا۔ کسی نے اس کی قرأت

عزیز از جانِ چشتیاں جانم

---

[1] مقدمۂ کلمتہ الحقائق ص ۹۔ حیدر آباد ۱۹۶۱ء [2] اردو نامہ کراچی اپریل تا جون ۱۹۶۸ء ص ۴۷

[3] شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۱۰۴ [4] ایضاً ص ۱۱۴ [5] حسینی شاہد: شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۱۱۵۔۱۱۴

Marfat.com

کی لیکن یہ قرآت غلط ہے۔ ۱۰۰۷ھ کو نہ صرف مندرجہ بالا دو مادّوں کی تائید حاصل ہے بلکہ حضرت امین الدین اعلیٰ کی تاریخِ ولادت کی بھی[1]

پیرِ چشتیاں یوں ہے

۱۰۰۷ھ

اس طرح حضرت جانم کا سنہ وفات ۱۰۰۷ھ ہی صحیح ماننا ہوگا۔

نثری تصانیف: ان کی سب سے اہم کتاب ارشاد نامہ نظم میں ہے۔ یہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور اسے ۱۹۷۱ء میں اکبر الدین صدیقی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ ان کی کئی نثری تصانیف پر اس کا اثر ہے۔ نثری کتابوں میں سب سے اہم کلمتہ الحقائق ہے۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے رسالے ان سے منسوب ہیں جن کے بارے میں قوی امکان ہے کہ وہ ان کے ہوں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے 'اردو نثر کا آغاز اور ارتقا' میں نیز اپنے مرتبہ کلمتہ الحقائق میں ص۹ پر ان کی نثری کتابوں کی یہ فہرست دی ہے۔

۱۔ کلمتہ الحقائق ۲۔ مقصودِ ابتدائی ۳۔ ذکرِ جلی ۴۔ کلمتہ الاسرار ۵۔ معرفت القلوب
۶۔ ہشت مسائل ۷۔ رسالۂ تصوّف

ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو میں ذیل کے رسالوں کے نام لکھے ہیں

۱۔ کلمتہ الحقائق ۲۔ مجموعتہ الاشیا ۳۔ مقصودِ ابتدائی ۴۔ ارشاد نامۂ نثر
۵۔ معرفت القلوب

اکبر الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ ارشاد نامے کے مقدمے میں ذیل کی کتب کو ان سے منسوب کیا۔

۱۔ مقصودِ ابتدائی ۲۔ کلمتہ الاسرار ۳۔ ذکرِ جلی ارشاد نامہ ۴۔ معرفت القلوب
۵۔ ہشت مسائل ۶۔ کلمتہ الحقائق۔

ان میں سے کلمتہ الاسرار بالیقین برہان الدین جانم کی نہیں بلکہ ان کے بیٹے امین الدین اعلیٰ کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے توجہ دلائی کہ اس رسالے میں حضرت برہان الدین رازِ الٰہی کا نام اور ان کے اشعار آئے ہیں۔ رازِ الٰہی کا زمانہ ۹۹۸ھ تا ۱۰۸۳ھ ہے جب کہ جانم کا

---

[1] حسینی شاہد، شاہ امین الدین اعلیٰ ص۲۲

Marfat.com

انتقال ۱۰۰۷ھ میں ہوا۔ اس طرح وہ ایسی کتاب کے مصنّف نہیں ہو سکتے جس میں ان کے بعد کے شاعر رازِ الٰہی کے اشعار ہوں۔[1]

ڈاکٹر حمیرہ جلیلی کے مرتبہ کلمتہ الاسرار (۱۹۷۹ء) کے متن میں صـ۶۴ پر برہان رازِ الٰہی کا نام اور ان کے چار فارسی اشعار ہیں۔ حمیرہ اپنے مقدمے میں لکھتی ہیں کہ کلمتہ الاسرار کے چھ نسخے دریافت ہوئے ہیں جن میں سے چار میں اسے امین الدین اعلیٰ کی تصنیف مانا ہے اور صرف ایک میں برہان الدین جانم کی۔

برہان رازِ الٰہی کے ذکر اور اس کی ستھری زبان کی وجہ سے کلمتہ الاسرار ان کی تصانیف سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان سے منسوب بقیہ تصانیف کا ذیل میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

کلمتہ الحقائق: اسے جولائی ۱۹۶۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دو اساتذہ اکبر الدین صدیقی اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے شائع کیا۔ اکبر الدین صدیقی کے مقدمے پر ۱۲ر جولائی ۱۹۶۱ء اور ڈاکٹر رفیعہ کے مقدمے پر ۱۴ر جولائی ۱۹۶۱ء درج ہے۔ میرے سامنے اس کے دونوں ایڈیشن ہیں لیکن اس تحریر میں بطورِ خاص اکبر الدین صدیقی کے ایڈیشن کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ان کا نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کے ۱۴ نسخوں کی اطلاع دی ہے جن میں سے بیشتر حیدر آباد میں ہیں، چند انجمن ترقیِ اردو پاکستان، انجمن ترقیِ اردو ہند اور بیجاپور وغیرہ میں ہیں۔[2] قدیم ترین نسخہ ۱۰۶۸ھ کا کراچی میں ہے۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں "حضرت شاہ برہان الدین جانم" کے عنوان سے مضمون لکھا جو بعد میں ان کے مجموعے "قدیم اردو" میں شامل ہوا۔ اس میں ارشاد نامہ کے تعلق سے لکھا

> "ان کا ایک رسالہ (جس کا ذکر آگے آئے گا) سنہ ۹۹۰ھ کی تصنیف ہے اور چونکہ یہ سنہ انھوں نے خود اپنی نظم میں لکھ دیا ہے اس لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہمارے خیال میں یہ ان کی آخری تصنیف تھی اور اسی سال میں انتقال فرمایا۔"

---

[1] حسینی شاہد، شاہ امین الدین اعلیٰ، کلمتہ الحقائق۔ اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱

[2] قدیم اردو ص ۲۵۔

Marfat.com

انھوں نے ان دونوں قیاسات کی کوئی وجہ نہیں دی۔ دونوں نتائج بے بنیاد ہیں۔
مولوی عبدالحق کے بیان سے گمراہ ہوکر اکبر الدین صدیقی نے اپنے مقدمے میں لکھ دیا کہ کلمتہ الحقائق ۹۹۰ھ کے قبل لکھی گئی لیکن بعد میں ایک مضمون میں اسے ارشاد نامے پر موخر قرار دیا۔ لکھتے ہیں

"طویل نظم ارشاد نامہ میں سنسکرت کے الفاظ بھی ملتے ہیں اس لئے یہ کتاب بوجھل اور مشکل ہوگئی۔ غالباً معتقدین کی فرمائش پر اس کی شرح لکھی۔ یہی شرح نثری کتاب کلمتہ الحقائق ہے۔"[1]

ڈاکٹر رقیہ سلطانہ نے اپنے مرتبہ کلمتہ الحقائق میں سنہ تصنیف کی بحث چھیڑی ہی نہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کے سنہ تصنیف کی حدود مقرر کیں۔ ارشاد نامے اور کلمتہ الحقائق کا مقابلہ کرکے انھوں نے طے کیا کہ کلمتہ الحقائق ارشاد نامے کے بعد کی تصنیف ہے اور اس طرح ۹۹۰ھ اور ۱۰۰۷ھ (تاریخِ انتقالِ جانم) کے درمیان وجود میں آئی۔ اس کے چند دلائل حسینی شاہد نے یہ دیئے ہیں۔[2]

۱۔ کلمتہ الحقائق کی ابتدا میں ارشاد نامے کے کئی اشعار منشور کرکے لکھ دیئے گئے ہیں مثلاً

سہج سہج سو اس کا ٹھہار — سہج ہوا ہے اس تھے بار
جد کچھ نہ تھا، تھا وہی — شریک نا اس دوجا کوئی
ایسا حال جے سمجھے کوئے — جس پر کرم خدا کا ہوئے

(ارشاد نامہ۔ ص ۱۳۷۔ ۱۳۶۔ مرتبۂ ڈاکٹر زور)

سہج سہج سو تیرا تھار، و سہج ہوا بھی تو جے تھے بار۔ جدھاں کچھ نہ تھا بھی تھا نیں دوجا شریک کوئی نیں۔ ایسا حال سمجھتا خدا تھے خدا کوں، جس پر کرم خدا کا ہوئے۔

(کلمتہ الحقائق ص ۲۱)

۲۔ کلمتہ الحقائق میں کئی جگہ ارشاد نامے کے اشعار نقل کئے ہیں۔
۳۔ کلمتہ الحقائق کے بیشتر حصوں میں ارشاد نامے کے اشعار کو نثری ترتیب سے لکھ دیا ہے۔
۴۔ کلمتہ الحقائق میں ارشاد نامے کے بہت سے شعار کی نثری تشریح ہے۔

---

[1] اصحابِ سلسلۂ بندہ نواز کی علمی و ادبی خدمات۔ بجھتے چراغ ص ۲۵۔
[2] نوائے ادب جولائی ۷۰ء۔ ص ۴ تا ۸۔

Marfat.com

۵۔ جو مسائل جس تفصیل و ترتیب سے ارشاد نامے میں ہیں اسی طرح کلمتہ الحقائق میں ہیں۔ وہی تشبیہات و تمثیلات اور لفظیات استعمال کی ہیں۔

اس رسالے کا موضوع مسائلِ تصوّف ہیں۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ تک کی نثری تصانیف میں یہ سب سے ضخیم رسالہ ہے۔ اکبر الدین صدیقی کے یہاں اس کا متن ۲۰۸ صفحات پر ہے۔ یہ سوال و جواب کے انداز میں ہے۔ مُرید مختصر سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتا ہے۔ ایک امکان یہ ہے کہ کسی مرید نے واقعی اس طرح کے سوال کئے ہوں اور پھر سوال و جواب کو مدوّن کر دیا ہو۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ خود شاہ جانم نے اسے سوال و جواب کے پیرائے میں لکھا ہو۔ اس کے مختلف نسخوں کا متن حیرت انگیز طور پر یکساں ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق اردو کی پہلی مستند نثری کتاب پیرِ روشناں محمد بایزید انصاری م۔ ۹۸۰ھ کی خیر البیان ہے۔ اس کے بعد دوسری مستند کتاب جانم کی کلمتہ الحقائق ہے۔ دکن میں اس سے پہلے کے جن رسالوں کا نام لیا جاتا ہے وہ یا تو موجود ہی نہیں اور اگر ہیں تو مبیّنہ مصنّف سے ان کا انتساب ثابت نہیں۔ کلمتہ الحقائق کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو اور فارسی میں کیا تناسب رکھے۔ وہ جگہ جگہ فارسی جملے لکھ جاتا ہے، ایک جملہ اردو، دوسرا فارسی۔ ایک جملے کا ایک تابع جملہ اردو، دوسرا فارسی مثلاً ڈاکٹر حسینی شاہد کے مضمون سے کچھ مثالیں۔

ا جملے کا آغاز اردو سے کرتے ہیں اور ختم فارسی پر کرتے ہیں۔

ان کے سیوک میں رنگ لال پیدا شد
اس دل کی بزرگی کسے را نہایت نہ رسد

ب فارسی سے شروع کر کے اردو پر ختم کرتے ہیں

ایں نام بر ہر یک صفت تعلق دھرتا ہے
در منزلِ ملکوت حال کیوں دسے گا

ج رسالے کے آخر میں تقریباً سات صفحے پوری طرح فارسی میں ہیں۔ جہاں بھی مرشد کا جواب ذرا طویل ہے وہ زیادہ تر فارسی میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کو اردو کے مقابلے میں فارسی لکھنے پر زیادہ قدرت ہے اس لئے وہ بار بار فارسی میں بولنے لگتا ہے۔ مرید نے اس کی صنعتِ ملمّع والی نثر کو اسی

Marfat.com

انداز سے نقل کر دیا ہے۔ یہی کیفیت شمالی ہند میں افضل کی بکٹ کہانی میں ہے۔

جانم نے ارشاد نامے کی طرح کلمتہ الحقائق کی زبان کو بھی گجری کہا ہے

سب یو زبان گجری' نامِ ایں کتاب کلمتہ الحقائق[1]

ارشاد نامے میں لکھتے ہیں

یہ سب گجری کیا بیاں　　کر یہ آئینہ دیا نماں
کلمۂ حق سب کیا بیاں　　دیکھ خلاصہ ہوئے عیاں

اسی شعر سے ان کے ذہن میں کلمتہ الحقائق کا نام تشکیل پایا ہوگا۔

کلمتہ الحقائق کا لسانی مطالعہ کئی حضرات نے کیا ہے۔ ذیل کے مصنّف اور تحریریں اہم ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں مختصراً اس کی لسانی خصوصیات درج کیں۔

۲۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے اپنے ایڈیشن (جولائی ۱۹۶۱ء) کے مقدمے میں لسانی جائزے کو تین سے زیادہ صفحات دیئے۔

۳۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو میں صفحہ ۲۳۷ - ۲۳۶ پر اس کی زبان کی خصوصیات درج کیں۔

۴۔ سب سے مفصّل، ۳۴ صفحوں کو محیط، مضمون "کلمتہ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ" دیوی سنگھ چوہان کا ہے جو نوائے ادب جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے عالمانہ امعانِ نظر کے ساتھ اکبرالدین صدیقی کے متن کی تصحیح کی۔ متعدد ہندی اور مراٹھی الفاظ کا تلفّظ اور معنی واضح کئے۔ انھوں نے دکنی پر مراٹھی اثر کی وضاحت بھی کی۔

۵۔ اس سلسلے کا آخری اہم مضمون حسینی شاہد کا "کلمتہ الحقائق' اردو نثر کا پہلا مستند نقش" مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۷۰ء ہے۔ علی گڑھ تاریخ کو چھوڑ کر تین مضامین اور کلمتہ الحقائق کے دو ایڈیشن جولائی میں شائع ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کلمتہ الحقائق کو جولائی کے مہینے سے کوئی خصوصی تعلق ہے۔

رسالے کی زبان میں دکنی کی عام خصوصیات ہیں ہی۔ مختلف نقّادوں نے جو لسانی مطالعہ کیا ہے ان میں سے محض دو چار نکتے پیش کئے جاتے ہیں۔ اوّل ڈاکٹر نذیر احمد کی تحریر مشمولہ علی گڑھ تاریخ سے[2]:

---

[1] اکبرالدین صدیقی کی مرتبہ کلمتہ الحقائق ص ۲۱۔　[2] علی گڑھ تاریخ ص ۲۳۷ - ۲۳۶۔

Marfat.com

۱۔ الفاظ میں کثرت سے 'والا' کے بجائے 'ہارا' یا 'ہار' کا لاحقہ لگا کر اسمِ فاعل بنانا مثلاً کرتہار، انپڑ نہارا۔

۲۔ پنا کے لاحقے سے اسمِ کیفیت بنانا میں پنا' جیو پنا

۳۔ تاکید کے لئے چ یا چہ کا بہت زیادہ استعمال مثلاً تریچہ، اسیچہ

۴۔ ہندی لفظوں، فقروں اور جملوں کو واؤ عطف سے جوڑنا مثلاً

پھل و پھول و کانٹا۔

خدا بیں و اس کے قدرت میں

۵۔ عربی کا سابقۂ نفی فارسی لفظوں پر لگانا مثلاً لانشاں

۶۔ ہے، رہے اور اچھنا کی مختلف صورتیں۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے تین خصوصیتوں کی طرف توجہ دلائی[1]

۷۔ جس طرح نظم میں ضرورت شعری سے لفظوں کی تقدیم و تاخیر روا ہوتی ہے جانم نے نثر میں بھی وہی کیا مثلاً

خدائے تعالیٰ ایک اچھے سب میں کیوں

اس کا کہو میت سمجھ ہوئے تیوں

۸۔ ایک حرفِ ربط یا حرفِ عطف کی جگہ دوسرا حرف لے آنا مثلاً

الف۔ عمامہ پاکیزہ کر کر سُکا لینا نہ کی بھی میلا کرنا

ڈاکٹر حسینی شاہد کے مطابق 'بھی' بجائے 'پر' ہے۔ میرا خیال ہے 'کی بھی' دراصل 'کبھی' ہے

ب۔ حرفِ تشبیہ 'و یسا' کی جگہ 'و'

جیسا وہم کرے گا وتیرا چ وہم کا بار دے گا

ج۔ 'جو' کی جگہ 'و'

خدائے تعالیٰ کے دل میں تھا وانکارا ہوا نفس تھے

۹۔ بعض مفرد جملے کہ 'بھی' 'پس' سے شروع ہوتے ہیں مثلاً

---

[1] نوائے ادب جولائی ۷۰ء۔ ص ۲۸۔۲۷۔

Marfat.com

کہ اوپ نائوں نشان کر دیکھلانا
بھی ظلمات اندھارا سو ممتنع الوجود
پس ذکرِ جلی کیوں

۱۰۔ اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں[1]

"کنڑ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً میں تو کون ہو کر جانتا' یعنی یہ جانتا ہے کہ میں کون ہوں۔ اس قسم کا استعمال بیجاپور کے ادیبوں اور شعرا میں عام ہے اور گولکنڈہ کے ادیبوں اور شاعروں نے اس کی بجائے 'بول کے' کا لفظ استعمال کیا ہے۔"

اس قسم کی نحوی ساخت کنڑ اور تیلگو کا اثر ہے۔ 'بول کے' والے فقرے تیلگو نحو کا لفظی ترجمہ ہیں۔

غرض اس رسالے کی زبان پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں اس لئے وہ لڑکھڑا لڑکھڑا کر اکھڑی اکھڑی زبان لکھتا ہے۔

ارشادنامۂ نثر: اس میں پانچ ذیلی رسالے ہیں۔ ہر ذیلی رسالے کے شروع میں براعت الاستہلال کے طور پر چند اشعار ہیں جن میں اس جزو کے موضوع کا اظہار کیا ہے۔ ان کے بعد نثر میں لکھا ہے۔ علی گڑھ تاریخ ادب میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ان پانچوں حصوں کی تفصیل دی ہے[2]

۱۔ **ذکرِ جلی:** یہ پہلا رسالہ ہے جس کا موضوع شریعت ہے۔ شروع میں چار شعر ہیں جن میں سے دو یہ ہیں

ارشاد نامہ شریعت کا اس میں فیض ہے رحمت کا
جس کو دیوے پاوے راہ کہیا یہدی من یشاء

جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے توجہ دلائی مندرجہ بالا دوسرا شعر شاہ جانم کی دو نظموں میں آتا ہے۔ وصیت الہادی کے پہلے شعر کا مصرعِ ثانی ہے۔

سکتا قادر قدرت سوں سمجھے تجھ کوں کوئی کیا جس کوں لوڑے دیوے راہ کہیا یہدی من یشاء (چاہے)[3]

---

[1] مقدمہ کلمتہ الحقائق ص ۱۴ [2] ص ۲۴۰ تا ۲۴۲

[3] مولوی عبدالحق: رسالہ اردو جولائی ۲۷ء۔ نیز قدیم اردو ص ۲۶۔

Marfat.com

ارشادنامے میں یہ شعر یوں ہے

ولیکن جس کوں اپیں خواہ کہیا یہدی من یشاء[1]

اس کے بعد نثر شروع ہوتی ہے۔

"بسم اللہ ناؤں خدا کا' الرحمٰن الرحیم بخشنہارا و بخشانے ہارا' اللہ محمد کے راز ہور رموز کیا باتاں کسی نامحرم کے آنگے نا بولنا' بولے تو کافر ہوں گے' سنیں گے سو دیوانے ہوں گے' ان کو بول کر دیوانے نہ کرنا ہور اپنے کافر نہ ہونا۔ جو شرط ہے اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ اترتے دم میں بولنا"[2]

اس کے ابتدائی حصے کا جزو "بسم اللہ ناؤں خدا کا' الرحمٰن الرحیم بخشنہارا و بخشانے ہارا' معرفت القلوب میں بھی ملتا ہے جسے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ' ڈاکٹر نذیر احمد اور اکبر الدین صدیقی نے شاہ برہان الدین جانم سے منسوب کیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ غالباً شاہ میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔ یہ بحث آگے آئے گی۔

ابتدائی جملے کے آگے کا جزو 'اللہ محمد کے راز۔۔۔ الخ' کم از کم دو مزید رسالوں میں ملتا ہے۔ ایک شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسالۂ وجودیہ[3] میں۔ دوسرے اس رسالۂ وجودیہ میں جس کا ذکر ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی فہرستِ مخطوطات جلد اوّل میں صفحہ ۲۵۰ پر کیا ہے اور جسے قیاساً شاہ میراں جی خدانما سے منسوب کیا ہے۔ اس کے ابتدائی جملے یہ ہیں۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ایں رسالۂ وجودیہ۔ اللہ محمد کے راز رمز کے باتاں کسی نامحرم کے انگے نا بولنا' بولیں گے سو کافر ہویں گے و سنیں گے سو دیوانے ہویں گے ان کوں دیوانے بھی نہ کرنا۔ اپنے کافر بھی نہ ہونا۔ زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ جوں زبان سیں کہتے ہیں تو دم آوتے جاتے اللہ اللہ کہنا۔"

ان کی تقلید میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی اسے میراں جی خدانما سے منسوب کیا اور اس کے طولانی اقتباسات دیئے[4] لیکن ڈاکٹر حسینی شاہد کہتے ہیں کہ میراں جی خدانما نے رسالۂ وجودیہ ضرور لکھا ہے لیکن وہ یہ رسالہ نہیں بلکہ ایک دوسرا مخطوطہ ہے[5] جو ادارۂ ادبیات

---

[1] ارشادنامہ مرتبہ اکمال الدین صدیقی ص ۱۳۷۔ [2] علی گڑھ تاریخ ص ۲۴۰۔ [3] شاہ امین الدین اعلیٰ ص ۳۵۹۔
[4] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا۔ ص ۲۲۰ [5] بحوالہ ایضاً ص ۱۷۴ - ۱۷۳۔

Marfat.com

میں نمبر ۴۵۹ پر ہے اور جسے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب میراں جی خدانما میں نقل کیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے ارشاد نامۂ نثر کے اس جزو ذکرِ جلی کا ترقیمہ بھی درج کیا ہے جس میں 'تمام شد ارشادِ جلی' لکھ کر مزید چار پانچ سطروں میں پانچ تنوں کی تفصیل ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور اکبر الدین صدیقی (مقدمۂ ارشاد نامہ) نے ارشاد نامۂ نثر میں سے صرف پہلے رسالے ذکرِ جلی کا ذکر کیا ہے۔ صدیقی اسے 'ذکرِ جلی ارشاد نامہ' کہتے ہیں۔ ان کے مطابق اسے ذکرِ وجودیہ سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ذکرِ جلی عورتوں سے خطاب کر کے لکھا گیا ہے کیونکہ اس کی تشریح میں 'کھانے کے بھانڈے میں ہاتھ بھاتے وقت۔۔۔ پانی کے بھانڈے کو اٹھاتے وقت۔۔۔ پیتے پکاتے وقت، جھاڑتے جھوڑتے وقت، سیتے پروتے وقت'[2] ذکر کرنے کی ہدایت ہے۔ شاہ جانم اس میں بھی کلمتہ الحقائق کی طرح مونث حرفِ اضاف 'کی' کو بہ شکلِ جمع 'کیاں' کر لیتے ہیں مثلاً 'چار روز کیاں طبیعتاں'

اس رسالے میں چار عناصر ماٹی، پانی، آگ، بارا (ہوا) کا ذکر ہے۔ چونکہ امین الدین اعلیٰ نے خلا کو شامل کر کے پانچ عناصر کا ذکر کیا ہے اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ رسالہ شاہ امین الدین سے پہلے کا ہے۔

۲۔ ذکرِ قلبی۔ اس کا موضوع طریقت ہے۔ پہلا شعر ہے۔

ارشاد نامہ طریقت کا　　اس میں گنج ہے نعمت کا
اس میں دوسرے تن کے مراقبے کا ذکر ہے

۳۔ ذکرِ روحانی یا ذکرِ روحی۔ اس کا موضوع حقیقت ہے اور پہلا شعر یہ ہے

ارشاد نامہ حقیقت کا　　اس میں تن ہے ظلمت کا
اس میں تیسرے تن کے مراقبے اور ممتنع الوجود کا بیان ہے

۴۔ ذکرِ سری۔ اس کا موضوع معرفت ہے

ارشاد نامہ معرفت کا　　اس میں تن ہے وحدت کا
اس میں عارف تن یا عارف الوجود کا بیان ہے

---

[1] جلد پنجم ص ۱۱۹　　[2] اردو نثر کا آغاز، ص ۱۷۴-۱۷۳

Marfat.com

۵۔ ذکرِ خفی۔ اس کا موضوع وحدت ہے۔

ارشاد نامہ وحدت کا اس میں نور ہے شاہد کا

رسالے کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ہے جس کے سرورق پر کسی سمیع الدین ادریس نے اس کا نام 'ذکرِ جلی مصنفہ شاہ برہان الدین جانم' لکھا ہے۔ سالار جنگ میں اس کے کئی حصّے ہیں جنھیں نصیر الدین ہاشمی نے ارشاد نامہ کے نام سے بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک کے خاتمے میں غالباً کاتب نے 'ایں بیانِ حضرت شاہ برہان صاحب' لکھا ہے۔

ڈاکٹر زور کے نزدیک یہ نثری رسالہ شاہ جانم کے طویل منظوم رسالے 'ارشاد نامہ' کی شرح ہے جس کو ان کے قریبی زمانے میں شاہ جانم کے کسی مرید یا شاہ امین الدین اعلیٰ نے تصنیف کیا ہوگا[1] لیکن اس دعوے کا جواز نہیں۔ منظوم اور منثور ارشاد نامے کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارشاد نامۂ نثر مثنوی ارشاد نامہ کی شرح نہیں گو دونوں کا موضوع یکساں ہے۔ منظوم ارشاد نامہ میں مرید نے پہلے سوال ہی میں پانچوں اذکار کی حقیقت دریافت کی ہے۔

شریعت، طریقت، حقیقت سوں مجمع لیا یا معرفت سوں (ص ۱۳۶)

اور آگے وحدت کا ذکر اس شعر میں آیا ہے

تفرید اکھیں اور تجرید کرو خلاصہ جے توحید

اس رسالے کا تعلق شاہ برہان کے دوسرے منظوم رسالے شہادت الذکر سے بھی ہے۔ اس میں پانچ اذکار جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی کا بیان ہے۔ کلمتہ الحقائق میں بھی ان اذکار کا ذکر ملتا ہے۔

ڈاکٹر ندیر احمد ارشاد نامۂ نثر کو اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ذکرِ جلی کو شاہ برہان الدین ہی کی تصنیف مانتے ہیں[2] لیکن اکبر الدین صدیقی نے لکھا ہے

'ظاہرا یہ بھی حضرت، جانم کا معلوم نہیں ہوتا'[3]

یہ صحیح نہیں۔ اس کے جانم کی تصنیف ہونے کے یہ دلائل ہیں

۱۔ اس کا موضوع ان کے دو منظوم رسالوں بشارت الذکر اور ارشاد نامہ سے مشترک ہے۔

---

[1] بحوالۂ ڈاکٹر ندیر احمد: ملی گزٹ تاریخ ص ۲۴۲

[2] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۱۷۳ [3] ارشاد نامہ کا مقدمہ ص ۲۷

Marfat.com

۲۔ اس میں وصیت الہادی اور ارشاد نامے کا ایک شعر لیا گیا ہے۔

۳۔ اس کی زبان کلمتہ الحقائق کی طرح ہے۔

۴۔ دو مخطوطوں میں اسے شاہ جانم کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ لکھتی ہیں

"شاہ صاحب کے اسی رسالے کو ان کے ایک مرید شریف نے منظوم بھی کیا تھا جس کا ایک مخطوطہ جامعہ بمبئی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس میں وہ اپنے مرشد شاہ برہان کا ذکر کرتا ہے۔ شاہ برہان نے خود بھی اسے منظوم کیا تھا اور "بشارت الذکر" نام رکھا ہے"[1]

اس کی حقیقت یہ ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں ۷۰ شعر کی مثنوی پنج گنج موجود ہے جس کا ذکر فہرستِ مخطوطات جلد سوم صفحہ ۸۱ - ۸۰ پر نیز جلد پنجم صفحہ ۲۷۵ پر ہے۔ اس میں یہ پانچ حصے ہیں۔

گنجِ اوّل ذکرِ جلی تعلقہ۔ گنجِ دوم ذکرِ قلب و سوسہ۔ گنجِ سوم ذکرِ روح مشاہدہ۔ گنجِ چہارم ذکرِ سر معاینہ۔ گنجِ پنجم ذکرِ خفی معاینہ۔[2]

ڈاکٹر زور نے اس کی صفائیِ زبان دیکھ کر بعد کی تصنیف قرار دیا لیکن ڈاکٹر نذیر احمد اسے شاہ جانم کی تصنیف ماننے پر مائل ہیں۔[3] بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں رسالہ پانچ ذکر (اذکارِ پنج گنج) بھی یہی ہے۔ اس میں مصنّف نے پانچ اذکار جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی کا بیان شاہ برہان کے حوالے سے کیا ہے۔ اس میں شاعر لکھتا ہے۔

جلی ہور قلبی، روحی سیومی — چہارم سری ہے، خفی پنجمی
یو پنج گنج عنایت کرے تجھ الٰہ — بفضلِ محمد رسالت پناہ
دکن کے جو ہیں پیر شاہِ برہان — کیے او وضح سوں ہر یک کو بیان[4]

---

[1] اردو نثر کا آغاز ص ۱۷۵

[2] علی گڑھ تاریخ ص ۲۲۹، نیز ڈاکٹر قیوم صادق: بیجاپور کی اردو مثنویاں ص ۸۴۔ ناشر مہاراشٹر اردو ادبی سرکل۔ تعلقہ احمد پور۔ ضلع عثمان آباد۔ ضلع عثمان آباد۔ مہاراشٹر۔ ۱۹۸۰ء

[3] علی گڑھ تاریخ ص ۲۲۹ [4] بیجاپور کی اردو مثنویاں ص ۸۵

Marfat.com

زبان کتنی صاف ہے۔ آخری شعر سے ظاہر ہے کہ شاہ برہان سے کافی بعد میں کسی شخص نے ان سے لے کر پانچوں اذکار کا بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کا بھی یہی خیال ہے کہ اس کی زبان نسبتاً صاف ہے اور 'ارشاد نامے' وغیرہ کے مقابلے میں بہت سہل اور بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کسی مرید نے ان کے نام سے لکھ دی ہو۔[1]

مقصودِ ابتدائی: اس رسالے کا صرف ایک نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں موجود ہے اور کلمتہ الحقائق کے ساتھ مجلّد ہے۔ اس میں کہیں کتاب یا مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کے بارے میں لکھا۔

"غالباً شاہ برہان ہی کا ایک رسالہ ہے"[2]

ڈاکٹر نذیر احمد اور اکبر الدین صدیقی دونوں اس سے متفق ہیں۔ رسالے کا آغاز یوں ہے۔

"الحمد للہ ... اے دوست، عزیزِ من، ابتدائی کا مقصود جے کچھ بولیا جاتا ہے
سوتوں خوب سن"

'ابتدائی کا مقصود' کے فقرے سے ڈاکٹر زور نے اس کا نام مقصودِ ابتدائی رکھا۔ اس میں سوال و جواب کے پیرائے میں تصوّف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا سوال جواب یہ ہے

سوال: پوچھئے اوّل تھے اوّل کیا تھا
جواب: بولیا اوّل حقیج تھا[3]

یہ سوال جواب کلمتہ الحقائق کے سوال جواب سے ملتا ہے

سوال: کہ خدائے تعالیٰ اوّل تھے اوّل کیوں ہے
جواب: قدیم تھے قدیم، اوّل تھے اوّل، اپیں تھا[4]

خاتمے میں چند ابیات ہیں۔

یوں دیکھے آپ دھنڈول ست کر کیرے سانچے بول

---

[1] تذکرۂ مخطوطات جلد سوم ص ۳۶۔ بحوالہ علی گڑھ تاریخ ص ۲۲۹

[2] تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اوّل ص ۵۴

[3] علی گڑھ تاریخ ص ۲۳۹

[4] کلمتہ الحقائق مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۲۲

Marfat.com

نہیں تو کھانے بلا بھیرے تیوں دین گنوایا سارا　　ایسے دھندے ہم جگ اندھے پھر بستے اپیچ ٹھارا
چلتے کا تو نیم نہیں رہے تو شہ پھوکٹ کھایا　　اس دھات عمر خرچ کیا سب، آخر پھر پچتایا[1]

ڈاکٹر نذیر احمد نے پہلے شعر سے مماثل ارشاد نامے کے چار شعر نقل کئے جن میں دھنڈول اور بول قافیہ آیا ہے۔ ان میں کا ایک شعر یہ ہے۔

جو اب آکھیں دیکھ دھنڈول　　جے تجھ ویسے صحی بول

دوسرے اور تیسرے شعر کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے کہ یہ جانم کے منظوم رسالے وصیت الہادی سے ماخوذ ہیں[2]۔ مجھے تیسرے شعر کی مماثل بیت مل گئی

چلنے کا تو نیم نہ ہوئے یہ تو شا پھوکٹ کھایا　　اس دھات عمر خرچ کیتا آخر پھر پچتایا[3]

اکبر الدین صدیقی لکھتے ہیں، اس کو سہو[4] شیخ محمود خوش دہاں سے بھی موسوم کیا گیا ہے[5]

کلمتہ الحقائق سے موضوع کی مماثلت اور وصیت الہادی سے اشعار کے اشتراک کے باعث اسے برہان الدین جانم کی تصنیف مانا جا سکتا ہے۔

معرفت القلوب: اس کا ایک نسخہ آغا حیدر حسن دہلوی کے کتب خانے میں تھا، ایک امین درگاہ بیجاپور میں ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں اس کا اقتباس دیا ہے[6]۔ وہی اقتباس ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے مقالے میں اور ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ابتدا کا نمونہ یہ ہے

بسم اللہ نانوں اللہ کا، الرحمٰن مہربان، الرحیم بخشنے ہارا اور بخشان ہارا۔ سرانا نوازنا خدا کوں بہوت کہ اور پرورش کرن ہارا تمام عالم کوں
جان اے سالک پچھانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے　　(دکن میں اردو ص ۱۷۶)

ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں، اس میں بسم اللہ کے جو معنی دیئے ہیں وہ وہی ہیں جو ارشاد نامہ کے حصہ اول میں آئے ہیں[7]

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۲۳۹　　[2] ایضاً ص ۲۴۰
[3] قدیم اردو ص ۲۶　　[4] مقدمہ ارشاد نامہ ص ۷۲
[5] طبع سوم ص ۱۷۶　　[6] علی گڑھ تاریخ ص ۲۴۳

Marfat.com

ملاحظہ ہو ارشاد نامۂ نثر کے ذکرِ جلی کا متعلقہ جملہ

'بسم اللہ ناؤں خدا کا' الرحمٰن الرحیم بخشنہارا' بخشانے ہارا'

نذیر احمد کے مطابق جملے کا دوسرا جزو شرحِ مرغوب القلوب سے مشترک ہے۔ موخر الذکر میں ہے۔

'سرانا نواز ناخدا کوں بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا'

یہ لفظی ترجمہ ہے 'الحمد للہ ورب العالمین' کا۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں

"بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان و بیان دونوں اعتبار سے یہ رسالہ برہان جانم ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ سرِ دست اور کچھ نہیں کہا جا سکتا"[1]

میں اس تیقّن کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ جانم سے انتساب کے دلائل اور ان میں کچھ شکوک ملاحظہ ہوں۔

الف۔ اس میں جانم کا مرغوب فاعلی لاحقہ ہارا آتا ہے لیکن جیسا کہ شرحِ مرغوب القلوب کی مثال سے معلوم ہوا میراں جی خدانما نے بھی 'پالن ہارا' کی ترکیب استعمال کی ہے۔

ب۔ اس میں شریعت' حقیقت' طریقت اور معرفت کا بیان ہے۔ جانم کے ارشاد نامۂ نثر میں یہ موضوعات اس ترتیب سے ہیں۔

شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت' وحدت

لیکن میراں جی خدانما خلیفۂ شاہ امین کی شرحِ مرغوب القلوب کے دوسرے باب میں معرفت القلوب والی ترتیب شریعت' حقیقت' طریقت اور معرفت ہی ہے[2]۔ شرحِ مرغوب القلوب سے ایک جملے کے اشتراک' موضوعات کی مشترک ترتیب نیز دونوں کتابوں کے ناموں کی مشابہت کے سبب مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ شاہ جانم کی نہیں میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔

ہشت مسائل : یہ وہی رسالہ ہے جسے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ اس کا نسخہ آغا حیدر حسن کے کتب خانے میں تھا جہاں سے لے کر نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' میں اس کا اقتباس دیا۔ وہی اقتباس ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنے

[1] ملی گڑھ تاریخ ص ۲۴۳ [2] بحوالہ اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۱۷۶

Marfat.com

مقالے میں اور ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ میں دیا ہے۔ اقتباس یہ ہے۔

"پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کوں معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السلام نے سوال کئے کہ سات طبق آسمان ہور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید ہے

جواب۔ تحدا کہیا اے حبیبِ من ایں ہمہ جدید آفریدہ شد

سوال۔ تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا

جواب۔ تجھ سوں میں تھا۔[1]

اس اقتباس کی زبان کلمتہ الحقائق کے مقابلے میں بہت صاف ہے لیکن اس میں اردو کے ساتھ ایک جملہ فارسی کا آگیا ہے۔ شاہ برہان کے دوسرے رسالوں کی طرح اس کے سوالوں میں بھی زبان جواب کے مقابلے میں جدید ہے۔ کیا ایسا ہے کہ جواب شاہ برہان ہی کے ہیں جب کہ سوال کی زبان میں کچھ ترمیم ہوگئی ہے یعنی کسی نے انھیں بعد میں مرتب کیا ہے۔ کسی نے وہ جزو نقل نہیں کیا جن میں اس رسالے کو شاہ برہان کا قرار دیا گیا ہے۔ بہ صورتِ موجودہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسالہ شاہ برہان ہی کا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ بعد کے ایک دوسرے بزرگ شاہ برہان رازِ الٰہی ہوئے ہیں۔

مجموعتہ الاشیا : ۱۳ صفحات کے اس رسالے کا واحد نسخہ انجمن ترقیِ اردو ہند میں ہے جہاں یہ میری نظر سے بھی گزرا۔ یہ کلمتہ الحقائق اور دوسرے رسالوں کے ساتھ ایک جلد میں ہے۔ اس کا عنوان ہے

'مجموعتہ الاشیا من تصنیفِ حضرت برہان الدین قطب الاخطاب'

آخر میں ہے

منج امین میرا نام ہیں ہے۔۔۔ امین مطلق۔۔۔ دیکھ امین کا چاؤ

ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں

"اس رسالے کے آخر میں انجمن کے مخطوطے میں ایک نظم 'امین' تخلص کی درج ہے جس کے متعلق قیاس ہوتا ہے کہ شاید وہ امین الدین اعلیٰ یعنی برہان جانم کے بیٹے ہوں۔ اس سے اس رسالے کی صداقت پر شبہ کم ہو جاتا ہے۔"[2]

---

[1] دکن میں اردو طبعِ سوم ص ۱۷۷ [2] علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو ص ۲۳۹-۲۳۸

Marfat.com

نثر میں بار بار 'امین' کا لفظ اور امین تخلّص کی نظم کی وجہ سے میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ جانم کا نہیں شاہ امین الدین اعلیٰ کا ہے۔

ابتدا میں ایک تمہید ہے جس میں رسالے کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد بقیہ متن سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ تمہید سے نمونہ

"اے رسالہ واسطے طالب کے سوال ہور جواب مختصر لائے ہیں۔ ذاتِ مطلق کتیں ہور صفات برحق کتیں معلوم کرے اپنی ذات کے تیں اس وجہ سوں کہوجے موافق اس حدیث کے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'

- - - - - - - - - - - - - - - -

اس رسالے کے تیئں نام مجموعتہ الاشیار رکھے ہیں

سوال: جو شاہد کیوں ہے

جواب: کہہ دو وجہ ہے یک ذاتی دوسرا صفاتی۔ ذاتی اُو ہے جو بے چون اور بے چونہ اور بے چگونہ اور بے مانند اور بے نمونہ"[1]

ڈاکٹر نذیر احمد کا مشاہدہ ہے کہ اس رسالے میں کلمتہ الحقائق کے کثیر الاستعمال الفاظ بے چون، بے چگونہ، کتیں استعمال ہوئے ہیں۔ 'پنا' کے لاحقے سے بھی اسم کیفیت بنائے گئے ہیں مثلاً مے پنا، یک پنا، بندہ پنا، مگر ہارا کے لاحقے کی جگہ والا استعمال ہوا ہے۔ کلمتہ الحقائق میں سوال و جواب کے شروع میں بارہا کہ' آیا ہے۔ اس رسالے میں جو آیا ہے[2]

معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ شاہ جانم کے بجائے شاہ امین کا رسالہ ہے۔

رسالۂ تصوّف:

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں[3] کہ اس رسالے کا حوالہ پروفیسر عبدالقادر سروری کی مملوکہ ایک بیاض میں ہے۔ عنوان میں یہ عبارت درج ہے۔

"مِن کلامِ شمس المحققین شاہ برہان الدین جانمن بیجاپوری قدس اللہ سرہ۔"

اس کے نیچے لفظ 'ارشاد نامہ' درج ہے جس سے مراد ہے کہ ان کے فرمودات درج ہیں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد رسالے کا آغاز یوں ہے

---

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۳۸ [2] ایضاً

[3] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۱۷۷۔ ۱۷۶

Marfat.com

ظاہر کا تن واجب الوجود' اس کا دیکھ روح جاری' اس کا شاہد مشہود' رسالے کا خاتمہ ایک نظم پر ہے جس کا آخری شعر یہ ہے

ہاتاں سو قدیر کر ہوا ناؤں وہ اسم مرید پیٹ اور پاؤں

یہاں 'قدیر' کے کیا معنی ہیں؟ قدرت والا؟ یا کسی شاعر کا تخلص ہے؟

ہمارے سامنے جو نثری جملہ اور جو شعر ہے اس کی زبان بہت صاف ہے. کوئی مضبوط قرینہ نہیں کہ یہ رسالہ شاہ برہان الدین جانم کی تصنیف ہے۔

رسالۂ وجودیہ: ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخِ ادبِ اردو میں جانم کے سلسلے میں لکھتے ہیں.

'کلمتہ الحقائق اور رسالۂ وجودیہ ان کی نثری تصانیف ہیں. باقی دوسری نثری تصانیف مشکوک ہیں' ص ۲۱۰

رسالۂ وجودیہ کا مخطوطہ انجمن ترقیِ اردو پاکستان میں ہے. مزید تفصیل میں جائے بغیر یہ عرض کرنا ہے کہ یہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ کا رسالۂ وجودیہ ہے. جالبی نے صفحہ ۲۱۲ پر جو اقتباس دیا ہے وہی حسینی شاہد نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۷۰ پر نیز ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کا مصنّف میں صفحہ ۵۷ پر دیا ہے۔

جانم سے منسوب اتنی بہت سی نثری تصانیف میں صرف کلمتہ الحقائق کو سو فیصدی یقین کے ساتھ ان سے منسوب کیا جاسکتا ہے. ارشاد نامۂ نثر بھی انھیں کا ہونے کے قوی دلائل ہیں. مقصودِ ابتدائی اور مجموعتہ الاشیا ان کے ہو سکتے ہیں. ہشت مسائل' معرفت القلوب' رسالۂ تصوّف اور رسالۂ وجودیہ ان کے نہیں معلوم ہوتے. دکھنی رسائل کے انتساب کے معاملے میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے جو کچھ شاہ امین کے تعلق سے کہا ہے وہ خواجہ بندہ نواز' شاہ میراں جی شمس العشّاق اور شاہ برہان الدین جانم سے منسوبات کے سلسلے میں بھی مفید ہے. کہتے ہیں

'حضرت امین کی تعلیمات کو ان کے سلسلے کے بزرگوں نے نثر کی طرح دہرایا ہے' بالخصوص گفتار' گنج مخفی اور رسالۂ وجودیہ (نثر) کے مضامین سے دکھنی نظم و نثر کے رسائل پٹے پڑے ہیں. مضامین مسائل اور اصطلاحوں کے اشتراک کی وجہ سے ان رسائل کی زبان اور ان کے اظہار و اسلوب میں اتنی مماثلت اور مشابہت پیدا ہو گئی ہے کہ جب تک کوئی

Marfat.com

بدیہی خارجی ثبوت نہ مل جائے مصنّف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ حکم نہیں لگایا جاسکتا"[1]

"جہاں تک زبان کی بناء پر کسی رسالے کے مصنّف یا زمانۂ تصنیف کے تعین کا سوال ہے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے کہ اب تک دکھنی زبان کی ان مخصوص لسانی خصوصیات، نحوی اور صرفی شکلوں کا سائنٹفک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے جو اس کے ارتقاء کے مختلف مدارج کی نشان دہی کرتے ہیں اور جن کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نظم و نثر کے کسی کارنامے کے بارے میں حکم لگا سکیں کہ وہ ان لسانی صوتی صرفی اور نحوی خصوصیات کی وجہ سے اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے بارے میں رائے زنی اٹکل پر ہوتی رہی ہے۔۔۔۔۔

زبان کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہوئے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ نقل در نقل کے ہاتھوں زبان میں بڑی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ہر نقل کرنے والا شعوری یا غیر شعوری طور پر نقل کرتے ہوئے زبان کو اپنے عہد کے مطابق کرتا جاتا ہے جس کی وجہ سے قدیم نمونے اپنی قدامت کھو بیٹھتے ہیں یا بڑی حد تک ان کی زبان کی کہنگی اور امتیازی خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں"[2]

زبان سے متعلق ڈاکٹر حسینی شاہد کے اس مشاہدے کے باوجود کسی مخطوطے میں زبان کی کیفیت سے رہبری ضروری ہوتی ہے۔

جانم کی تصانیف کا موضوع تصوّف ہے۔ ان کے بیٹے امین الدین اعلیٰ نے اپنی تصانیف میں موضوع کو اصطلاحوں، خود ساختہ اصطلاحوں سے گراں بار کر کے ریاضی کا رنگ دے دیا۔ مولوی عبدالحق شاہ جانم کی نظم ارشاد نامہ کے سلسلے میں ان عارفانہ رسالوں کے داؤں پیچ سے منغّض ہو کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالتے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ طویل اقتباس۔

"تصوّف ہماری ادبیات، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبے میں رچا ہوا ہے (شاید ہماری سیاسیات بھی اس سے خالی نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لاش ہے جس میں روح کا نام نہیں اور جسے ہم صدیوں سے پیٹتے چلے

---

[1] شاہ امین الدین علی اعلیٰ ص ۳۴۸ [2] ایضاً ص ۳۴۴۔

Marfat.com

آتے ہیں یا ایک شاندار درخت ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے، کہنے کو درخت ہے مگر صرف ایندھن کے قابل رہ گیا ہے یا ایک خوبصورت اور نامور عمارت کا کھنڈر ہے جس کی تعریف کر دینا ہی ہمارے ذوقِ سلیم کی دلیل ہے۔ یا ایک قبر ہے جو اپنے پُر عظمت گنبد کی وجہ سے بچ رہی ہے۔ بہت سوں نے اسے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ پیشے کی بدولت بہت سی مقدس چیزیں کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ بھی محفل کے گرمانے کے لئے ایک لطیفہ ہو گیا ہے۔

تصوّف اب اس کا نام ہے کہ چند اصطلاحیں یاد کر لیں یا چند آسن یا کروٹ لیے، اور نہیں تو کم سے کم لباس ہی میں جدت پیدا کر لی۔ حسن و عشق کے چرچے میں جب کچھ مزا نہ رہا تو تصوّف نے ہماری غزلوں میں چاشنی پیدا کر دی۔ کسی شعر میں تصوّف کی اصطلاح کا آجانا ہمیں وجد میں لانے کے لیے کافی ہے۔ مایوسی اور ناکامی، غفلت اور کاہلی کا سہارا اب یہی رہ گیا ہے اور کیا ستم ظریفی ہے کہ ریا کا دشمن خود ریا کے لباس میں جلوہ گر ہے۔ اور اب تو اس کی لے اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ شاید چند روز میں ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اس کے لیے کوئی ڈگری قائم کرنی پڑے۔

غرض تصوّف ایک قسم کی روحانی منطق ہے جو لفظی داؤ پیچ اور مبہم بیانات کا مجموعہ ہو گیا ہے۔ اسی قسم کے بیانات اور نظموں میں بھی ہیں جن سے نہ تزکیۂ نفس کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور نہ اخلاق پر کوئی اثر پڑتا ہے۔"[1]

یونیورسٹیوں میں ڈگری کی بات سچ ہو گئی۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور میں تصوّف کی پروفیسری قائم ہو گئی ہے۔

شاہ وجیہ الدین علوی:

ملفوظات کے سلسلے میں ان کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ ۹۱۰ھ میں محمد آباد (جاپانیر) میں پیدا ہوئے اور ۹۹۸ھ میں احمد آباد میں انتقال کیا۔[2] نجیب اشرف ندوی نے بھی یہی سنہ ولادت لکھا ہے جو ان کے بقول 'شیخ' سے نکلتا ہے اور سنہ وفات

---

[1] قدیم اردو ص ۳۸ [2] اردو کی ابتدائی نشوونما ص ۳۰

Marfat.com

۹۹۱ھ جو شیخ وجیہ الدین سے برآمد ہوتا ہے[1]۔ ظاہرا ندوی صاحب نے مادۂ وفات حل کرکے نہیں دیکھا کیونکہ 'شیخ وجیہ الدین' سے ۱۰۲۹ھ نکلتا ہے۔ ندوی صاحب کی تاریخ کے خلفشار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۹۹۸ھ ہی صحیح سنہ وفات ہوگا۔ یہ ۳۳ سال کی عمر تک تحصیلِ علم کرتے رہے۔ شاہ قادنِ کے مرید تھے لیکن دراصل انھوں نے فیضِ روحانی شیخ محمد غوث گوالیری سے حاصل کیا۔ ان کے بھائی قاضی برہان الدین کے بیٹے شاہ ہاشم حسین علوی بھی اردو کے مصنف تھے۔ وجیہ الدین کے مریدوں میں احمد گجراتی بھی تھا جس نے قلی قطب شاہ کے عہد میں مثنوی لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا لکھیں۔

جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ان کے حالات اور ملفوظات میں دو مجموعے بحر الحقائق اور ملفوظ شاہ وجیہ الدین ملتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے تاج الحقائق کو بھی انھیں کی تصنیف گردانا ہے[2] لیکن ڈاکٹر نور السعید اختر نے اپنی کتاب تاج الحقائق میں ثابت کر دیا کہ یہ وجہی کی تصنیف ہے۔ اس کے بارے میں مفصل بحث دسویں باب میں وجہی کے سلسلے میں کی جائے گی۔

اس طرح شیخ وجیہ الدین علوی نے ملفوظات کے علاوہ اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔

---

[1] علی گڑھ تاریخ ص ۱۰۱

[2] اردو نثر کا آغاز ص ۱۴۷

Marfat.com

ساتواں باب

بیجاپور اور بیدر میں اُردو شاعری

سترہویں صدی میں

جب بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو ۱۴۹۵ء میں یوسف عادل شاہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بانی سلطنت بیجاپور نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے جہاں محمد شاہ کے گورنر سے بہت سے قلعے چھین لیے اور دریائے بھیما سے بیجاپور تک تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا[1]۔ وہیں ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے بھی اپنی ریاست کی بنیادیں مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ یوسف عادل شاہ خود شاعر تھا[2] اور شعراء کی قدر و منزلت سے واقف تھا۔ فارسی اور ترکی پر اسے عبور حاصل تھا۔ یوسف عادل شاہ کے دورِ حکومت میں بقول پی ایم جوشی بیجاپور کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی[3]۔ عبدالحق نے "ہندوی" کو اس عہد کی "ثانوی زبان" تحریر کیا ہے۔ یوسف عادل شاہ کے دورِ حکومت میں بیجاپور اہل حرفہ صناع اور اہل علم کا مرکز بن گیا تھا اور اسی زمانہ میں حاجی روحی شیخ نصیرالدین، نصراللہ ولی، پیر جمنا اور حضرت پیر معصوم وارد بیجاپور ہوئے تھے۔ یوسف عادل شاہ نے بہمنیوں کی پیروی میں ہندوستانی تہذیب کی اصل روح کو باقی رکھا اور اس کی گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھایا یوسف کے زمانۂ حکومت میں بچوں کو جن ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا ان میں بھی ہندوستانیت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یوسف کی شہزادی کا نام بی بی ستی تھا۔ سلطنت کی حفاظت اور مدافعت کے لیے نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی اور انھیں "چیلے" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یوسف کے جانشین اسمٰعیل نے ایک نیا شہر چندا پور کے نام سے آباد کیا تھا! اسمٰعیل کا تعمیر کردہ

---

[1] جان برگس۔ رائٹرز آف محمڈن پاوران انڈیا (انگریزی) جلد سوم۔ ص ۵

[2] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک۔ ص ۱۸، ص ۱۹

[3] پی ایم جوشی۔ ہسٹری آف میڈیول انڈیا۔ جلد اوّل ص ۳۹۵

Marfat.com

شاہی محل چمپا محل کہلاتا تھا۔[1] اسماعیل بقول میر سعادت علی رضوی فارسی کا ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔[2] وہ علما اور فضلا کی قدردانی اور رعایا پروری کے لیے مشہور تھا۔ جے این چودھری لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ اوّل کے عہد کا ایک اہم کارنامہ فارسی کے بجائے "ہندی کو دفتری زبان" قرار دینا ہے اس نے آفاقیوں کو فوج کے اہم عہدوں سے برطرف کر کے ان کی جگہ "دکھنیوں" کو ممتاز عہدوں پر فائز کیا۔ ابراہیم کے عہد میں ایک غیر ملکی زبان کی جگہ ایک مقامی اور دیسی زبان یعنی دکنی کو حاصل ہو گئی۔ شاہی دفاتر میں حسابات وغیرہ کا اندراج فارسی میں ہوتا تھا۔ لیکن دکن کے سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے بعد سے فارسی کا اثر کم ہونے لگا اور شاہی مراسلت میں بھی دیسی زبان کا استعمال ہونے لگا۔ وی سی ورما "ہسٹری آف بیجاپور" میں رقمطراز ہیں کہ شاہی دفتروں میں فارسی کی جگہ مراٹھی نے لے لی تھی[3] "تاریخ فرشتہ" میں محمد قاسم فرشتہ نے بھی عہد ابراہیم عادل شاہ اوّل کے عہد حکومت کے اس اہم واقعے کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ نے "امرائے غریب" کی "معزولی" اور "دفتر فارسی را برطرف ساختہ کردہ بہمانہ را صاحب دخل گردانیدہ" کی تفصیل بیان کی ہے۔ خافی خان نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ جنوبی ہند میں مراٹھی کنڑی اور تلگو رائج تھی ان زبانوں کے علاقوں میں نظام شاہی، قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں قائم تھیں لیکن ان میں سے کسی زبان کو بھی "ہندوی" سے موسوم نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف ابتدا ہی سے دکن کو "ہندوی" اور "ہندی" کہا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی اور برہان الدین جانم کے کلام سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ "بساتین السلاطین" کے مورخ کا بیان زبان زیادہ واضح ہے وہ لکھتا ہے۔

آنا چوں طبع ہمایوں پاشاہ اکثر میل بجانب نعت خاص خویش یعنی زبان دکن است
..... شعرائے ہندی گو بسیار از خاک بیجاپور برخواستہ اند[4]

سلاطین بیجاپور اگر دکنی زبان سے شخصی دلچسپی نہ لیتے اس زبان میں شعر نہ کہتے اور اس کی کما حقہ حوصلہ افزائی نہ کی جاتی تو شاید بیجاپوری ادب کا سرمایہ اتنا گرانقدر نہ ہوتا۔ بہمنی دور میں اردو کا خاصا

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ ص ۹۲

[2] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک ص ۲۷

[3] وی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ ص ۲۰

[4] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۴۳۰

Marfat.com

چرچا رہا یہاں تک کہ دکنی کو دفتری زبان کی حیثیت بھی عطا کی گئی تھی اور اس میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو چکا تھا۔ بیجاپور بہمنی حکومت کا ایک حصہ تھا اس لیے بہمنی دور ہی میں یہ علاقہ دکنی زبان سے آشنا ہو چکا تھا۔ صوفیاء اور علماء نے تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں اس زبان کو ذریعۂ اظہار بنا کر خطۂ دکن میں اسے عوامی مقبولیت بخشی تھی۔ شیخ عین الدین گنج العلم کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دکنی زبان میں وعظ کہتے اور اسی میں اظہار خیال کرتے تھے[1]۔ ان کی تعلیمات سے بیجاپور کی فضائیں گونج اٹھی تھیں ان کے مریدوں کے علاوہ خواجہ بندہ نواز کے سلسلے کے مشائخین اور ان کے معتقدین نے بھی اسی زبان سے جو عوام میں رائج تھی اپنی تعلیمات اور مذہبی تصورات کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیا تھا۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں شاہ میراں جی شمس العشاق کی مساعی کا ذکر ضروری ہے۔ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے دکن میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کر دیں۔ "مغز مرغوب" اور "چہار شہادت" کا متن شائع ہو چکا ہے۔ شمس العشاق اردو کے دور اولین کی ان ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی کاوشوں نے دکنی ادب کی بنیادیں استوار کیں اور یہ بتا دیا کہ اس نوخیز زبان میں پھلنے پھولنے اور عوام کا دل موہ لینے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ رشد و ہدایت کے سلسلے میں صوفیاء نے اپنی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا اور یہی اس عہد میں ابلاغ و ترسیل کا سب سے موثر وسیلہ تھی۔ شمس العشاق بیجاپور کے اولیائے کبار میں سے تھے اور انھوں نے دکنی زبان و ادب کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شمس العشاق سے لے کر شاہ تراب چشتی تک چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے دکنی ادب کی نشوونما اور فروغ میں اہم حصہ لیا۔ صبغۃ اللہ بازی کا قیام بیجاپور میں مختصر رہا لیکن اس کے دیرپا اثرات قائم ہوئے ان کے مریدوں میں عاشق قابلِ ذکر ہے۔ بیجاپور کے علماء اور صوفیاء میں ایک قابل لحاظ تعداد بیدر کے مشائخین اور اہل طریقت کی تھی اس سلسلے میں "سکھ انجن" اور "توصیف" کے شاعر شاہ ابو الحسن اور ان کے خاندان کے مختلف افراد کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں بیدر سے بیجاپور کا مکانی قرب بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب گجرات کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو یہاں کے علماء اور اہل حرفہ تلاش روزگار میں بیجاپور پہنچے یہ وہ مختلف اسباب تھے جن کی بنا پر بیجاپور میں دکنی زبان و ادب تیزی کے ساتھ ترقی کے زینے طے کر رہے تھے۔

---

[1] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۹۵

Marfat.com

علی عادل شاہ کے زمانے میں علم وادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔ علی نے خاندانی روایات کی پاسداری کی اور فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی کی قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ علی عادل شاہ اوّل کے عہد حکومت میں بیجاپور میں عراق عرب، ایران اور دوسرے مقامات سے شعراء اور علماء آکر یہاں رہ بس گئے۔ خود بادشاہ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اور اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں ۱۶۱۲ء تک دربار میں ظہوری اور ملک قمی کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن دونوں بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے ایک دکنی شاعر عبدل نے دربار میں ان کی جگہ لے لی۔ اب بقول مسعود حسین خان رفتہ رفتہ بیجاپور میں فارسی کی جگہ "ہندوی" شاعری لیتے جا رہے تھے۔ عبدل کا مشہور ادبی کارنامہ "ابراہیم نامہ" ہے وہ اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "ابراہیم نامہ" میں کہتا ہے کہ دربار بیجاپور میں نئے پھول کھل رہے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ موسیقی میں اپنی مہارت اور کمال کی وجہ سے جگت گرو کہلاتا تھا وہ ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس نے کتاب نورس" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ ابراہیم نے سنسکرت شاعر نرہری کی سرپرستی تو عبدل کی بھی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی۔ عبدل ابراہیم نامہ میں کہتا ہے کہ بادشاہ بیجاپور کا دربار علماء، فضلاء اور شعراء سے معمور رہتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں مقامی روایات اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی قدر و منزلت، دکنی زبان کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوئی اور دکنی میں طبع آزمائی کرنا باعث توقیر سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ابراہیم کے عہد میں بیجاپور میں دکنی ادب نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بقول رچرڈ میکس ویل ایٹن عادل شاہی سلطنت میں سب سے زیادہ صوفی جمع ہو گئے تھے۔

محمد عادل شاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کا جانشین تھا اور ۱۰۳۷ھ میں سربرآرائے سلطنت ہوا تھا۔ اس کے بعد حکومت میں فارسی اور دکنی کی بڑی سرپرستی اور حوصلہ افزائی۔ آتشی نے "خمسہ نظامی" کے جواب میں پانچ مثنویات لکھی تھیں اور ظہوری کے فرزند ظہور نے "خمد نامہ" مرتب کیا تھا۔ اس کی ملکہ شہر بانو بڑی علم دوست اور ادب نواز ملکہ تھیں۔ اس کی پرورش گولکنڈے کے اس ادبی ماحول میں ہوئی تھی جو شعر و ادب کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔ رستمی کا "خاور نامہ" اور ملک خوشنود کی مثنوی "جنت سنگار"، ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو کی سرپرستی کا نتیجہ

سلہ رچرڈ میکس ویل ایٹن۔ صوفیز آف بیجاپور (انگریزی) صہ ۱۰۴

Marfat.com

ہیں[1]۔ سلطان محمد عادل شاہ کی شادی نواب مظفر خان کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ حسن شوقی نے اپنی مثنوی "میزبانی نامہ" میں اس شادی کی تفصیلات نظم کی ہیں جس سے اس عہد کی معاشرت، رسوم و رواج اور آداب مجلس پر روشنی پڑتی ہے۔ حسن شوقی نے "میزبانی نامہ" میں اس عہد کی محفل آرائیوں کی بڑی متحرک اور گویا تصویریں پیش کی ہیں۔ محلات کی سجاوٹ، نشست و برخاست کے آداب مختلف قسم کے کھانوں، روشنی کے انتظامات، پان کے بیڑوں کی تقسیم سازوں کی ترنم ریزی، زرق برق لباس، زیورات کی چمک دمک اور رقص و سرود کی انجمنوں کے عمدہ مرقعے شاعر نے اپنی مثنوی میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیئے ہیں۔ صنعتی محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر تھا۔ اس نے "قصہ بے نظیر" (۱۰۵۵ھ) میں پریوں اور دیوں سے تحیم انصاری کی معرکہ آرائی کی جو تفصیلات اپنی مثنوی میں نظم کی ہیں۔ ان سے اس عہد کے سامان حرب و ضرب کا پتہ چلتا ہے اور اس عہد کے اسلحہ جنگ کے بارے میں ہمیں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

محمد عادل شاہ نے ۱۰۶۸ھ میں انتقال کیا اور علی عادل شاہ ثانی سربرآرائے سلطنت ہوا۔ عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کرتا تھا اور اس کا شمار بیجاپور کے سربرآوردہ شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ علم و ادب کا دلدادہ تھا۔ قاضی کریم اللہ، شاہ کمال، علامہ فتح اللہ شیرازی اور سطور زماں، ملا احمد قاضی نور اللہ اور مصطفی خاں کیانی اس عہد کی نامور شخصیتیں تھیں۔ بادشاہ کی قدردانی اور سرپرستی کی وجہ سے انھوں نے بیجاپور کو اپنا مسکن بنالیا تھا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مرزا مقیم۔ دولت شاہ، حکیم آتشی اور عبدالقادر اس عہد کے مشہور شعراء تھے اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بادشاہ کی علم دوستی کا اس سے بھی ثبوب ملتا ہے کہ اس نے شاہ نور اللہ کو "تاریخ علی عادل شاہ" مرتب کرنے پر مامور کر دیا تھا۔ نصرتی بادشاہ کا رفیق و جلیس تھا اور اس نے سلطان وقت کی فتوحات اور اس کے محاورات کی "علی نامہ" میں بڑی اچھی مصوری کی ہے۔ "بساتین السلاطین" کا مورخ محمد ابراہیم زبیر رقمطراز ہے کہ "دکنی" علی کی "مادری زبان" تھی[2] اور دکنی سے اسے طبعی لگاؤ اور مناسبت تھی اور چوں کہ علی اپنے عہد کا بلند پایہ سخنور تھا اس لیے "استاد عالم" کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا۔ سکندر بیجاپور کا آخری حکمراں تھا اسے عالمگیر نے بقول مورخ "گلدستۂ بیجاپور" ۱۱۱۱ھ میں زہر ہلاہل سے ہلاک کردا

---

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری (مضمون) مشمولہ نوائے ادب۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۶۲

[2] محمد ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ص ۲۵

Marfat.com

دیا تھا۔ سکندر نے مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ شیواجی نے بعض عادل شاہی قلعوں پر قبضہ کرلیا تو سکندر نے بہلول خاں کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا تھا اور شیواجی کا لشکر حملے کی تاب نہ لاکر منتشر ہوگیا تھا۔ نصرتی نے "سکندر نامہ" میں عادل شاہی حکومت کی اس آخری بڑی معرکہ آرائی کا حال نظم کیا ہے۔

جب ہم عادل شاہی دور میں اردو زبان وادب کی ترقی کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی حکمرانوں کے زمانے میں دکنی نے نشوونما اور فروغ کی اہم منزلیں طے نہیں کی تھیں۔ اس عہد کے علماء وصوفیاء دکنی کے ذریعہ سے جو عوامی ترسیل کا ایک کامیاب وسیلہ ثابت ہوئی تھی، اسلامی عقائد کی ترویج واشاعت کرارہے تھے دکنی عوام کی زبان تھی اور یہی ادبی تصانیف کا بھی محرک بنی۔

عادل شاہی دور میں باقاعدہ نثر نگاری کا آغاز ہوا برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقائق"، اور اس کے بعد ان کے فرزند امین الدین اعلیٰ کی "کلمۃ الاسرار" اور دوسرے رسالے منظر عام پر آئے۔ جانم نے ارشاد نامہ، بشارت الذکر منفعت الایمان، رموز الواصلین اور وصیت الہادی بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔

محمود خوش دہاں نے اپنی مثنوی علم الحیاۃ میں بادشاہ وقت جگت گرو ابراہیم عادل شاہ کی رعایا پروری علم دوستی اور شجاعت وسخاوت وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے اور کہتا ہے۔

اس دنیا میں میانے ہے ایک شاہ
اس کوں حق کا نت پناہ
سلطان ابراہیم جوں خلیل
شیریں سخن نظر جمیل
ایں نور سں بولے ہیں
اپنا علم بھی کھولے ہیں
سب دلیا کے استاد کلاتے
جو اُن ایسا علم پاتے

شہباز حسینی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت میں بیجاپور میں موجود تھے۔ شہباز ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ مرزا مقیم سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور اس نے

سلہ حمید شطاری (مترجم) گلدستہ: بیجاپور۔ ص ۱۱۸

Marfat.com

قلعہ بکھری کی فتح کے موقع پر فتح نامہ مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مقیمی اسی دور کا شاعر ہے۔ مقیمی کی مشہور مثنوی "چندر بدن و مہیار" کا اس دور کے مورخ خاص نور اللہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ "سکھ انجن" کے شاعر شاہ ابو الحسن کا وطن بیدر تھا اور ان کے والد برہان الدین حبیب اللہ بیدر کے مشاہیر شیوخ میں سے تھے۔ ابو الحسن بیدر کی سکونت ترک کر کے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور چلے آئے تھے "صحیفہ اہل ہدیٰ" کے مصنف نے ان کے نام کے آخر میں "البیدری ثم البیجاپوری" تحریر کیا ہے۔ سید محی الدین ابن سید محمود قادری نے "صحیفہ اہل ہدیٰ" میں شاہ ابو الحسن اور ان کے افراد خاندان نے بیجاپور میں رشد و ہدایت کا جو قابلِ قدر کام انجام دیا ہے اور علم و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا مفصل حال قلمبند کیا ہے۔ مصطفیٰ قادری کے بیٹے شمس الدین قادری متوفی ۱۱۲۸ھ ۱۷۱۵ء شاعر تھے ان کی مثنوی "علم سکوک" کا پتہ چلتا ہے مثنوی "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" کے شاعر احمد گجراتی کے فرزند شیخ محمد شریف عاجز نے مشہور رومانی قصے اپنی مثنویوں میں نثر کیا ہے ان کے مثنویوں کے نام بھی یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں ہیں۔ عاجز نے علی عادل شاہ کی مدح میں اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں شعر کہے ہیں اور مثنوی لیلیٰ مجنوں میں محمد عادل شاہ کے سپہ سالار کی تعریف و توصیف کی ہے۔ صنعتی بھی سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کا شاعر ہے۔ اس نے ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۴ء میں اپنی مثنوی قصہ بے نظیر مکمل کی تھی چنانچہ وہ کہتا ہے۔

محمد شہ داد گر دیں پناہ
کہ ہر دم محمد جسے دست گاہ
براہیم کے بعد از ہوا نامدار
جگت میں محمد شہ کامگار

یہ مثنوی اپنی ڈرامائی تاثر کی وجہ سے بیجاپوری ادب میں ایک خاص انفرادیت کی حامل ہے اس نے رزم و بزم دونوں کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مرقع کشی کی ہے اس کی ایک اور مثنوی "گلدستہ" بھی دستیاب ہوئی ہے۔ شعرائے بیجاپور کے یہاں رزم و بزم دونوں کی پر اثر پیشکشی اس بات کا ثبوت ہے کہ بیجاپوری ادب کا دامن وسیع ہو گیا تھا اور اس میں تنوع کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کی بہن سلطان خدیجہ شہر بانو کا جب سلطان محمد شاہ سے بیاہ ہوا تو جہیز کے ساتھ بیجاپور آنے والے زریں کمر غلاموں میں ملک خوشنود بھی تھا۔ بیجاپور جگت گرو نے علم و دانش کی جو شمع روشن کی تھی وہ اس کے بعد اور فروزاں ہو گئی۔ سلطان محمد عادل شاہ بھی بیجاپور کا بڑا علم

Marfat.com

دوست اور ادب نواز حکمراں تھا اور اسی کے دور میں ملک خوشنود نے "جنت سنگار" لکھی تھی ملکہ خدیجہ سلطان نے اعلان کر دیا تھا کہ بیجاپور میں جو شاعر ابن حسام کے خاور نامہ (فارسی) کو دکنی میں خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرے گا اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا جائے گا۔ رستمی نے ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں ملکہ کے حکم کی تعمیل کی تھی "خاور نامہ" ۱۰۵۹ھ ۱۶۴۹ء میں مکمل ہوا تھا۔ "خاور نامہ" دکنی کی سب سے طویل مثنوی ہے اور چوبیس ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ سلطنت میں نہ صرف بادشاہوں نے علم و ہنر کی قدر دانی کی بلکہ یہاں کی ملکہ نے بھی شعراء کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف علم و ادب کا چرچا ہو اور اہل قلم کی قدر دانی کی جا رہی ہو شعر و ادب کا نشو و نما پانا اور ترقی کی منزلیں طے کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں معلوم ہوتا۔

حسن شوقی ایک سیلانی شاعر تھا وہ احمد نگر اور گولکنڈے کے علاوہ بیجاپور کے دربار سے بھی وابستہ رہا تھا۔[1] حسن شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ چھے سو بیس ۶۲۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ جنگ تالی کوٹ دکن کی ایک بہت اہم اور فیصلہ کن جنگ تھی اس جنگ میں ابراہیم قطب شاہ، عادل شاہ، حسین نظام شاہ (احمد نگر) اور بریڈ شاہ (بیدر) کی متحدہ فوجوں نے سلطنت وجیا نگر کا خاتمہ کر دیا تھا اور راجہ رام راج کو شکست اٹھانی پڑی تھی۔ تاریخی اعتبار سے فتح نامہ نظام شاہ اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔ "میزبانی نامہ" میں بادشاہ کی تقریبات شادی کی تفصیل نظم کی ہے۔ جس سے اس دور کے رسوم و رواج تہذیبی اقدار، آداب محفل اور گوناگوں ثقافتی مظاہر پر روشنی پڑتی ہے۔ مختار پور کے علم دوست خداں محمد عادل شاہ اور سکندر عادل شاہ کے زمانۂ حکومت میں دارالنور بیجاپور میں موجود تھا۔ عادل شاہی پایۂ تخت اس وقت علم و ادب اور صنعت و حرفت کی ایک عظیم مرکز بن گیا تھا۔ "اس نے معراج نامہ" یادگار چھوڑا ہے۔ شاہ اول کی ادبی کاوشیں بھی بیجاپور ہی میں منصۂ شہود پر آئیں۔ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں محمد امین ایاغی نے اپنی مثنوی "نجات نامہ" (۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء) میں پیش کی تھی۔ ایاغی نصرتی کا ہم عمر تھا اور غزل گو شغلی بھی بیجاپور سے تعلق رکھتا تھا۔ بیجاپور میں مختلف اصناف سخن نے تشکیل و تعمیر کی منزلیں طے کر کے دکنی ادب کو مالا مال کر دیا۔

بیجاپوری ادب کے ابتدائی دور میں گجری زبان و بیان، ذخیرۂ الفاظ، طرز ادا، طرز فکر اور لب و لہجے پر سنسکرت اور ہندی اس طور و روایت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ فارسی اسلوب کا رنگ

---

[1] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۱۰۲

Marfat.com

ابھی چوکھا نہیں ہوا تھا۔ بیجاپور کے ابتدائی ادب پر یہی رنگ غالب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی طرز اظہار اور عجمی تصورات کا رنگ جیسے جیسے گہرا ہوتا گیا ہندوی روایت دم توڑتی گئی۔ برہان الدین جانم، ابراہیم عادل شاہ ثانی اور شیخ داؤد وغیرہ کے یہاں گجری روایت کی پذیرائی نسبتاً زیادہ ہے۔ ملک خوشنود کی جنت سنگار مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" اور صنعتی کی قصۂ بے نظیر میں عجمی اثرات اور تہذیبی میلانات کا احساس زیادہ گہرا اور ہمہ گیر نظر آتا ہے۔ لیکن ہندوی اثر پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ گجری روایات سے گہری وابستگی نے بیجاپور کے دور اوّل کی نظم و نثر کے نمونوں کو گولکنڈے کے اسلوب سے الگ اور ممیز کر دیا۔ شعرائے بیجاپور کی زبان اور ان کا طرز ادا گجری اثرات کے تابع رہا اس لیے اس میں قدامت و اجنبیت کا احساس باقی رہا۔ نصرتی جیسا عظیم المرتبت شاعر بھی لچھمی نرائن شفیق کو اس لیے درخورِ اعتنا نظر نہیں آتا کہ اس کی زبان پر ہندوی اور گجری لغات کی چھاپ موجود ہے چنانچہ "چمنستان شعراء" میں وہ کہتا ہے "الفاظش بطور دکھنیاں بر زبان ہا گراں می آید"[1] رفتہ رفتہ عجمی اثرات اور لغات، تشبیہات استعارات اور طرز فکر بیجاپوری ادب میں نفوذ کرنے لگے اور اسے گجری سے قرب رکھنے والی اہل بیجاپور کی زبان، اُن روایات و اسالیب سے گریز نہ کر سکی جو اس کے وجود کا جزو بن گئے تھے اِس حقیقت کا ادراک ہمیں "سب رس" اور "کلمۃ الحقائق" یا "کلمۃ الاسرار" کی زبان اور طرز تحریر کے مقابلے و موازنے سے حاصل ہوتا ہے یا مقیمی یا غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بیجاپور کے تہذیبی و ادبی مزاج کی تشکیل مقامی اثرات، ہندوی خصوصیات اور "ہندسنانیت" کے زیر اثر ہوئی تھی۔ اور بیجاپوری ادب ایک خاص حد تک گجری روایات کا رہین منت تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیجاپوری اسلوب سے آخر وقت تک عجمی اثرات کی پذیری کے باوجود ہندوی اثر پوری طرح زائل نہ ہو سکا۔ پراکرتوں کے مواد سے تراکیب وضع کرنے کا رجحان تشبیہات و استعارات کے استعمال کی نوعیت ذخیرہ مرکبات اور پورے شعری آہنگ پر عالمگیر کی فتح دکن تک یہی ایک رنگ چھایا رہا۔ یہ اثر نہ صرف لسانی اور تخلیقی سطح پر کارفرما رہا بلکہ فکر کا عنصر بھی براہ راست اس کی زد میں آگیا تھا۔ بیجاپور کے فلسفیانہ تصورات پر بھی یہ اثر غالب رہا۔ عرفان نفس سلوک کی اوّلین منزل تصور کی جاتی ہے اور من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ وجود کے ادراک کا پہلا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ بیجاپور کے مشائخین اور عطا نے اس پر بطور خاص زور دیا ہے میراں جی

---

[1] لچھمی نرائن شفیق۔ چمنستان سعراء۔ صـ ۲۲۲

Marfat.com

شمس العشاق کی تعلیمات میں اس کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ جانم نے بھی وجود کے چار مراتب پر زور دیا ہے اور چار عناصر واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود کی تشریحات ان صوفیا کے یہاں بار بار ہماری نظر سے گزرتی ہے۔ امین الدین اعلیٰ نے اپنے خانوادے کے مخصوص تصورات کی مزید وضاحت کی لیکن ہندوستانی فلسفے سے اثر پذیری کے نتیجے میں انھوں نے ہندو فلسفے سے "خالی" کا تصور مستعار لیا اور یہ پانچواں عنصر ہے جسے امین الدین اعلیٰ نے مقامی فلسفے کے زیر اثر اخذ کیا ہے اور یہی فلسفہ پانچ عناصر پچیس گن کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ بیجاپور کے ان مشائخین کے یہاں اسلامی اور ہندو فلسفے کے مخصوص تصورات میں ایک طرح کے قرب کا احساس ہونے لگتا ہے۔ رام و رحیم میں یکجائی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بھگتی تحریک اور تصوف دونوں نے احترام آدمیت اور محبت پر زور دیا ہے۔

بیجاپوری ادب میں ہر قسم کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہے وہ صوفیانہ تصورات، فلسفیانہ نکات، معاملات حسن و عشق، پند و موعظت، اخلاق آموزی، رزم و بزم اور ہر قسم کے خیالات کی ترسیل اپنی مخصوص لغات اور اسلوب میں کرتا رہا۔ شعرائے بیجاپور نے اپنی مثنویوں میں اپنے ادبی تصورات کی بھی ترجمانی کی ہے صنعتی شعر کی عظمت سے آشنا ہے وہ کہتا ہے کہ شاعر کائنات کے اسرار و رموز کو بے نقاب کرتا ہے دنیا جسم ہے اور شعر اس کی روح اس لیے شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سہ

جو کچھ ہے شہادت میں ہور غیب میں
سخن کے سمانا ہے آجیب میں

جہاں کا لبد ہور سخن جیو ہے
سخن جیو ہے جیو میں پیو ہے

ملک خوشنود اور عبدل شعری کارناموں کو سدا بہار عظمت و توقیر کا حامل تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انہی کے ذریعے سے شاعر دنیا میں اپنا نام باقی رکھ سکتا ہے چنانچہ عبدل "ابراہیم نامہ" میں کہتا ہے سہ

نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں
اگر کچھ رہے تو بچن شعر جاں

شاعر کے اس تصور سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے شعرا سخن سنجی کو نفس بیکاری کا مشغلہ یا کوئی غیر اہم فعل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کی ابدیت اور دائمی حیثیت کے قائل تھے اس لیے ان شعرا نے زبان و بیان، تخیل و تفکر اور ابلاغ و ترسیل کی بہترین صلاحیتوں سے کام لیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کی ادبی مساعی کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ مل سکے داستانوں

Marfat.com

میں تخیل کی اونچی اڑانوں کے لیے وسیع میدان موجود تھا اور مافوق الفطرت عناصر کو محیر العقل بنا کے پیش کرنے کا موقع بھی میسر تھا اس لیے ان سے بھی بڑے سلیقے اور ادبی ذکاوت کے ساتھ کام لیا گیا ہے۔

بیجاپوری ادب کو واقفیت اور تاریخی شعور نے بھی مالا مال کر دیا ہے۔ حسن شوقی کی مثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ"، مرزا مقیم کی "فتح نامہ بکھری"، اور نصرتی کا "علی نامہ"، یہاں بطور خاص قابل ذکر ہیں مورخین کا خیال ہے کہ تاریخ دانی میں نصرتی نور اللہ سے بہتر ہے۔ رستمی کا "خاور نامہ" حضرت علی کے محاربات کی تصویر ہے لیکن اس میں تاریخی واقعات پر تخیل کی کارفرمائی غالب آگئی ہے۔

شعرائے بیجاپور نے بحور و اوزان کے سلسلے میں بھی ابتداءً ہندوی اور گجری روایات کی پابندی کی لیکن رفتہ رفتہ ان میں تبدیلی آتی گئی۔ جگت گرو کا کلام بیجاپوری ادب میں ہندوی بحروں اور اراکین و افاعیل کا آخری بڑا نمونہ ہے لیکن اسی کے دربار کے شاعر عبدل نے ظل اللہ کی پیروی کرنے کے بجائے فارسی اوزان کو ترجیح دی ہے۔ ابراہیم سے لے کر محمود بحری تک فارسی بحروں کو اپنانے کا ایک مسلسل رجحان کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ وقت کا تقاضہ بھی تھا اور شاعری کے ذوق کا تقاضہ بھی۔

جب ہم بیجاپور میں مختلف اصناف سخن کی نشوونما کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کی طرح غزل بھی ایک پسندیدہ صنف سخن رہی ہے۔ حسن شوقی، علی عادل شاہ شاہی، نصرتی اور شغل وغیرہ نے اس صنف کی نشوونما میں اہم حصہ لیا ہے۔ یوں تو بیجاپور کے اکثر شعراء نے غزل کی صنف سے سروکار رکھا ہے لیکن حسن شوقی، ملک خوشنود نصرتی اور شاہی نے بیجاپور میں اس شعری ہیئت کی نوک پلک درست کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے ملک خوشنود نے غزل کے اشعار کو روانی، گھلاوٹ، نغمگی و شگفتگی سے آشنا کیا۔ بیجاپور کا آخری مشہور غزل گو بحری ہے جس کی زمینوں میں ولی نے غزلیں کہی ہیں۔ بحری کے کلام میں سرزمین دکن اور اس کی روایات کی پاسداری و محبت کا بار بار احساس ہوتا ہے۔ اس نے اس خطۂ ارض سے اپنی وابستگی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے سہ

بحری کوں دکن یوں ہے کہ جوں نل کو دمن ہے
پس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

بحری اس عبوری دور کا غزل گو ہے جب نئے سیاسی، معاشرتی اور لسانی رجحانات کے تحت دکن اور شمال کی زبان میں ہم آہنگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اسی دور کے آخر میں ولی نے ریختہ کے نئے معیاروں سے دکنی غزل کو روشناس کرایا۔ شعرائے بیجاپور جن لسانی اور ادبی روایات کو رفتہ رفتہ قبول کرتے جا رہے تھے وہ اب شعر گوئی کا معیار تصور کی جا رہی تھیں۔

Marfat.com

شعرائے بیجاپور میں غزل کے خدوخال ایک صنف ادب کی حیثیت سے پہلی بار حسن شوقی کے کلام میں اجاگر ہوتے نظر آتے ہیں۔ شاہی، نصرتی اور بعض دوسرے شعراء کی غزلوں میں جسم کی آنچ زیادہ شدید اور نمایاں ہیں۔ جنسی پہلو زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔ ریختی میں عورت اظہار عشق کرتی ہے اور اپنے جذبات واحساسات کی بے تکلفی کے ساتھ ترجمانی کرتی ہے۔ بیجاپور ریختی گوئی کے سلسلے میں گولکنڈے سے آگے دکھائی دیتا ہے۔ ہاشمی بیجاپور ہی کا ایک کامیاب شاعر نہیں بلکہ اردو شاعری میں ایک مسلّمہ ریختی گو کی حیثیت سے منفرد مقام کا حامل ہے۔ ہاشمی نے محض جذبات کی عکاسی ہی پر اکتفا نہیں بلکہ مستورات کے محاورے ان کے طرز تکلّم، ان کے مخصوص کنایات، ان کے کوسنے اور تکیہ کلام کو بھی اپنی ریختیوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر کے ایک قابلِ قدر ادبی خدمت انجام دی ہے۔ ہاشمی نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے لباس وزیورات، آداب نشست وبرخاست، خواتین کے رہن سہن، ان کے طرز فکر، توہمات اور ان کی جذباتی زندگی کی بڑی پُر اثر مرقع کشی کی ہے۔

مثنویوں کی ابتداء میں جہاں شعرا بادشاہ وقت کی مدح کرتے ہیں قصیدے کی اثر آفرینی اور مدحیہ رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔ ملک خوشنود نے "جنت سنگار" میں سلطان محمد عادل شاہ کی تعریف وتوصیف کی ہے۔ حسن شوقی "فتح نامہ نظام شاہ" میں سلطان وقت کا مدح خواہاں نظر آتا ہے۔ اسی طرح "فتح نامہ بکھیری" میں حکمراں وقت کی مدحت طرازی ملتی ہے۔ بزرگانِ دین کی بھی تعریف وتوصیف ملتی ہے علی عادل شاہ شاہی نے خواجہ بندہ نواز کی شان میں شعر کہے ہیں یا اپنے محل اور باغ کی توصیف وتعریف کی ہے۔ نصرتی نے "علی نامہ" میں مثنوی کے درمیان علاحدہ قصیدے پیش کئے ہیں ہیئت کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مثنوی کے درمیان ٹانک دیا گیا ہے لیکن نصرتی ایسا باکمال سخن گو ہے اور فن پر اُسے اتنا عبور حاصل ہے کہ ادبی ادب کے اعتبار سے دو علاحدہ اور مختلف المزاج اصناف اپنی منفرد اور علاحدہ حیثیت باقی رکھتے ہوئے بھی نامل اور بے ربط نظر نہیں آتے۔ بلکہ ان میں خیال وبیان کی یک رنگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کے درمیان کوئی خلا پیدا نہیں ہونے پاتا۔ نصرتی کے قصائد کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو کا ایک ایسا قصیدہ نگار ہے جس کی مساعی کا ذکر کیے بغیر قصیدے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی اور نصرتی کی رباعیاں موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کے اعتبار سے گرانقدر ہیں۔ شعرائے بیجاپور نے رباعی کے صنف کو جو اخلاقی ومتصوفانہ تصورات کے لیے مختص سمجھی جاتی تھی۔ عشقیہ مضامین وموضوعات سے متعارف کروا دیا۔

Marfat.com

بیجاپور کے اکثر حکمران اہلبیت کے معتقد اور مداح تھے اس لیے بھی مرثیے کی صنف نے یہاں بہت ترقی کی بلکہ خدیجہ سلطان نے جو صاحب بڑے کہلاتی تھیں حسینی محل کے نام سے ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کروایا تھا اس کی ستائش نصرتی نے "علی نامہ" میں کی ہے یہاں محرم میں علم ایستادہ کئے جاتے ہیں اور ہر روز مرثیہ خوانی ہوتی اور اہل بیت کے مصائب بیان کیے جاتے تھے بانی سلطنت یوسف عادل شاہ بہمنی وزیر محمود گاوان کا تربیت یافتہ تھا۔ "تاریخ دکن" میں سید علی بلگرامی لکھتے ہیں کہ یوسف عادل شاہ نے محمود گاوان کی صحبت میں مذہب اثنا عشری اختیار کر لیا تھا ڈی سی ورما "ہسٹری آف بیجاپور" میں رقمطراز ہیں کہ ذی الحجہ کے مہینے میں جمعہ کے دن ۹۱۰ھ میں بیجاپور کی مسجد قلعہ ارک میں یوسف عادل شاہ نے نماز پڑھی تھی اور نصیب خاں سے جو سادات مدینے سے تھا اذان دلوائی تھی جس میں حضرت علی کا نام لیا گیا تھا اور خطبہ میں ائمہ معصومین کے نام شامل کیے گئے تھے۔[۲] بقول ابوالنصر محمد خالدی ہندوستان کی تاریخ میں بیجاپور پہلا مقام ہے جہاں سے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان ہوا تھا۔[۳] علی عادل شاہ اوّل نے دو نہروں کے درمیان ایک خوبصورت باغ تیار کروایا تھا اور اس کے ساتھ ایک عالی شان مسجد بھی تیار کروائی تھی جس کا نام حضرت علیؓ کے نام پر "مسجد غالب" رکھا گیا تھا۔ اس مسجد میں ایک ہزار تینتیس (۱۰۳۳) چراغ دان تھے اور یہ اعداد لفظ "غالب" سے برآمد ہوتے ہیں۔ محمد عادل شاہ کا جانشین علی عادل شاہ ثانی نے ۱۰۶۷ھ کے عہد حکومت میں حسینی محل میں ہر سال مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ اس کا ذکر نصرتی نے "علی نامہ" میں کیا ہے۔ نصرتی لکھتا ہے کہ علی عادل شاہ ثانی کو اہلِ بیت اطہار سے بڑی مودت و عقیدت ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اس نے "مائی نیکو کار" کے سایۂ عاطفت میں بچپن گزارا تھا۔ نصرتی کہتا ہے سہ رکھتا ہے اہلبیت سوں اخلاص موروثی سدا یعنی کہ جب مشہور ہے تس مائی نیکو کار کا نصرتی نے "علی نامہ" میں علی عادل شاہ ثانی کی اہل بیت سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے محرم میں اس کی مصروفیات پر روشنی ڈالی ہے اور شب عاشور بادشاہ کے علموں کی شہر گشت کا مفصل حال نظم کیا ہے خود علی عادل شاہ شاہیؔ کے کلیات میں حسینی محل کی تعریف و توصیف میں ایک نظم موجود ہے۔ مختصر

---

[۱] سید علی بلگرامی تاریخ دکن حصہ اوّل۔ ص ۲۶۹

[۲] ڈی سی ورما۔ ہسٹری آف بیجاپور۔ باب چہارم۔ ص ۵۲

[۳] ابوالنصر محمد خالدی۔ کچھ دکھنی کلام (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی۔ جولائی ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۹

Marfat.com

یہ کہ عادل شاہی عہد کی تہذیبی زندگی کے اس تناظر میں جب ہم بیجاپوری ادب میں مرثیوں کی کثرت دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ عادل شاہی اہلِ بیت حکمراں کے پرستار تھے اس لیے ان کے عہد میں مراسم عزاداری کی بہتات اور رثائیہ کلام سے دلچسپی ایک فطری امر معلوم ہوتی ہے۔ محرم میں عزاداری کی مختلف تقریبات کے انعقاد کے موقع پر مرثیہ کہنا یا عزائیہ کلام پیش کرنا باعث سعادت تصور کیا جاتا تھا۔ جگت گرو ابراہیم عادل شاہ اور پھر علی عادل شاہ شاہی کے بیجاپور میں راگ رنگ اور موسیقی کی محفلیں تہذیبی زندگی پر اتنی چھائی ہوئی تھیں کہ رثائیہ کلام موزوں کرتے ہوئے شعراء نے ان پر راگ راگنیوں کے نام لکھ دیئے ہیں۔ یہ مرثیے گائے جاتے تھے اس لیے شعراء نے ان میں نغمگی اور ترنم کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ ملک خوشنود، شاہی اور مرزا وغیرہ نے مرثیہ نگاری کی نشوونما میں اہم حصہ لیا۔ بیجاپور کے بعض مرثیے گیتوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ عادل شاہی عہد کی ابتدا میں گیت اور دوہرے خاصے مقبول رہے بعض گیتوں کا موضوع حسن و عشق ہے لیکن اکثر گیتوں کا مزاج متصوفانہ ہے اس سلسلے میں برہان الدین جانم اور امین الدین اعلیٰ کے کلام سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اس قسم کے گیت ان سے پہلے بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی اور علی جیو گام دھنی پیش کر چکے تھے۔ شعراء بیجاپور کے گیت طرز اظہار اور خیالات کی پیشکشی میں ان سے نسبتاً بہتر اور موثر معلوم ہوتے ہیں۔ بیجاپور میں گیت کہنے کی روایت موجود تھی اس لیے مرثیے جو گانے کی غرض سے لکھے جاتے تھے اس کا ہلکا سا رنگ جھلک گیا ہے

مرزا بیجاپور کے دور آخر کا مرثیہ نگار ہے اس نے مسلسل اور طویل مرثیے لکھے ہیں اور اپنے مراثی میں مکالموں سے بھی کام لیا ہے۔ بیجاپور کے عزائیہ کلام میں مرزا کی مرثیہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس نے مرثیے کے خدوخال کو نئی آب و تاب عطا کی اور روایتی طرز سے انحراف کر کے بعض جدتیں بھی کیں اور نئے تجربات کیے ہیں۔ حضرت حر کا مرثیہ قصیدہ کی ہیئت میں کہا گیا ہے اور اس میں مثنوی کی طرح قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔ مرزا کے بعض مرثیے مربع کی شکل میں بھی ہیں اور اس نے اپنے کلام کے لیے غزل کی ہیئت کو بھی اپنایا ہے۔

عادل شاہی دور کے ابتدائی چند برسوں میں ادب نے کوئی غیر معمولی ترقی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دربار میں فارسی کا بول بالا تھا۔ غالباً اسی لیے اس دور میں صرف چند ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے اصناف سخن کے متنوع استعمال کی طرف بھی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اور شاعری میں فکر کی گہرائی اور ادبیت کا عنصر بہت کم اجاگر ہو سکا تھا۔

بیدر ۱۴۲۴ء سے ۱۶۵۶ء تک بہمنیوں کا پایۂ تخت رہا تھا۔ احمد شاہ ولی بہمنی نے ۱۶۲۴ء

Marfat.com

میں اپنا دارالسلطنت منتقل کیا۔ اور سیاسی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے یہ سرزمین شنگرف غیر معمولی اہمیت کی حامل بن گئی۔ اس دور میں بیدر اہل حرفہ اور اہل علم وفن کا مرکز تھا جب بہمنیوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو بقول محمد سلطان مصنف "یادگار سلطانی"، المعروف بہ آئینۂ بیدر امیر برید نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قید کر دیا اور امیر برید نے بیدر پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

برید شاہی دور کے شعراء اور ادیبوں میں "بھوگ بھل" کا شاعر محمد بن عیسیٰ خان امیر برید ثانی کے دور کا شاعر ہے۔ قریشی نے "در دور ثانی امیر"، کہہ کر اپنے زمانہ حیات کی وضاحت کر دی ہے۔ فنی نقطہ نظر سے "بھوگ بل"، قریشی کا کوئی غیر معمولی ادبی کارنامہ نہیں ہے اس کی ادبی اہمیت تاریخی اور لسانی ہے "بھوگ بل"، کی اہمیت کا راز اس کی قدامت اور موضوع کی قدرت میں پوشیدہ ہے۔

قریشی وہ پہلا شاعر ہے جس نے ہندوی اور دکنی میں خط فاصل قائم کیا وہ کہتا ہے ؎

یو شاعر کیا نظم دکنی تمام

"بھوگ بل"، کے موضوع سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں علمی موضوعات کی طرف شاعر متوجہ ہو رہے تھے۔ قریشی کا موضوع جنس سے متعلق ہے اور اس نے "رتی رہس"، نامی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ قریشی کہتا ہے کہ "رتی رہس"، کا شاعر بہت دانشمند اور "بدونت" تھا اور اس علم میں اُسے مہارت حاصل تھی۔ جنس کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ پہلی دکنی تصنیف ہے اس میں جنسیات کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوی ادب کی روایات سے خوشہ چینی کا رجحان اس عہد میں عام تھا۔ سنسکرت ادب میں اس موضوع پر، وانسائین نے پہلی بار توجہ کی۔ اس نے "کام سوتر" مرتب کی تھی۔ قریشی نے "بھوگ بل"، میں گلگوک پنڈت اور رتی رہس کے حوالے دیئے ہیں "ولایت نامہ" اور "بھوگ بل"، دونوں قریشی کی ادبی کاوشیں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ سنہ ۱۰۰۱ھ میں یہ مثنوی مکمل ہوئی تھی "ولایت نامہ" اور "بھوگ بل"، ادبی اعتبار سے بلند پایہ شعری کارنامے نہیں لیکن ان سے بیدر میں ادب کے آغاز وارتقاء اور برید شاہی عہد کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی

محمد قلی قطب شاہ اور اکبر کا ہم عصر عادل شاہی حکومت کا چھٹا فرمانروا ابراہیم عادل شاہ ثانی سنہ ۹۷۸ھ میں پیدا ہوا تھا[1] علی عادل شاہ اوّل لاولد تھا اور اس نے اپنے بھائی شاہ طہماسپ کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا[2]۔ اور اپنی زندگی

---

[1] علی بن طیفور لبسطامی، حدائق السلاطین۔ مخطوطہ نمبر ۵۲۷۔ کتب خانہ سالار جنگ صـ ۱۱۱ ب۔

[2] سید محسن۔ عبد ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ صـ ۱۹

Marfat.com

ہی میں ماہ شوال ۹۸۷ھ میں ایک عظیم الشان جشن منعقد کر کے ابراہیم کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔[۳] اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھتیجا ابراہیم سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس وقت ابراہیم کی عمر تقریباً نو سال[۴] تھی اس لیے افضل خاں جو ابراہیم عادل شاہ اوّل کے زمانہ میں وکیل سلطنت تھے اس کمسن بادشاہ کے متولی یا نائب السلطنت مقرر ہوئے۔ ابراہیم زبیری "بساتین السلاطین" میں لکھتے ہیں، "دراں ہنگام مدارج عمرش از نہ سالگی تجاوز نکردہ بود"[۵] چار معتبر امرا شاہ کمال الدین، فتح اللہ مرتضیٰ خاں آبخو، منجن خاں اور افضل خاں کی آپس میں گفت و شنید کے بعد، "مسند عزت و شوکت" اور "چتر سبزہ زنگاری"، جو "لازمۂ عادل شاہیہ" تھا ابراہیم کے حصے میں آیا۔ ابراہیم کو مستقبل میں تخت و تاج کا وارث بننا تھا اس لیے اس کے چچا نے اس کی تعلیم و تربیت پر بطور خاص توجہ کی تھی وہ بچپن ہی سے علم و ادب کا شایق، متین، بردبار اور سنجیدہ شہزادہ تھا۔ "کتاب نورس" کے ایک گیت میں وہ اپنی قابلیت پر ناز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "ابراہیم کے باپ علم کے دیوتا گنپتی اور ماں سرستی ہیں سہ

ابراہیم کو گوت پتا دیو کر گنپتی ماتا پوتر سرستی عہد ابراہیم کے سنسکرت شاعر نے جو بقول پی جی لاے غالباً ابراہیم کا درباری شاعر بھی تھا ابراہیم کو "نورس منجری" میں گنپتی کا گوت اور "سارذا دریا" کا بیٹا کہا ہے۔ "بساتین السلاطین" اور "تاریخ فرشتہ" کے مورخین اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ نوعمری میں وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں مصروف رہنے کے بجائے تحصیل علوم میں مگن رہتا تھا۔ اور اس نے قرآن مجید کی تعلیم کے علاوہ خوش نویسی اور فنون سپاہ گری، خطاطی، مصوری اور نقاشی میں درک پیدا کیا تھا۔ وزیر شاہ نواز خاں نے اسے فارسی تعلیم کی جانب متوجہ کیا تھا اور اساتذہ مقرر کیے تھے۔ علی عادل شاہ کی رحلت کے بعد دکن کی فریس و دانشمند ملکہ چاند بی بی نے جو احمد نگر کی مشہور شہزادی اور عادل شاہی حکمران علی عادل شاہ اوّل کی ملکہ اور ابراہیم کی چچی تھی، ابراہیم کی تربیت کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ملکہ چاند سلطانہ سے ابراہیم کو بڑی محبت تھی دس سال تک مختلف متوالیاں ریاست امور سلطنت کی نگرانی کرتے رہے۔ کامل خاں کشور خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں ابراہیم

---

[۱] فدا علی طالب (مترجم)، تاریخ فرشتہ جلد چہارم۔ ص ۸۵

[۲] جان برگس۔ رائلز آف دی محمڈن پاورز آف انڈیا۔ ص ۸۷

[۳] ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ ایشان پنجم۔ ص ۱۵۲

Marfat.com

کے نگراں اور مشیر رہے تھے۔ دلاور خاں حنفی مذہب کو بیجاپور کا سرکاری مذہب قرار دینے کا خواہاں تھا اور اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ حنفی عقائد کا نصف صدی سے زیادہ عرصے تک بیجاپور میں بول بالا رہا۔ متولیوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی ابراہیم کو سامنا کرنا پڑا۔ کشور خان نے اس خبر پر کہ مصطفٰے خان کو چاند سلطانہ ابراہیم کا پیشوا اور متولی بنانا چاہتی ہے اسے قتل کرکے اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا لیکن اس اقدام سے چاند بی بی اور بیجاپور کی تمام رعایا سخت برہم تھی[۲] کشور خاں چاند بی بی سے بھی خائف تھا اس لیے اس نے ملکہ پر تہمت لگادی کہ وہ اپنے بھائی نظام شاہ سے خفیہ مراسلت کر رہی ہے تاکہ بیجاپور نظام شاہیوں کے قبضے میں چلا جائے[۳]۔ مختصر یہ کہ کشور خاں کے ایما پر چاند بی بی کو محل شاہی سے گرفتار کرکے ستارا روانہ کر دیا گیا[۴] ان پیشواؤں اور متولیوں سے ابراہیم کو ۱۵۹۰ء کو نجات ملی اور آخری متولی دلاور خاں کا زوال اس کے حق میں فال نیک ثابت ہوا[۵] عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے مورخ دلاور خان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس وقت وہ ریاست بیجاپور کا مطلق العنان حاکم تھا ..... اب وہ جوان ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ خود حکومت کرے۔ مگر دلاور خاں نے ایسا جکڑ دیا تھا کہ کچھ کرتے بن نہ پڑتی تھی[۶] لیکن بادشاہ نے اس معاملے میں بڑے تدبر اور دوراندیشی سے کام لیا

---

۱ نذیر احمد۔ اردو شہ پارے پر ایک نظر (مضمون)، مشمولہ تحقیقی مطالعہ۔ ص ۱۲۵

۲ سید علی محسن۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ ص ۶۶

۳ (۱) " " " " ص ۶۹

۴ ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان پنجم ص ۱۶۳

۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طالب (مترجم) ص ۸۸۔ ۱۲۵

۶ سید علی محسن۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ ص ۱۷۶

Marfat.com

اور عین الملک اور آنکس خان کی مدد سے دلاور خان کے تسلّط سے نجات حاصل کی اور اب اس کی حقیقتی بادشاہت کا آغاز ہوا۔ ابراہیم نے ایک قلیل عرصہ میں بیجاپور کی سلطنت کو مستحکم کر دیا اور اس کے لیے اُسے معرکہ آرائی بھی کرنی پڑی۔ جب دلاور خان بیجاپور سے راہ فرار اختیار کر کے احمد نگر میں پناہ گزیں ہوا تو وہاں اس کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور برہان نظام شاہ نے اسے اپنا مشیر خاص بنا لیا اور دلاور خان کے ورغلانے پر بیجاپور کی سلطنت سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جب بیجاپور پر برہان نظام شاہ کا لشکر حملہ آور ہوا تو اسے ہزیمت اٹھانی پڑی اور ابراہیم کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ "بساتین السلاطین" کی روایت کے مطابق "یک صد و شصت فیل ہزار اسپ و اسلحہ بیشمار"[2] اور بقول فرشتہ "صد فیل بزرگ کوہ تمثال و چہار صد سوار"[3] سلطنت بیجاپور کو جنگ میں کامیابی پر دستیاب ہوئے۔ ۱۳ محرم ۱۰۰۴ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۵۹۶ء کو بادشاہ اپنے دارالسلطنت کو کامیاب و کامران لوٹا۔ میر محمد صالح[4] ہمدانی اس وقت بیجاپور آئے ہوئے تھے اور وہ اپنے ساتھ موے مبارک لائے تھے ابراہیم نے انھیں شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا اور اس مقدس تحفہ کے عوض انھیں مالامال کر دیا۔

ابراہیم کی ملکہ چاند سلطان احمد ملی کی بہن تھی اس طرح ابراہیم عادل شاہ ثانی محمد قلی قلب شاہ کا بہنوئی تھا۔ ابراہیم نے ایک جگہ اپنی محبوب ملکہ کی اس طرح تعریف کی ہے ؎

دھن بی بی چاند سلطان ملکی جہاں
اتم سندری ایسی کہاں

یا شاعر کہتا ہے ؎

ابراہیم سب سندری دیکھا بولچھن ہے کہاں
جات چاند سلطان نانوں ملکے جہاں

ابراہیم بڑا خوش گو تھا اور فن موسیقی سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ ابراہیم نے علم موسیقی کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے دور میں اہل کمال کو حکومت کی

---

[2] [3] " " " " " ص ۱۹۸

[4] جان برگس۔ دی رائٹز آف محمڈن پاورانِ انڈیا۔ ص ۹۶

[5] " " " ص ۱۱۴

Marfat.com

جانب سے مالی امداد دی جاتی تھی۔ ابراہیم علم دوست تھا اس لیے اس کے دربار میں علماء و فضلاء کی بڑی عزت و توقیر ہوتی تھی۔ علماء و فضلا کی کثیر تعداد سے جو پایۂ تخت میں موجود تھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم نے علوم و فنون کی ترقی اور رعایا کے علمی و ادبی ذوق کی تسکین اور ان کی ذہنی تربیت کے کیا کیا سامان فراہم کیے تھے۔ اس عہد میں بیجاپور علم و ہنر کا مرکز بن گیا تھا۔ مورخین میں محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ گلشن ابراہیمی" اور رفیع الدین شیرازی نے "تذکرۃ الملوک" کی وجہ سے شہرت حاصل کی اور ادیبوں اور شعراء میں ظہوری، ملک قمی، باقر کاشی، سنجر کاشی اور ابوطالب بکم جیسی ہستیاں ابراہیم کے دربار سے وابستہ تھیں اور دکنی شعراء میں عبدل کا طوطی بول رہا تھا۔

ابراہیم نے بچپن میں خوش نویسی کی تربیت حاصل کی تھی۔ بادشاہت کے بعد بھی یہ اسکا ایک محبوب مشغلہ رہا۔ ظہوری دیباچہ "خوان خلیل" میں رقمطراز ہیں کہ ابراہیم خط نسخ، ثلث، شکست اور نستعلیق کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔[1] مشہور خوش نویس خلیل اللہ بیت شکن عہد ابراہیم سے تعلق رکھتا تھا۔[2] مصوری میں بھی ابراہیم نے دستگاہ حاصل کی تھی۔ شاہی مصور فرخ حسین اپنے عہد کا باکمال فن کار تھا۔[3] ابراہیم فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اور فن موسیقی میں کمال حاصل کرکے "جگت گرو" کا لقب اختیار کیا تھا۔[4] وہ خود کہتا ہے:

ابراہیم گائے بجائے پر جنگ
جگت گرو نادمورت خطاب پائے

اس دور کے سنسکرت شاعر نرہری کی "نورس منجری" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو "جگت گرو" کے علاوہ "نادمورتی" کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ ابراہیم شطرنج سے خاص دلچسپی تھی اور وہ اپنے عہد کا بہترین کھلاڑی تصور کیا جاتا تھا۔ ظہوری نے اس کے بارے میں اٹھارہ رباعیاں کہی تھیں۔[5] ابراہیم کے اشعار سے اس کی علم دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ ابراہیم گاتا بجاتا ہے اور اس کا دل لچھمی سے بیزار ہوگیا ہے سرستی دیوی ابراہیم سے خوش ہوگئی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کو لفظ "نورس" اتنا مرغوب تھا کہ اس نے اسے مختلف اشیاء کے

---

[1] نذیر احمد۔ ظہوری لایت۔ انڈورک (انگریزی) ص ۳۳

[2] نذیر احمد علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب الف۔ اور ادب عادل شاہی میں ص ۲۵۱

[3] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۱۸۰

[4] نذیر احمد۔ لائف اینڈ ورک (انگریزی) ص ۳۳

Marfat.com

لیے استعمال کیا ہے۔ اپنی سواری خاص کے ہاتھی کا نام اس نے "نورس پیکر" تجویز کیا تھا۔ اسی طرح اپنی ایجاد کردہ راگنی کو اس نے "نغمۂ نورس" سے موسوم کیا تھا۔ ان کے علاوہ شراب محل، سکہ، علم اور نشان وغیرہ جیسی مختلف النوع چیزیں اسی نام سے موسوم تھیں۔ ابراہیم لفظ "نورس" کا ایسے رسیا تھا کہ وہ "شاہ نورس" کہلانے لگا۔[1] رفیع الدین شیرازی کا بیان ہے کہ ابراہیم نے ۱۰۰۸ھ میں توروے کے مقام پر ایک نیا شہر آباد کیا تھا جس کا نام نورس تجویز کیا تھا کیوں کہ یہ ابراہیم کا مرغوب لفظ تھا۔

قطب شاہی اور نظام شاہی سرحدوں پر فوج کشی ابراہیم کی زندگی کی پہلی جنگی مہم تھی۔ بیجاپوری فوجوں نے قلعہ اوسہ کا محاصرہ کرلیا اور احمد نگر پر چڑھائی کی تیاری مکمل کر دی تو مرتضیٰ خاں نے صلابت خاں کو جو اس فساد کا باعث تھا عہدے سے معزول کر دیا اور اپنے امرا رکو دلاور خاں کے یہاں پیام صلح کے ساتھ روانہ کیا۔ قطب شاہی سرحد پر حملے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ "گلشن ابراہیمی" اور تاریخ "قطب شاہی" کے بموجب محمد قلی کی ایک بہن ابراہیم سے منسوب تھی اور محمد قلی نے پالکی روانہ کرنے میں تساہل" کیا تھا جب محمد قلی کو اپنی سرحد پر بیجاپوری فوج کی آمد کی خبر ملی تو انھوں نے امیر زنبیل مصطفےٰ خان کی ہمراہی میں جس کے ساتھ امین الملک اعتبار خان فخر الملک وامین خاں بھی تھے چاند سلطان کی سواری نلدرک روانہ کر دی اور وہیں ابراہیم کا عقد ہوا۔[2]

ابراہیم اپنے تدبر اور فراست کے باوجود شمشیر وسنان سے زیادہ "طاؤس در باب" کا دلدادہ تھا۔ اس کے ملک کا اس کے شعر سے اندازہ ہوتا ہے وہ کہتے ہیں۔ ؎

اس جگ میں دو پکھ لیجئے
ایک تنبورا ایک کامنی کیجئے

ابراہیم نے ۹۸۸ھ تا ۱۰۱۳ھ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) تک بڑے تزک و احتشام کے ساتھ حکومت کی۔ عبدالمجید صدیقی "مقدمۂ تاریخ دکن" میں لکھتے ہیں کہ ابراہیم کے دور میں سلطنت نے بڑی ترقی کی تھی۔[1] ان کے عہد میں بیجاپور علوم وفنون کا مرکز بن گیا تھا۔ ابراہیم نے ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۶۰۳ء میں بیجاپور کا نام تبدیل کر دیا اور اسے بیدیاپور سے موسوم کیا عبدل دہلوی نے ابراہیم کے دارالسلطنت کو اہل ہنر کا ملجا وماوا قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہاں مختلف ملکوں کے لوگ

---

[1] نذیر احمد۔ مشہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی) ص ۳۲

[2] سید علی حسن۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ ص ۱۴۵، ص ۱۴۶

Marfat.com

آآ کر بسنے لگے تھے۔

بسے شہر دوران سب بھیس کا — رہے لوگ سکھ سوں چھپن دیس کا (۵۶)
جس کوئی ملک عالم میں دیکھا پھرائے — بدیاپور نگر میں رہو سکھ سوں آئے

سنسکرت شاعر نرہری نے بدیاپور کی نواس منجری میں بڑی تعریف کی ہے[۱]۔ عبدالحمید صدیقی لکھتے ہیں کہ ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء[۲] میں ابراہیم نے بیدر فتح کیا۔ عہدِ ابراہیم میں بیدر کو بیجاپور میں ضم کر دیا گیا جو ایک اہم فوجی کارنامہ ہے[۳]۔

"سباتین السلاطین" میں ابراہیم کی شکل و صورت اور وضع قطع کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ عبدل نے بھی "ابراہیم نامہ" میں اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حسن و جمال کو بھی بہت سراہا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا حسن و جمال یوسف سے فزوں ہے۔ اس کی سن نشر ظہوری" کے باب ہفتم سے بھی ہوتی ہے جس کی سرخی "صورت زیبا و طلعت جہاں آرا" ہے۔ عبدل کہتا ہے ؎

یوں شہہ روپ کی سن کہانی تمام — رہ کر سیکھا مصر یوسف مدام
کہ مجھ روپ تھے ہو ادھک شہہ دکن — گلا روپ بھر کر سو چوسٹھ لکھن

"کتاب نورس" میں خود ابراہیم اپنی تصویر کھینچتے ہوئے "در مقام کیدار" کہتا ہے کہ ایک ہاتھ میں ساز ہے اور دوسرے میں کتاب ہے اور نواس کے گیت گاتا جاتا ہے۔ اس نے زعفرانی پوشاک زیبِ تن کی ہے اس کے دانت کالے ہیں اور ناخن حنا بند ہیں اس کے گلے میں مالا ہے اور اس کا شہر بیندیاپور اور اس کی سواری ہاتھی ہے۔

"سہ نثر ظہوری" میں "سیرت پسندیدہ و اطوار برگزیدہ" کے زیرِ عنوان بادشاہ کے حسن سیرت کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ ظہوری نے بادشاہ کی فہم و فراست اور نکتہ دانی کے کئی واقعات قلمبند کیے ہیں وہ ایک جگہ کہتا ہے۔ ؎

زر خالص سخن بدولت او
فکر من کیمیا طبیعت او

---

[۱] عبدالحمید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۶۸

[۲] پی جی لالے۔ "پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ آزری فلکیت اِن نورس منجری" مشمولہ جنام پرتم ۱۹۸۵ء ص ۵۲

[۳] عبدالحمید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۷۲

Marfat.com

"حدائق السلاطین" میں علی بن طیفور کے الفاظ "بوفور عقل و کیاست موصوف و بکمال فہم و فراست مصروف"[1] سے بھی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی دانائی کا اظہار ہوتا ہے۔ "سہ نثر" میں ظہوری نے ابراہیم کی ہنر پروری اور علوم و فنون سے اس کے شغف اور اہل کمال کی سرپرستی کا بھی ذکر کیا ہے کہ بادشاہ ملک گیری کی ذمہ داریوں کے باوجود دوسروں کو علم و ہنر کی دولت سے مالامال کرتا ہے" باوجود شغل ملک گیری و رعایت احوال رعایا و لشکری بار جگت گروی یعنی استادی عالم برگردن گرفتن و زحمت تربیت شاگردان کشیدن غرض التفات مرحمت است"[2] عبدل نے ابراہیم کے شہر بدیاپور اس کے قلعہ ارک محلات شاہی اور اس کے بازاروں کی تعریف کی ہے جہاں جواہرات کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ عطریات کی دکانیں سجی ہوتی ہیں اور "محبوبان دلربا" مست خرام ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد کے دو انگریز سیاح فچ FICH اور نیو ہیری New Berry نے ۱۵۸۳ء میں عادل شاہ کے دارالسلطنت کو ایک ایسا خوبصورت، متموّل اور عالی شان شہر پایا تھا جہاں امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ مغل سفیر اسد بیگ نے جو ابراہیم کی برتری کا زیادہ قائل نہ تھا اپنی سیاسی عصبیت کے باوجود، اس کے دلفریب شہر کی خوبصورتی اور یہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور دلنواز محلات کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔[3]

ابراہیم نے نہ صرف اپنے پایۂ تخت کے قدیم نام بیجاپور کو بدلا بلکہ ایک نیا شہر بھی بسایا جسے "نورس پور" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ ۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء میں بیجاپور کی مغربی سمت تقریباً چار میل کے فاصلے پر اس نے شہنواز خاں کے زیر نگرانی نیا دارالسلطنت تعمیر کروایا تھا۔[4] اس شہر میں ابراہیم نے اپنے لیے ایک خاص محل تعمیر کروایا تھا جو سنہری اور لاجوردی رنگ آمیزی کا بے مثل نمونہ تھا۔ یہ "نورس محل" اپنی خوبصورتی اور کاریگری کے اعتبار سے ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ ظہوری نے بھی اس کو بہت سراہا ہے۔ واقعات مملکت بیجاپور میں اس کا مفصل حال درج ہے نرہری نے "نورس منجری" میں جو سنسکرت میں لکھی گئی تھی بڑی تعریف کی ہے۔ پی جی لا ے

---

[1] علی بن طیفور بسطامی۔ حدائق السلاطین۔ مخطوطہ نمبر ۵۳۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۱۱ ب

[2] ظہوری۔ سہ نثر ظہوری۔ ص ۲۷، ص ۳۸

[3] بمبئی گزیٹیر۔ ص ۵۸۵ (ب) مسعود حسین خان ابراہیم نامہ۔ ص ۲۷

[4] بشیر الدین۔ واقعات مملکت بیجاپور حصہ اول۔ ص ۲۰۸، ص ۲۰۹

Marfat.com

ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنے ہمعصر محمد قلی قطب شاہ کی طرح بہت سی خوبصورت عمارتوں کا معمار ہے۔ "ہفت گھن" "دلکشا باغ"، "نورس محل"، "برج حیدری، تاج باولی"، اور مسجد ملکہ جہاں"، اسی کے شایستہ ذوق تعمیر کی یادگاریں تھیں۔[1]

ابراہیم عادل شاہ کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا۔[2] حدائق السلاطین میں علی بن طیفور بسطامی رقمطراز ہیں کہ ۱۱ محرم ۱۰۳۷ھ میں ابراہیم نے اڑتالیس برس حکومت کرنے کے بعد قلعہ بیجاپور میں رحلت کی۔[3]

آشیروادی لال سری واستو لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عادل شاہی سلاطین میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت تھا اور اپنی رعایا کا ہر دلعزیز سلطان تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو وسعت و استحکام عطا کیا تھا۔[4] ابراہیم کے عہد میں ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اسد بیگ، انتو پنڈت اور نکھو پنڈت کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے خاص مشیر بتاتا ہے۔[5] ابراہیم نے۔

بقول پی ام جوشی "ناتھ پنتوں"، اور دوسرے اہل اللہ کا اثر قبول کیا تھا۔[6] چاند بی بی کی آغوش شفقت میں پرورش پانے کی وجہ سے اس نے اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا۔ ابراہیم ہندو مت کا بڑا احترام کرتا تھا اس کے بعض نراسن کے آغاز میں سرسوتی کا نام نظر آتا ہے۔[7] ابراہیم مذہب کی اصل روح پر ایمان رکھتا تھا اور معنوی تحدیدات کو غیر ضروری تصور کرتا تھا۔

ابراہیم کے لشکر کی تعداد باون ہزار سوار بتائی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی فوج میں نو سو پچین ہاتھی موجود تھے۔

---

[1] عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخ۔ صـ۸۸

[2] عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن صـ۶۰-۶۴

[3] علی بن طیفور بسطامی۔ حدائق السلاطین۔ مخطوطہ نمبر ۵۳۷۔ کتب خانہ سالار جنگ صـ۱۱۲۔ الف

[4] پی ام جوشی۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا۔ جلد اوّل۔ صـ۳۹۸

[5] " " " " " " "

[6] بشیر الدین۔ واقعات مملکت بیجاپور۔ حصہ اوّل۔ صـ۲۲۶

[7] نذیر احمد۔ کتاب نورس ابراہیم عادل شاہ ثانی (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء صـ۵۸

Marfat.com

۱۶۱۲ء تک ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں ظہوری اور ملک قمی کا بول بالا تھا لیکن دونوں ضعیف ہو چکے تھے اس لیے ایک دکنی شاعر عبدل ابراہیم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ عبدل کے الفاظ میں اب عادل شاہی دربار میں نئے پھول کھل رہے تھے ؎

بیٹھے مجلسی لوگ ہر ئیک فن — کھلے پھول ہر حسن دولت چمن
نظر شاہ پھر بھنور اھر پھول پر — بچن باس رس لے کلیاں مکھ پر

عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار کی بڑی متحرک اور گویا تصویریں پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر زور ابراہیم کی ادبی تخلیقات کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اس نے صرف ایک کتاب "نورس نامہ" لکھی تھی۔ انھوں نے "کتاب نورس نامہ" کا نام "نورس نامہ" تحریر کیا ہے جو درست نہیں۔ نذیر احمد نے ظہوری اور ملک قمی کے حوالے سے اس کا نام "کتاب نورس" تحریر کیا ہے[1]۔ "حدائق السلاطین" میں بھی قدیم مورخ علی بن طیفور بسطامی اسے "کتاب نورس" تحریر کرتا ہے[2]۔ عام طور پر اس کو "نورس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ہم عصر شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا پورا نام "کتاب نورس" تھا۔ نورس کے آگے لفظ کتاب کا اضافہ غالباً اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ اس دور میں اس لفظ سے بادشاہ کی غیر معمولی الفت کی وجہ سے گوناگوں چیزیں اس سے موسوم کی گئی تھیں۔ ظہوری کی مندرجہ ذیل عبارت میں کتاب کا نام "کتاب نورس" تحریر کیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "وامثال اینہا در خطبۂ کتاب نورس کہ کہن سرائے جہاں از وہر آوازہ است وقوم گردیدہ"[3] اسی طرح ملک قمی لکھتا ہے "بر خطبہ کتاب نورس ..... نثر نہ توانست نگارشت ..... پنڈاری ناتھ رانڈے نے کتاب نورس کا نام "نورس راگ مالا" تحریر کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ ان دونوں مصنفین نے "کتاب نورس" کو ابراہیم کی واحد ادبی یادگار قرار دیا ہے۔ لیکن مسعود حسین خاں نے ابراہیم نامہ کے ایک شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ابراہیم نے "کتاب نورس" کے علاوہ ایک اور تصنیف "بدھ پرکاش" بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے

---

[1] نذیر احمد۔ کتاب نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب علی گڑھ جو ۱۹۵۲ء۔ ص ۵۸

[2] علی بن طیفور بسطامی۔ حدائق السلاطین۔ مخطوطہ نمبر ۵۲۰۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۱۱۱ ب

[3] نذیر احمد۔ کتاب نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۲ء ص ۵۸

[4] پنڈاری ناتھ رانڈے۔ نورس کے گیت (مضمون) مشمولہ منشو دھک ۱۹۸۶ء جلد ۱، ۲۔ ص ۵۰، ص ۵۸، ص ۵۹

Marfat.com

جس کے گیت جشن سالگرہ وغیرہ تقاریب کے موقعوں پر گائے جاتے تھے[1] لیکن تاحال ابراہیم کا وہی کلام ہمارے سامنے ہے جو کتاب "نورس" میں محفوظ رہ گیا ہے۔ یہ کتاب ایک عرصۂ دراز تک ناپید تھی لیکن اپریل ۱۹۵۵ء میں نذیر احمد نے مختلف کتب خانوں کے نو نسخوں کی مدد سے "کتاب نورس" کے متن کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ "کتاب نورس" کا دیباچہ فارسی کے مشہور انشا پرداز ظہوری نے ۱۰۰۸ھ میں تحریر کیا تھا۔ "کتاب نورس" کی تاریخ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ظہوری کے اس بیان سے کہ بادشاہ کی عمر تیرے عشرے میں ہے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ "کتاب نورس" ۱۰۰۹ھ سے قبل مرتب ہو چکی تھی[2] نذیر احمد لکھتے ہیں چونکہ ظہوری ورود بیجاپور ۱۰۰۷ھ کے قبل ثابت نہیں ہو سکتا اس لیے کتاب نورس کی تکمیل ۱۰۰۷ھ اور ۱۰۰۸ھ کے درمیان ہوئی ہو گی[3] یہی مصنف اپنی کتاب "ظہوری لائف اینڈ ورکس" میں رقمطراز ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب نورس ۱۰۰۵ھ میں مکمل ہوئی تھی اور ظہوری اور ملک قمی کے دیباچے ۱۰۰۵ھ یا ۱۰۰۶ھ میں لکھے گئے تھے[4] جمیل جالبی نے اس کا سنِ تصنیف ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء بتایا ہے[5] ملک قمی اور ظہوری دونوں نے اس کے دیباچے فارسی میں لکھے تھے ظہوری ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں اپنی انشا پردازی اور علمیت کی وجہ سے ممتاز حیثیت کا حامل تھا مثنوی نگاری میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا[6] ظہوری ۹۸۸ھ تا ۱۰۰۳ھ کے دوران وارد احمد نگر ہوا تھا اور نظام شاہی دربار سے وابستہ ہو گیا تھا لیکن وہاں سے بیجاپور چلا آیا تھا۔ نذیر احمد شیر خان اور عبدالرزاق کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ یوسف بیجاپور کے توسط سے وہ عادل شاہی دربار میں متعارف ہوا تھا۔ ظہوری نے اپنی مثنوی میں ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں نو سو اشعار نظم کیے تھے اور بادشاہ کے اوصاف حمیدہ کو بیحد سراہا تھا[7] غلام علی آزاد "سرو آزاد" میں رقمطراز ہیں کہ بیجاپور میں ظہوری

---

[1] مسعود حسین خان۔ مقدمہ ابراہیم نامہ قدیم اردو۔ جلد سوم ۱۹۷۹ء صہ ۲۳

[2] نذیر احمد۔ مقدمہ کتاب نورس۔ صہ ۱۹

[3] نذیر احمد مقدمہ کتاب نورس۔ صہ ۲۰

[4] نذیر احمد ظہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی)۔ صہ ۳۴

[5] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ صہ ۳۴

[6] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی) صہ ۳۲

[7] " " " " صہ ۳۳

Marfat.com

کی اچھی پذیرائی ہوئی اور اس کا شمار "مقربان بساط عزت" میں ہوا۔ ملا ظہوری کی غیر معمولی قابلیت و علمی استعداد سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی سے ان کا بیاہ کیا تھا۔[1] "ماثر الکرام موسوم بہ سرو آزاد" میں غلام علی آزاد بلگرامی تاریخ عالم آرائی عباسی کے حوالے سے اور ماثر رحیمی[2] میں عبدالباقی تھاوندی لکھتے ہیں کہ ملک قمی اور مولانا ظہوری نے "کتاب نورس" جو نو ہزار بیت پر مشتمل تھی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے نام سے مرتب کی تھی اور گرانقدر انعام واکرام سے سرفراز ہوا تھا۔ ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۲۵ھ تک ظہوری بیجاپور میں مقیم رہا تھا۔ ظہوری کی تاریخ وفات ۱۰۲۴ھ تا ۱۰۲۵ھ بتائی گئی ہے[3] "سرو آزاد" میں غلام علی آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ "وفات ملا ظہوری در دکن سنہ خمس وعشرین والف (۱۰۲۵ھ) واقع شد"[4]۔ ظہوری کے دیباچے نے اپنی مخصوص طرز انشا پردازی کی وجہ سے عالمی شہرت پائی۔ ظہوری نے "کتاب نورس" کے دیباچے کو شاہی کلام کے شایانِ شان بنانے کے لیے عبارت آرائی کا کمال دکھایا تھا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی طرح کچھ عرصہ بعد ظہوری کا یہ دیباچہ اصل کلام سے علیحدہ ہو گیا۔ "سہ نثر ظہوری" کلاسیکی سرمایہ بن چکی ہے۔ وہ انتہائی انکساری کے ساتھ اپنے اس گرانقدر مقدمے کو تصنیف شاہی کے لیے "گزند عین الکمال" کا انسداد سمجھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظہوری کی انشا پردازی کا یہ بے مثل نمونہ ایک منفرد ادبی اہمیت کا حامل ہے اور ملک قمی کے دیباچے سے بہتر ہے۔ کتاب نورس میں ایک راگ یا راگنی کو عنوان قرار دے کر اس کے تحت گیت موزوں کیے گئے ہیں۔ یہ گیت مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے ان میں ربط و تسلسل نہیں۔ "کتاب نورس" سترہ راگوں کے ذیل میں ۵۹ گیت اور سترہ دوہرے موجود ہیں۔ رام کیری، اساوری، توڑی، بھیرو، دھناسری، ملار، جیز، پوریا، گوری کنڑا، یا کرنائی کیدار، نوروز، بھوپالی، ماروس، براری اور کلیاں میں مختلف گیت موزوں کیے گئے ہیں۔ ہر گیت کے نام سے پہلے "درمقام" اور بعد میں "نورس" کے الفاظ تحریر کیے گئے ہیں۔ راگ راگنیوں کے تحت گیت اور دوہرے شیخ باجن گام دھنی جانم محمود دریائی اور بعض دوسرے شعرا نے بھی لکھے ہیں مگر ان کا موضوع متصوفانہ ہے۔

---

[1] غلام علی آزاد۔ سرو آزاد۔ صہ ۳۱۔ [2] غلام علی آزاد۔ سرو آزاد صہ ۳۲

[3] عبدالباقی تھاوندی۔ ماثر رحیمی۔ جلد سوم۔ صہ ۴۴۷، صہ ۴۴۸

[4] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورک۔ صہ ۳۲

[5] غلام علی آزاد۔ سرو آزاد۔ صہ ۳۴

Marfat.com

اور ابراہیم نے عشقیہ واردات وکیفیات کی مصوری کی ہے۔ بقول نذیر احمد ابراہیم عادل شاہ نے ایک راگنی ایجاد کی تھی جس کا نام "نغمۂ نورس" تھا۔[1] ظہوری نے اپنی اٹھاون رباعیوں میں "نغمۂ نورس" کی طرف اشارے کیے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی میں بہت سی خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں۔ دونوں کمسنی میں ۱۵۸۰ء میں تخت نشیں ہوئے اور ایک وسیع وعریض مملکت کے بادشاہ بنے۔ محمد قلی اور ابراہیم دونوں کا عہد حکومت امن وامان اور خوشحال کا دور تھا۔ دونوں بادشاہوں نے فنون لطیفہ کی سرپرستی کی اور اہل علم وہنر کی بڑی قدر دانی کی۔ محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم دونوں کو فن تعمیر اور موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ ابراہیم کی طرح محمد قلی نے اپنے اشعار میں موسیقی سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کے کلام میں کلیاں، رام کیری، اساوری، دھناسری، کنڑا، اور گوری اور مختلف سازوں کا بار بار ذکر آیا ہے ابراہیم نے اپنے پسندیدہ طنبورے کو "موتی خان" کے نام سے موسوم کیا تھا وہ کہتا ہے ؎

موتی خان ساگر ایمان پور
تا پر تنت کلو کھو گور

پنڈاری ناتھ رانڈے اپنے مضمون "نورس کے گیت" میں لکھتے ہیں "ابراہیم عادل شاہ کی نورس گیت مالا گیتوں کا پھول بن ہے۔ اپنی نوجوانی میں ابراہیم نے محلات میں جو محفلیں سجائی تھیں یہ انہی کا پھول بن ہے" سرسوتی اس محفل کی خاص دیوی ہے۔ اس کے دربار میں ابراہیم نے وقتاً فوقتاً یہی گیت پیش کیے تھے۔ پنڈاری ناتھ رانڈے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وجیانگر کے فنکاروں نے جو بیجاپور آگئے تھے راگ راگنیوں کو تصویروں میں پیش کیا ہوگا۔ ساتویں صدی کے اچاریہ ناردنے راگوں کو چھ قسموں میں اور پھر ہر راگ کو چھ راگنیوں میں تقسیم کیا تھا۔ گیارھویں صدی کے شاعر جے دیو گی "گیت گووند" ہندوستانی موسیقی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں رادھا کرشن کی رس بھری لیلاؤں کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستانی موسیقی اور مصوری ایک نئے رجحان سے روشناس ہوئی ابراہیم کی نورس راگ مالا اسی نئی بہار کا ایک خوبصورت پھول ہے۔ دیوی گری کے مال غنیمت کے ساتھ علاء الدین گوپال نائک بھی دلی کے دربار میں لایا گیا۔ گوپال نائک دیوگیری کے راجا رام دیو رائے کی فرمائش پر دھرپد میں۔

---

[1] نذیر احمد۔ ظہوری لائف اینڈ ورکس (انگریزی) ص ۳۲

Marfat.com

اپنا کمال دکھایا کرتا تھا۔ جب جنوب میں خلجی اور تغلق بادشاہوں کا اثر و رسوخ بڑھا تو کئی تہذیبی امور سے دکن متاثر ہوا ان میں موسیقی بھی ایک تھی۔ ابراہیم عادل شاہ کے دورِ حکومت میں بیجاپور میں ایرانیوں سے زیادہ مقامی باشندوں کا اثر و اقتدار تھا۔ کئی مرہٹہ سردار اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔[1] اس پس منظر میں نورس کے گیت خالص ہندوستانی رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ایک ہندوستانی موسیقار اور سنگیت کلا کے شیدائی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ابراہیم نے مختلف راگوں کے تحت جو شعر لکھے ہیں ان میں کہیں دو، کہیں تین، اور کہیں چار مصرعے دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر نے قافیے پر توجہ کی ہے لیکن ردیف کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ نورس میں چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی بحریں موجود ہیں۔ چھوٹی بحروں میں ہلکے پھلکے شعر ہیں اور طویل بحروں میں کہی ہوئی ابیات میں خیال آفریں کا عنصر زیادہ ہے" سہ نثر ظہوری" کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ "کتاب نورس" کے بعض حصوں کو فارسی میں منتقل کیا گیا تھا تاکہ دربار سے وابستہ ایرانی امراء بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔[2] یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خود ابراہیم فارسی زبان میں شعر کہتا تھا اور اس کا تخلص ابراہیم تھا۔[3] کلام الملوک میں میر سعادت علی رضوی نے اس کا نمونۂ کلام کلام الملوک درج کیا ہے۔ "کتاب نورس" سے ابراہیم عادل شاہ کے ادبی مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے اور اس کی ندرت فکر و تخیل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ظہوری بھی بادشاہ کی رفعت خیال کا مداح ہے۔ "کتاب نورس" کے اشعار میں ابراہیم کی شخصیت کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اور اس کی نجی زندگی کے بعض گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک مرنجا مرنج انسان تھا اس کا دور حکومت امن و امان اور مرفہ الحالی کا دور تھا۔ دارالسلطنت بیجاپور کو دارالسرور کہا جاتا تھا۔[4] فارغ البالی، دولت کی فراوانی، پرسکون ماحول اور جمالیاتی شعور نے ابراہیم کے طرز فکر اور اس کی شاعری کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ابراہیم کے گیتوں میں نشاطیہ عنصر کی فراوانی ہے اور زندگی کی مسرتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا رجحان نظر آتا ہے ابراہیم نے اپنے ملک کے بارے میں کہہ دیا تھا کہ ؎ اس جگ میں دو کچھ لیجیے ؛ ایک تینورا ایک کامنی کیجیے

---

[1] پنڈری ناتھ رانڈے۔ نورس کے گیت (مضمون) مشمولہ سنشودھک جلد نمبر ۱، ۲، مارچ۔ جون ۱۹۸۲ء ص ۵۷ تا ص ۶۵

[2] نذیر احمد۔ کتاب نورس۔ ص ۲۵

[3] نذیر احمد۔ کتاب نورس (مضمون) مشمولہ۔ تحقیقی جائزے ص ۳۷ [4] میر سعادت علی رضوی۔ کلام الملوک ص ۲۹

[5] علی بن طیفور بسطامی۔ حدائق السلاطین۔ مخطوط نمبر ۵۳۷ تذکرہ کتب خانہ۔

Marfat.com

ابراہیم کے کلام میں کہیں اس کے ہاتھی آتش خاں کا ذکر ہے تو کہیں موتی خاں (طنبورا) کا اور کہیں ملکہ جہاں کی تعریف کی گئی ہے تو کہیں کسی کامنی کے حُسن کو سراہا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ "کتاب نورس" کا کلام ایک ایسے شاعر کی شعری تخلیقات ہیں جس نے زندگی کا بھرپور لطف اٹھایا ہے اور اپنے تجربات اور اصطلاحات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ "کتاب نورس" کے اشعار میں ابراہیم کی شخصیت بے نقاب نظر آتی ہے" درمقام کیدار نورس" میں شاعر نے اپنا جو مرقع پیش کیا ہے وہ ایک موسیقی کے دلدادہ خوش باش اور زندہ دل انسان کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہاتھ میں ساز اور دوسرے میں کتاب ہے جس کو وہ دیکھتا ہے اور کتاب نورس کے گیت گاتا جاتا ہے اس کا لباس زعفرانی ہے دانت کالے ہیں اور ناخن پر مہندی لگی ہوئی ہے۔ بڑا ہنرمند اور محبت کرنے والا ہے "کتاب نورس" کے ہلکے پھلکے گیت عشقیہ نوعیت کے حامل ہیں اور ان میں کہیں کہیں شاعر کے زور بیان اور قدرت فکر کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ "کتاب نورس" کی سب سے اہم خصوصیت اس کا ہندوستانی مزاج اور مقامی عنصر ہے۔ دہلی میں اس کا معاصر حکمران اکبر اور گولکنڈے میں محمد قلی بھی ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ تھے اور انھیں ہندوستانی ثقافت سے جذباتی وابستگی تھی۔ اس عہد کے لباس طرز معاشرت اور فنون لطیفہ میں ہندوستانیت کا رجحان نمایاں ہے۔ ابراہیم ہندی موسیقی کا ماہر تھا اور اس کی سرپرستی و قدردانی کا شہرہ سن کر شمالی ہند اور خاص طور پر بنارس کے ماہران موسیقی کے دربار میں جمع ہو گئے تھے[1] ابراہیم کے عہد میں فن موسیقی کو بیجاپور میں بڑی ترقی ہوئی۔ "بساتین السلاطین" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت میں تین باقاعدہ موسیقی دان طبقے یعنی (۱) حضوری (۲) درباری اور (۳) شہری پیدا ہو گئے تھے۔ حضوری وہ موسیقار تھے جنھیں بادشاہ سے شرف تلمذ حاصل تھا درباری ان حضوریوں سے اکتساب کرتے تھے اور ان کا فرض یہ تھا کہ وہ عوام میں اس فن کو مقبول اور ہردلعزیز بنائیں اور اس فن کی تعلیم دیں" حضوریاں" ہمیشہ بادشاہ کے حضور میں رہتے تھے "تذکرۃ الملوک" میں رفیع الدین شیرازی رقمطراز ہیں کہ ہر مذاق و معیار کے موسیقار ابراہیم کے پایۂ تخت میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے ماہرین موسیقی عطائی اور کمتر درجے کے کیجن کہلاتے تھے[2] نورس پور میں ایک محلہ موسیقاروں کے لیے وقف کر دیا گیا تھا جن کی تعداد ہزاروں تک

---

[1] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۲۹

[2] نصیرالدین ہاشمی۔ شاہانِ دکن کی اردو شاعری (مضمون) مشمولہ نوائے ادب اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۵۹

Marfat.com

پہنچی تھی۔ ابراہیم خوش گلو اور خوش الحان تھا اور موسیقی سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ اس عطیہ خداوندی سے اس نے اتنا استفادہ کیا کہ "جگت گرو" کہلانے لگا۔ ابراہیم نے موسیقی کے لیے دکنی بول استعمال کئے ہیں۔ ابراہیم کے دربار میں رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتیں اور گوئیے حاضر رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو جانور پالنے کا بھی شوق تھا۔ ظہوری نے "تعریف رخش" "توصیف باز" اور "توصیف طوطی" جیسے عنوانات قائم کر کے رباعیات کہی ہیں اس کے علاوہ "کتاب نورس" میں ابراہیم کے پسندیدہ ہاتھی آتش خان کا بھی ذکر کیا گیا ہے" نورس منجری" میں سنسکرت شاعر نرہری نے بھی بادشاہ کے جانوروں جیسے ہاتھیوں اور گھوڑوں وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ ابراہیم کی "کتاب نورس" شعر و نغمہ کا اچھا امتزاج ہے اور اس سے بادشاہ کی وسعت نظر اور کشادہ قلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ ابراہیم ہندوستانی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہندوستانی تصورات اور دیومالا سے ابراہیم کو خاص وابستگی تھی۔ کتاب نورس" میں بار بار دیومالائی کرداروں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دکن میں ہندو دیومالا پر اتنی گہری نظر اور اس سے ایسی مکمل واقفیت کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ "اندرا" ایراوت" " بانی" بھاگیرتھی" "بارتی" " تری لوچن" (مہادیوی) "درگا" " سرستی" "سیتا" "شیوا" "گینتی" "لکشمی" "کیلاس" "گنگا" "ہنوت" (ہنومان) اور ایسے بہت سے نام "کتاب نورس" کے گیتوں میں ہندو دیومالا سے شاعر کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ ابراہیم کی طرز فکر اور تخیل پر ہندوستانیت کی چھاپ کتنی گہری تھی۔ ابراہیم کے تصورات پر ہندو جمالیات کا اثر نمایاں ہے ابراہیم کے عہد کی گنگا جمنی معاشرت کے سررشتے آریائی تہذیب میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ابراہیم جہاں سرسوتی اور گینتی سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتا ہے وہیں آنحضرتؐ کا معتقد اور خواجہ بندہ نواز کی ولایت کا بھی قائل ہے اور انھیں خراج عقیدت ادا کرتا ہے ؎

سید محمد ہتی میرا جیون رتن ہیں اتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے اس نمونے بہشت اپارے

شاعر کے یہاں استعارے اور تشبیہات بھی ہندوستانی ماحول سے ماخوذ ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ چاند ہنس ہے جو چاندنی کے موتی چگ رہا ہے یا شاعر کہتا ہے کہ چاند اندر دیوتا ہے جو اپنے سفید ہاتھی ایراوت پر سوار ہو کر نکلا ہے یا چاند برہمن ہے جو چاندنی کی گنگا میں اشنان کر رہا ہے ابراہیم ایک اور جگہ کہتا ہے کہ محبوب کی پیشانی پر جو تلک لگا ہے اور اس میں جو چاول چمک رہا ہے

Marfat.com

وہ گویا شیو کی تیسری آنکھ "اگن نیتر" ہے[1]۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں کتاب "نورس" میں موجود ہیں جو ہندوستانی روایات سے شاعر کے غیر معمولی لگاؤ کو ظاہر کرتی ہیں "کتاب نورس" کے وہ گیت جن میں عاشقانہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ ابراہیم کی شاعری کی اچھی نمایندگی کرتے ہیں اس نے محبوب کا سراپا بڑے دلکش موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ایک نار دیکھیا کھڑی سامنے　　پونم رات کی مکھ چاندنی
یا جھمکے میگھ رات سو دامنی
چتاری چتر نہ سکے ہوئے مانی　　جیوں موج پر موج آوے پانی

عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں ابراہیم عادل شاہ کے ادبی تصورات پر بھی روشنی ڈالی ہے وہ کہتا ہے کہ بادشاہ "بچن" کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے اور الفاظ کا اچھا پارکھ ہے۔ وہ اس تصور کا حامل ہے کہ "بچن" اور "ارت" میں ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ "بچن" جھاڑ ہے اور "ارت" اس کا پھل اس لیے ابراہیم، عبدل کو ان کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہا ہے:

توں کر حرف جھاڑو کو سب بار بار　　پھرے خوب معنیٰ سو پھل آشکار
توں پھر بیج معنی سو جیوں بج انار　　حرف بول تھوڑا ارتھ بے شمار

شاعر کی نازک خیالی اور حسن بیان کا مندرجۂ ذیل اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے:

دنکر جوت پتی سو تج نانو نئیں کوئی تج سارے
سارے تارے چاند ہوئیں جوت تج تارے
دنیا کھڑا بھرے چند دود　　اد پر نرمل مکھ سو چاند سود
مکھ گورا ٹھیک فلک چھائی ادھر　　تلک اکشتا سوا سورا گن نیتر

کتنا دیکھو یو مکھ
ان نینوں تھیں سب ہولی چوک
دندی دیویں دل پر داغ دُکھ

ایک "ابھوگ" ملاحظہ ہو جس میں عشقیہ جذبات و تجربات کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

برہ پھاٹی تو دیکھ چاٹاک دھاوے گا
ابراہیم نسو جلگ ایسا پیو کہاں پاوے گا

---

[1] مہادیو کی تین آنکھوں میں سے ایک پیشانی پر ہوتی ہے اسی لیے انھیں تری لوچن یا تری نیتر کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

سند میاں کر سنگار یوب کنٹھ لاوے گا
رات تھوڑی مدن بہوت اٹھ جاوے گا

ابراہیم کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے نذیر احمد لکھتے ہیں۔ اشعار میں عربی اور فارسی الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن بیشتر جگہوں پر سنسکرت کے الفاظ اصل شکل میں یا ترمیم شدہ حالت میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اگر دونوں قسم کے اشعار الگ الگ لکھ دیئے جائیں تو کوئی شخص ہرگز یہ قیاس نہیں کر سکتا کہ یہ ایک ہی کتاب کے اجزاء ہیں۔"[1]

"کتاب نورس" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم فارسی اور دکنی کے علاوہ سنسکرت اور برج بھاشا سے بھی بخوبی واقف تھا۔ دکنی شعراء نے فارسی عروض کی پابندی کی ہے لیکن ابراہیم نے ہندی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ابراہیم کی نورس میں سنسکرت کے تت سم اور تت بھو لفظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں یہ غالباً ابراہیم کے موضوع کا بھی تقاضہ تھا۔ کیوں کہ موسیقی کو سنسکرت اصطلاحوں سے خاص مختلف نظر آتی ہے کہ اس میں سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ کے الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ دکنی زبان سے ابراہیم کو دلچسپی ضرور تھی۔ ابراہیم نے دکنی انداز شعر گوئی کی زیادہ پاسداری نہیں کی ہے اور برج بھاشا اور سنسکرت کے ادق الفاظ سے اسے گرانبار کر دیا ہے۔ "کتاب نورس" کوئی مسلسل نظم نہیں جس میں تسلسل وارتباط ہو بلکہ اس میں علیحدہ علیحدہ اشعار ہیں جو بلحاظ انداز بیان اور زبان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عام دکنی شعراء نے فارسی عروض کے سانچے میں اپنی نظموں کو ڈھالا ہے لیکن ابراہیم نے فارسی اوزان کی پابندی نہیں کی ہے۔ بعض ابیات کی زبان دکنی ہے اور بعض اشعار میں اودھی، برج بھاشا راجستھانی اور پنجابی

---

[1] مقدمہ نذیر احمد۔ مقدمہ "کتاب نورس"۔ ص ۵۵، ص ۵۶

Marfat.com

زبان کے اثرات نمایاں ہیں[1]۔ ہم "کتاب نورس" کو دکن کے نمائندہ شعری کارناموں کی فہرست میں جگہ نہیں دے سکتے۔ "کتاب نورس" کے گیتوں کی زبان مشکل ہے اور اس سے لطف اندوز ہونا آسان نہیں سنسکرت کی نامانوس لغات اور موسیقی کی اصطلاحات نے ابراہیم کے اکثر گیتوں کو عسیر الفہم بنا دیا ہے۔ سنسکرت کے کئی ایسے لفظ جو اکثر دکنی شعراء کے یہاں کم نظر آتے ہیں "کتاب نورس" میں بکثرت برتے گئے ہیں۔ مثلاً رکشتا (چاول) ایراوت (سفید ہاتھی) اشومتی[2] (زمین) اُد (پانی) اودت (طلوع) بیب (دو) بیرون (سورج) درونا (دیوتا) بھوشن (زیور)۔ پھت (پھول) جھیک (مچھلی) جگرنگ (ایک قسم کا پرندہ جو دن میں اپنی مادہ کے ساتھ رہتا ہے اور رات میں جدا ہو جاتا ہے) کالی داس اور دوسرے سنسکرت شاعروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ چھار (راکھ) دھام (گھر) سدھانو شو (چاند) سارک اشاوک۔ ہرن کا بچہ)، سوپان (سیڑھی) کشٹ (کم) گورمنڈان (قوس قزح) ماشنگ (ہاتھی) مکرند (آب کل) ودھو (چاند) اور ہمکر (چاند) وغیرہ۔

ابراہیم کی زبان کے بارے میں نذیر احمد لکھتے ہیں۔

"اس کی زبان سخت تر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی زبان کی دشواری قدامت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ موضوع کی وجہ سے مصنف کو مجبوراً اس میں ایسی زبان اختیار کرنی پڑتی ہے جس میں سنسکرت کے الفاظ و فقرات کی کثرت اور ہندو مذہب و موسیقی کی اصطلاحات کی افراط ہے۔ یہی سبب ہوا کہ یہ زبان اس عہد کی مروجہ زبان سے الگ ہو گئی[3]۔"

سنسکرت زبان سے دلچسپی نے بھی ابراہیم عادل شاہ ثانی کو اپنے عہد کے سنسکرت شعراء میں مقبولیت عطا کی تھی۔ سنسکرت شاعر نرہری نورس پور کا باشندہ تھا جیسا کہ اس نے اپنی نظم میں بتایا ہے۔ نرہری نے "نورس منجری" میں جس انداز سے ابراہیم کی مدح کی ہے اس سے بادشاہ کی سنسکرت دان طبقے میں ہر دلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔ "نورس منجری" کے پہلے حصے میں جو ایک سو ۱۷۲ بہتر بندوں پر مشتمل ہے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مدح و ستائش کی گئی ہے اور اس کو "جگت

---

[1] نذیر احمد۔ کتاب نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی (مضمون) مشمولہ اردو ادب۔ جون ۱۹۵۲ء۔ ص ۶۴

[2] اشو (گھوڑا) اشومی۔ جہاں گھوڑے پلتے ہیں۔ یعنی زمین۔

[3] نذیر احمد۔ اردو شبہ پارے پر ایک نظر (مضمون) مشمولہ۔ تحقیقی مقالے

Marfat.com

گرو،" ابہر راما،" اور" نادمورتی،، کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔" نورس منجری" کے اس ابتدائی حصے میں مختلف بحریں شاعر نے استعمال کی ہیں باقی تین حصوں" رَس،" نائک،" اور نائکا بھید" یا النکار وغیرہ کا ذکر ہے۔ نرہری نے ابراہیم کے محل تیر کماں اس کے ہاتھی، گھوڑے اور اس کی تلوار کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور بادشاہ کی نبرد آزمائی کی ستائش کی ہے۔" نورس منجری،، کے سنہ تصنیف سے ہم واقف نہیں ہیں۔" نورس منجری،، کو پروئز پی جی لالے شعبہ سنسکرت عثمانیہ یونی ورسٹی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اس موضوع پر انھوں نے سنسکرت کے ایک سمینار میں جو ساگر (بھوپال) میں ستمبر ۱۹۸۴ء میں منعقد ہوا تھا مقالہ بھی پڑھا تھا۔ جو شائع ہو چکا ہے[1]

" نورس منجری،، میں نرہری نے جس انداز سے بادشاہ کی مدح کی ہے اُس سے پی جی لالے کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ نرہری ابراہیم کا درباری شاعر تھا اس نے منجری میں ابراہیم عادل شاہ کی عظمت کے بارے میں ایک قصّہ بھی نظم کیا ہے اور کہتا ہے کہ ایک دن دنیا کی تمام مخلوقات برہما کے پاس حاضر ہوئیں اور استدعا کی کہ وہ زمین کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے انھیں نجات دلائیں۔ برہما نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا اور نادمورتی یعنی ابراہیم عادل شاہ کی صورت میں دنیا میں پیدا ہوا۔ نرہری کا ابراہیم کو برہما کا اوتار کہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ دورِ ابراہیم میں اس کی رعایا کے تمام طبقات اس کا کتنا احترام کرتے تھے۔" نورس منجری،، میں نرہری نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جیسے" نادمورتی،، کے علاوہ وہ ابراہیم کو" نورس پرما،،" گیان مورتی،،" ستیہ مورتی،،" جگت گرو،، اور گیان گرو کہتا ہے ؎

नादमूर्ति, ज्ञानमूर्ति सत्यमूर्ति मर्द्धायभा
जगद्रार जनि गरु वाण्मी नवरस प्रिय

"نورس منجری کا شاعر کہتا ہے کہ ابراہیم کے نو آباد شہر" نورس پوری،، میں کئی علماء موجود ہیں۔

---

[1] پرسنالٹری آف ابراہیم علی شاہ آزری فلکیٹٹ اِن نورمنجری،، (مضمون) مشمولہ جننام وقیم۔ ڈاکٹر اے۔ سی میوین فیلیسٹیشن والیوم) (ایسیزان کانٹم پوریری انڈالوجی ریسرچ) پی جی ڈیپارٹمنٹ آف سنسکرت اُنکل یونیورسٹی بھونیسور۔ اڑیسہ۔ ۱۹۸۵ء

[2] پی جی لالے۔ پرسنالٹی آف ابراہیم علی شاہ آزری فلکیٹٹ اِن نورس منجری،، (مضمون) مشمولہ۔ جننام رتم۔ ص ۵۱

Marfat.com

جن سے بادشاہ وہ اپنے شاگردوں کی طرح سلوک کرتا ہے تمام رعایا اطمینان مسرت اور فارغ البالی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ یہاں بادشاہ کے محل میں فلسفہ اور دیگر علوم جاننے والے موجود رہتے ہیں۔ یہ محل "آنند مندرم" کہلاتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کی ذات سرچشمۂ فیضان بنی ہوئی ہے نرہری نے اپنے مربی کے محل کے لیے "آنند امندرم" اور "سنگیت مندرم" کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ابراہیم کا محل موسیقی علم اور جگت عیش و عشرت کا مخزن بنا ہوا تھا۔ نرہری نے ابراہیم کی سواری خاص کے گھوڑے کا نام "کنا مورتی" بتایا ہے اور اس کے سڈول جسم اور صبا رفتاری کی تعریف کی ہے۔

نرہری نے ابراہیم کی شکل و صورت اور اس کے حسن و جمال کو بھی بہت سراہا ہے "نورس منجری" میں شاعر نے ۱۳۰۹ سے لے کر بند نمبر ۱۵۱ تک مختلف "رسوں" کی ابراہیم عادل شاہ "نادمورتی" کے حوالے سے تشریح کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم اپنے عہد کا کتنا عظیم موسیقار تھا۔ نرہری کہتا ہے کہ بدیاپوری یا شہر علم میں علماء کی تنگ دستی دور ہو چکی ہے اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

محمود خوش دہاں نے اپنے مثنوی "علم الحیات" میں بادشاہ وقت جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عدل و انصاف، علم پروری اور عظمت و جلالت کا ذکر کیا ہے۔ ؎

اس دنیا میانے ہیں اک شاہ
اس کو حق کا نت پناہ
عارف عاقل سلیم حال
مکھ تجلی نور جمال
سلطان ابراہیم جوں خلیل
شیریں سخن نظر جمیل
اپن نورس بوے ہیں
اپنا علم بھی کھولے ہیں
سب ولیاں کے اسناد کلاتے
جو اُن ایسا علم پاتے

Marfat.com

عبدل عبدل دبستان بیجاپور کے اوّلیں شعراء میں سے ایک ہے۔ اس کی شعری یادگار "ابراہیم نامہ" بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ دکن کی معاصر تاریخوں سے عبدل کے حالات زندگی پر روشنی نہیں پڑتی۔ "ابراہیم نامہ" کی بعض داخلی شہادتوں سے کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ عبدل نے خود کو "دہلوی" کہا ہے ؎

زبان ہندوی مجھ سوں ہوں دہلوی
نہ جانوں عرب اور عجم مثنوی[5]

عبدل یا اس کے آباواجداد کے دہلی سے وارد بیجاپور ہونے کے اسباب اور اس کے صحیح سنہ کا ہمیں علم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو عبدل کا خاندان بیجاپور میں اس کی پیدائش سے قبل ہی سکونت پذیر تھا یا وہ بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ بیجاپور چلا آیا تھا کیوں کہ شعرائے دہلی کے تذکرے عبدل کے ذکر سے خالی ہیں۔ اگر وہ پختہ عمر میں شاعر کی حیثیت سے دہلی میں مشہور ہوتا تو کسی نہ کسی تذکرے میں اس کا ذکر ضرور موجود ہوتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدل دہلی سے ابراہیم کی دعوت پر بیجاپور نہیں آیا تھا بلکہ اس نے اپنے شاعرانہ کمال کی وجہ سے دربار میں رسائی حاصل کی تھی۔ ہم عبدل کے پورے نام سے بھی واقف نہیں ہیں نصیرالدین ہاشمی نے شاعر کا نام عبدالقادر[1] اور عبدالغنی[2] بتایا ہے۔ ڈاکٹر زور شاعر کا نام عبدالغنی[3] تحریر کرتے ہیں مسعود حسین خاں عبدل کے نام کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"راقم السطور کا خیال ہے کہ یہ غالباً عبداللہ ہوگا..... عام طور پر عبداللہ نام کے اشخاص کا عرف عبدل پایا جاتا ہے۔"[4] اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ کی طرح عبدل سنّی العقیدہ

---

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ د فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔ ص۸۰۰

[2] " " دکن میں اردو۔ ص۱۹

[3] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات۔ جلد اوّل ص۲۶۸

[4] مسعود حسین خاں۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص۸۷

[5] اس شعر کے پہلے مصرع کے لفظ "ہوں" کی قرأت "ہور" کرتے ہوئے گری رام شرما لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دہلوی اور ہندوی زبانیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہی تھیں اس لیے شاعر اسے ایک نہیں سمجھتا۔ دہلوی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ جگہ پانے لگے تھے اور نئی لفظیات دلی کی زبان کو ہندوی سے دہلوی بنا رہی تھیں۔ ہندوی کے تحت برج بھاشا اور اودھی آتی ہے۔ دکن ہندی کا ساہتیہ۔ ص۱۹۹

Marfat.com

حمد تھا جس کا ثبوت "ابراہیم نامہ" میں حمد و نعت کے بعد "در مدح یاران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" سے ملتا ہے۔ خلفائے راشدین کی مدح کا لب و لہجہ اس کی عقیدت مندی اور جذباتی وابستگی کا غماز ہے۔

نبی کے پریت کے تھے سو چار یار ملک و تن چار چار و کنار
پدک دین مجلس جڑے و تن کنن صدق سو لگ رہے و جبتن

اور آخر میں وفور عقیدت سے کہتا ہے کہ "اپنے پیر" سے "منکر" ہونے والا "مشرک" ہے اس بیان سے شاعر کے عقائد اور مسلک کا اظہار ہوتا ہے "ابراہیم نامہ" میں مدح چار یار کے بعد "مرشد شہباز سید محمد گیسو دراز" کی توصیف کی گئی ہے۔ مدحیہ اشعار سے خواجہ بندہ نواز سے عبدل کے جذباتی لگاؤ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں کہ عبدل ابراہیم گیسو دراز کے خاندان کا مرید تھا اور جگہ جگہ کے عرس میں شرکت کرتا تھا۔[1] ممکن ہے کہ عبدل بھی بادشاہ کے ہمراہ بیجاپور یا بادشاہ کے بسائے ہوئے نئے شہر نورس پور جا کر خواجہ دکن کے روضے پر جا کر حاضری دیتا ہوگا۔ عبدل خواجہ بندہ نواز کی مدح کرتے ہوئے ان سے دعا کرتا ہے ؎

توں دے مجھ شرکوں سو ہر دو جہاں
نظر شاہ استاد و مقبول آں

"ابراہیم نامہ" سے عبدل کا ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ "ابراہیم نامہ" کی ابتدا میں شاعر کہتا ہے کہ بادشاہ نے اپنی مہربانی سے مجھے طلب کیا اور حکم دیا کہ تو نئے "مضمون" کی ایک ایسی کتاب تیار کر کہ شاعری کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے تیرا نام باقی رہ جائے شاعر کہتا ہے کہ بادشاہ کی یہ بات سن کر اسے بڑی حیرانی ہوئی اور اس نے عرض کیا کہ میں عربی اور فارسی سے ناواقف ہوں اور دہلوی ہونے کی وجہ سے صرف "زبان ہندوی" سے واقف ہوں۔ بادشاہ نے بڑا بلیغ جواب دیا کہ "عشق" ایک ہے لیکن اس کے کئی روپ ہیں جس ملک کی جو زبان ہوتی ہے اسی میں شعر کہنا چاہیے ؎

زبان روپ پرگٹ جو جس ملک کر
اسی بچن سوں شاعری بول دھر

عبدل کا خود کو عربی اور فارسی سے نابلد کہنا اس کی انکساری کا ثبوت ہے ابراہیم کے دربار میں

---

[1] نذیر احمد۔ اردو شہ پارے پر ایک نظر (مضمون) مشمولہ تحقیقی مطالعہ۔ ص ۱۲۵

Marfat.com

ظہوری، ملک قمی، مولانا جیند راور مولانا باقر کاشی جیسے بلند پایہ فارسی شاعروں کا طوطی بول رہا تھا اور اہل زبان سے فارسی شعر گوئی میں مطابقت کرنا عبدل کے لیے آسان نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے اس نے بادشاہ سے اس سلسلے میں اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ عبدل کی معلومات وسیع تھیں اور وہ علوم متداولہ میں دستگاہ رکھتا تھا۔ فن شعر اور موسیقی سے بخوبی آشنا تھا[1]۔ خود بادشاہ وقت فنون لطیفہ کا ماہر اور ان کا دلدادہ تھا اس لیے اس کے دربار سے وابستہ شعراء کا ان علوم سے واقف ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں معلوم ہوتی۔

عبدل کے "ابراہیم نامہ" کو سب سے پہلے بھگوت دیال ورما نے ۱۹۳۲ء میں متعارف کروایا پھر ڈاکٹر زور نے مخطوطہ سالار جنگ کی نقل تیار کی لیکن اس کی کتابی شکل میں ترتیب و اشاعت کا کام مسعود حسین خان نے مکمل کیا۔

"ابراہیم نامہ" ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء / ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء کا شعری نامہ ہے ابراہیم نامہ کے آخر میں عبدل نے اپنے اس شعری کارنامے کی تاریخ تصنیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

بچن پھول گوندیوں ابراہیم نام
کیا ہس پر برس بارہ تمام

دیوی سنگھ چوہان نے اپنے مضمون "تاریخ ابراہیم" میں عبدل کے اس شعری کارنامے کے سنہ تصنیف سے بحث کی ہے اور ڈاکٹر شریمتی آشا اتھاپے کے مقالے "نورس اور ابراہیم نامے کی نقادانہ تشریح" کے حوالے سے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے دیوی سنگھ چوہان اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ابراہیم نامہ" تصنیف ۱۰۱۲ھ ہے[2]۔ نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر زور اور نذیر احمد نے اس کو ۱۰۱۲ھ قیاس کیا ہے لیکن کتاب کے آخری عنوان "در تواریخ ختم کتاب ابراہیم نامہ سہشور سنہ ۱۰۱۲" سے مسعود حسین خان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چوں کہ ۱۰۱۲ھ سہشور ۲۵ مئی ۱۶۱۱ء کو شروع ہوتا ہے جو ۱۰۲۰ھ ہے اس نے ابراہیم نامہ کا سنہ تصنیف ۱۶۱۲ء مطابق ۱۰۲۱ھ ہے[3]۔ ابراہیم نامہ کی ایک اندرونی شہادت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے

---

[1] مسعود حسین خاں۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص ۹

[2] " " " ص ۵۸

[3] دیوی سنگھ چوہان۔ تاریخ ابرہیم نامہ (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی۔ کنوبر ۱۹۶۴ء۔ ص ۴۰

Marfat.com

عبدل کہتا ہے ؎

سنوں اب صفت شہہ دمن تخت ٹھاؤں
بدیاپور گھر ہے بھی اس کا جو ناؤں

۱۰۱۲ھ مطابق ۱۶۰۳ء میں بیجاپور کا نام تبدیل کر کے ودیاپور رکھا گیا تھا اس لیے ابراہیم نامہ" اس کے بعد کی تصنیف قرار پائی ہے جسے مسعود حسین خان نے ۱۹۶۹ء میں دو نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی موجود ہے۔ یہ دراصل ایک طویل قصیدہ یا توصیف نامہ ہے[1] جس کی جزئیات تاریخی صداقت پر مبنی ہیں۔ مسعود حسین خان نے اسے "شاہ نامہ" سے تعبیر کیا ہے[2] حقیقت یہ ہے کہ "ابراہیم نامہ" میں ابراہیم عادل شاہ کی شخصیت اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور شعر گوئی کو تاریخ نویسی کا درجہ عطا کرتی ہے۔ بقول مہاپنڈت راہل سانکرتیاین "ابراہیم نامہ ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی[3]" ابراہیم نامہ" کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ یہ دکن کے اوّلین ادبی کارناموں میں سے ایک ہے۔ اس کی اہمیت ادبی اور تاریخی ہے۔ بیجاپور کے چھٹے فرمانروا ابراہیم عادل شاہ ثانی کا دور" ابراہیم نامہ" کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے عہدِ ابراہیم کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے جس طرح ہم عصر تاریخوں کا مطالعہ ضروری ہے اسی طرح ابراہیم نامہ کی چشم دید شہادتیں عبدل کے پر لطف بیانات اور شاعرانہ توضیحات بھی ہماری اچھی رہبری کرتی ہیں۔ عبدل نے تاریخی صداقتوں کو ادبی دلکشیوں سے روشناس کر کے ابراہیم ثانی کے عہد کی ایک مستند اور جاذب نظر دستاویز ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہے۔ بقول محمد حسن عبدل نے اپنے دور کی عظمت کا نقش شاعرانہ طرز سے کھینچ دیا ہے اور قصیدے کی شان و شوکت نہ سہی قصیدہ کی تخیلی رنگ آمیزی اور شاعرانہ طرز نگارش کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں[1]۔

"ابراہیم نامہ" ادبی محاسن کے اعتبار سے اپنے ہم عصر قطب شاہی شاعر وجہی کی قطب مشتری سے کم تر درجے کی حامل ہے۔ عبدل جیسا کہ خود اس کا بیان ہے دہلوی تھا۔ بیجاپور کے سرمایہ

---

[1] مسعود حسین خان۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص ۵۸
[2] " " " " ۔ ص ۲
[3] مہاپنڈت راہل سانکرتیاین، دکن ہندی کا دیہ دھارا۔ ص ۱۲۸

Marfat.com

ادب میں اس کے پیش نظر زیادہ تر مذہبی نوعیت کی مثنویاں تھیں۔ برہان الدین جانم کی نظمیں صوفیانہ مصطلحات سے مملو ہیں اور ان کا موضوع مذہب تصوّف ہے۔ ادبی کاوشوں میں خود ابراہیم عادل شاہ ثانی کی "کتاب نورس" کا نمونہ عبدل کے سامنے موجود تھا جس میں پہلی بار ایک غیر مذہبی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ اگر بیجاپور کے صوفی شعراء کی زبان میں صوفیانہ اصطلاحات کی کثرت تھی تو ابراہیم کی "کتاب نورس" میں موسیقی کی اصطلاحوں کی بہتات تھی۔ بہرحال عبدل کے لیے دبستان بیجاپور میں کوئی ایسا ادبی نمونہ موجود نہیں تھا جس کی پیروی اور اتباع کو وہ اپنا شعری مسلک بنا سکتا اس لیے عبدل کو خود اپنی راہ تراشنی پڑی۔ موضوع کے اعتبار سے عبدل کا "ابراہیم نامہ" قصیدہ ہے لیکن اس میں وہ خیال آفرینی پر شکوہ طرز ادا ادب و لہجے کی وہ گونج نہیں جو اس صنف سے مخصوص ہے۔ "ابراہیم نامہ" کے اشعار اپنے ممدوح بادشاہ کی تعریف و توصیف سے پُر ہیں لیکن ان میں قصیدے کی شان و شوکت اور طنطنہ موجود نہیں ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے شاعر مثنوی کے فنی اصولوں پر عمل پیرا نظر آتا ہے اور مثنویوں میں کسی بادشاہ یا امیر کی مدح کا جو انداز ہوتا ہے وہی عبدل کے "ابراہیم نامہ" میں جا بجا اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے مثنوی کی سست گامی کا ذکر کرتے ہوئے مسعود حسین خان لکھتے ہیں کہ مبالغہ اور غلو کی کثرت کی وجہ سے "ابراہیم نامہ" میں روانی کی کمی ہے وہ رقمطراز ہیں:۔

> "عبدل کو ایک ایسی زبان میں لکھنا پڑا جو ابھی تک ادبی اسالیب سے ناآشنا تھی وہ ایک ایسی ناتراشیدہ اور ناہنجار زبان میں شاہ نامہ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو عرب و عجم کی مثنوی کے اسالیب سے بے بہرہ تھی۔"[1]

عبدل نے تشبیہات و استعارات اور تمثیلی انداز میں اپنا زور طبع دکھایا ہے۔ اس نے ابراہیم کی طرح ہندو دیومالا کی تلمیحات سے بھی استفادہ کیا ہے اور اُن سے اپنے ابلاغ کی معنی آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔ رخصت شب اور آمد صبح کے لیے دلچسپ استعارات استعمال کئے ہیں۔ یہ توضیحی بیانات، تشبیہات و استعارات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ عبدل احمد گجراتی کے طرز ادا سے متاثر تھا۔ شیخ احمد شریف گجراتی محمد قلی کا درباری شاعر تھا۔[2] اور اس نے ۱۵۸۰ء اور ۱۵۸۵ء

---

[1] مسعود حسین خان۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص ۴۲

[2] شمس اللہ قادری۔ اردوے قدیم۔ ص ۶۲

Marfat.com

کے درمیان اپنی مثنوی یوسف زلیخا جو دبستان گولکنڈہ کا اولین نقش ہے لکھی تھی۔ احمد گجراتی نے مثنوی "یوسف زلیخا" میں منظر کشی کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی جھلک عبدل کے "ابراہیم نامہ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ احمد گجراتی گولکنڈے سے عبدل کے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور چلے آئے تھے۔ ان حالات میں عبدل کا ایک کہنہ مشق نامور اور مسلم الثبوت استاد سخن کے فن سے خوشہ چینی کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں معلوم ہوتی اگر احمد گجراتی کی "یوسف زلیخا" دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے تو عبدل کا "ابراہیم نامہ" دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے۔

عبدل کے یہ نادر استعارے ملاحظہ ہوں ؎

اڑی رات کوئل گگن پن اوپر　　نکل دیس کا باز سیج صبح پر
پکڑ سورج چنگل سو مکھ کرن رات　　دسیا لال موہو شفق گگن ہات

عبدل کی توضیحی شاعری سے اس کے زور بیان اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے "در تعریف نورس محل حضرت شاہ" اس کی ایک اچھی مثال ہے اس خوبصورت اور پرشکوہ محل کی جگہ اب صرف اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں لیکن اس کے حسن اور اس کی شان و شوکت کی بڑی پراثر تصویر "ابراہیم نامہ" میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔

گگن سات سبڑھی ہو مل جوڑ کر　　نہ لگ محل نورس کے ایک گھن اوپر
وہ لے گگن آ کر چھیے تس منجار　　رہے طاق بندھیا ہو کر ٹھار ٹھار
خرٹ تورتن مل کندن زر نگار　　سورج چاند مل کر جڑے نو سنار
گگن آرسا کر نورس محل دھر　　اپس روپ اس میں سو دیکھے نظر
سو چھاں شور ہو مکھ کلس درمیاں　　بھرے ذات کی چھانہ ہو دیس جہاں
زمیں سیس پر تھال لے کوٹ دھر　　کنگورے برن مان موتی سو بھر
رکھیا جھک درمیاں نورس محل جان　　اجالا برں آن موتی سو بھر
جلیارات کا جل ہو جن کیا بکھار　　دیس چو طرف بھر خلق کوں ستار

اسی طرح در تعریف آنکہ مشورت کرد شاہ با بہار کہ از یک طرف من آراستہ اہل خود در یک طرف

لہ سیدہ جعفر۔ مقدمہ یوسف زلیخا۔ ص ۵۸

Marfat.com

تو با جمیع درختاں آراستہ" میں جیسے موزوں استعارے اور دلکش تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں ان کی مثال دبستان بیجاپور میں عبدل سے قبل ملنی دشوار ہے۔ رانیوں کے لباس و زیورات، اُن کی آرائش اور ناز و ادا کی بڑی دلفریب اور متحرک تصویریں شاعر نے پیش کی ہے۔ عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں اپنے عہد کے رسم و رواج، آداب دربار، شاہی لشکر، محلات، عمارات اور سیر و شکار جیسے موضوعات پر قابل قدر معلومات فراہم کی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے لشکر کی ہیئت اور فوج شاہی کے رعب و جلال کی اس طرح تصویر کشی کی ہے ؎

دمامیں ڈھمک نادسوں تھر تھریں — بہتے نیر دریا ہو موجاں پھریں
سمند جیب موجوں کریں یوں پکار — دمامیوں شہد شبہہ نہو ناقرار
پھس دھار آ بھولڑا تھار تھار — دیس نین چشموں ڈگی لاگی نار
دیکھیا یوں گگن پر زمیں بے قرار — کھڑے پھر سو بادل چھڑک میگھ دھار

عبدل واقعات کی مناظر کی اچھی مصوری پر قادر ہے۔ دربار شاہی کی سجاوٹ، جواہرات کے مرصع تخت، ارکان دولت کا زرق برق لباس میں حاضر ہونا۔ سونے کی تھال میں شمعوں کی جگمگاہٹ اور چھت کے جھاڑ، فانوس اور اس سے متعلق جزئیات کے پُر لطف توضیحات و بیانات سے "ابراہیم نامہ" میں واقعیت و اصلیت کا جوہر نمایاں ہوگیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار اور اس کے عہد کی مجلسی زندگی کے یہ خاکے تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے حامل بن گئے ہیں۔ عبدل نے اپنی تشبیہات ہندوستانی ماحول اور معاشرت سے اخذ کی ہیں۔ ان پر مقامی رنگ و آہنگ کی چھاپ خاصی گہری نظر آتی ہے۔ بالوں کے جوڑے کو موڑ، ناک کو وادے (طوطا) سید (لفظ) کو "کوئلان"، گردن کی زیبائش کو "فاختی" سے اور چال کو ہنس سے تشبیہہ دینا ہندوستانی فضا اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ "ابراہیم نامہ" پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ عبدل کے کلام میں خارجیت کا عنصر خاصا فعال ہے۔ سالگرہ کے جشن کا بھی شاعر نے بڑا پر اثر مرقع پیش کر کے اس عہد کے بعض تہذیبی مظاہر سے ہمیں روشناس کروایا ہے۔ اس جشن کی محفل موسیقی کا ذکر کرتے ہوئے عبدل نے اپنے ممدوح کی "کتاب نورس" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے گیت اہل طرب اور موسیقار، طبل اور دف پر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ گاتے ہیں۔ اس نغمہ ریز مجلس نشاط کو جن محبوبان دل آرا نے رونق بخشی تھی ان کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔ انوکھے استعارے اور اچھوتی تشبیہات شاعر کے مخصوص طرز فکر کی غمازی کرتے ہیں۔ ؎

Marfat.com

کوئی باندھ جوڑا دسے یوں نماے　　سونے کے سرو پر بیٹھا مور آے
کہ یا بیس کوئل جو شمشاد پر　　پکر پھول گل لعل مکھ چونچ کر
کوئی گوند چوٹی لگی پیٹھ آئے　　کندن کھاپ ترخیا جیوں درمیاں سہائے
کہ یا کھا پے سونے چڑھیا ناگ سیاہ　　اچھل جائے پکڑا سو چھن سیں ماہ
کوئی رکھ جڑت سیں پھل سیں مال　　رھیا جو مشک راس پر آے لال
کہ یا رات کی کوٹھری درمیاں　　رکھیا لاے دیوا سو سیں پھول جان

مسعود حسین خاں نے "قطب مشتری" اور "ابراہیم نامہ" کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دونوں مثنویاں گولکنڈہ اور بیجاپور میں دو سال کے وقفے سے مکمل ہوئی ہیں۔ اور اگر "ابراہیم نامہ" کا ہیرو ابراہیم عادل شاہ ہے تو قطب مشتری کا مرکزی کردار شہزادۂ گولکنڈہ محمد قلی ہے[1] مسعود حسین خان کا یہ خیال درست ہے۔ وجہی کی "قطب مشتری" کے تمام کردار فرضی ہیں اور اس مثنوی میں محمد قلی کے معاشقے کو شاعر نے اپنا موضوع سخن نہیں بنایا ہے۔ راقمۃ السطور نے اپنے مضمون بھاگ متی اور اس کا نو دریافت مقبرہ" میں اس سے مفصل بحث کی ہے[2]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے "ابراہیم نامہ" کی ہیئت مثنوی کی ہے اور اس کا موضوع قصیدے سے مناسبت رکھتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ، اس کے عدل و انصاف جگت گرو کی علمیت، فنونِ لطیفہ سے اس کی دلچسپی اور ذوقِ تعمیر کی خوبصورت اور متحرک تصویریں "ابراہیم نامہ" میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ ابراہیم نے اپنے ممدوح جگت گرو کی سواری خاص کے ہاتھی آتش خاں اور اس کے پسندیدہ طنبور کی موتی خاں کی بھی تعریف و توصیف کی ہے۔ بیدر یا پور کے عالیشان محلات، یہاں کے باروق بازاروں شاہی لشکر "نورس محل" قلعہ و حصار کے استحکام و بلندی، فیلان حضرت شاہ عالم پناہ اسپان تیز گام، سلحداران ہنرمند، شہر کی چہل پہل اور گھما گھمی کا عبدل نے بڑے پر لطف انداز میں ذکر کیا ہے۔ ایک قصیدہ نگار کی طرح عبدل نے بھی اپنے ممدوح کے حسن سیرت اور حسن سیرت اور حسن صورت دونوں کو سراہا ہے اور ابراہیم کی حسن و جمال میں یوسف کا ہمسر بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ یوسف پر صرف زلیخا فریفتہ تھی لیکن میرے ممدوح کے حسن کو دیکھ کر سارا عالم دنگ ہے ؎

---

[1] مسعود حسین خان۔ مقدمہ ابراہیم نامہ۔ ص ۱

[2] سیدہ جعفر۔ بھاگ متی اور اس کا نو دریافت مقبرہ (مضمون) مشمولہ "آجکل" جولائی ۱۹۸۰ء۔ ص ۲۲

Marfat.com

یوں شبہہ روپ کی کہانی تمام　　نہ رہ کر سکیا مصر یوسف مدام
کہ مجھ روپ تھے ہوا دھک شبہہ دکن　　کلا روپ بھر کر سو چوسٹھ لکھن
بھولی مجھ حسن اک زلیخا مدام　　سو شبہہ دیکھ کر بھول عالم تمام

بادشاہ کے حسن انتظام، اس کے عہد کی خوش حالی اور امن وامان کے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ اس شہر میں کوئی غمزدہ اور اشکبار نہیں یہاں درد کی کراہیں نہیں شہنائی کی آواز سنائی دیتی ہے اور فراغت ومرفہ الحالی کا دور دورہ ہے سہ

نہ اس شہر میں انجھو جھڑیں　　سو بن میگھ دھاراں نہ ہو کچ پڑیں
نہ اس شہر میں کوئی دردوں ہنکار　　سو بن پائے شہنائی نا کوئی پکار
نہ پڑتا شہر میں کو باندھیا نفر　　سو بن موتیوں ہور پھولوں کی لٹر
نہ اس شہر میں کوئی مارے کسے　　سو بن کھاد منڈل نہ دوسرا دے

عبدل نے اپنے خیالات بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیے ہیں اور اپنے خلاق تخیل کا "ابراہیم نامہ" میں بار بار ثبوت پیش کیا ہے۔ "ابراہیم نامہ" میں "بچن" کے تعلق سے عبدل نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اس کے ادبی تصورات کا پتہ چلتا ہے اور اس کی ندرت خیال کا اندازہ ہوتا ہے سہ

بچن روپ لائق کیا جگ رچن　　بچن موت پر گٹ ہو قدرت رسن
بچن درمیاں رہ ازل ہو رابد　　رچیا تیں ترلوک لا کر سبد
نکل گیاں دریا تھے یک بچن بوند　　اوٹھیا شوق ہر موج دل سو سمند

"چ تاکیدی" جو دکن سے مخصوص ہے "ابراہیم نامہ" میں نظر نہیں آتا۔ دکن افعال اور حرف انکاری کو بھی شاعر نے استعمال نہیں کیا ہے جمع میں ان کے بجائے وں کا استعمال بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ عبدل بیجاپور میں نوادر تھا اس لیے دکن کے مخصوص الفاظ اس نے نہیں برتے ہیں۔ سری رام شرما دکنی ہندی کا ساہتیہ" میں لکھتے ہیں کہ عبدل کی زبان "دہلوی" ہے اور شاعر نے اس کو ہندی سے ممیز کیا ہے۔ دہلوی میں عربی اور فارسی الفاظ شامل ہونے لگے تھے اور اس کا محاورہ "ہندی" سے مختلف ہوتا جارہا تھا جس میں کہ اودھی اور برج بھاشا کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبدل کی زبان پر برج بھاشا کا خاصا اثر ہے۔

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ سترہویں صدی کے ربع اوّل تک بھی برج الفاظ کا اثر دکنی ادب میں قایم رہا۔

عبدل کا "ابراہیم نامہ" دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی کارنامہ ہے اور اس طرح عبدل کو دبستان بیجاپور کا سرخیل کہنا بیجا نہیں معلوم ہوتا۔

چراغ علی نے نصیرالدین ہاشمی کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہ عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں اپنا تخلص عبدل اور مراثی میں عبدالنبی استعمال کیا ہے۔ ان کے ایک مرثیے کا ذکر کیا ہے جو کتب خانہ سالار جنگ کا مخزونہ ہے[2] اس مرثیے کے چند شعر یہ ہیں ؎

آج غم کا ابر جگ پر چھائیاں — میکھ ہر لین سوں برسائیاں
اس شہا پر ظلم کرنا حق یزید — اپنے موں (کوں) بھر سائیاں
گل علی ہور فاطمہ کے باغ کے — دھوپ لگ (کر) ظلم کی کملائیاں
عرش پر سب عرشیاں نعرا کرے — بہشت میں رضواں پچھاڑے کھائیاں
کر کرم عبدالنبی پر یا امام — لب دعا کے کھول تج پاس آئیاں

عبدل کا نام نذیر احمد نے عبدالنبی بتایا ہے اور نصیرالدین ہاشمی بھی عبدل کا نام یہی قیاس کرتے ہیں ان دونوں محققین کے بیانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ بالا مرثیے کو عبدل سے منسوب گیا گیا ہے لیکن راقمۃ السطور کا خیال ہے کہ یہ انتساب قیاس آرائی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

شہباز حسینی

شہباز حسینی کا ذکر "تذکرہ اولیائے دکن" اور "روضۃ الاولیاء بیجاپور" میں درج کیا گیا ہے۔ وہ خواجہ بندہ نواز کی اولاد سے تھے[3] شہباز حسینی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار میں بیجاپور میں موجود تھے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ خواجہ بندہ نواز کی اولاد کا بہت معتقد تھا۔ چنانچہ اس نے شہباز حسینی کی بیجاپور میں بڑی خاطرداری کی اور وہ وہیں فوت ہوئے اور محلہ شاہ پیٹھ میں دفن کیے گئے[4] شہباز حسینی شاہ ہدایت اللہ حسینی کے

---

[1] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۹۹

[2] چراغ علی۔ اردو مرثیے کا ارتقا بیجاپور اور گولکنڈے میں ۱۷۰۰ء تک ص ۴۲-۴۴

[3] نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو چوتھا باب ص ۲۶۶

[4] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۲۲، ۲۳

Marfat.com

مرید اور خلیفہ تھے۔ جمیل جالبی نے انھیں ہدایت اللہ حسینی کا پوتا تحریر کیا ہے[1]۔ مشتاق کے ہمعصر محمود کے مرشد کا نام بھی شاہ شہباز تھا۔ وہ ایک برگزیدہ شخص تھے لیکن شاعر نہیں تھے۔ شہباز حسینی نے ایک عرصے تک بیجاپور میں رشد و ہدایت کی شمع فروزاں رکھی۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب اشعار میں بعض جگہ یہی تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ آپ کا تخلص شہباز تھا[2]۔ سہ

مخفی نانوں معشوق رکھ ظاہر شہبا کہ لائے

یا

سو ہے عاشق شہباز ہے دونوں جگ کھلارا

خواجہ نصیرالدین سائیاں پنت راکھے ہمار

انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بندہ نواز کا تخلص شہباز تھا۔ اسی تخلص کے ایک اور شاعر ملک شرف الدین شہباز (۹۳۴ھ) گزرے ہیں جو شاہ علی خطیب کے خلیفہ اور ارادت مند تھے لیکن تاحال ان کے کلام کا کوئی مستند نمونہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور میں ادبی شخصیتوں کی جو سرپرستی اور قدردانی کی جارہی تھی اس کے پیش نظر یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ شہباز حسینی نے اردو میں مشق سخن کی ہوگی۔ شہباز حسینی کا انتقال ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۶ء میں ہوا[3]۔

سخاوت مرزا کو دو ایسی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں شہباز حسینی تخلص موجود ہے اور وہ انھیں خواجہ بندہ نواز سے منسوب کرتے ہوئے پس و پیش کرتے ہیں اور لکھا ہے:-

"شاعر نے اپنا پورا نام شہباز حسینی ظاہر کیا ہے اس لیے ان دونوں غزلوں کے حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہونے میں ہم کو شبہ ہے۔ استعارات و تشبیہات زمانہ مابعد کی معلوم ہوتی ہیں"[4]

سخاوت مرزا اور ڈاکٹر زور مندرجہ ذیل دو غزلوں کو شہباز حسینی کی تخلیق تصور کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل۔ ص ۲۲۷

[2] نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۳۱

[3] ڈاکٹر نذیر احمد۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب ۱۔ ص ۲۶۸

[4] " " " " " " " ص ۲۶۵

Marfat.com

کہ "شہباز" کے آگے حسینی لگا کر انھوں نے اپنے تخلص کو خواجہ بندہ نواز کے تخلص سے ممتاز کیا تھا۔[1]

توں تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ناہو نرم تجھ اور چڑے پس کھائے گا آزار توں
بھتیج گھوڑا زور ہے بدخیال اس کا ہو رہے
تن لوٹنے کا چور ہے نا چھوڑ اس بدھار توں
گھوڑے کوں بھیتر کھوڑ ہے اس کوں نہ حکمت ہو رہے
ہر دم ذکر سو توڑ ہے غافل نہ ہو ہو شیار توں
کر دی کلا دل گیان کا لاغام دے خوش دھیان کا
چارا کھلا ایمان کا رکھ باند اپنے دار توں
خوگر شریعت نعل بند زیں ہے طریقت زیر بند
حق ہے حقیقت پیش بند ٹک معرفت اختیار توں
دونوں رکاباں نیک و بد رکھتا قدم توں ایک حد
تب ہو پڑے گا دیکھ جب توبہ کا چابک مار توں
جب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا
تب عشق چھکڑ پائے گا خود مار لے تروار توں
شہباز حسینی کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوے کر
اللہ کے جانب ہوے کر تب پائے گا دیدار تو

(۲)

سونے نہ دیوں خلق کوں شہباز نس دن روئے کر
سوتے سنے پر کون مرے مرت کوئی دیکھے سوئے کر
سوناریاں سنسار کیاں کئی لاک لیلیٰ سار کیاں
عاشق تری دیدار کیاں مجنوں نہ شیدا ہوئے کر
بھنواں سنگھاسن ہوں کرو پلکھاں اوپر پنجرے دھرو
دن رات صبح کوں لے پھروں دو تیں پتلیاں بھوے کر

---

[1] نذیر احمد — علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب۔ ص ۲۶۹

Marfat.com

تارے دسیں گرد تمریا بند پری گل لعل اوپر
افشاں ورق پوہے مگر یا مکھ دکھاوں خوے کر
نقاش جب تج دیکیا صورت تیری لکھ نہ سکیا
ان جہد کر جتنا جیا سب جنم اپنا کھوے کر
جب جیو کے سلطان کوں ہووے ہوس چوگاں اوپر
سر آپنا میداں میں رکھے حسینی گوئے کر
شہباز دوجا نام تئیں جب جیو اوپرے آوں میں
آرے تے سر تا پاوں لگ آپس چراواں دوئے کر [1]

ڈاکٹر زور رقمطراز ہیں کہ شہباز حسینی کی بعض غزلیں بعد میں خواجہ بندہ نواز کی طرف منسوب کردی گئیں[2]۔ نصیر الدین ہاشمی نے لفظ "شہباز" سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر شہباز کی غزلوں کی خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر دیا ہے[3]۔ لیکن نذیر احمد زبان اور تشبیہات وغیرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں خواجہ بندہ نواز کی شعری تخلیق ماننے سے انکار کرتے ہیں[4]۔

معلوم ہوتا ہے کہ شہباز ایک قادرالکلام شاعر تھے اور انھیں مقبولیت بھی حاصل تھی۔ بعد کے دکنی شعراء نے ان کی زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ شہباز کا اصل موضوع بھی تصوف ہے۔ شہباز حسینی کے کلام میں بیجاپوری اسلوب کی جھلک نمایاں ہے اور ان کے اشعار میں فارسی و ہندی اثرات کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے لیکن فارسی اور عربی لغات کا تناسب خواجہ محمد دہدار فانی کی شاعری کی طرح ان کے یہاں بڑھ گیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری ایک مخصوص راستے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔

پیار محمد بن عیسیٰ خاں قریشی بیدری

"بھوگ بل" کے شاعر کا نام پیار محمد بن عیسیٰ خان تھا اور اس نے قریشی تخلص اختیار

---

[1] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۹۹

[2] چراغ علی۔ اردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈے میں ۱۷۰۰ء تک ص ۴۲ ص ۴۴

[3]

[4]

Marfat.com

کیا تھا۔[1] قریشی اپنی مثنوی "ولایت نامہ" (۱۰۰۰ھ) میں اپنے پورے نام "ولدیت، وطن اور پیر طریقت کے نام کی وضاحت کرتا ہے مثنوی کے آخر میں قریشی کہتا ہے ؎

قریشی پیار محمد بن عیسٰی خان　　لکھیا نامہ کہو الشد رحمان

سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ قریشی، فیروز بیدری کا مرید تھا جنھوں نے "پرت نامہ" اپنی یادگار چھوڑا ہے اور جس طرح فیروز بیدری نے "پرت نامہ" یا "توصیف نامہ" میں شیخ مخدوم جی بیدری کی مدح کی ہے، اس طرح ان کی تقلید میں قریشی بیدری نے "ولایت نامہ" میں اپنے مرشد قطب الدین فیروز کی توصیف کی ہے[2]۔ اس نظم میں قریشی اپنے مرشد فیروز بیدری سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

الشد کی ہے نظر پیکر مدت گیر　　جھراویں بیل مدوے قطب دیں پیر

اس شعر میں قطب دین کو واضح طور پر "پیر" کہا گیا ہے اس لیے کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہی کہ قریشی اپنے روحانی رہبر کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

قطب دین اولیا رہے شاہ غازی　　جنھوں کے دین و دنیا بیش بازی

مودیں ہمیں مدت تل تل کھڑی مانجھ　　کریں شبہہ دستگیری صبح ہور سانجھ

قریشی بیدری کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے قریشی کو امیر برید کے زمانے کا شاعر بتایا ہے[4] لیکن ان کا یہ بیان خاصا مبہم ہے کیوں کہ برید شاہی خاندان میں دو امیر برید گزرے ہیں۔ امیر برید اوّل (۹۱۰ھ تا ۹۴۹ھ / ۱۵۰۴ء تا ۱۵۴۲ء) اس خاندان کا دوسرا حکمران تھا۔[5] امیر برید دوم نے تقریباً آٹھ سال یعنی ۱۰۱۰ھ / ۱۶۰۱ء سے ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء تک حکومت کی ہے۔ عبدالقادر سروری نے علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں قریشی بیدری کو محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء)

---

[1] (۱) سخاوت مرزا۔ اردو ادب شمارہ ۳۰ سنہ ۱۹۶۵ء ص ۵ (ب) انصار اللہ فیروز بیدری قادریہ سلسلہ کا ایک بزرگ شاعر (مضمون) مشمولہ۔ رسالہ ذوق نظر حیدرآباد۔ جولائی سنہ ۱۹۸۵ء۔ ص ۶۵

[2] سخاوت مرزا۔ اردو ادب۔ شمارہ ۳۰ سنہ ۱۹۶۵ء۔ ص ۵

[3] انصار اللہ۔ فیروز بیدری قادریہ سلسلہ کا ایک بزرگ (مضمون) مشمولہ رسالہ ذوق نظر حیدرآباد۔ جولائی سنہ ۱۹۸۵ء ص ۶۵

[4] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۸۵

[5] عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۸۳

Marfat.com

تا ۱۵۲۰ء) کے عہد کا شاعر بتایا ہے اور بہمنی دور کے شعراء میں ان کا شمار کیا ہے[۲]۔ جو درست نہیں۔ محمود شاہ، بہمنی سلطنت کا چودھواں تاجدار تھا "بھوگ بل" کی اندرونی شہادت اس سلسلے میں ہماری اچھی رہبری کر سکی ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

بھی اس بعد در دورِ ثانی امیر — کہ جن شاہ بھوگی ہیں نرمل سریر
سو اس شاہ کے دور بیدر مقام — یو شاعر کیا نظم دکنی تمام

قریشی کے مندرجہ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امیر برید ثانی (۱۶۰۱ء سے ۱۶۰۹ء) کے دور سے تعلق رکھتا تھا جب کہ "بھوگ بل" کا تعارف کراتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطات کی توضیحی فہرست میں بھی انھیں امیر برید اوّل کے عہد کا شاعر تحریر کیا ہے۔ جس کا زمانہ حکومت انھوں نے ۹۱۰ھ تا ۹۵۰ھ بتایا ہے[۳]۔ قریشی نے "در دور ثانی امیر" کہہ کر اپنے عہد کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ عبدالقادر سروری کی غالباً اس لیے تسامح ہوا ہے کہ قریشی نے "بھوگ بل" کے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ "شاہ محمود" کے دور میں "ہندوی لوک" کو فارسی میں نقل کیا گیا تھا ؎

برید شاہ محمود کی در رسی — کیئے ہندوی لوک کوں فارسی

اس شعر میں محمود شاہ کا نام دیکھ کر عبدالقادر سروری نے قریشی کو بہمنی بادشاہ محمود شاہ کے عہد سے منسوب کر دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ قریشی امیر برید (اول) کے "دربار کا متوسل" تھا جب نصیر الدین ہاشمی کا پہلا بیان کہ وہ امیر برید اوّل کے دور کا شاعر تھا غلط ثابت ہوتا ہے تو پھر قریشی اپنے عہد کی "ہندوی"[۴] سے بخوبی واقف تھا ورنہ ترجمے کا خیال اس کے ذہن میں کیسے آتا؟۔ نصیر الدین ہاشمی نے "بھوگ بل" کا سن تصنیف "دکن میں اردو" میں ۱۰۲۳ھ بتایا ہے[۵]۔ "بھوگ بل" میں قریشی نے اپنے نام اور مقام تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے عہد کے حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

---

[۲] عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ تیسرا باب۔ ص ۱۸۵

[۳] نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطات کی توضیحی فہرست ص ۳۳۹

[۴] بھوگ بل۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۶

[۵] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو ص ۲۸۵

Marfat.com

جو پیدا ہوئیں شاعراں نیک خواہ — کہ شہر بیدر سچا تخت گاہ
سو شاعر قریشی لکھیا یہ ضمیر — کہ بیدر کیرا زائیدہ یک فقیر

فنّی نقطہ نظر سے "بھوگ بل" دکنی ادب کے شہ پاروں میں شمار نہیں کی جا سکتی اس کی اہمیت کا راز اس کی قدامت اور موضوع کی ندرت میں پوشیدہ ہے۔ قریشی وہ پہلا شاعر ہے جس نے "ہندوی" اور "دکنی" میں تمیز کی ہے جہاں وہ "بھوگ بل" میں ہندوی کوک" کا ذکر کرتا ہے وہیں اپنی زبان کو اس نے "دکنی" سے موسوم کیا ہے ؎

یو شاعر کیا نظم دکنی تمام [1]

"بھوگ بل" کی ابتدا میں شاعر کہتا ہے کہ اس نے "رتی رہس" نامی کتاب سے استفادہ کیا ہے اس کا شاعر بہت صاحب فہم اور "بدونت" تھا اور اس علم میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ "ہندو" تھا اور اس نے اپنی زبان میں "کوک" کو نظم کیا تھا۔

کیا مُستَعِد رائے کی کاج تب
رتی رہس میں تھے جینا ہوں میں سب

شاعر کہتا ہے کہ "برید شاہ محمود" کے دور میں "گوک" کو فارسی کا جامہ پہنایا گیا تھا اس کے بعد جب امیر ثانی کا عہد آیا تو میں نے بمقام بیدر اس کو "دکنی" میں نظم کیا ہے اور اس کا نام "بھوگ بل" رکھا ہے۔

"بھوگ بل" میں محبّت کے دیوتا مدن کی تعریف، توصیف کی ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں اسی سے محبّت کی ابتدا ہوتی ہے ؎

مدن ناؤں ہے عشق کا بادشاہ
شعرِ عشق اس تے ہوئی گاہ گاہ

"بھوگ بل" ادبی اعتبار سے کوئی بہت بلند پایہ کا افسانہ نہیں اس کے موضوع کی انفرادیت اور ندرت نے اسے قابل توجہ بنا دیا ہے اس میں عورتوں کی مختلف قسموں "پدمنی"، "چیتنی"، "سنگنی" اور "ہستنی" کی خصوصیات اور عادات و اطوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خود شاعر کہتا ہے ؎

---

[1] بھوگ بل۔ مخطوطہ نمبر ۴۳۱۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۶

Marfat.com

اول پدمنی کے پچانت میں فعل　　دوسرا بیان چیتنی کا یہی اصیل
سوتسری میں ہیں سنگنی خصلتاں　　بھی جوتھی میں ہیں ہنستھنی کیاں گناں

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جن کے بارہ ذیلی ابواب قائم کیے گئے ہیں اس میں اٹھائیس مختلف آسنوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ بعض دواؤں کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے۔ یہاں "بھوگ بل" کے شاعر کا طبی نقطۂ نظر سے اظہار ہوتا ہے "بھوگ بل" میں جنسیات سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس رسالے کے صرف دو مخطوطوں کا ہمیں علم ہو سکا ہے ایک کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے[1]۔ "رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کلکتہ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کا عکسی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کا مخزونہ ہے[2]۔ اس مخطوطے میں پینتالیس تصویریں موجود ہیں اس کا پہلا اور آخری صفحہ غائب ہے مخطوطہ نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے اور صفحات کی جملہ تعداد ۲۷۴ ہے۔

ڈاکٹر زور نے قریشی کی اس کتاب کا نام "بہوک پہل" تحریر کیا ہے لیکن اس کتاب کا نام دراصل "بھوگ بل" ہے دکنی کاتبوں نے اکثر ہائے مخطوطہ کی جگہ ہائے ہوز تحریر کیا ہے اور گ کو صرف ایک مرکز کے ساتھ تحریر کرتے ہیں "پہل" دراصل "بہل" ہے جسے ڈاکٹر زور نے دو نقطوں کے اضافے کے ساتھ پڑھا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب کا نام بقول پروفیسر محفوظ الحق "بہوک بہل" ہے اور بقول ڈاکٹر زور "بہوک پہل" مگر زیر بحث مخطوطے میں "بہوگیل" پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے تینوں نام ہوں"[3]

راقمۃ الحروف نے کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطے کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مخطوطے میں مندرجہ ذیل شعر ہے

رکھیا ناوں بنگار سی بہوگیل　　جو چاتر کرے بہوگ دن دن اگل

موجود ہے دوسرے مصرعے کی ردیف "اگل" ہے جس سے مراد آگے یعنی زیادہ ہے لفظ اگل کا

---

[1] بھوگ بل۔ مخطوطہ نمبر۔ ۱۳۴ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ۱۵۶ انجمن ترقی اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست ۳۸۳ پر ایک مخطوطے بھوگ بل کا ذکر ہے جس کے کاتب کا نام شہاب الدین قریشی بتایا گیا ہے اور سن کتابت ۱۰۸۲ھ درج کیا گیا ہے۔

[3] نصیر الدین ہاشمی۔ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۳۴۰

Marfat.com

ہم قافیہ لفظ "لفظ بہوگیل" نہیں ہو سکتا بلکہ "بہوگیل" ہی ممکن ہے جس سے نصیرالدین ہاشمی کے اس بیان کی تردید ہوئی ہے کہ قریشی کی اس کتاب کا نام "بہوگیل" تھا۔

"بھوگ بل" کا موضوع جنسیات سے متعلق ہے اور ایسے موضوعات میں شاعر کی شعری صلاحیتوں کو بروے کار آنے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اس کے باوجود "بھوگ بل" میں اکثر جگہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ "قریشی گھٹیا درجے کا شاعر" نہیں[1] عورت کی اعلیٰ ترین قسم پدمنی کے اوصاف پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیا ہے اور اپنے شاعرانہ تخیل کا ابھی اظہار کیا ہے ؎

خوش آواز میں بلبلاں پھول پر — خوشی سوں سنی بھول سب کان دھر
ہر یک جھاڑ ڈلتی میں اوکھاں سروپ — کھلی پھول مقبول خوش باس روپ
مدن مست سور نہیں میں مت دوئی — جھمکنے میں جون مرگ سوں نہیں اڑی
کرے جیو تازہ جو خوش باس آئے — برہ مارے عاشق کے دل کو اگھائے
معطر کریں پھول خوش رنگ و باس — اچھے عاشقاں پاس دائم یو باس

"بھوگ بل" کی ابتداء میں شاعر کہتا ہے کہ خدا نے دنیا میں اپنی مخلوق کی تعداد بڑھانے کے لیے عورت اور مرد میں محبت پیدا کی ہے ؎

محبت ملانیہ سوناری و نر — کیا نسل ہو ذوق جفتی بھیتر
بنایا نبی آدم کی پھنسلی حوا — تو آدم کی دکھ کوں حوا ہوئی دوا

قریشی بیدری کی "بھوگ بل" دراصل پنڈت کل کوک کی "رتی رہس" کا ترجمہ ہے جو وتسائین کی "کام سوتر" کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ قریشی نے اس کا اعتراف کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

اہے اصل شاعر کا ناؤں گلوک — سو پرگٹ ہوا اسم شاعر کے لوک
کیا مستعد راے کاج سب — رتی رہس میں تھے چینا (ہوں) میں سب

قریشی کہتا ہے کہ "بھوگ" کے موضوع پر یہ کتاب شاستروں اور طب کی کتابوں کی مدد سے لکھی گئی ہے۔ سر رچرڈ برٹن نے "کام سوتر" کے مقدمے میں کلکوک پنڈت اور لوک شاستر کا بھی

---

[1] عبدالقادر سروری۔ علی گڑھ تاریخ اردو ادب تیسرا باب ص ۱۸۵

Marfat.com

حوالہ دیا ہے[1]۔ اصل "رتی رہس" میں صرف آٹھ سو اشعار ہیں اور قریشی نے چونکہ "بھوگ بل" میں اکثر جگہ تشریح اور تفصیل سے کام لیا ہے اس لیے اس کے اشعار کی تعداد دو ہزار آٹھ سو ساٹھ تک پہنچ گئی ہے۔ ایچ، ایس گیمبرس (H. S. Gambers) نے رتی شاستر کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ جنسیات کا علم دراصل شاستروں اور ویدوں کا رہین منت ہے[2]۔ دکن میں جنسیات کے موضوع پر جو قابل ذکر کتاب تصنیف ہوئی ہے وہ دور محمد قلی قطب شاہ کے مصنف صفی الدین جیلانی کی "تذکرۃ الشہوۃ" ہے جو فارسی میں لکھی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ جنسیات کے موضوع پر قریشی کی "بھوگ بل" دکن کی اولین تصنیف ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں کوک شاستر، رتی شاستر، نائیکہ بھید اور کام کلا کی معلومات سے استفادہ کیا ہے۔ بھوگ بلاس محمد قلی کی شاعری کا خاص میلان محسوس ہوتا ہے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر محمد قلی نے اپنے عہد کے نامور حکیم صفی الدین جیلانی کی تصنیف کے علاوہ قریشی بیدری کا "بھوگ بل" کا بھی مطالعہ کیا ہو۔ محمد قلی نے اپنے اشعار میں اپنی محبوباؤں اور پیاریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصی خصوصیات کی بھرپور ترجمانی کرنے اور ان کے خدوخال کو واضح کرنے جنسیات کی بعض اصطلاحوں سے مدد لی ہے۔ کام سوتر میں حسن و جمال، عادات و اطوار اور خصائل کے اعتبار سے عورتوں کی جو چار قسمیں بتائی گئی ہیں ان کا ذکر محمد قلی کے کلام میں موجود ہے۔ وہ اپنی مختلف محبوباؤں کو "کام سوتر" کے بتائے ہوئے مختلف زمروں میں تقسیم کرتا اور ان کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ اور چترنی پاچیتنی کی اس طرح تعریف کی ہے ؎

کہو چیتنی ناد کا کیا ہے حال
چلی چار نیکی میانہ ہے فد
اسی پوتلی نار سینہ کشاد
بہوت نار کو ناچ ناد

Marfat.com

اسی طرح عورتوں کی تیسری قسم یعنی سنکھی کے اوصاف وخصائل پر بھی شاعر نے روشنی ڈالی ہے اور کہتا ہے ؎

نشانیاں یو اس میں کی سن لے تمام　　میانہ اُسے رنگ فربہ اندام
گل لعل خوش آئیں جس نار جاں
اچھے نار سنکھن نشانی بچھاں

خوبصورتی اور تناسب اعضا کے اعتبار سے پدمنی اور چترنی کا رتبہ بہت بلند ہے۔ سنکھنی کا درجہ اس کے بعد آتا ہے اور سب سے آخر میں ہستھنی کا مقام ہے جو کہ بدصورت اور بے حیا بتائی گئی ہے۔ قریشی بھی رتی رہس اور کام سوتر کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہے اور ہستھنی کے بارے میں کہتا ہے ؎

پہچات توں کر ہستھنی کی اتال　　رہے انگ فربہ مستی کری چال
شرم کی نہیں بات ناری میں ٹک　　اچھے ہیں شرم او لکھن سار مک

قریشی کے زمانۂ حیات کے متعلق مسعود حسین خاں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ شعر میں شاہ محمود کا نام پڑھ کر انھوں نے بعد کے اشعار پر غور کیے بغیر یہ رائے قائم کی ہے کہ قریشی محمود شاہ بہمی کے عہد کا شاعر تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ فیروز بیدری (شاعر پرت نامہ) کا ہمعصر تھا اور تیسرے یہ کہ عمر میں فیروز سے بڑا تھا۔[1] لیکن "بھوگ بل" کے اشعار سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے کہ برید شاہ محمود کے دور میں "ہندوی کوک" کو فارسی میں منتقل کیا گیا تھا۔ پھر "(بھی)" اس دور میں جو امیر (برید) ثانی کا دور ہے بمقام بیدر میں اسے دکنی قالب میں ڈھال دیا ہے ؎

برید شاہ محمود کے دور بھی　　کیے ہندوی کوک کو فارسی
یہی اس بعد در دورِ ثانی امیر　　کہ جن شاہ بھوگی ہے نرمل سریر
سو اس شاہ کے دور بیدر مقام　　یو شاعر کیا نظم دکھنی تمام

ان اشعار کے پیش نظر مسعود حسین خاں کے اخذ کردہ نتائج درست نہیں معلوم ہوتے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض مورخین کے خیال میں امیر برید ثانی کے نام کا کوئی

---

[1] بھوگ بل۔ مخطوطہ نمبر ۴۳۱ ۴۔ کتب خانہ سالار جنگ۔ ص ۲۳

[2] مسعود حسین خان۔ پرت نامہ۔ قدیم اردو جلد اوّل ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۳۸

Marfat.com

حکمراں گزرا ہی نہیں چنانچہ عبدالمجید صدیقی "مقدمہ تاریخ دکن" میں رقمطراز ہیں :۔

"سلاطین برید کے سلسلۂ نسب میں یہاں صرف مورّخ فرشتے کا تتبع ہے اور یہ بہت کچھ تحقیق طلب ہے۔ مراۃ الصفاء اور دوسری تاریخیں اس سے اختلاف کرتی ہیں مسز ولزی ہیگ نے ایک دوسرا شجرہ پیش کیا ہے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ سلاطین برید کی کوئی ہمعصر تاریخ ہے نہ ان کے دور کے تمام سکّے دستیاب ہوئے ہیں اگرچہ غلام ہمدانی گوہر نان نے ایک تاریخ برید کا حوالہ دیا ہے۔ اسی وجہ سے اس سلسلۂ نسب کی تحقیق بہت مشکل ہو جاتی ہے"[1]

عبدالمجید صدیقی نے محمد قاسم فرشتہ مورخ "گلشن ابراہیمی" (تاریخ فرشتہ) کے تتبع میں جو شجرہ تحریر کیا ہے اس میں برید شاہی سلطنت کا ساتواں بادشاہ امیر برید دوم (۱۰۱۰ھ تا ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۱ء تا ۱۶۰۹ء) قاسم برید ثانی کے دور میں (۹۹۴ھ تا ۹۹۸ھ) لکھی تھی اور قریشی کی مراد سلطان محمود سے کوئی بریدی سلطان ہے[2]

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بریدوں کے کسی بادشاہ سلطان محمود کے ذکر سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ دراصل اشعار کی تفہیم سے پیدا ہونے والی غلط فہمیاں ہیں جنھوں نے محققین کے ذہن کو اس طرح الجھا دیا ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے "بھوگ بل" کا موضوع بہت ہی منفرد ہے اور اپنے موضوع پر دکن میں یہ پہلی کتاب ہے۔ یہ موضوع اس اعتبار سے بہت مشکل ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے موضوع کی مقصدیت مجروح ہو سکتی ہے یہ شاعر کا کمال ہے کہ وہ جنس کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بھی عریانی اور فحاشی سے بلند نظر آتا ہے اور اس نے جنس کا ذکر ایک فن اور کلا کی حیثیت سے کیا ہے۔ ایلورا، اجنتا اور کھجوراہو کی مورتیاں آرٹ کا حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ ایچ ایس گیمبرس (H. S. Gambers) نے رتی شاستر کے ترجمے میں علم جنسیات کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ جب شیو نے دس ہزار سال کی تپسیا کے بعد آنکھیں کھولیں تو پاروتی کو اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھا۔ شیو نے پاروتی سے کہا کہ وہ ان سے جو چیز طلب کرے گی فوراً مل جائے

---

[1] عبدالمجید صدیقی۔ مقدمہ تاریخ دکن۔ ص ۷۲

[2] " " " ص ۷۳

[3] سخاوت مرزا۔ اردو ادب۔ شمارہ ۳۰ سنہ ۱۹۶۵ء۔ ص ۵

Marfat.com

گی۔ پاروتی نے شیو سے "علم جنسیات" طلب کیا۔[1] اس موضوع کی شان نزول کے بارے میں شاستروں ویدوں، پرانوں اور دیگر مذہبی کتب میں مختلف روایتیں ملتی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ معلومات کے اعتبار سے سنسکرت ادب میں اس موضوع پر واتسائین نے پہلی بار توجہ کی اور کام سوتر مرتب کی تھی۔ واتسائین نے بعض اور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں لیکن وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ کر ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ اس لیے اولیت کا سہرا واتسائین کے سر باندھا جاتا ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قریشی نے "بھوگ بل" کی تصنیف کے سلسلے میں کام سوتر کا بھی مطالعہ کیا ہوگا یا اس کی معلومات سے مستفید ہوا ہوگا۔ قریشی نے کلکوک پنڈت اور رتی رہس کے حوالے ضرور دیئے اور کہتا ہے ؎

روایت کریں وادیاں حساب — رتی رہس تھا ناؤں سو اس کتاب
لکھیا تھا سب ہی ہندوی یہ کتیب — کھیا ہے بہت بھوگ کیرا حسیب
اہے اصل شاعر کا ناؤں کلکوک — سو پرگٹ ہوا اسم شاعر کے کوک

قریشی کہتا ہے کہ کل کوک نامی شاعر جس نے رتی رہس ہندوی میں لکھی تھی بڑا ذی فہم اور عقلمند تھا اور وہ اس علم پر عبور رکھتا تھا۔ قریشی نے کھلے دل سے اس کتاب سے اپنی خوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے "بھوگ بل" کا مواد اسی ماخذ سے مستعار لیا ہے۔

"بھوگ بل" میں قریشی نے جس کے موضوع پر ایک بالغ نظر شاعر کی طرح روشنی ڈالی اور تلذذ، جنسی مسائل، عورتوں کی قسمیں اور ان کے علاج معالجے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اصل رتی رہس آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔[2] لیکن قریشی نے جا بجا اضافے کیے ہیں اور تصرف سے کام لے کر اپنی توضیحات کو بامعنیٰ اور سریع الفہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ قریشی کی "بھوگ بل" میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے دو ہزار آٹھ سو ساٹھ اشعار ہیں جس سے قریشی کی اس موضوع سے متعلق وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسٹوورٹ "بھوگ بل" کے بارے میں کہتا ہے کہ اس میں عورتوں پر فحش طنز کیا گیا ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹوورٹ نے

---

[1] ایچ ایس گیمبرس۔ مقدمہ رتی شاستر۔ صفحہ ۱۱۰

[2] نور السعید اختر۔ قدیم اردو میں جنسیاتی ادب کا پہلا نقش (مضمون) مشمولہ شیرازہ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۴، ۵، ۶، صفحہ ۶۴

Marfat.com

مجموعے کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔

"بھوگ بل" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریشی انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں اور نفسیاتی کیفیات کی موثر ترجمانی پر قادر تھا۔ وہ سنسکرت، "ہندوی"، عربی، فارسی اور دکنی پر دستگاہ رکھتا تھا قریشی احادیث سے بھی بخوبی واقف تھا اور طب و حکمت کے علوم سے آشنا تھا۔ "بھوگ بل" میں انفرادی فکر کا بار بار احساس ہوتا ہے۔ حمد و نعت کا اضافہ اور احادیث سے جنس کی اہمیت ثابت کرنے کی کوشش قریشی کے تخلیقی ذہن کی پیداوار اور اس کی ذاتی اپج کی غماز ہے۔ مثنوی میں قریشی نے جنس کے موضوع کو بھی متصوفانہ رنگ میں ڈبو دینے کی کوشش کی ہے اور کہتا ہے سہ

کہے عقل معشوق تھے ہو جُدا — جدا جیو سے کوئی کیوں ہے خُدا
رہیں عشق بھی دوی یکبک جدا — اہے یک مجازی حقیقت دو جا
مجازی تھے انپڑے حقیقت مین جن — سرافراز ہووے دو نعمت سو تن
مجازی منے بی دو تقسیم ہے — بہت بہانت تعظیم و تکریم ہے

مثنوی میں عقل اور عشق کا موازنہ کرتے ہوئے قریشی نے انسانی زندگی میں ان دونوں طاقتوں کی اہمیت واضح کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قریشی ایک خوش گو شاعر تھا۔ تشبیہات رنگینی کلام اور استعارات کی اچھی مثالیں "بھوگ بل" میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے شاعر کو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے مظاہرے کے مواقع حاصل نہ تھے اس کے باوجود قریشی نے اپنے طرز ادا اور جولانی طبع کے جوہر کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش ضرور کی ہے۔

سہیلیاں کے زلفاں میں پھاندے دھرے
نینیاں مرگ عاشق کی اس میں پڑے
سہیلی کا مکھ شمع عاشق پتنگ
پتنگ جائے جل کر کریاس سوں سنگ

"ولایت نامہ"، جیسا کہ شاعر کا بیان ہے ۱۱۰۱ھ میں مکمل ہوا تھا۔ قریشی کہتا ہے سہ

دوشنبہ روز تھا پہلا مہارا — اللہ نے بخشایہ پندسارا

سلہ چارلس سٹیورارٹ۔ اے ڈسکرپٹو کیٹلاگ آف دی اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری آف دی لیٹ ٹیپو سلطان آف میسور۔ صـ۱۸۱

Marfat.com

جمادی الاوّل یہ ..... سنہ واحد ہزار ایک سال ہوا

شاعر نے مثنوی کے نام کی وضاحت اس طرح کی ہے ؎

ولایت نامہ را تحریر کردم
برائے ہمشیاں ہدیہ بردم

"ولایت نامہ" کا موضوع پیر طریقت کی تعریف و توصیف ہے اور اشعار میں متصوفانہ رنگ جھلک نظر آتی ہے۔ اس مثنوی کا بھی حمد سے آغاز ہوتا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

الف اللہ ساجا ایکی سجان — دو جا میم ہے محمد انبیا رجان
دیتا ہوا آخرت اس کوں نہ پایا — دو جگ میں تو الف کو میم بھایا

مثنوی کا درجہ ادبی اعتبار سے زیادہ بلند نہیں لیکن زبان کے آغاز و ارتقاء کی گتھیوں کو سلجھانے میں اس دور کے شعراء کی ادبی تحقیقات کا صرفی و نحوی اور صوتی تجزیہ مفید اور اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔

مقیم اور مقیمی مرزا محمد مقیم مشہد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام میر محمد رضا مشہدی تھا۔ "برہان ماثر" میں ان کے والد کو "صحیح النسب سید" بتایا گیا ہے[1] اور ان کے فرزند محمد مقیم کے نام کے ساتھ مرزا کا سابقہ موجود ہے۔ "برہان ماثر" کے الفاظ میرزا محمد مقیم ابن میر محمد رضا رضوی مشہدی" سے باپ کے سید اور بیٹے کے مغل ہونے کا اظہار ہوتا ہے جو یقیناً ایک مضحکہ خیز بیان ہے۔ "بساتین السلاطین" میں بھی مرزا مقیم کے نام کے ساتھ "میرزا" کا لفظ تحریر کیا گیا ہے[2]۔ اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری حیدر آباد میں "دیوان خمسہ" کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے ترقیمے میں "مصنفہ مرزا مقیم سلمیٰ" تحریر کیا گیا ہے[3]۔ "حدیقۃ السلاطین" میں میرزا نظام الدین احمد الصاعدی شیرازی نے شاعر کا نام محمد مقیم ہی تحریر کیا ہے لیکن احترامی لفظ "صلا" کا اضافہ بھی کیا ہے[4]۔ لیکن ان تذکروں میں کہیں شاعر کا تخلص مقیمی تحریر نہیں کیا گیا ہے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ مرزا مقیم استرآبادی (ایران) سے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے وطن سے نکلا تھا۔ واپسی پر شیراز میں مقیم ہو گیا اور

---

[1] (۱) علی بن عبدالنبی طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۵۰۴ (ب) جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل۔ ص ۱۸۵ اور ۲۳۵

[2] میرزا ابراہیم رہبری۔ بساتین السلاطین بستان ششم ص ۳۲۵

[3] مرزا نظام الدین احمد الصاعدی شیرازی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۱۰۰

[4] دیوان خمسہ مخطوطہ نمبر ۹۶۳۔ دواوین فارسی۔ نمبر داخلہ ۱۶۸۹۵ اورنٹیل سکرپٹ لائبریری۔

Marfat.com

سرپرستی کی خاطر بیجاپور چلا آیا جہاں اس کا ہم وطن فتوحی استرآبادی "فتوحات عادل شاہی" مرتب کر رہا تھا۔[1] ڈاکٹر زور[2] اور نصیرالدین ہاشمی[3] نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ میرزا محمد مقیم کا تخلص مقیمی تھا۔ اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ مرزا محمد مقیم کا تخلص سلمیٰ اور مقیمی تھا۔ فارسی میں اس کی یادگار "خمسہ" اور قصائد ہیں تو دکنی میں چند ریدن و مہیار۔" اکبرالدین صدیقی کے اس بیان کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے کہ "برہان ماثر" بساتین السلاطین"، گلدستہ بیجاپور"، "حدیقۃ السلاطین" اور "فتوحات عادل شاہی" میں شاعر کا نام مرزا مقیم ہی تحریر کیا گیا ہے اور لفظ مقیمی کہیں اس کے نام کے ساتھ بطور تخلص نظر نہیں آتا۔ "احوال سلاطین بیجاپور" میں جہاں مرزا محمد مقیم مشہدی کی اردو شاعری کا ذکر ہے وہاں بھی مقیمی نہیں، مقیم تحریر کیا گیا ہے۔ "گلدستہ بیجاپور" سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا محمد مقیم فارسی کے علاوہ "ہندوی" میں بھی کلام موزوں کرتا تھا۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے:۔

"تیسرے حکیم آتش کہ فکر بلند اس کی رتبہ سنج طارم اعلیٰ کی تھی چوتھا مرزا مقیم کہ معنیٰ
نوازی و لفظ پردازی میں عدیل و سہیم رکھتا تھا۔[4]

ان تمام شواہد کی بنا پر اکبرالدین صدیقی کا یہ بیان کہ مرزا محمد مقیم اور مقیمی ایک ہی شاعر تھا غلط معلوم ہوتا ہے۔ راہل سانکرتیاین دکنی ہندی کا دیہ دھارا میں اسی غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔[5] جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ انھیں محمد مقیم کی ایک نایاب فارسی مثنوی دستیاب ہوئی ہے جس میں شاعر نے اپنا تخلص مقیمی اور سلمیٰ ظاہر کیا ہے۔[6] ثبوت میں انھوں نے حسب ذیل شعر پیش کیا ہے۔ سہ

مقیمی نہ بینی درس باغ کس تماشا کند پر کلے یک نفس

جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کتب خانہ کی ایک قدیم بیاض میں ایک "فتح نامہ" درج ہے جس کے ترقیمے میں یہ الفاظ تحریر کیے گئے ہیں:۔

---

[1] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد اوّل۔ ص ۳۷

[2] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۳۷

[3] نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۱۹۵

[4] خواجہ میر احمد علی (مرتب)، حمیدالدین شطاری۔ گزشتہ بیجاپور۔ ص ۶۱

[5] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل۔ ص ۲۳۶

[6] راہل سانکرتیاین، دکنی ہندی کا دیہ دھارا ص ۲۲۶

Marfat.com

"مرتب شد فتح نامہ بکھیری گفتار مرزا محمد مقیم"، لیکن اسی بیاض میں "فتح نامہ" کے بعد "چندر بدن و مہیار" بھی تحریر کی گئی ہے اور اس کے ترقیمے کے الفاظ ہیں "مرتب شد قصہ مہیار و چندر بدن گفتار مقیمی"، فتح نامہ بکھیری"، اور "چندر بدن و مہیار دونوں کی زبان فارسی نہیں دکنی ہے جس سے جمیل جالبی نے نذیر احمد کی طرح یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ مرزا مقیم بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا اور اسی شاعر نے قلعہ بکھیری کی فتح کے موقع پر "فتح نامہ" مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا اور دوسرا شاعر مقیمی "چندر بدن اور مہیار" کا شاعر ہے جس نے ایک فارسی مثنوی بھی لکھی ہے۔ اور دونوں مثنویوں میں اپنا تخلص مقیمی ہی استعمال کیا ہے۔[۲]

"فتوحات عادل شاہی" اور "بساتین السلاطین"، میں اس کی فارسی شاعری کی بڑی تعریف کی گئی ہے وہ اعلیٰ درجے کا شکستہ نویس بھی تھا۔[۳] مرزا مقیم جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا ہے بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے متوسل تھا۔ "زوال سلطنت قطب شاہیہ" میں سید علی حسن لکھتے ہیں کہ اگر بیجاپور کا سفیر ابوالحسن گولکنڈے میں متعین تھا تو گولکنڈے کا سفیر ملا محمد مقیم بیجاپور پر مامور تھا اور چوں کہ ان سفیروں کا قیام مستقل ہوتا تھا اور ان کی حیثیت "رزیڈنٹ"، کی سی ہوتی تھی۔ اس لیے انھیں "حاجب مقیم"، کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔[۴]

مقیم فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا اس نے قلعہ بکھیری فتح ہونے پر "فتح نامہ"، مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔[۵] "گلدستہ بیجاپور" کے مورخ خواجہ میر احمد علی، علی عادل شاہ ثانی کے درباری شعراء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ملا نصرتی ہندی گو تھا۔ شاہ نور اللہ اور مرزا مقیم، مرزا دولت شاہ اور حکیم آتش اکثر فارسی گو تھے اور ہندی شعر بھی کہتے تھے۔[۶]

---

[۱] سیدہ جعفر داوم پرکاش نرمل۔ مقدمہ چندر بدن و مہیار (ہندی) صـ۱۰

[۲] جمیل جالبی تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ صـ۲۳۶، ۲۳۷۔

[۳] نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں علماء و فضلا کی خدمات (مضمون) مشمولہ رسالہ نوائے ادب بمبئی۔ جولائی ۱۹۵۸ء۔ صـ۱۸

[۴] سید علی حسن۔ زوال سلطنت قطب شاہیہ۔ صـ۷

[۵] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ صـ۲۳۵۔۲۳۶

[۶] خواجہ میر احمد علی (مرتب حمید الدین شطاری) گلدستہ بیجاپور۔ صـ۶۱

Marfat.com

فتح نامہ بکھیری کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانے میں موجود ہے[1] جس کو چندر بدن ومہیار" کے شاعر مقیمی کی تصنیف بتایا گیا ہے حالاں کہ اس کی زبان مثنوی چندر بدن ومہیار سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ فتح نامہ بکھیری میں مقیم نے اکثر مصرعوں پر فارسی آمیز اردو لکھی ہے۔ یہ دراصل ایرانی نژاد شاعر مرزا محمد مقیم کا "فتح نامہ" ہے جو اس نے اپنی مخصوص فارسی آمیز دکنی میں لکھا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خبرہائے حرم زفتح وظفر — سفارش زواجے کہ گیرد اثر
چو آمد بدرگہ وکرنش نمود — رکھیا سر قدم پر وفا نر استود؟
بگفتا ہمیں وبے ضرد وقدر — نوازش گری کرد ونجشید صدر
لیا کوٹ زدوی زحکمت بہ بیس — زجنگ وز صلح وزصنعت بہ بیس

فتح نامہ بکھیری کی زیراکس کاپی رائقۃ الحروف کے پاس موجود ہے اس میں سلطان محمد عادل شاہ کے عہد حکومت کی ایک جنگ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ "واقعات مملکت بیجاپور" لفظ بکھیری کے بجائے ابکیری تحریر کیا گیا ہے[2] اس جنگ کا حال قلمبند کرتے ہوئے بشیرالدین احمد لکھتے ہیں کہ محمد عادل شاہ نے جو کرناٹک تسخیر کرنے کا ارادہ کیا تھا اور جنگ کی تھی اس کی نوعیت مذہبی تھی سپہ سالار اندولہ خاں اور ملک ریحاں کی رہنمائی میں عادل شاہی لشکر نے پہلے ابکیری پر حملہ کیا۔ ملک ریحان نے قلعہ شولاپور سے کثیر فوج کے ساتھ اندولہ خاں سے ملاقات کی۔ ابکیری کے راجہ ابر سبھدرا نے جب اس لشکر کثیر کو دیکھا تو اس نے صلح کر لینا مناسب سمجھا اور سولہ لاکھ نقد باج ادا کیا اور باقی چودہ لاکھ اقساط میں ادا کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ دو سال تک راجہ سبھدرا نے جب قسط ادا نہ کی تو اس کے قلعہ پر دوبارہ چڑھائی کرنی پڑی۔ مرزا مقیم کے "فتح نامہ بکھیری" میں اس جنگ کی جو تفصیلات نظم کی گئی ہیں وہ اس سے مختلف ہیں۔ مرزا مقیم کہتا ہے کہ مصطفےٰ خان شاہ ابوالحسن اسد خان اور شہنواز خاں کو بادشاہ حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اپنے "اسلام اور ایمان" کی قسم ہے میں جب تک بکھیری فتح نہ کر لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔

---

[1] افسر امروہوی وسرفراز علی۔ انجمن ترقی اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ جلد اوّل۔ ص ۳۴۸

[2] بشیرالدین احمد۔ واقعات مملکت بیجاپور۔ جلد اوّل۔ ص ۲۵۵

Marfat.com

نہ چھوڑوں بکھیری نہ اس پنڈ کوں　　کھندل مار توڑوں کھر کنڈ کوں
دھروں ایک جربا جو تروار کا　　جو ترخے سینا پھوٹ کفار کا

مختصر یہ کہ محمد عادل شاہ ایک عظیم الشان فوج لے کر بنکاپور پہنچا اور بکھیری فتح کرنے کے منصوبے تیار کرنے لگا۔ سلطان نے مصطفےٰ خان کو اس مہم کے لیے منتخب کیا۔ مصطفےٰ خاں نے راجہ سے کہا ؎

اگر باج شہ کا دیا جیا
نہیں تو سمجھ تو کہ جیوتے گیا

جب قلعہ دار عادل شاہی فوج کے حملوں کی تاب نہ لا سکا تو اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ مصطفےٰ خاں کی خدمت میں صلح کا خط بھیجا جائے اس کے بعد خود وہ حاضر ہوا اور اس طرح بکھیری کا راجا مطیع و فرماں بردار بن گیا اور عادل شاہی حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔ ان ہی واقعات کو مرزا مقیم نے فتح نامہ بکھیری میں بیان کیا ہے۔ مرزا مقیم کا لب و لہجہ اور طرز ادا عام دکنی شعراء سے خاصا مختلف ہے اس نظم میں دکنی کے ٹھیٹ محاورے بہت کم استعمال کیے گئے ہیں۔ لب و لہجے سے غرابت اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ "فتح نامہ بکھیری" کا شاعر دکن کا باشندہ نہیں۔ فتح نامہ بکھیری کی ابتدا اس منظر سے ہوتی ہے ؎

کھولے زلف مشکیں ہونس نار کی　　چھپے تب سفیدی سو آکاس کی
دیا سور شاہی سو مہتاب کوں　　پڑا آپ مغرب میں جا خواب کوں

"مقیمی چندر بدن و مہیار" کا شاعر ہے جس نے ایک فارسی مثنوی بھی اپنی یادگار چھوڑی ہے اور دونوں مثنویوں میں اپنا تخلص مقیمی ہی برقرار رکھا ہے۔ نذیر احمد اور جمیل جالبی مقیم اور مقیمی کو دو مختلف تخلص تصور کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دو مختلف شاعروں کے تخلص ہیں۔ اکبر الدین صدیقی مقدمہ "چندر بدن و مہیار" میں اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں"۔ جب تک تاریخی مواد نہ ملے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔[1]

"برہان ماثر" میں مرزا مقیم کے نام کے آغاز میں لفظ حکیم بھی تحریر کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ مثنوی چندر بدن و مہیار۔ ص ۵

[2] علی بن عزیز اللہ طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۴۱۷

Marfat.com

اکبرالدین صدیقی نے ان کے نام کے ساتھ بیک وقت مرزا اور رضوی دونوں الفاظ تحریر کر دیئے ہیں۔ مقیم کے والد میر محمد رضا رضوی مشہدی کو "برہان ماثر" کا مورخ "سیادت پناہ" اور زبدۃ الاولاد مرتضوی" لکھتا ہے جس سے ان کی سیادت کا اظہار ہوتا ہے[1] آگے چل کر "برہان ماثر" کا مصنف مقیم اور ان کے والد کے بارے میں رقمطراز ہے۔

"از جملہ سادات صحیح النسب ونقابت پناہ نجابت وہدایت دستگاہ میرزا مقیم ابن سیادت ونقابت پناہ نجابت وہدایت دستگاہ شمۃ السادات واتقیاء العظام میر محمد رضا رضوی مشہدی"[2] میر محمد رضا رضوی مشہدی ۹۷۵ھ اور ۹۸۰ھ کے درمیان ترک وطن کر کے ایران سے ہندستان چلے آئے تھے[3] مقیم کے ہندوستان میں اجنبی ہونے کا ثبوت "برہان ماثر" سے بھی ملتا ہے جن میں "غریباں" ارکان دولت کا ذکر کرتے ہوئے "مرزا محمد مقیم رضوی" کا نام بھی درج کیا گیا ہے[4]۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمد مقیم کے والد ۹۸۸ھ میں بقید حیات تھے کیوں کہ فرشتہ لکھتا ہے کہ علی عادل شاہ کی وفات پر انھوں نے مرثیہ لکھا تھا[5] اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سنہ یا اس سے قبل وہ بیجاپور میں موجود تھے ۱۰۴۱ھ میں شاہ جہاں کے حکم سے آصف خاں نے بیجاپور کا محاصرہ کر لیا تھا" حدیقۃ السلاطین" کا مصنف لکھتا ہے کہ مصطفیٰ خان جو عادل شاہ کا پیشوا تھا آصف خاں کی خدمت میں صلح کی پیش کش لے کر گیا تھا اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔" ملا محمد مقیم کہ در بیجاپور بہ حجابت رفتہ بود اخبار آنجا را بخدمت ملازمان بارگاہ گیتی پناہ (عبداللہ قطب شاہ) اعلام می نمود"[6]

مقیم کے مفصل حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ بیجاپور میں ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء - ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء کے درمیان پیدا ہوا۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ فتوحی نے اپنی تاریخ (۱۰۵۰ھ) میں مقیم کو

---

[1] علی بن عزیزاللہ طباطبا۔ برہان ماثر۔ ص ۴۱۷

[2] " " " " " ۔ ص ۵۰۷

[3] اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ چندر بدن ومہیار۔ ص ۸

[4] علی بن عزیزاللہ طباطبا۔ برہان ماثر ص ۵۵۷

[5] محمد قاسم فرشتہ (مترجم) محمد فدا علی طالب تاریخ فرشتہ۔ جلد چہارم۔ ص ۸۶

[6] نظام الدین احمد الصاعدی۔ حدیقۃ السلاطین۔ ص ۱۷۔

Marfat.com

"جوان" لکھا ہے۔ ظاہر بہ انوار" جانب آراستہ و باطن بہ آثار صدق وصفا پیراستہ درعنفوان شباب والعیان جوانی کسب کمالات صوری و معنوی نمودہ[1] اس لحاظ سے شاعر کی عمر ۱۰۵۰ھ میں تیس چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ ۱۰۱۵ھ میں مکمل کی تھی اس میں مقیم کے والد ملا رضا رضوی کا حوالہ موجود ہے لیکن ان کے فرزند کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مقیم اس وقت کم سن ہوگا اور اس نے بحیثیت شاعر شہرت حاصل نہ کی ہوگی اس کے بعد "برہان ماثر" وہ ایک ذمہ دار شخصیت کے روپ میں ہمارے سامنے آیا ہے اور سفارت جیسی سنجیدہ اور اہم خدمات پر مامور دکھائی دیتا ہے۔ اکبر الدین صدیقی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے ملا رضا بیجاپور آئے ہوں اور اس کے بعد بیجاپور سے گولکنڈہ گئے ہوں۔ مذہب امامیہ کے تعلق سے ملا رضا اور ملا مقیم کا جو مرتبہ صاحب برہان ماثر" نے بتایا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے[2]

ہمعصر تاریخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خوش گو اور ہر دل عزیز شاعر تھا۔ پیرزادہ غلام محی الدین نے "احوال سلاطین بیجاپور" اور ابراہیم زبیری نے "باتین السلاطین" میں اس کے کلام کو بہت سراہا ہے اور اس کی شاعری میں جو معنیٰ آفرینی شیرینی اور شاعرانہ محاسن ہیں ان کی بڑی تعریف اور توصیف کی ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے محمد مقیم اپنی مادری زبان فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ اور نیشنل مینو سکرپٹ لائبریری میں "دیوان خمسہ" کا جو نسخہ موجود ہے وہ شاعر کا تحریر کردہ ہے اس میں بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی کے ساتھ تین کالموں میں اشعار درج کئے گئے ہیں۔ "دیوان خمسہ" میں شاعر کے قصائد، قطعات، رباعیات، غزلیں اور مثنوی کے نمونے موجود ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے "اردو شہ پارے" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے کہ شاعر کا تخلص مقیم ہے نا کہ مقیمی دوسرے یہ کہ مثنوی "چندر بدن و مہیار" ۱۰۴۸ھ سے قبل مکمل ہوئی تھی اور اس زمانے میں مقیم بیجاپور میں موجود تھا۔ لیکن کوئی ایسا قرینہ نہیں جس سے ہم مقیم کو "چندر بدن و مہیار" کا شاعر ثابت کر سکیں۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اکبر الدین صدیقی

---

[1] فزونی استندآبادی۔ فتوحات عادل شاہی۔ ص ۳۸۴، ۳۸۵

[2] اکبر الدین صدیقی۔ مقدمہ مثنوی چندر بدن و مہیار۔ ص ۱۷

Marfat.com

لکھتے ہیں کہ" تاریخ اور تذکروں میں کوئی اور شاعر مقیمی تخلّص رکھنے والا نہیں پایا جاتا اور قصے نے مرزا مقیم مقیمی کے نام سے شہرت پائی ہے"[1] اکبرالدین صدیقی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ" مرزا مقیم نے فارسی میں اپنا تخلص مقیم استعمال کیا تو دکنی میں مقیمی یہی چندر بدن ومہیار کا مصنّف ہے"[2] رافۃ الحروف کا بھی یہی خیال ہے کہ مرزا مقیم اور مقیمی دو مختلف شخصتیں ہیں۔ مقیم ایرانی نژاد شاعر تھا اور فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا اور مقیمی اور سلمٰی تخلص اختیار کیے ہوئے تھا وہ محمد عادل شاہ والی بیجاپور کے دربار سے متوسل تھا اور اُسے نظام شاہی اور عادل شاہی درباروں میں باریابی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مرزا مقیم کا تعلق بیجاپور کے دربار سے بحیثیت حاجب مقیم ("ایزیڈنٹ") گولکنڈہ تھا اور وہ درحقیقت گولکنڈے کا سفیر تھا جسے بیجاپور روانہ کیا گیا تھا اور ابوالحسن کو جو بیجاپور کا سفیر تھا گولکنڈہ بھیجا گیا تھا۔ جیساکہ سیّد علی محسن نے زوال سلطنت قطب شاہیہ میں لکھا ہے[3] چندر بدن کا شاعر مقیمی عقائد کے اعتبار سے سنّی تھا۔ چنانچہ "چندر بدن ومہیار" میں "درصفت چہار یار کبار" سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور آخر میں وہ کہتا ہے[4]

جو کوئی انو چاروں سے منکر اَہے
وہ لاشک محمد ستی دور اَہے

اس کے برخلاف مقیم اثنا عشری عقائد کا حامل تھا جس کی "برہان اثر" سے تصدیق ہوتی ہے[5]

گلدستہ بیجاپور سے پتہ چلتا ہے کہ" مرزا مقیم" اکثر فارسی میں شعر کہتا تھا" اور" ہندی" میں بھی اس نے شعر کہے ہیں[6] فزونی نے مقیم کو فارسی کا مستند شاعر تسلیم کیا ہے اور" فتوحات عادل شاہی" میں اس کے بہت سے شعر نقل کیے ہیں ان تمام اشعار میں شاعر نے مقیم تخلص استعمال کیا ہے۔ مثلاً

منع مردم می کند زاہد زمئے خوردن مقیم
خود خمار بادۂ عصیاں مدرسش سراست

---

[1] اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ مثنوی چندر بدن ومہیار۔ ص۲۰
[2] " " " " " " ۔ ص۲۲
[3] سیّد علی محسن۔ زوال سلطنت قطب شاہیہ۔ ص
[4] اس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔
[5] خواجہ میر احمد علی (مرتب) حمیدالدین شطاری۔ گلدستہ بیجاپور۔ ص۶۱

Marfat.com

شبہا خدنگ نالہ ام از پردہا مقیم
بر قلب آسماں زرہ پوشش می زنم
توشۂ راہ مقیم از اشک و آہ حسرت است
منزلے در پیش ما افتادہ پس دور و دراز

خود فزونی نے مقیم کا تخلص کہیں مقیمی ظاہر نہیں کیا ہے۔ یہ قیاس کرنا کہ اس نے فارسی میں مقیم اور دکنی میں مقیمی تخلص اختیار کیا ہوگا۔ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ چندر بدن و مہیار اگر اسی شاعر کے زور طبع کا نتیجہ ہوتی تو کہیں نہ کہیں مقیم تخلص استعمال ہوتا لیکن اس کے برخلاف مثنوی میں صرف ایک ہی تخلص یعنی مقیمی برتا گیا ہے۔ مثلاً

مقیمی بچن کا ترنگ سارتوں
بسر کاں چلیا ہے تو مہیار کوں
مقیمی پیرت پنج انپٹریاں ہوں میں
پرت کے کمند پنج سنپڑیا ہوں میں
شرح سٹ مقیمی پرت پار کا
قصہ کہہ توں پورا سو مہیار کا

مقیمی کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں اس کی مثنوی "چندر بدن مہیار" کا قصہ بیجاپور کے مقام کدری کوٹہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قاضی نورالله نے تاریخ "عادل شاہیہ" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔" توزک آصفیہ میں بھی تجلی علی کہتے ہیں کہ یہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں چندر بدن اور مہیار کی داستانِ محبت لیلیٰ مجنوں اور شیریں کوہ کے قصہ عشق کی طرح مشہور ہو گئی تھی۔ مقیمی نے "چندر بدن مہیار" میں کسی بیجاپوری شاعر کا ذکر نہیں کیا ہے اور "ترتیب کردن سخن" کے وقت اس کے پیش نظر کوئی اور نہیں بلکہ گولکنڈے کا مشہور شاعر غواصی تھا جس کے تتبع پر وہ ناز کرتا ہے یہ

تتبع غواصی کا باندیا ہوں میں
سخن مختصر لیا کہ سانڈیا ہوں میں

یہ شاہ تجلی علی تجلی۔ توزک آصفیہ۔ ص ۱۵۲، ۱۵۳۔

Marfat.com

اس کے بعد وہ غواصی کی اپنے حال پر "عنایت" کا بھی اس طرح اعزاف کرتا ہے ؎

عنایت جو اس کی ہوئی مج اُپر
یو تب نظم قصہ کیا سر بسر

مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" غواصی کی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" کے بعد لکھی گئی تھی کیوں کہ مقیمی نے غواصی کے تتبع کا ذکر کیا ہے۔ امین کی بہرام و بانوے حسن (جسے بعد میں دولت شاہ نے مکمل کیا) میں مقیمی کی چندر بدن و مہیار کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۵۰ھ میں مکمل ہوئی تھی اس طرح مقیمی کی چندر بدن و مہیار ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۴۸ھ کے درمیان کی شعری یادگار ہے[1]۔ شاہ ابو الحسن قادری کا انتقال ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ایک نظم "توصیف" میں محبوب کا سراپا بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور اپنی نظم کو خوبصورت تشبیہات و استعارات سے پر لطف و رنگین بنا دیا ہے۔ محبوب کا سراپا پیش کرتے ہوئے شاہ ابو الحسن نے اپنے "سجن" کے خدوخال، لباس اور اس کے زیورات کا دلچسپ اور موثر مرقع کھینچا ہے اور آخر میں خود کو مہیار اور محبوب کو چندر بدن سے نسبت دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دل مرا ستاب جیوں مہیار ہے
اے مجیلی چال کی چندر بدن [2]

دکن میں چندر بدن اور مہیار کا قصہ زبان زد خاص و عام تھا۔ مندرجہ بالا شعر میں یہی تلمیح ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ شاہ ابو الحسن کی نظر سے مقیمی کی چندر بدن و مہیار بھی گزری ہو اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس میں مقیمی کی چندر بدن و مہیار" کے کرداروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۴۵ھ کے درمیان لکھی گئی تھی۔ شمس اللہ قادری "چندر بدن و مہیار" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مقیمی نے یہ قصہ ۱۰۸۹ھ میں نظم کیا ہے۔ اور اپنے بیان کے ثبوت میں انھوں نے مقیمی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

صدی بارھویں میں تھے کم سال دو
لکھیا نظم کوں میں نے با طرز نو

---

[1] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ صفحہ ۳۹
[2] سید جعفر۔ سکھ انجن۔ صفحہ ۱۱

Marfat.com

مثنوی چندر بدن ومہیار کے جو نسخے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے کسی نسخے میں سنِ تصنیف کا یہ شعر موجود نہیں ہے۔ اس شعر پر ہمیں ایک سوالیہ نشان لگانا پڑتا ہے۔ مقیمی نے چندر بدن ومہیار" میں کہیں کہیں تلمیحات سے بھی کام لیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تلمیح ہی وہ صنعت ہے جس سے شاعر کو دلچسپی رہی ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں ؎

ہندو راج میں جیوں کہ اندر اَہے
مسلمان میں جوں سکندر اَہے

ہے محبوب سب میں وہ ربناوتی
سوج پر غلامی بھی ثابت ہوئی
تو سلطان میرا سچا غزنوی
ہندو میں کہاں ہور ترک تو کہاں
کہاں رام سیتا مرگ تو کہاں

اسپرنگر نے اپنے کٹیلاگ میں "سومہار کی کہانی" کا ذکر کیا ہے۔ اکبرالدین صدیقی کے خیال میں یہ کوئی علیحدہ مثنوی نہیں بلکہ چندر بدن ومہیار ہی ہے[1]۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسپرنگر نے ذیل کا شعر پڑھ کر اس کو "سومہیار کی کہانی" سے موسوم کیا ہے ؎

شرح سرٹ مقیمی پرت پیار کا
قصہ کہہ تو پورا سومہیار کا

قدیم نسخوں کی کتابت میں مہیار واضح نہیں ہے بلکہ مہیار ہی پڑھا جاتا ہے۔ اس طرح سومہیار سے ملا کر اسپرنگر نے مثنوی "چندر بدن ومہیار" کا نام "سومہار" تصور کر لیا ہے[2]۔ اکبرالدین صدیقی کو قصہ سومہار کے وجود سے انکار ہے۔ شمس اللہ قادری وہ پہلے مصنف ہے جنھوں نے اس قصے کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ایک غریب کسان کا افسانہ ہے۔ جس میں دیہاتی زندگی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ شمس اللہ قادری نے مثنوی "سومہار" کے ابتدائی اشعار

---

[1] اکبرالدین صدیقی۔ مقدمہ چندر بدن ومہیار۔ ص ۲۴
[2] " " " " " " ص ۲۳

Marfat.com

اس طرح نقل کئے ہیں۔

رحیا تو خلاق رحمان ہے　　نرنکار بیچود سبحان ہے
اندھیارا کرے اور اجلاستیں　　نہ چھپتا نہ تو وہ .....
فلک اور زمین کا ہے اک شاہ توں　　بندیا ملک اور فلک میں ماہ توں

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ قصہ سومہار جیسا کہ اکبرالدین صدیقی کا خیال ہے کوئی علیٰحدہ قصہ نہیں تو پھر مقیمی کی چندر بدن ومہیار کے کسی نسخے میں شمس اللہ قادری کے نقل کیے ہوئے اشعار کیوں موجود نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں ہمیں قصہ سومہیار اور چندر بدن ومہیار کو ایک ہی مثنوی تسلیم کرنے پر تامل ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مقیمی کی ایک مثنوی کے کئی نسخے موجود ہیں تو دوسری مثنوی کا ایک نسخہ بھی کیوں دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چوں کہ دور شہنشاہیت میں ایک غریب کسان کا قصہ نظم کیا گیا ہے درباری شان وشوکت کے بجائے اس میں بقول شمس اللہ قادری دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی اس لیے غالباً اس کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا ہوگا۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو بھی اپنے عہد میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی تھی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھی۔ ایک اور بات یہ تھی کہ اگر اس مثنوی کا موضوع مذہبی یا متصوفانہ ہوتا یا کسی بزرگ کی کرامات اس میں بیان کی جاتیں تو اس کی اچھی پذیرائی ہوتی اور مذہبی جذبے کے تحت اس کا تحفظ کیا جاتا چوں کہ دونوں صورتیں نہیں تھیں غالباً اس لیے بھی یہ قصہ سومہار گمنامی کے اندھیرے میں کھو گیا۔

ابراہیم دار نے "منتخب التواریخ" میں بدایونی کے حوالے سے ملا داؤد کے منظوم قصے کا نام جس میں نورک وچندر کا افسانہ بیان کیا گیا ہے۔ "چندر بدن" تحریر کیا ہے[2] لیکن ملا داؤد کے منظوم کارنامے کا نام "چندائن" ہے[3] چندائن ملا داؤد نے ۷۷۹ھ میں مکمل کی تھی جسے ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر دشونا تھ پرتاپ نے مرتب کردیا ہے۔

نوراللہ نے اپنی تاریخ عادل شاہیہ" میں اور اس کے بعد شاہ علی تجلی نے "توزک آصفیہ"

---

[1] شمس اللہ قادری۔ اردوے قدیم۔ ص ۵۴

[2] ابراہیم دار۔ گوجری اور اردو کی نشوونما میں اہل گجرات کا حق (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۸۵

[3] ڈاکٹر تنگینار۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ پہلا ایڈیشن۔ ص ۱۳۸

Marfat.com

میں چندر بدن مہیار کے قصے پر روشنی ڈالی ہے شاہ تجلی لکھتے ہیں کہ آصف جاہ ثانی نظام علی خاں کو ارکاٹ کے نواب محمد علی خاں والاجان کی بغاوت کی اطلاع ملی تو وہ تمر تنگر (کرنول) سے تروپتی کی جانب روانہ ہوئے۔ راستہ میں کدری کوٹہ کے مقام پر آصف جاہ ثانی نے ایک ایسی قبر دیکھی جس پر دو تعویذ تھے اس کا سبب دریافت کیا تو مقامی لوگوں نے بتایا کہ مہیار نامی شخص یہاں رہتا تھا ایک کدری کوٹہ میں جاترا کے موقع پر اس کی نظر ایک ہندو لڑکی چندر بدن پر پڑی اور وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا اور اس نے لڑکی سے اظہار محبت کیا۔ لیکن لڑکی نے مہیار کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کیوں کہ رسم و رواج اور مذہب کی دیواریں درمیان میں حائل تھیں عاشق ناکام از خود رفتگی کے عالم میں دشت و بیاباں میں صحرا نوردی کرنے لگا۔ آبادی اور ویرانوں کی خاک چھانتا ہوا جب مہیار علاقہ بیجانگر پہنچا تو یہاں کے بادشاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ شکار کھیلنے کے لیے اس طرف آنکلا تھا۔ بادشاہ کو مہیار کی حالت زار پر رحم آگیا اور وہ اسے اپنے شہر بیجانگر لے گیا۔ یہاں اسے مختلف نازنین دکھائی گئیں تاکہ وہ ان میں اپنی محبوبہ کی شناخت کرے لیکن یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی۔ بالآخر "پیر سیاہ" سے پتہ چلا کہ مہیار ایک راجہ کی لڑکی پر عاشق ہے۔ بادشاہ مہیار کے ساتھ اس راجہ کی سلطنت میں پہنچا لیکن راجہ نے مہیار کی درخواست یہ کہہ کر رد کر دی

لکھیا ہے ہمارا سو ہندو دھرم
مسلمان کوں کیوں ہو ہندو حرم

جب دوسرے سال پھر جاترا کا دن آیا تو چندر بدن پوجا پاٹ کے لیے دوبارہ اسی جگہ پہنچی۔ مہیار تو اس کا منتظر ہی تھا وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اور غم فرقت کا حال بیان کرنے لگا۔ چندر بدن کا دل مہیار کے عشق میں گھائل ہو چکا تھا لیکن اسے اپنی رسوائی کا خوف تھا اس نے غصے کے ساتھ کہا "جیتا ہے دوانے موا نہیں ہنوز"، یہ جملہ سنتے ہی مہار کی روح پرواز کر گئی۔ شاہ تجلی اور نور اللہ لکھتے ہیں کہ مہیار کی موت کا واقعہ ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا اور جب بادشاہِ وقت ابراہیم عادل شاہ کو جوان دنوں یہیں مقیم تھے اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ "عاشق کا جنازہ" "دھوم سے اٹھے"، جب یہ جنازہ چندر بدن کے گھر کے سامنے پہنچا تو وہیں ٹھہر گیا اور کوشش کے باوجود جنازے کو آگے بڑھایا نہ جا سکا۔ جب چندر بدن کو اس کی اطلاع ملی اس نے غسل کر کے کلمہ پڑھا اور ایک صاف چادر پر لیٹ گئی۔ جنازے کے تابوت میں حرکت پیدا ہوئی تو اسے قبرستان پہنچا دیا گیا اور جب قبر میں دفن کرنے کے لیے چادر ہٹائی گئی تو لوگوں نے دیکھا

Marfat.com

کہ چندر بدن بھی مہیار کے ساتھ مجوخواب تھی دونوں کو علیٰحدہ کرنے کی کوشش میں ناکامی ہوئی تو ایک ہی قبر میں انھیں دفن کر دیا گیا۔ مثنوی کا ہیرو موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے قبول محمد حسن یہ تصور اس دور کے عام احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور پریم مارگی تصورات سے بہت قریب ہے موت اور محبت کا یہ جذبہ اس دور کی تصانیف میں عام ہے جس طرح سید محمد جائسی کے پدماوت میں علاءالدین اور پدمنی کے درمیان کی فرقتی داستان کا اختتام موت پر ہوا ہے یہاں بھی محبت موت پر فتح پاتی ہے[1]

چندر بدن و مہیار کی یہ داستانِ عشق اپنے عہد میں زبان زد خاص و عام تھی آج اس طرح کے فوق الفطرت اور فوق العادت کے قصوں سے ہمیں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی ہمارا ذوق بدل چکا ہے لیکن قدیم زمانے میں انھیں بہت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ بقول عبدالقادر سروری چندر بدن و مہیار کو قدیم ادب میں کلاسیکی ادب کا درجہ حاصل ہو چکا ہے، عرب کے لیلیٰ مجنوں اور ایران کے شیریں فرہاد اور پنجاب کے ہیر رانجھے کی طرح دکن کا یہ قصہ لازوال شہرت رکھتا ہے[2] دکنی اور فارسی کے شعراء نے انھیں بار بار نظم کیا ہے۔ حکیم محمد امین آتشی نے فارسی میں اس قصے کو شعر کا جامہ پہنایا تھا۔ حکیم محمد آتشی ایک نامور فارسی شاعر تھا اس کی چار تصانیف کا پتہ چلتا ہے "محبت نامہ" "محمد انور" "قصہ چندر بدن" اور "سالار جنگ" میں موجود ہیں لیکن قصہ چندر بدن ناپید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چندر بدن اور مہیار کے قصے نے اس زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اور اکثر شعراء کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ بلبل نے اپنے قصے کی بنیاد آتشی ہی کے قصے پر رکھی تھی۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے[3]

ہوا بلبل اوپر اس کے ضرورت — دکھانا فرس کی بندی میں صورت
لیکن تاریخ عشق عاشقین باد — کیا ہوں آتشی قصے کی بنیاد

یہ قصہ دکن کے بہت سے معروف و غیر معروف شعراء کا موضوع رہا ہے۔ مقیمی کے بعد بلبل نے اس قصے سے دلچسپی لی۔ بلبل نے آتشی اور مقیمی دونوں کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے[4] محمد باقر

---

[1] محمد حسین۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ پانچواں باب۔ ص ۱۱۹
[2] عبدالقادر سروری۔ اردو مثنوی کا ارتقاء۔ ص ۵۹
[3] محمد باقر آگاہ۔ مخطوطہ ندرت عشق۔

Marfat.com

آگاہ نے سنہ ۱۱۲۴ھ میں "ندرتِ عشق" کے نام سے جو مثنوی لکھی تھی اس میں وہ چندر بدن ومہیار کے قصّے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

یہ دل چاہتا ہے کہ لے جانِ من　　سنو حال مہیار و چندر بدن
اگر چہ یہ قصّہ کہن سال ہے　　یہ تیری زباں پہ نئی حال ہے

اس "کہن سال" قصّے کی جھلک شاہ تراب کی مثنوی "مہ جبیں وملا" اور میر کی "دریائے عشق" اور "اعجاز عشق" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دکن میں اس قصّے کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک مختلف شعراء اس قصّے کو اپنی مثنویوں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ چندہ حسینی واقف بیجاپوری (مابعد سنہ ۱۲۰۰ھ) اور ان کے بعد قاسم علی بیگ اخگر نے اپنی مثنوی میں چندر بدن ومہیار کے قصّے کو نظم کیا ہے۔ دکن میں مقیمی ہی نے سب سے پہلے اس قصّے کو اپنی مثنوی میں نظم کر کے دادِ تحسین حاصل کی تھی۔ یہ قصّہ کم وبیش اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جو مقیمی کا عہد ہے۔

"تاریخ رشید الدین خانی میں چندر بدن ومہیار کا ذکر کرتے ہوئے مہیار کو "مہایار" تحریر کیا گیا ہے۔ جو درست نہیں۔ مورخ انھیں سلطان محمد عادل شاہ سے قبل کے "عاشق ومعشوق" بتاتا ہے کہ وہ دونوں "عادل شاہی عہد" میں "عادل شاہی فلمرو" میں موجود تھے۔[2]

محاسن شعری کے اعتبار سے مقیمی کی "چندر بدن ومہیار" کوئی غیر معمولی ادبی شاہکار نہیں ہے۔ جب ہم مقیمی کی مثنوی کا اس کے پیشرو شاعر غواصی کی مثنویوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو مقیمی کمتر درجے کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ زورِ تخیل، قدرتِ بیان یا صوری خوبی کے اعتبار سے بھی اس کا شمار اپنے عہد کی نمائندہ مثنویوں میں نہیں ہو سکتا۔ اس عہد کی معاشرت کی طرف مثنوی میں بعض اشارے ضرور ملتے ہیں[2] شری رام شرما گپتی ہندی کا ساہتہ میں لکھتے ہیں کہ مقیمی نے ہندو معاشرت کی اچھی عکاسی کی ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقیمی نے چندر بدن ومہیار کبر سنی میں لکھی تھی۔ وہ اپنی مثنوی میں دو جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور خود کو "ڈھلیا" کہہ کر اپنی ضعیفی اور سن رسیدگی

---

[1] غلام امام خان ترین ہجر۔ تاریخ رشید الدین خانی۔ ص ۲۱۱

[2] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتہ۔ ص ۳۲۸

Marfat.com

کا اظہار کرتا ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں جہاں قصّے کا آغاز ہوا ہے مقیمی کہتا ہے کہ یہ عشقیہ قصّہ کہاں اور میں بوڑھا شاعر کہاں ؎

کہاں یو حکایت کہاں میں ڈھلیا
بچن کا فگار اور کہاں لے چلا

اکبرالدین صدیقی نے لفظ "ڈھلیا" کے معنی فٹ نوٹ میں ناچیز تحریر کیے ہیں جو درست نہیں۔ آگے چل کر بیان رسیدن عاشق بہ ملک معشوق و شیفتہ شدن برآں،، سرخی کے تحت لکھے گئے اشعار کے آخر میں مقیمی جوانی کی تعریف کرتا ہے اور دوسری طرف مرتبہ کہتا ہے کہ ایسی حکایت کا تعلق جوانی سے ہے اور اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں ؎

جوانی کی دوری دیوانہ کرے
پچھن تن ضعیفی کا بھانا کرے

کہاں وو حکایت کہاں حال مج کہاں او جوانی کہاں چال مج

مثنوی میں سادگی، بیساختگی اور روانی کی کمی نہیں غیر ضروری تفصیلات سے پرہیز کر کے جزئیات کو نظر انداز کیا گیا ہے لیکن قصّے کی دلچسپی شاعر نے برقرار رکھی ہے۔ وجہی، احمد، گجراتی، غواصی اور نصرتی کی مثنویوں میں ان کے گہرے مشاہدے اور دیدہ وری نے جزئیات کی مدد سے واقعات، مناظر اور کرداروں کو زندہ و متحرک کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر مثنوی میں قصّے کا خلاصہ پیش کر رہا ہے۔ بابا چندہ جیتی واقف نے مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" کے تتبع میں جو مثنوی لکھی ہے اس میں انھوں نے رجحان کے بجائے تفصیل سے کام لیا ہے اور مقیمی پر تنقید کی ہے کہ اس نے ایک دلچسپ قصّے کو بہت زیادہ مختصر کر دیا ہے اور کہتا ہے ؎

مقیمی نے مگر دکھنی زبان میں
لکھے ہیں قصہ اک ان کے بیان میں
کیے ہیں مختصر کچھ اس میں مذکور
ولیکن ہے جہاں کی بیچ یہ مشہور

میر تقی میر نے اپنی مثنوی "دریائے عشق،، میں محبت کو ایک عظیم طاقت سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محبت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ یہی نہیں بلکہ محبت

Marfat.com

سے "سات آسمان گردش میں" ہیں۔ محبت محیر العقل کارنامے انجام دیتی ہے وہ پانی میں آگ لگاتی ہے اور اسی سے "تیغ و گردن میں لاگ" ہے۔ میر سے پہلے مقیمی چندر بدن و مہیار" میں قصۂ عشق کے آغاز سے قبل محبت کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت باعثِ آرائش عالم ہے۔

دنیا میں بڑا ہے پرت کا رتن
پرت بن نہیں کوئی خالی جیون
پرت کوں بنایا ہے کرتار و د
پرت سونچہ سنواریا ہے سنار دو
خلاصے میں سب کے پرت ہے اول
پرت بن نہیں کوئی دوجا قفل
پرت کی ندی نت اُبلتی رہے
پرت سونچہ دنیا پو چلتی اہے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقیمی نے ادبی و شعری محاسن سے زیادہ قصہ گوئی پر توجہ صرف کی ہے۔ مثنوی میں ایسے مواقع موجود تھے جہاں شاعر اپنے بلند تخیل اور ندرت فکر کا ثبوت دے سکتا تھا۔ مقیمی نے تشبیہات و استعارات اور علائم سے اپنے بیان کو پر لطف اور دلکش بنانے کا کام لیا ہے اور مثنوی میں کہیں کہیں ادبیت کی جھلک دکھائی ہے۔ چندر بدن کا یہ سراپا ملاحظہ ہو ؎

اتھی خوبصورت میں جیوں شہ پری — ولیکن پری سوں اتھی برتری
لطافت میں موزوں و دشیریں سخن — اتھاناوں اس کا سو چندر بدن
چنچل مد کی مانی نزاکت کی دہات — پھرے نت ہمیشہ سہلیاں سنگات
تھی محبوب عالم کی دن جگبدن — کہ چندر جیسے دیکھ کرتا سرن

مثنوی میں مقیم کہتا ہے کہ اس نے غواص کی پیروی ضرور کی ہے لیکن "نوے طرز خوش" کے ساتھ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں روانی کے ساتھ اس طرح قصہ بیان کرنا کہ درمیان میں خلا پیدا نہ ہو اور قصے کے تسلسل میں خلل واقع نہ ہو شاعر کا ایک قابل تعریف وصف کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔

عام طور پر مثنویوں میں مافوق الفطرت عناصر سے کام لیا جاتا ہے لیکن مقیمی کی چندر بدن

Marfat.com

ومہیار بڑی حد تک ایک فطری قصہ معلوم ہوتی ہے۔ مثنوی کے آخر کا وہ حصہ جہاں مہیار کا جنازہ چندر بدن کے دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے اور اس کے بعد تابوت میں سے بجائے ایک کے دو نعشیں برآمد ہوتی ہیں محیّر العقل ہے۔ ورنہ اس مثنوی میں نہ ہیر و کہیں دیو کے ظلم کا نشانہ بنتا ہے اور نہ کسی پری کے عشق میں مبتلا ہو کر صعوبتیں برداشت کرتا ہے چندر بدن کا قصہ ہماری روزمرہ زندگی کے واقعات و تجربات کی عکاسی کرتا ہے اس لیے مثنوی کی پوری فضا میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مقیمی ایک اچھا قصہ گو ہے اس لیے اس کی کہانی میں کہیں جھول نہیں آتا اور نہ ایک دوسرے بیان کی تردید کر کے قاری کے ذہن میں الجھن پیدا کرتا ہے۔ مقیمی نے قصہ گوئی کے تقاضوں کی طرف توجہ کی ہے وہ کہتا ہے کہ چندر بدن و مہیار کا قصہ اتنا دلچسپ اور عجیب و غریب ہے کہ اس کو سن کر لوگ لیلیٰ مجنوں کی مشہور زمانہ داستان کو بھول جائیں گے ؎

قصہ سچ پریت کا کھیا ایک اُن
جو بسرے تو لیلیٰ و مجنوں کو سن

مقیمی کہتا ہے کہ وہ اس قصے سے اتنا متاثر ہوا کہ اشعار خود بخود ڈھلنے لگے ؎

بچن درد ہو دل سے اُبلنے لگے
نوے طرز خوش تب نکلنے لگے

"چندر بدن و مہیار" ادبی اعتبار سے کوئی بہت بلند پایہ کارنامہ نہیں اس کے باوجود ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مقیمی اپنے عہد کا کوئی غیر معروف شاعر نہیں تھا۔ بعد کے بعض نامور شعراء نے اس قصے کی طرف اشارہ کیے ہیں مثلاً ابن نشاطی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ۔ بہرام و بانوے حسن میں اس نے جس انداز سے مقیمی کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دکن کا ایک کہنہ مشق اور شہرت یافتہ شاعر تھا اور اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" نے خاصی مقبولیت حاصل کی تھی۔ مقیمی اپنے عہد کا ایک نامور شاعر رہا ہوگا تب ہی تو امین اس کے نقش قدم پر چلنا اور اس کا تتبع کرنا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

یکایک میرے دل میں آیا خیال
قصہ یک لکھوں میں مقیمی مثال

مقیمی کا ایک نسخہ محفوظ رہ گیا ہے کتب خانہ سالار جنگ کی ایک قدیم بیاض میں آٹھ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ درج کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھا مرثیہ گو تھا۔

Marfat.com

شاعرانہ حسن بیان کے اعتبار سے مقیمی کا یہ مرثیہ قابل توجہ ہے۔ دوسرے دکنی شعراء کی طرح مقیمی نے بھی حسن بیان کے ذریعے سے اپنے مرثیے میں اثر آفرینی اور مقبولیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند شعر یہ ہیں[1]

مکھ دکھایا چندر گگن سوں نکل
اشک جاری ہوے مسیں سوں نکل
خاک جوگی نمن لگا مکھ کوں
خلق پھرتا ہے جو کدن سوں نکل
جگ کے بستاں سگل گئے کملائے
بلبلاں رو رہیں وطن سوں نکل
جب مقیمی بیان کرتا ہے
آگ جھڑتا ہے سب بچن سوں نکل

شاہ ابوالحسن

"تذکرہ محبوب الزمن"، "صحیفہ اہل ہدیٰ"، "مشکواۃ النبوۃ" اور "تذکرہ اولیائے بیجاپور" میں شاہ ابوالحسن کا نام سید میران شاہ ابوالحسن قادری تحریر کیا گیا ہے[2] قربی دیلوری کا نام بھی سید شاہ ابوالحسن تھا۔[3] وہ دارالنور بیجاپور میں پیدا ہوئے تھے اور سید الطرفین تھے۔ انھیں شیخ فریدالدین ہبکری نائطی سے بیعت حاصل تھی۔ جو سلسلہ قادریہ کے پیر طریقت تھے۔[4] دکن میں اس نام کے بعض اور بزرگ بھی گزرے ہیں تفصیل "المراتب فی اطوار المراقب" کے مصنف کا نام بھی سید ابوالحسن قادری تھا اور وہ قربی کے پوتے تھے۔ اسی طرح "تحفۃ النصائح" کے مصنف زاری کے مرشد کا نام بھی شاہ ابوالحسن تھا اور وہ خاموش تخلص کرتے تھے۔

---

[1] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ا

[2] ان کا سنہ ولادت ۱۱۱۸ھ ہے اور تاریخ وفات ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء ہے۔ عربی اور فارسی تصانیف کے علاوہ انھوں نے دکن میں بھی ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ جسے فضل اللہ نے مرتب کر کے ۱۹۶۴ء میں حیدرآباد سے شائع کر دیا ہے۔

[3] سید فضل اللہ۔ مقدمہ دیوان قربی۔ ص ۱۱

Marfat.com

شاہ ابوالحسن قادری کا وطن بیدر تھا اور ان کے والد برہان الدین حبیب اللہ بیدر کے مشاہیر شیوخ میں سے تھے۔ میراں سید شاہ بدرالدین حبیب اللہ اپنے زمانے کے مشہور عالم اور شیخ طریقت تھے۔ "مشکوٰۃ النبوۃ" کے مصنف نے ان کے والد کا نام عبدالقادر یوسف تحریر کیا ہے[1] صاحب "مشکوٰۃ النبوۃ" نے "مکاشفۂ قادریہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ سید عبدالقادر "سبعہ قادریہ" میں سے تھے انھوں نے ترک وطن کر کے بغداد سے ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ اور بیدر جو اس زمانے میں علوم وفنون کا مرکز بنا ہوا تھا پہنچے تھے۔ سید عبدالقادر نے بیدر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی۔ بدرالدین حبیب اللہ کی ولادت بغداد میں ہوئی تھی یا بیدر میں؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ حبیب اللہ کا شمار بیدر کے سربرآوردہ شیوخ اور علما میں ہوتا تھا[2] بدرالدین حبیب اللہ نے سرزمین شنگرف بیدر ہی میں زندگی بسر کی اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے بڑے صاحبزادے شاہ ابوالحسن قادری تھے۔ منجھلے بیٹے کا نام مصطفےٰ قادری اور چھوٹے کا نام قاسم قادری تھا۔ ابوالحسن قادری کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی تک بارہ واسطوں سے پہنچتا ہے[3] ڈاکٹر زور نے "تذکرۂ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو" جلد سوم[5] میں "تذکرۂ اولیائے دکن" سے جو شجرہ نقل کیا ہے اس میں دو غلطیاں موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ سید احسن الدین کا نام سید حسین بتایا گیا ہے اور دوسرے سید عبدالرحمٰن کے والد سید شرف جہاں کا نام موجود نہیں ہے جو کہ "صحیفۂ اہل ہدیٰ" میں تحریر کیا گیا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے "تذکرۂ اولیائے دکن" میں ابوالحسن کا جو شجرۂ نسب درج کیا ہے وہ صحت پر مبنی نہیں۔ "صحیفۂ اہل ہدیٰ" کا شجرۂ نسب زیادہ صحیح اور مستند معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے مصنف ابوالحسن کے خاندان ہی کے فرد تھے۔ اسی طرح "مشکوٰۃ النبوۃ" میں سید یوسف کے والد کا نام سید حسن اور ان کے پد۔

---

[1] شاہ غلام علی۔ مشکوٰۃ النبوۃ مخطوطہ نمبر ۱۹۴۔ تذکرہ ص ۴۹۳۔ اورنٹیل مینوسکرپٹ لائبریری۔ حیدرآباد۔

[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد سوم۔ ص ۶۳

[3] سید وجیہ۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۶، ۷

[5] ڈاکٹر زور، تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد سوم۔ ص ۶۳

Marfat.com

بزرگوار کا اسم گرامی سیّد محمد ضو تحریر کیا گیا ہے جو صداقت پر مبنی نہیں ہے[1]

ابوالحسن بیدر میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں ان کا بچپن اور زمانۂ شباب گزرا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں انھوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی شاہ مصطفےٰ قادری کے ساتھ ہجرت کر کے بیجاپور چلے آئے تھے[2] سیّد محی الدین مصنّف "صحیفۂ اہل ہدیٰ" کا بیان ہے کہ حکومت میں انتشار پیدا ہو جانے اور امن و امان باقی نہ رہنے کی وجہ سے شاہ ابوالحسن نے اپنے برادرِ خورد کے ہمراہ بیجاپور کا رخ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر ان دونوں نے "سی بازار" کے قریب قیام کیا تھا یہ مقام اندرون حصار اعلیٰ پور کے دروازے کے قریب واقع تھا اور شاہی انبار خانے سے متصل تھا۔ شاہ ابوالحسن کے بھائی شاہ قاسم نے والد کے انتقال کے بعد شمالی ہند کا سفر اختیار کیا تھا[3] کچھ عرصہ بعد جب شاہ قاسم اپنے وطن پہنچے تو معلوم ہوا کہ دونوں ترک وطن کر کے بیجاپور چلے گئے ہیں۔ شاہ قاسم بھی بیجاپور پہنچ گئے اور اس طرح ابوالحسن قادری کا تمام خاندان بیدر سے بیجاپور منتقل ہو گیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ شاہ ابوالحسن بیجاپور ہی کے ہو رہے اور اپنی وفات تک یہیں قیام پذیر رہے اس لیے "صحیفۂ اہل ہدیٰ" کے مصنف نے ان کے نام کے آخر میں "البدری ثم البیجاپوری" تحریر کیا ہے[4] عبدالجبار ملکاپوری نے "تذکرہ اولیائے دکن" میں دو مختلف مقامات پر شاہ ابوالحسن کے حالات درج کئے ہیں اور انھیں دو علیحدہ شخصیتوں کے طور پر پیش کیا ہے[5]۔ پہلے انھوں نے "تذکرہ روضۃ اولیائے بیجاپور" سے حالات اخذ کئے ہیں اور پھر "تذکرہ مکاشفہ" سے استفادہ کیا ہے۔ میراں سید شاہ مصطفےٰ قادری صاحب کشف و کرامات تھے ان کی روحانی قوّت اور فیوض و برکات کا بڑا چرچا تھا۔ وہ ہر وقت ریاضت و عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اہلِ دنیا سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔ کبھی اہلِ دُوَل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ہر طرح کی ترغیبات سے بلند تھے[6] ان کے روحانی تصرفات زبان خاص و عام تھے۔ "صحیفۂ اہل ہدیٰ"

---

[1] سیّدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۸

[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جلد دوم۔ ص ۶۳

[3] محمد ابراہیم زبیری، روضۂ اولیاء بیجاپور مخطوطہ نمبر ۱۹۶۔ تذکرہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری ص ۵۲

[4] سیّد محی الدین بن سعید محمود قادری مخطوطہ صحیفہ اہل ہدیٰ مملوکہ میراں سیّد مرتضیٰ قادری ص ۴۱

[5] عبدالجبار ملکاپوری: تذکرہ اولیائے دکن۔ جلد اوّل۔ ص ۴۹ اور ص ۹۴

[6] سیّدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۸، ص ۹

Marfat.com

کے مصنف سید محی الدین قادری ابن سید محمود قادری نے ان کی بہت سی کرامات کا ذکر کیا ہے[1]۔ ابوالحسن کے برادرِ خورد میراں شاہ قاسم معروف بہ محمد فضل اللہ نے اپنے والد بدرالدین حبیب اللہ سے بیعت حاصل کی اپنے وطن بیدر سے وہ پہلے شمالی ہند اور پھر حرمین شریف پہنچے تھے، عبدالقادر جیلانیؒ کے روضے کی زیارت سے مشرف ہو کر واپسی میں انھوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور دلاور قادری سے ملاقات کے لیے سندیلا پہنچے اور ایک طویل عرصہ تک یہیں قیام کیا تھا۔ سندیلہ میں انھوں نے وہاب شاہی اور نقشبندیہ سلاسل میں اجازت حاصل کی تھی۔ وطن لوٹنے پر انھوں نے مسجد جید خاں میں قیام کیا[2]۔ "صحیفہ اہل ہدیٰ" میں ان کے روحانی تصرفات کا مفصل ذکر درج کیا گیا ہے[3]۔ "روضۃ الاولیائے بیجاپور" میں ابراہیم زبیری نے بھی ان کی کرامات پر روشنی ڈالی ہے[4]۔ شاہ قاسم کا انتقال ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں ہوا اور مسجد جید خان کے صحن میں دفن ہوئے[5]۔ شاہ قاسم کی تاریخ وفات "دستگیر کل اولیائے بیجاپور" ہے[6]۔

۱۰۳۲

شاہ ابوالحسن کے خاندان نے رشد و ہدایت کا جو کام انجام دیا ہے اور علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابوالحسن کے بھتیجے اور شاہ مصطفیٰ قادری کے بیٹے شمس الدین قادری متوفی ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۵ء شاعر تھے ان کی مثنوی "علم سلوک" کا پتہ چلا ہے جو ایک سو ایک اشعار پر مشتمل ہے اور جس میں ناسوت، ملکوت، لاہوت اور جبروت کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے اپنا تخلص اس طرح استعمال کیا ہے ؎

اتیا شمس الدین حبیب کو مندے
یو چار و محل دیک کوں سوندے

---

[1] سید محی الدین قادری ابن سید محمود مملوکہ قادری صحیفۂ اہل ہدیٰ میراں سید مرتضیٰ قادری ص ۲۴، ۳۱

[2] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۱۵، ۱۶

[3] سید محی الدین قادری ابن سید محمود قادری۔ صحیفہ اہل ہدیٰ مملوکہ میراں سید مرتضیٰ قادری ص ۷۱

[4] محمد ابراہیم زبیری روضۃ الاولیاء بیجاپور۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۶۔ تذکرہ۔ اورنٹیل مینوسکرپٹ، لائبریری۔ ص ۵۳

[5] سید محی الدین قادری ابن سید محمود قادری مخطوطہ صحیفہ اہل ہدیٰ مملوکہ میراں مرتضیٰ قادری ص ۸۷

[6] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۱۸

Marfat.com

اس مثنوی کا موضوع تصوّف ہے اور دیگر قدیم شعراء کی طرح شمس الدین نے بھی ناسوت ملکوت، لاہوت اور جبروت کو چار محلوں سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی مثنوی میں ان کی "سیر" کرائی ہے اور کہتے ہیں ؎

یو فانی ہے جگ سیر محلاں کی کر
بھی ذکراں سیتی رکھ توں اس کی خبر

"علم سلوک" کے جستہ جستہ شعر یہ ہیں ؎

ایتا سن توں علم سلوک اختیار — اگر ہے تو اہل طریقت کا یار
شریعت کوں توں راج مارگ پچھان — کہ جس راگ مارگ میں امن وامان
جو اس کو کبھی چھوڑ کر جائے گا — کوئی کچھ ہلاکی اونے پائے گا
پڑے جا ہلاکی کے بھونریان مین — بھی غول بیاباں کے ہوریان مین
کھڑے کھودرے ہور کانٹیاں کے چبھن — ہوے بیر کے اوبلایاں کے سونپ
شریعت کی مارگ کوں چھوڑیاں جنے — تو راہ ہلاکت کوں لوڑیاں اونے

شاہ ابوالحسن قادری کے خاندان نے جنوب ہند میں تعلیم و تلقین کا جو کام انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے ابوالحسن کے پوتے ابوالحسن ثانی ابن سید عبدالقادر کی صاحبزادی قربی دیوری کے دادا میران سید ولی محمد سے بیاہی گئی تھیں اس طرح قربی دیوری کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ ان کی تربیت سے باقر آگاہ اور عبداللطیف ذوقی نے بڑا فیض اٹھایا تھا۔ قربی کے دکن کے علاوہ عربی فارسی میں متعدد خطبات اور رسائل دستیاب ہوئے ہیں۔ "رسالہ اثبات حقیقی" رسالہ "حق الحق"، "رسالہ برہان خاطر فی بیان توحید جامع"، "رسالہ دلیل حکم فی بیان توحید الاقوام" "رسالہ عین العیان"، "رسالہ وجدان"، "رسالہ کیمیائے سعادت" اور "تجدد امثال" ان کی قابل قدر تصانیف ہیں۔ قطبی نے ۱۱۵۱ھ/۱۷۱۴ء میں اپنا دکنی دیوان مرتب کیا تھا۔

شیخ محمود خوش دہاں، شاہ ابوالحسن قادری کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ مصطفےٰ بھی شاعر تھے۔ ادارہ ادبیات اردو میں ان کی نظم "وصیت نامہ" موجود ہے اس کے صفحہ اوّل کی پیشانی پر یہ عبارت تحریر کی گئی ہے "وصیت نامہ حضرت پیغمبر از شیخ مصطفےٰ نے دکنی میں کہا ہے اس کا ذکر بھی صفحہ اوّل پر سرخی کے بعد آیا ہے۔ "وصیّت نامہ" ایک سو اکیاون ابیات پر مشتمل ہے اس میں وہ وصیتیں درج ہیں جو رسول خدا نے حضرت حمزہ کو

Marfat.com

کی تھیں ؎

کہے شیخ حمزہ کوں حضرت نبی　　کہو اے وصیت امت کوں سب ہی
کہے شیخ حمزہ یو پنداں تمام　　سنیا ہوں نبی سوں علیہ السلام

اس میں مال دنیا کی حرص سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور عذاب قبر سے ڈرنے، عورتوں پر ظلم نہ کرنے اور دوسروں پر تہمت لگانے سے باز رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ نظم میں دوسری مذہبی واخلاقی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے۔ ؎

ہوں فرزند میں شیخ محمود کا
جو دھرتا ہوں امید معبود کا

شاہ ابوالحسن کے پانچ فرزند تھے اور سب ہی علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ مند تھے۔ پانچوں بیٹے اپنے والد کے مرید اور خلیفہ تھے اور ابوالحسن کی طرح ہمیشہ ذکر و شغل میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان پانچوں صاحبزادوں کی اولاد بیجاپور کنکال، مدکل اور تالی کوٹے میں آج بھی موجود ہے۔[1]

شاہ ابوالحسن کے بڑے فرزند شاہ عبدالقادر تھے دوسرے بیٹے کا نام نعمت اللہ، تیسرے کا بدرالدین، چوتھے کا ابوالقاسم اور پانچویں کا سید محمد میران تھا۔ سید عبدالقادر نے بی بی امۃ المجید سے شادی کی تھی۔ وہ سید اعظم مشہور بہ سید محمد میراں گوہر شب چراغ کی صاحبزادی تھیں[2] سید عبدالقادر نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء میں وفات پائی۔[3] ان کے فرزند شاہ ابوالحسن ثانی متوفی ۱۱۳۲ھ سکندر علی شاہ کے عہد میں موجود تھے "خازن سلسلۂ قادریہ" ان کی تصنیف ہے دوسرے صاحبزادے شاہ نعمت اللہ کی اولاد بجنیر بس گئی ہے۔ سید بدرالدین جو شاہ ابوالحسن کے تیسرے فرزند تھے بڑے وجیہہ اور خوبصورت تھے ان کا مزار پر نیڈہ میں مرجع خلائق ہے۔ چوتھے بیٹے سید ابوالقاسم کی اولاد میں بیجاپور کے مشہور صوفی اور متقی سید ابوالحسن المعروف بہ کالے حسن تھے ان کی اولاد بیجاپور ارکاٹ میں قیام پذیر ہے[4] سید محمد میران کے اخلاف بیجاپور ہی میں مقیم ہیں۔ ان کی دختر کا نام بی بی رقیہ تھا

---

[1] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۴۶

[2] سید محی الدین قادری۔ سید محمود قادری مخطوطہ صحیفۂ اہل ہدیٰ۔ مملوکہ میراں سید مرتضیٰ قادری ص

[3] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۴۶

[4] " " " " ص ۴۷

Marfat.com

جو سید محی الدین کی شریک حیات تھیں۔ شاہ ابوالحسن کی رفیقۂ حیات سیدہ بی بی فاطمہ سلطان بڑی پاکباز زاہدہ تھیں انھوں نے ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء میں انتقال کیا۔[1]

شاہ ابوالحسن کا شمار بیجاپور کے بلند پایہ علماء اور مشائخین میں ہوتا تھا وہ بڑے پابند شریعت اور متقی انسان تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شاہ بدرالدین حبیب اللہ سے حاصل کی تھی۔ اوائل عمر ہی سے انھیں خدا رسیدہ بزرگوں اور علمائے کرام کی صحبت کا شوق تھا۔ پیر محمد لطف اللہ بن شیخ موسیٰ کی تربیت نے شاہ ابوالحسن کی روحانی قوتوں کو اجاگر کر دیا تھا۔ ابوالحسن نے شاہ کمال الدین جیسے متبحر عالم سے بھی فیوض و برکات حاصل کیے تھے اور ان کے جانشین بھی مقرر ہوئے تھے۔[2] ابوالحسن نے اپنی تمام زندگی خلق اللہ کی رہنمائی میں گزار دی۔ بیجاپور، بیدر اور اطراف و اکناف کے تمام علاقوں میں شاہ ابوالحسن قادری اپنے زہد و تقویٰ ریاضت اور روحانی تصرفات کی وجہ سے مشہور اور مقبول ہو گئے تھے۔ اس وقت بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ حکمراں تھا۔[3] سید محی الدین "صحیفۂ اہل ہدیٰ" میں لکھتے ہیں کہ جس نے بھی آپ کی دست بوسی کی وہ مرتبۂ ولایت کو پہنچا۔ ابوالحسن ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے اور دنیوی معاملات سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ "مشکوٰۃ النبوۃ" میں سید علی موسوی القادری لکھتے ہیں کہ ان کی کرامات سے متاثر ہو کر ابراہیم عادل شاہ متعدد آزمائشوں کے بعد ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ ایک آزمائش اجے پال جوگی سے مقابلے کی بھی تھی۔ "تذکرہ اولیائے دکن" اور "روضۃ الاولیاء بیجاپور"[4] میں اسرافیل دکن کے مرید ہونے کا واقعہ اور شاہ ابوالحسن کی بعض کرامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "مکاشفہ" اور "صحیفۂ اہل ہدیٰ" میں ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی شہزادی زہرا سلطانہ سے متعلق بھی ان کی ایک کرامت کا مفصل ذکر ملتا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری رقمطراز ہیں:

"بادشاہ نے آپ کے لیے وظیفۂ معقول مقرر کر دیا تھا۔ آپ دل جمعی سے ذکر و شغل میں مشغول رہتے تھے۔"[5]

---

[1] سیدہ جعفر۔ مقدمہ سکھ انجن۔ ص ۴۷

[2] " " " " ۔ ص ۴۸

[3] عبدالجبار ملکاپوری: تذکرہ اولیائے دکن۔ جلد اوّل۔ ص ۴۹

[4] محمد ابراہیم زبیری۔ روضۃ الاولیائے بیجاپور مخطوطہ نمبر ۱۹۶۔ تذکرہ۔ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری ص ۸۶/۸۸

[5] عبدالجبار ملکاپوری: تذکرہ اولیائے دکن۔ جلد اوّل۔ ص ۴۹

Marfat.com

شاہ ابوالحسن نے ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء کو انتقال کیا۔ مصنف "صحیفۂ اہل ہدیٰ"، سید محی الدین قادری ابن سید محمود قادری نے شاہ ابوالحسن کی تاریخ وفات مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح پیش کی ہے ؎

بوالحسن بود — می نمودند نہ فلک — بانوس
بادمی در رہنمائے عالم شد — از کرامات در جہاں زد کوس
نقل چوں کرد ار فانی را — ہر دو عالم بماند در افسوس
گفت ہاتف بوصف تاریخش — زیب پیرائے جنت الفردوس

۱۰۴۵ھ (مطابق ۱۶۳۵ء)

رنبھاپور میں جو رنبھادیوی کے نام سے مشہور ہے شاہ ابوالحسن ابدمی نیند سو رہے ہیں۔ یہ مقام گول گنبد کے جنوب میں واقع ہے اور گول گنبد کی بلندی سے صاف نظر آتا ہے[1]۔

"سکھ انجن" آنکھ مچولی شاہ ابوالحسن کی وہ یادگار مثنوی ہے جو دکنی شاعری میں اپنی رمزیاتی اور ایمائی اسلوب کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے بقول ڈاکٹر زور یہ مثنوی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ دکن کی چند قدیم ترین مثنویوں میں سے ہے اور اس کا کوئی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے سوا اور کتب خانے میں موجود نہیں[2]۔ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں "سکھ انجن" کے دو نسخے محفوظ ہیں۔ ایک مخطوطہ ۱۱۹۱ھ کا تحریر کردہ ہے اور دوسرا ۱۲۱۱ھ کا ہے یعنی انیس سال بعد نقل کیا گیا ہے۔ ۱۱۹۱ھ کے مخطوطے کو کاتب نے خاصے اہتمام کے ساتھ لکھا ہے۔ عنوانات اور متن سرخ روشنائی میں تحریر کیے ہوئے ملتے ہیں۔" سکھ انجن" کی تاریخ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے چوں کہ شاہ ابوالحسن کا انتقال ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء میں ہوا تھا۔ اس لیے یہ ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء یا اس سے قبل کی مثنوی ہو سکتی ہے۔

"آنکھ مچانی"، بچوں کا ایک پسندیدہ کھیل ہے جس میں چور بننے والا لڑکا اپنے ساتھیوں کو جو چھپ جاتے ہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ شاہ ابوالحسن نے اس مثنوی میں ایک طفلانہ بازی کے ذریعے سے تصوف و حکمت کے بعض نکات کی تشریح کی ہے چور بننے والے لڑکے کی آنکھیں بند

---

[1] رافعۃ الحروف نے اپنے سفر بیجاپور ۱۹۸۴ء میں اس کی تحقیق کی ہے۔

[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ۔ ادبیات اردو جلد سوم۔ صفحہ ۶۲

Marfat.com

کردی جاتی ہیں تاکہ وہ اپنے گرد پیش کچھ دیکھ نہ سکے جب تک ایسا نہ ہو کھیل میں لطف پیدا نہیں ہوتا۔ تلاش وجستجو میں لڑکے کو بڑا مزہ آتا ہے اور جب وہ بالآخر اپنے ساتھی کو پا لیتا ہے تو گویا اپنی مراد حاصل کر لیتا ہے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں قطرہ سمندر کو پا لیتا ہے اپنے ساتھی کو پانے سے عارضی جدائی ختم ہو جاتی ہے یعنی طالب مطلوب سے جا ملتا ہے۔ شاہ ابوالحسن نے اس کھیل کی تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے ذریعے سے تصوف کے بعض مسائل کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اس کے تعلق سے شاعر کہتا ہے ؎

چھپے جینے کا سو کھیل
آنکھ مچانی کڑوا تیل

دکنی ادب میں "سرِ دلبران در حدیث دیگران" کی روایت ابتدا ہی سے موجود ہے۔ دکن کے اکثر شعراء اور ادیبوں نے متصوفانہ تصورات وخیالات کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے کیوں کہ ان کا مخاطب صرف پڑھا لکھا طبقہ ہی نہیں تھا بلکہ جاہل عوام بھی تھے۔ اس لیے افہام وتفہیم کے لیے انھیں ایک ایسا انداز اختیار کرنا پڑا جو سیدھا سادا، آسان اور سریع الفہم ہو اور جس میں روزمرہ کی مانوس چیزوں کے وسیلے سے ایسے نکات کی تشریح وتفصیل بیان کی جائے جو عوام کی ذہنی سطح سے اونچی ہو۔ ایران میں ترانے کی "دھیم دانا نانا" کو تعلیمات کی برکت سے نوازہ گیا تھا۔ اور اس کو "در آدر نتم ودر جانی" جیسے بلیغ اور بامعنی الفاظ میں بدلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تفریح اور کھیل کے دوران نصیحت کی باتیں بتانا، دکن کا ایک قدیم طریقہ ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ پند وموعظت کی تلخی کو کھیل کود اور تفریح کی باتوں کے ذریعے سے گوارا اور قابل قبول بنایا جائے۔ دکنی ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں تشبیہات واستعارات، حکایات وتمثیل کے پیرایے میں "مشاہدۂ حق" کی گفتگو کی گئی ہے دکنی ادب کے چکی نامے، ہیلے، چرخہ نامے، شکار نامے، شادی نامے، سہاگن نامے، پہیلیاں اور لوری نامے دراصل پند وموعظت، اخلاق آموزی اور تصوف کے مسائل کی عام فہم انداز میں تشریح وترسیل کی کامیاب کوششیں ہیں۔ اس سلسلے میں چرخہ نامے اور چکی نامے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چرخہ کاتنے اور چکی پیسنے کے دوران خاص مصرعوں کی مسلسل تکرار سے کسی مخصوص نکتے کو بڑی سہولت اور آسانی کے ساتھ بخوبی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ایک خاص خیال کو بار بار دہرانے سے اس کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی اس پر عمل کرنے کے لیے ذہنی طور پر خود بخود تیار بھی ہو جائے

Marfat.com

یہ قدما کا ایک اچھا طریقہ تھا کہ براہ راست انداز میں نصیحت کرنے کے بجائے وہ روزمرہ کے معمولات میں مفید و کارآمد باتیں سکھانے کا موقعہ تلاش کر لیا کرتے تھے۔

"جوہر اسرار اللہ" میں علی جیو گام دھنی نے مکاشفہ "مشاہدۂ حق"، عالم ناسوت اور لاہوت وغیرہ کی تشریح کرتے ہوئے دید حق، یافت حق اور سلوک کی مختلف منزلوں کو کھیل سے تعبیر کیا ہے چنانچہ مکاشفہ نکتہ اوّل کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

اہیں کھیلوں آپ کھیلاؤں　　آپیں آپس لے کل کلاؤں

آگے چل کر "نکتہ پنجم در تخلص" میں کہتے ہیں ؎

یہ کھیل چھوڑو کھیل کھیلو　　شبہ تج کئیں ہوتی میلو

یہ جیو شاہ علی جیو لاؤ　　چھوڑنے کو لے جیو دھر آؤ

فاروقی کا چکی نامہ[1]۔ فی الحال شاہ قادری کا چکی نامہ (جسے نصیر الدین ہاشمی نے غلطی سے غوثی کا کارنامہ بتایا ہے) اور چکی نامہ کمالی"[2] وغیرہ میں دکنی شاعروں نے چکی کے گیتوں کی صورت میں ہلکے پھلکے انداز میں پند و موعظت کے علاوہ متصوفانہ خانہ نکات کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سہاگن ناموں، چرخہ ناموں، شادی ناموں اور لگن ناموں میں تصوف و اخلاق کے مختلف پہلوؤں کو عام فہم انداز میں ذہن نشیں کروانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "پھگڑی" دکنی لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ فرید اور فقیر اللہ شاہ نے پھگڑی کھیل کے انداز میں تصوف اور معرفت کی باتیں بتائی ہیں تاکہ بچے کھیل کھیل میں کارآمد باتیں سیکھیں۔ اسی طرح شاہ ابوالحسن نے ایک اور طفلانہ بازی آنکھ مچولی کی مدد سے تصوف کے مسائل سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"سکھ انجن" میں شاہ ابوالحسن نے تصوف کے بعض مسائل کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ بچوں کے کھیل "آنکھ مچانی" کھیلنے والے لڑکے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو جائے۔ اس کے ذریعے سے شاہ ابوالحسن نے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جب تک طالب، اشیاء کے اعتبارات رنگ، روپ، شکل اور کمیت وغیرہ کے احساس سے اپنی ہستی کو بلند نہ کرے اور زمان و مکان سے آزاد نہ ہو جائے وہ

---

[1] مخطوطہ نمبر ۳۷۔ تصوف و اخلاق۔ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] مخطوطہ نمبر ۳۸۔ تصوف و اخلاق۔ کتب خانہ سالار جنگ۔

Marfat.com

وہ سلوک کے راستے پر گامزن ہو کر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ یافت حق تک پہنچنے کی پہلی شرط اپنی ہستی کی نفی کرنا ہے۔ خود کو نیستی میں لے جانا اور وہم ہستی سے گزر جانا راہ عشق کی پہلی منزل ہے اور اس کے لیے اُذکُرُ رنگِ اذنسیت کی روش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ "آنکھ مچانی" کا مفہوم یہ ہے کہ جسم مادی سے بے خبر ہو جائیں تاکہ عالم ملکوت منکشف ہو سکے۔ شاہ ابوالحسن نے ان تمام نکات کو سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے کھیل کے پیرائیے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کھیل میں ایسا کھیل ہووے
پیا ملن کا میل ہووے
جس کوں یو کھیل سوجے گا
پیو کی مارگ پوجے گا
جس جیسے ہیں چھپنا ہوئے
چھپنا اس کا سپنا ہوئے
چھپنے جینے کا سو کھیل
آنکھ مچانی کڑوا تیل
آنکھ مچانی کھیل کھلائے
پیو پانے کا میل ملائے

شاہ ابوالحسن کہتے ہیں کہ یہ ایک انوکھا کھیل ہے اور اس میں حصہ لینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ یہ صرف "بلاکشانِ محبت" ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ آزمائشوں میں پورے اترے ہیں۔ اس کھیل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہم اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہیں اور اس طرح اس محبوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے جو رگِ جان سے قریب ہے۔ یہاں شاہ ابوالحسن کا اشارہ "وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" (کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ بیچ تمہارے نفسوں کے ہے) اور "هُوَ مِنْكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ" (وہی تمہارے ساتھ ہے جدھر دیکھو) کی طرف ہے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ "وَمَنْ اَحَبَّ شَیْءً اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ"۔ محبوب کا ذکر کرتے رہنا چاہنے والے کی عین تمنا ہوتی ہے اور "آنکھ مچانی" یا مراقبہ تو اس کی یاد میں کھو جانے اور اسے پا لینے کی کوشش ہے۔ اس کی مثال شاہ ابوالحسن نے یہ دی ہے کہ جس طرح عالم خواب میں آدمی جسم خاکی یا قویٰ سے بے خبر ہو جاتا ہے اور جسم مثالی بالفعل ہو جاتا ہے یہی حال مراقبے کا بھی ہے ؎

Marfat.com

جب توں نیناں اس میں دھوے
پاوے تب سکھ انجن دوں

سکھ انجن بولاؤ نیناں
سرمہ ہے او طور سیناں
دو تن کا دل پچھن ہے او
مرا۔تبے کا انجن ہے او

مرلقبے کو شاہ ابوالحسن یافت کی ایک منزل بتاتے ہیں۔ احسان ان تعبد اللہ کانت ترا ہ وان لم تکن ترا ہ فانہ یراک کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی عبادت کر گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر ایسا نہ کرے تو سمجھ کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ بعض صوفیاء کا خیال ہے کہ پہلے نصف میں مشاہدے اور دوسرے نصف میں مرلقبے کے اسرار و رموز پر سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ دکن کے ایک صوفی شاعر کمال نے سبعہ صفات کے بارے میں کہا تھا۔ ؎

اٹھا ساتوں پردے دیکھی پیو کی صورت
ہے پن جس کے مانع میں پن جس کی مورت

یعنی جب تک "ہے پن" اور "میں پن" کا احساس باقی رہے گا دوئی قائم رہے گی اور طالب و مطلوب کے درمیان پردے حائل رہیں گے۔ سبعہ صفات (حیات، علم، ارادہ، قدرت، سماعت، بصارت اور کلام) کو دکنی شعراء نے سات پردوں سے تشبیہ دی ہے۔ شاہ ابوالحسن کہتے ہیں کہ جب تک "دوئی پن" کا احساس باقی رہے گا وجود مطلق کا عرفان حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ؎

تن میں جیو پیو مل یک ہوئیں
دوی پن کوں یاں سب کھوئیں

اور "اَلتَّوحِیدُ اِسقَاطُ الاِضَافَات" کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکیں جب سالک اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی منزل پر منصور نے "انا الحق" اور بایزید بسطامی نے "سبحانی ما اعظم الشانی" فرمایا تھا اور جنید بغدادیؒ کو "لَیسَ مَا فِی جُبَّتِی مَاسِوَ اللہ" کا احساس ہوا تھا۔ عبدالقدوس گنگوہی کہتے ہیں ؎

Marfat.com

مَن نمی گویَم انا الحق یار می گوید بگو
چوں نگویَم چوں مرا دلدار می گوید بگو

شاہ ابو الحسن قرب کی تمنا کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

دیو پیا پیو جبورے　　پیو سنگ اپنی نیتورے
میّت پیا جب آوے ہات　　رین اندھیری ہوئے شبرات

شاہ ابو الحسن کا خیال ہے اوّل یہ کہ ماسوا اللہ سے نظر ہٹا کر سالک ذات مطلق کے تصور میں کھو جائے۔ دوسرے یہ کہ مراقبے کی مدد سے مشاہدۂ حق کی کوشش کرے فَتَقِبْ کا حکم اپنے اندر معنیٰ کی وسیع دنیا رکھتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ فنا کا راستہ اختیار کرے ؎

سونا جینا مرنا سو　　تینو پو دل دھرنا سو
مرنے آگے کا مرنا　　سو ہے آپس تے سرنا

یہاں "مرنے آگے کا مرنا" سے مراد مُوْتُوْا اَنْتَ قَبْلَ مُوْتُوْ سے ہے اس سے مراد طبعی موت نہیں بلکہ اختیاری موت ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں جسم خاکی سے گزرنا شہادت مبدار ہے۔ جسم مثالی سے گزرنا شہادت عمدلہ ہے اسی طرح روح سے گزرنا شہادت وجدا ہے آخر میں شہادت شہدار کا مرتبہ ہے جس کے متعلق صوفیاء کہتے ہیں کہ لَارَبْ وَلَارَبْ عَبْد۔ شاہ ابو الحسن اسی فنا کی منزل کا یوں ذکر کرتے ہیں ؎

سالک جب آپہنچے یاں　　جینا مرنا اس کا واں

یعنی سالک فانی بخود اور باقی بحق ہو جائے۔ شاہ ابو الحسن اپنی اس مختصر سی مثنوی میں اپنے متصوفانہ خیالات کی طرف محض اشارے کرتے ہوئے گزر گئے ہیں مثلاً یہ نکتہ کہ سالک کے سفر کی ابتدار حدود شریعت سے ہوئی، شریعت کے بعد طریقت، طریقت کے بعد معرفت اور حقیقت کی منزلیں آتی ہیں۔ مقام وحدت تک پہنچنے میں ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت سے گزرنا پڑتا ہے۔ صوفیائے دکن نے اس تفصیل کا اختصار اس طرح کیا ہے "پانچ رستے چار منزل اور ایک مقام"۔ چار منزل کے بارے میں شاہ ابو الحسن کہتے ہیں ؎

چاروں جب پیو دیوے ہات
کڑوا ہو رہے سب نبات

صوفیاء تمام اشیاء کائنات کو آثار اللہ سمجھتے ہیں۔ مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کے مخالف

Marfat.com

درجوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ سالک اثر سے نظر اٹھائے فعل پر رکھے، اسی طرح صفت تک پہنچے اور پھر ذات یعنی وجود مطلق کی طرف رجوع ہو۔ صوفیاء کی اصطلاح میں یہ "عروض" کہلاتا ہے اسی طرح ذات سے اثر تک پہنچنا "نزول" کہلاتا ہے "سکھ انجن" میں اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے ؎

عروض نزول میں بار پا کر
ابسی نت مہم سار کر

شاہ ابوالحسن جبریا نظریئے کے قائل معلوم ہوتے ہیں "سکھ انجن" میں کہتے ہیں ؎

جینا چھپنا اپنا کام
تعینا تیوں کا نام بد نام

وہ وحدۃ الوجود پر ایقان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام مظاہر میں ذات واجب الوجود کا پرتو موجود ہے وہی تمام اشیاء میں جاری وساری ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار "خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ" کی تشریح معلوم ہوتے ہیں ؎

آپی کھیل کھیل مچایا — دائی کے ہاتھوں آنکھ مچایا
آپی پھولباں ہو کر آیا — اپنے سر پر آپ چڑھایا

صوفیاء نے یادِ حق کے دو طریقوں پر زور دیا ہے۔ ایک "مقید" اور دوسرا "مطلق"۔ "مقید" میں اسم کا ذکر کیا جاتا ہے اور مطلق میں یافت مسمّٰی کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے یعنی حق سے حق کو پہچاننا جس کو "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ" کہا گیا ہے "سکھ انجن" میں شاہ ابوالحسن اسم کے ذکر پر زور دیتے ہوئے بار بار اس کو دھرانے کی تلقین کرتے ہیں ؎

صفت جلال کا تقاضہ یہ ہے کہ خلق کو ہستی سے نیستی کی طرف لے جائے اور جمال کا اقتضا یہ ہے کہ اس کو ہست کی طرف لائے مخلوق ان دونوں صفات کے درمیان ہے اور جلال وجمال کی سرعت تجلیات کی وجہ سے مخلوق ہست نہیں" ہست نما" ہوتی ہے اس کو اصول "تجدد امثال" بھی کہتے ہیں۔ سکھ انجن میں اس مسئلہ کی طرف بھی بلیغ اشارے کیے گئے ہیں ؎

شاہ ابوالحسن نے "سکھ انجن" کو حکایات پہیلی، اقوال، تلمیح، احادیث اور آیات سے آراستہ کیا ہے کہیں مولانا روم کے اشعار کی تشریح کی ہے تو کہیں ابوبکر شبلی اور امام غزالی کے اقوال کی افادیت کو واضح کیا ہے۔

Marfat.com

"سکھ انجن" کے بارے میں جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں :۔

"شاہ ابوالحسن قادری کی مثنوی سکھ انجن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس دور میں موضوع یا اسلوب کے اعتبار سے انھیں ممتاز کرتی ہو۔"[1]

جمیل جالبی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے شاہ ابوالحسن کی "سکھ انجن" کا سرسری مطالعہ کیا ہے ورنہ یہ مثنوی دکنی ادب میں اپنے رمزیہ اور علامتی اسلوب، اپنی گہری معنویت، ایمائیت اور منفرد طرز اظہار کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاہ ابوالحسن کی ایک اور نظم "توصیف" ہے[2] یہ نظم مختصر ہونے کے باوجود خاصی دلچسپ اور پرکشش ہے۔ "توصیف" میں ابوالحسن نے محبوب کا سراپا بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کو حسین تشبیہات اور دلفریب استعاروں سے رنگین اور پرلطف بنا دیا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ ابوالحسن نہ صرف تصوف و اخلاق کی سنجیدہ باتیں نظم کر سکتے تھے بلکہ وہ مادی محبت اور عاشقانہ تاثرات و جذبات کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ دکنی ادب میں سراپا کے متعدد دلکش نمونے موجود ہیں لیکن ان کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں بلکہ یہ مثنوی کا جزو بن کر یا غزل کی ہیئت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے برخلاف شاہ ابوالحسن کی یہ نظم اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ نظم ہمارے قدیم ادب کے سرمایہ میں اہمیت کی حامل نظر آتی ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :۔

جعد کے گیسو تیرے سنبل کی جال
کیس ہیں تج سیس سے شکن
سیس پر سیس پھول سارا چاند ہے
ماہ ہور خورشید کا جینا لگن
جعد پر تیرے دسے سونے کے پھول
کہکشاں سیں جوں سہانا ہے گگن
ہے ارائش چہرۂ گلنار پر
چشمۂ سورج سیں جوں دساں کرن

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل۔ ص ۲۳۱

[2] اکبرالدین صدیقی۔ کچھ دکنی کلام (مضمون) مشمولہ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۶ء۔ ص ۶ تا ۱۱۔

Marfat.com

گوشوارے ہیں تیرے کاناں کے بیچ
اے ثریّا کے ہیں خوشے دو کدن

دل میرا بیتاب جیو مہیار سے
اے چھبیلی چال کی چندر بدن[1]

عرض خدمت میں ہے تیرے اے سجن
درس کا مشتاق ہے یو بوالحسن

آئکی چال سیں دل کے صحن
اے میرے دل کی لگن جیو کے جیون

شیخ محمد شریف عاجز

شیخ محمد شریف عاجز مایۂ ناز شاعر شیخ احمد شریف گجراتی کے فرزند تھے[2]۔ ان کی والدہ قاضی عبداللہ کی صاحبزادی تھیں[3]۔ عاجز کے کتنے بھائی اور کتنی بہنیں تھیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ محمد ابراہیم زبیری کا بیان ہے کہ ان کے والد شیخ احمد شریف گجراتی کی اولاد بیجاپور میں موجود تھی[4]۔ محمد شریف عاجز تخلص کرتے تھے وہ اپنے بارے میں "لیلیٰ مجنوں" میں کہتے ہیں کہ میرا نام محمد اور تخلص عاجز ہے اور میرے والد کا نام احمد ہے۔

محمد اہے نام احمد پدر تخلص میں عاجز ہوا سربسر

دکن میں عاجز تخلص کے بعض اور شاعر گزرے ہیں لیکن ان میں سے قدیم شیخ احمد شریف گجراتی کے فرزند شیخ محمد شریف عاجز ہیں۔ عاجز کی دو مثنویاں "یوسف زلیخا" اور "لیلیٰ مجنوں" ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء اور ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں لکھی گئی تھیں[5]۔ عاجز اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں کے سنہ تصنیف کے بارے میں کہتا ہے ؎

---

[1] مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۵ھ) کا قصہ اس زمانے میں زبان زد خاص و عام تھا اس شعر میں بھی تلمیح لائی گئی ہے۔

[2] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۴۷

[3] محمد ابراہیم بیجاپوری۔ سبد شاہ سیف اللہ قادری (مترجم) روضۃ الاولیاء۔ بیجاپور۔ ص ۲۲

[4] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۴۷

[5] بحوالہ سبدہ جعفر۔ مقدمہ مثنوی یوسف زلیخا۔ ص ۳۷

Marfat.com

ہزار ہو رچہل شش یو ہجرت کے سال
ہوئے پر کھیا لیلےٰ مجنوں کے حال

اور شاعر "یوسف زلیخا" کے بارے میں کہتا ہے۔

نبی بعد ہجرت ہوئی یک ہزار
چہل چار پر حا کیا مر قطار

غلام عمر خاں نے محمد عاجز کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" مرتب کی ہے لیکن شاعر کی شخصیت اس کے حالاتِ زندگی اور دیگر امور پر مقدمہ میں غلام عمر خان کے مختصر بیانات سے روشنی نہیں پڑتی اور یہ بیانات بھی غلط فہمیوں پر مبنی اور گمراہ کن ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی ناواقف ہیں کہ محمد عاجز شیخ احمد گجراتی کے فرزند تھے۔ مرتب مقدمے میں زیر بحث شاعر کے حالاتِ زندگی سے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لیلےٰ مجنوں کے مصنف عاجز کی زندگی پر گہری تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے"[1]

آگے چل کر رقمطراز ہیں:-

"عاجز کے حالاتِ زندگی کے متعلق کوئی قیاس آرائی صرف ان سرسری اور اچٹتے ہی اشاروں کی مدد سے ممکن ہے جو خود اس کی مثنوی میں ملتے ہیں"[2]

انھوں نے عاجز کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کے مندرجہ ذیل اشعار سے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محمد عاجز سید تھا۔

حسن شاں ہا حسن احسن تمام
حسین شاہ شہیداں میں عالی مقام
انور بعد برحق ہیں بادامام
ہے پیری مریدی انور پر تمام
ہے عاجز اسی خاندان کا گدا
انو دوستی جیو کروں سب فدا

---

[1] غلام عمر خان۔ مقدمہ مثنوی لیلیٰ مجنون۔ قدیم اردو جلد دوم ۱۹۶۷ء۔ ص ۴

[2] " " " " " " " " ۔ ص ۹

Marfat.com

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے حسنین سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور کہتا ہے کہ بارہ اماموں پر پیری مریدی "تمام" ہے آخری شعر میں وہ خود کو اسی خاندان کا "گدا" بتاتا ہے اور ان کی موت پر زندگی نثار کرنے کی تمنا ظاہر کرتا ہے ان اشعار سے شاعر کی سیادت کا اظہار کیسے ہو سکتا ہے؟

دیباچے میں مرتب نے ایک اور جگہ تحریر کیا ہے یہ

"عاجز کو دربار شاہی سے کوئی واسطہ نہیں تھا"۔

حقیقت یہ ہے کہ عاجز نے اپنی مثنوی "یوسف زلیخا" میں سلطان محمد عادل شاہ کی مدح میں شعر کہتے ہیں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ "محمد عادل شاہ کی مدح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربار میں پیش کی گئی تھی"[1] معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کے مرتب نے ان اشعار کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جن میں عاجز نے نہ صرف بادشاہ کی مدح کی ہے بلکہ وزیر اعظم مصطفےٰ خاں اور سپہ سالار فوج کی بھی تعریف و توصیف کی ہے اور کہتا ہے ؎

توں سلطان محمد سو عادل ہے شاہ	تو حاکم ہے اسلام کا دین پناہ
تو خوش خلق ہے انبیاء اتقیار	اسم با مسمّٰی دیا نجہ خدا
بزرگی سلیماں کوں خاتم تھے تھا	سخاوت شے ختم یہ خاتم تھے تھا

.....

سخاوت سنے مصطفےٰ خاں تمام	شجاعت منے رُند لا سا غلام

اپنے دیباچے میں مرتب نے ڈاکٹر زور کے اس بیان کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے کہ عاجز بیجاپور کا شاعر تھا وہ لکھتے ہیں ؎

"عاجز کی زبان اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے عام میلان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گولکنڈہ اسکول کا شاعر ہوگا"[2]

عاجز بیجاپور کا شاعر تھا اور اپنی مثنوی میں بیجاپور کے عادل شاہی سلطان کی مدح کر کے اس نے اس حقیقت پر صداقت کی مہر ثبت کر دی ہے کہ گولکنڈے سے اس کا کوئی تعلق تھا "روضۃ الاولیاء" میں محمد ابراہیم کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ شیخ احمد کی اولاد بیجاپور میں سکونت

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۴۷

[2] غلام عمر خان۔ مقدمہ مثنوی "لیلےٰ مجنوں"، قدیم اردو۔ جلد دوم ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۳، ۱۴

Marfat.com

پذیر تھی۔[1]

شیخ محمد عاجز اپنے والد کی طرح شاہ وجیہ الدین گجراتی سے عقیدت رکھتے تھے۔ محمد ابراہیم زبیری کی روضۃ الاولیاء بیجاپور میں شاہ وجیہ الدین گجراتی نے خلفاء کی جو فہرست درج کی ہے اس میں بیسواں (۲۲) نام شیخ محمد کا ہے۔ نصیر خان بن کامل قریشی خان۔

مجموعۂ حالات شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی قدسرہ العزیز" میں لکھتے ہیں کہ محمد عاجز کو تصوف اور مذہبی امور سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اسمار عظام کی دعوت" میں موجود رہا کرتے۔[2] "صحیفہ اہل ہدیٰ" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ محمد عاجز بیجاپور مقیم رہے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کا مزار بیجاپور میں حصار کے باہر واقع ہے۔[3]

غلام عمر خاں محمد عاجز اور ان کے حالات زندگی کے متعلق حسب ذیل حقائق سے ناواقف ہیں:۔

(۱) عاجز کا نام شیخ محمد شریف تھا اور وہ سید نہیں شیخ تھا۔

(۲) عاجز مثنوی یوسف زلیخا اور لیلےٰ مجنوں کے شاعر شیخ احمد شریف گجراتی کا فرزند تھا۔

(۳) عاجز مشہور عالم شاہ وجیہ الدین گجراتی کے مرید تھے۔

(۴) عاجز کی ایک اور مثنوی یوسف زلیخا ہے۔

(۵) عاجز کا گولکنڈہ سے کوئی تعلق نہ تھا وہ بیجاپور کا شاعر تھا۔

(۶) عاجز کا مزار بیجاپور میں واقع ہے۔

مقدمہ لیلےٰ مجنوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق میں عدم توجہی، محدود مطالعے اور داخلی شہادتوں سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے کس طرح حقائق مسخ ہو کر رہ جاتے ہیں:۔

عاجز نے اپنے والد کی طرح شہرۂ آفاق رومانی قصوں سے دلچسپی اور "یوسف زلیخا" اور "لیلےٰ مجنوں" کی حکایتیں نظم کی ہیں انھوں نے اپنے والد احمد گجراتی کے مثنویوں سے استفادہ

---

[1] بحوالہ سیدہ جعفر۔ مقدمہ مثنوی یوسف زلیخا۔ ص ۳۷۔

[2] نصیر الدین خاں کامل قریشی خان مجموعۂ حالات۔ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی قدس اللہ سرہٗ العزیز" ص ۳

[3] اکبر الدین صدیقی (مترجم) صحیفہ اہل ہدیٰ۔ ص ۱۴

Marfat.com

کیا ہے[1] مثنوی لیلیٰ مجنوں میں قصہ شروع کرنے سے پہلے شاعر کہتا ہے ۔ ؎

کہو یو قِصّا تم سنوں کان دھر　　بزرگاں تے یو میں سُنیا سو خبر

ممکن ہے کہ "بزرگان" کا اشارہ شاعر کے والد احمد گجراتی ہی کی طرف ہو۔ مثنوی کے آخر میں شاعر کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے جس میں وہ خود کو شعرا کی "صف" کا گدا" کہتا ہے۔ "صف" سے مراد سلسلہ آبا و اجداد ہے اور عاجز کو شاعری ورثے میں ملی ہے وہ اس ودلیت سے محروم نہیں چنانچہ کہتا ہے ؎

نہ عاجز ہے محروم شکر خدا　　اہے شاعراں کے وو صف نگ گدا

یا جو زیرے میں اس کھان سون　　کیا شاعری میں اسے دھیان سون

مندرجہ بالا اشعار میں عاجز نے احمد کے کلام سے اثر پذیری اور خوشہ چینی کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ احمد کی مثنوی طویل و بسیط ہیں اور عاجز کی مختصر احمد گجراتی اور بلند پایہ شاعر ہے۔ اس کی ژرف نگاہی، ادبی بصیرت اور شاعرانہ کمال کا تتبع عاجز کے بس کی بات نہیں۔ عاجز کی مثنوی میں کہیں کہیں منظر کشی اور جزئیات نگاری کی کوشش ضرور موجود ہے لیکن شاعر نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ ایجاز و اختصار، کفایت اور مثنوی میں قصے کا تیزی سے حرکت کرنا اس مثنوی کے بنیادی وصف ہیں۔ سراپا نگاری جذبات کی مرقع کشی اور محاکات نگاری کے وہ اعلیٰ نمونے جو احمد گجراتی کی "یوسف زلیخا" میں نظر آتے ہیں عاجز کی لیلیٰ مجنوں میں کہیں اپنی جھلک نہیں دکھاتے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد عاجز نے اپنے والد کی طرح واقعات اور شخصیات کی مرقع کشی ضرور کی ہے۔ عاجز کی بعض تصویروں سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مثنوی کی فضا ہندستانی ہے اور شاعر نے احمد کی طرح ہندوستانی ماحول سے ماخوذ تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں ؎

نین دو موے دسیں چند بھرے　　جیسے مِرگ دیکھے سو پھاندے پرے

چندا ایسے مکھ میں ہے عیسیٰ بچن　　زلف ناگ رکھوال کرنے جتن

سوگس میں عجائب ہیں یاقوت لب　　کے ہیں جبل او دانت ہیرے کی چھب

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۴۷

Marfat.com

عاجز کی مثنوی میں روانی اور سادگی و بیساختگی کی کمی نہیں۔

پدر آؤ دیکھیا گھر میں مجنوں نہیں　　پوچھیا ہور کھایا پچھاری وہیں
اٹھا باٹ جنگل کی لے کر چلیا　　دیکھیا ایک کنج دنیا نے مجنوں ملیا
رکھیا پاؤں سیں رونے لگیا　　ملیا تھا سو جنگل بغیر میتھو بھگیا
کھیا کون یو پند تج کوں دیا　　میرا ملک ہور شہر غارت کیا
پوچھنا مجنوں تو کوں کہ کھول منج　　گھیا میں پدر ہوں نہیں نام تج
پدر کس کہیں سو نہیں منج کوں کام　　کیا ناؤں سیں لیلےٰ کا دل میں مقام

لیلیٰ اور مجنوں کا قصہ بظاہر ایک عشقیہ داستان ہے لیکن عاجز کی مثنوی میں اس کی تان عشقِ حقیقی پر ٹوٹتی ہے اور شاعر کہتا ہے ؎

او معشوق عاشق میں ملنا اچھے　　سیلےٰ ہور مجنوں بہانہ اچھے

عاجز کہتا ہے کہ مجازی محبت کا قصہ تو ایک بہانہ ہے دراصل اس میں کچھ اور معنیٰ پوشیدہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عاجز نے اپنے والد احمد گجراتی کی طرح عشقیہ داستان کو بھی عشقِ حقیقی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ احمد گجراتی نے بھی یوسف زلیخا میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھا تھا احمد گجراتی اور محمد عاجز دونوں وجیہ الدین گجراتی کے مرید اور شطاریہ مسلک کے پیرو تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ خانقاہوں میں بسر ہوا تھا اور اس ماحول کا اثر ان کی شخصیت اور طرز فکر کا جز بن گیا تھا۔

"بیاض مراثی" میں افسر صدیقی امروہوی نے دو مرثیوں کو "قصہ ملکہ مصر" کے شاعر محمد علی عاجز سے منسوب کیا ہے۔ بیاض میں جو مرثیے درج کیے گئے ہیں ان میں کہیں شاعر کا نام تحریر نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف تخلص (عاجز) تحریر کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا تعین مشکل ہو گیا ہے کہ یہ کون سے عاجز کا کلام ہے؟ ان دونوں مرثیوں کی زبان جدید اسلوب سے زیادہ قریب ہے اور زبان اسی سمت میں حرکت کرتی نظر آتی ہے جو بعد میں ریختہ کا معیار بنا۔ کلام میں روانی، دردمندی اور سلاست و بیساختگی موجود ہے۔

کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کی ایک اہم قدیم بیاض میں عاجز تخلص کے کسی شاعر کی ایک غزل بھی محفوظ رہ گئی ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

تری خوبی میں یوں سراپا سن کے ہو عاجز
نہ کہنے سر بسر اوسب جو شاعر انتخاب اچھتے[1]

Marfat.com

چوں کہ ہمیں صرف تخلص کا پتہ چلتا ہے اور شاعر کے نام کا علم نہیں اس لیے اس غزل کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ محمد شریف عاجز کی غزل ہے یا محمد علی عاجز کی۔

سیّد حسن شاہ محی الدین صنعتی

سیّد حسن شاہ محی الدین صنعتی بیجاپور کا ایک نامور شاعر تھا۔ عبدالقادر سروری[1]، ڈاکٹر زور[2]، نصیرالدین ہاشمی اور جمیل جالبی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بساتین السلاطین" میں جس شاعر صبعی کا ذکر کیا گیا ہے وہ صنعتی ہے لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قصۂ بے نظیر میں صنعتی نے جہاں جہاں اپنا تخلص استعمال کیا ہے وہاں صنعتی ہی تحریر کیا ہوا ملتا ہے کہیں صبعی نہیں ہے۔ خارجی ذرائع سے شاعر کے واقعات حیات پر کچھ زیادہ روشنی نہیں پڑی۔ شمس اللہ قادری نے صنعتی کے وطن کا نام ساگر بتایا ہے[5]۔ لیکن انھوں نے شاعر کا نام تحریر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ان کی نظر سے صنعتی کی مثنوی "گلدستہ" گزر چکی تھی جس میں شاعر نے اپنا نام ظاہر کیا ہے اگر شمس اللہ قادری کی نظر سے صنعتی کا وہ شعر گزرتا جس میں اس نے اپنا نام بتایا ہے اور انھوں نے اس کی صراحت کردی ہوتی تو بعد کے محققین کو شاعر کے نام سے متعلق غلط فہمیاں نہ ہوتیں۔ تلاش بسیار کے باوجود عبدالقادر سروری کو صنعتی کے حالات اور دیگر تفصیلات دستیاب نہ ہوسکی تھیں چنانچہ "قصۂ بے نظیر" کے دیباچہ میں انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ "مثنوی" گلدستہ" عبدالقادر سروری کی نظر سے نہیں گزری تھی۔ اور صنعتی کے حالات کسی تذکرے میں موجود نہیں تھے اس سے انھوں نے" بساتین السلاطین" مصنفہ مرزا ابراہیم

---

[1] بیاض نمبر ۶۳۴۔ ص ۶۵۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان
[2] عبدالقادر سروری۔ مقدمہ قصۂ بے نظیر۔ ص ب
[3] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۴۴
[4] نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۰۱
[5] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۲۷۵
[6] شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم۔ ص ۲۰۵
[7] عبدالقادر سروری۔ مقدمہ قصۂ بے نظیر۔ ص ا ط

Marfat.com

زبیری پر اپنی معلومات کی بنیاد رکھی تھی صاحب "بساتین السلاطین" نے ایک ایسے شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص صبعی ہے عبدالقادر سروری نے صبعی کو صنعتی سمجھا اور لفظ کی تبدیلی کو سہو کاتب تصور کیا۔ ان دونوں الفاظ کی باہمی مشابہت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"صبعی اور صنعتی میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے ممکن ہے کہ اس تجنیس خطی نے کو صبعی بنا دیا ہو"[1]

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس "قیاس" سے زیادہ مطمئن نہیں تھے کیوں کہ آگے چل کر وہ تحریر کرتے ہیں :۔

"بہر حال اس وقت سوائے قیاس کے ان دونوں کو سمجھنے کے ہمارے پاس کافی دلائل موجود نہیں ہیں"[2]

رافتہ الحروف کا خیال ہے کہ محمد ابراہیم خاں صبعی اور حسن شاہ محی الدین صنعتی دو مختلف شخصیتیں ہیں جن کے نہ صرف ناموں میں اختلاف ہے بلکہ حالات زندگی بھی بالکل جداگانہ ہیں۔ صنعتی کا نام محمد ابراہیم خان نہیں ہے۔ اور نہ صبعی، کی بگڑی ہوئی شکل یا سہو کاتب ہے۔ اس سلسلے میں داخلی شہادتیں یعنی خود صنعتی کے بیانات بہتر طور پر ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ مثنوی "گلدستہ" میں شاعر اپنے نام کے بارے میں کہتا ہے ؎

اپس فعل سوں کر مرا نیک نام　　سدا فر و عزت سوں رک تو مدام
بھی اس دہر تج دھر یا عین ہے　　مسمّی حسن شاہ محی الدین ہے

آگے چل کر اپنے والد کے نام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور کہتے ہیں کہ میں مرتضیٰ قادری کا "خلف" ہوں ؎

خلف مرتضیٰ قادری نا مور　　ہے نس نام عرفی شاہ حضرت مگر

بیجاپور کا شاعر مختار بھی حضرت شاہ کا مرید تھا۔ محمد حسینی عرف شاہ حضرت کا خاندانی سلسلہ بندہ نواز گیسو دراز سے جا ملتا ہے مختار شاہ حضرت کے بارے میں کہتا ہے ؎

ہے محمد حسینی ہے نادلں　　میرے سر پر اس کی ہمیشہ
کہ او شاہ حضرت سو ہشور ہے　　کہ فیض اس کا دو جگ میں معمور ہے

---

[1] عبدالقادر سروری۔ مقدمہ قصہ بے نظیر۔ ص ۷

[2] " " " " " ۷

Marfat.com

رہے بحث بے مثل پایا ہوں پیر　　کہ اوہے دو جگ میں مجھے دستگیر

ایک اور جگہ مختار کہتا ہے ؎

میرے پیر کا جد ہے اوسرفراز　　محمد حسینی سو گیسو دراز

جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" اور افسر صدیقی نے مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد اوّل میں صنعتی کا نام جو شیخ داؤد بتایا ہے اس کی اس داخلی شہادت سے تردید ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ صنعتی کا نام حسن محی الدین اور اس کے والد کا نام مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھا۔ اب ہم "بساتین السلاطین" کے بیان پر غور کریں تو حسب ذیل امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ "بساتین السلاطین" میں جس شاعر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام ابراہیم خان ہے۔

۲۔ ابراہیم خان کا تخلص صبعی ہے۔

اگر صبعی کوئی بے معنیٰ لفظ ہوتا تو اس کو کتابت کی غلطی سمجھ لینے میں ہمیں پس و پیش نہ ہوتا۔ "صبعی" ایک بامعنیٰ لفظ ہے "صبع" کے معنی عربی میں فخر کرنے کے ہیں۔ لفظ صبع سے صبعی بنا لینا اس لیے بھی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں یہ روایت بہت قدیم اور مقبول ہے۔ مقیم سے مقیمی، ذوق سے ذوقی، لطف سے لطفی، خیال سے خیالی، طبع سے طبعی، آتش سے آتشی، باغ سے باغی، شغل سے شغلی یہاں تک کہ ضعیف سے ضعیفی بھی بنا لیا گیا ہے۔ دکن کے اکثر بلند پایہ شاعروں کا تخلص "ی" پر ختم ہوتا ہے جیسے وجہی، غواصی، نصرتی، ابن نشاطی اور جنیدی وغیرہ۔ اس صورت میں یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ "صبع" سے صبعی بنایا گیا ہے۔ فارسی میں انوری، فردوسی، ظہوری اور اس طرح کے بیسیوں تخلص موجود ہیں۔

"بساتین السلاطین" کے مصنف زبیری نے ابراہیم خاں کو ایک قصیدہ نگار کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"قصیدہ و غزل، معنیٰ پیچیدہ، مضامین رنگین برجستہ چندان بربستہ کہ از بار تحسین آں زبان حرف گراں چوں رنگ روے شاں درہم شکستہ"..... اس کے برخلاف صبعی

Marfat.com

زبان حرف گیراں چوں رنگ روے شاہ درہم شکستہ ....[1]" اس کے برخلاف وہ بحیثیت مثنوی نگار شہرت رکھتا ہے اور اس کی تمام تر شہرت کا دارومدار مثنوی ہی ہے۔ زبیری کے مذکورہ بالا بیان میں صرف غزل اور قصیدے کا ذکر ہے۔ مثنوی کا نہیں۔ حالاں کہ ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں صنعتی کی مشہور مثنوی "قصہ بے نظیر" منظر عام پر آچکی تھی۔ نذیر احمد اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں۔

"ابراہیم خاں صنعتی بھی فارسی کا بڑے درجے کا شاعر تھا اس دور کے ایک شاعر نے تمیم انصاری کے قصے کو "قصہ بے نظیر" کے عنوان سے نظم کیا تھا۔ ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ نے اس مولف اور ابراہیم صنعتی کو ایک قرار دیا ہے اسی مصنف کی ایک اور کتاب مثنوی گلدستہ[2] پر محترمی سید تجیب اشرف ندوی صاحب نے رسالہ سب رس میں روشنی ڈالی ہے[3]" لیکن شمس اللہ قادری نے اس مثنوی کا نام "گلدستۂ عشق" تحریر کیا ہے۔ اور صنعتی تخلص کے دوسرے شاعر (یعنی حسن شاہ محی الدین) سے اس کو منسوب کرتے ہیں اور سخاوت مرزا بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ نذیر احمد کے مندرجہ بالا بیان میں صنعتی کا نام ابراہیم خان بتایا گیا ہے۔ یہاں صنعتی ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ "قصہ بے نظیر" نظم کرنے والے "اس دور کے" جس شاعر کا کا ذکر کرتے ہیں وہ حسن شاہ محی الدین صنعتی ہے۔

حسن شاہ محی الدین صنعتی کا قصہ بے نظیر نہ صرف اپنے محاسن کی وجہ سے مقبول ہوا بلکہ اس کے مذہبی رنگ نے بھی اسے قبول عام کی سند عطا کی۔ مذہب پرستی کے اس دور میں ایک ایسی ادبی تخلیق کو نظر انداز کر دینا جس میں صحابی رسول تمیم انصاری کی سرگزشت بیان کی گئی ہو اور جو شاعر کا ایک قابل قدر کارنامہ ہو تعجب خیز ہی نہیں بلکہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔

صاحب بساتین السلاطین" نے شاعر کی تعریف ایسے مبالغہ آمیز پیرائے میں کی تھی ہے

بہ میدان مصفی چوں ناز سمندر	سر اہل دعوی کشد در کمند
چوں دریائے طبعش شود موجزن	زند جوش گوہر زمین و زمن[4]

---

[1] مرزا ابراہیم زبیری۔ تاریخ بیجاپور مسمّٰی بہ بساتین السلاطین۔ ص ۲۳۴

[2] مثنوی گلدستہ۔ مخطوطہ نمبر ۵۳۸۔ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری۔ حیدرآباد۔ ص ۲۱

[3] نذیر احمد۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں علما و فضلا کی خدمات (مضمون) مشمولہ نوائے ادب جولائی ۱۹۵۹ء (نوٹ) یہ مضمون سب رس فروری ۱۹۴۵ء میں بھی شائع ہوا تھا۔

[4] مرزا ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان ششم۔ ص ۲۳۴

Marfat.com

ایسی صورت میں مصنف اپنے دعوے کی دلیل میں یقیناً قصہ بے نظیر جیسے بلند پایہ ادبی کارنامے کا ذکر ضرور سمجھتا۔ "بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری لکھتے ہیں کہ جب وزیر سلطنت خان محمد کو جو خانخانان کہلاتے تھے قتل کر دیا گیا تو یہ "عہدہ" فضائل و کمالات مرتبت ابراہیم خان" نے سنبھالا۔ جب محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان نے جو عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھیں حج کا ارادہ کیا تو ابراہیم خان بھی شامل ہو گئے اور اپنے فرزند کو جس کا نام عبدالمحمد تھا اپنی جگہ انتظام سلطنت پر مامور کیا[1] مندرجہ بالا بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ابراہیم خاں ایک جلیل القدر عہدے پر فائز تھا۔ اور وزیر سلطنت عادل شاہی تھا اس نے فراغت و خوش حالی کی زندگی بسر کی تھی اس کے برخلاف صنعتی کا یہ بیان ملاحظہ ہو جس میں وہ خود کو ایک غریب سپاہی کہتا ہے اور اپنی پریشان حالی کا ذکر کرتا ہے ؎

اتھا اصل میں اک سپاہی غریب　　سپاہاں کی سب گرد میں تھا قریب

آگے چل کر اپنی خستہ حالی اور گوشہ نشینی کا اس طرح ذکر کرتا ہے

ولے چرخ آفات ستے ہو حزیں　　خموشی پکڑ کر تھا گوشہ نشیں

مرے دل پہ کچ شادمانی نہ تھی　　شب و روز فکر و گرانی اتھی

کہتا ہے کہ ان حالات نے میری طبع کو "کند" کر دیا ہے اور میں اپنی بدقسمتی پر "تند" ہوں ؎

مکدر ہوا اوس نے طبع کند ہو　　اپس بخت پر میں اتھا تند ہو

ایک ایسا شخص جو بقول زبیری وزیر اور "از مجلسیاں حضور اعلیٰ" ہو خواہ کتنی ہی انکساری سے کام لے خود کو گوشہ نشیں نہیں کہے گا اور اس کو اپنی فلاکت و تنگدستی کی شکایت کرنے کی بھی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہاں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے صنعتی کی ابتدائی زندگی عسرت و پریشانی میں گزری ہو لیکن بعد میں اس نے دربار میں اسامی حاصل کر لی ہو۔ ابراہیم زبیری۔ محمد عادل شاہ کا سنہ وفات ۱۰۶۷ھ[2] بتایا ہے اور اس کے بعد اس کی ملکہ کے سفر حج کا ذکر کیا ہے۔ جس مثنوی میں وہ خود کو بادشاہ کا مقرب نہیں بلکہ ایک غریب سپاہی کہتا ہے

---

[1] مرزا ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان ہفتم۔ ص ۳۶۴

[2] مرزا ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان ششم۔ ص ۳۴۴

Marfat.com

۱۰۷۷ھ میں لکھی گئی ہے۔ شاعر اس مثنوی کے آخر میں قارئین سے استدعا کرتا ہے کہ اسے مثنوی پسند آئے تو وہ اس کے حق میں دعائے نیک کریں تاکہ اسے کلفت سے نجات ملے ؎

کہ جس حال میں آئے شفقت کا پیار　　میرے حق میں کرنا دعا بے شمار

کہتا ہے کہ میری زندگی تفکرات و مصائب کا شکار ہو گئی ہے۔ وہ فنکار جنھیں فراغت و خوش حالی نصیب ہوئی ہے وہ پوری دل جمعی کے ساتھ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ مجھے یہ نعمت "میسر" نہیں ؎

کئی باغباں جو اوّل ہو کے سب　　میرا تھا ان کو عیش و طرب

اوسی تے خوشی دل سوں افروز کر　　سنوارے اپس باغ سامان فکر

شاعر کہتا ہے کہ میرا دل "کدورت" کی "ہلاکت" کا نشانہ بن گیا ہے اس لیے اس مثنوی میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں ؎

کدورت میں تھا دل ہلاکت میں پر　　یو نکلیا سخن خام مج تے پڑ

ابراہیم زبیری "بساتین السلاطین" میں　　کا نام بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ابراہیم خاں صبعی است کہ مجموعہ علم عقلی فراہم آوردہ" [1] .....

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم خاں صبعی پٹھان تھا اس کے برخلاف حسن شاہ محی الدین صنعتی نے مثنوی "گلدستہ" میں خود کو "حسنین کی آل" سے بتایا ہے اور ان کی مدح کرنے کے بعد کہتا ہے کہ میں امام احمد بن حنبل کا پیرو ہوں ؎

شہیدوں میں افضل حسین و حسن　　بدل دیں لیں کربلا .....

انن آل میں ہو کو یو نام وار　　کیے مذہبی حنبلی استوار

اشعار کہنے کے بعد صنعتی نے معراج کا واقعہ بیان کیا ہے اور کہتا ہے کہ میں آنحضرت کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی سلسلے میں مشیخ ہوا ہوں

وسیلے انن سلسلے کا میں کر　　مشیخ ہوا ہوں وے بوج دھر

بیجاپور کے شاعر فخار کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ صنعتی خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سید تھا۔ مختصر یہ کہ صبعی اور صنعتی دو مختلف شخصیتیں ہیں

---

[1] مرزا ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان ششم۔ ص ۳۴۴

Marfat.com

اور جمیل جالبی کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا "جب تک کوئی اور بات سامنے نہ آئے ہمیں اور ابراہیم خاں کو ایک مان لینے کے سوا چارہ نہیں"۔[1]

صنعتی اور اس کے حالات زندگی کے متعلق مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں :۔

"کا نام سید حسن شاہ محی الدین تھا اور اس کے والد مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھے ۔ کے دادا کا نام شرف الدین قادری تھا۔[2] مرتضیٰ قادری کے متعلق "تذکرہ اولیائے دکن" میں عبدالجبار ملکاپوری بیان کرتے ہیں "آپ حضرت شرف الدین صوفی القادری کے صاحبزادے ہیں"[3] ان کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری لکھتے ہیں کہ ان کی طبیعت ابتدائے عمر ہی سے زہد و ورع کی طرف مائل تھی۔ ایک دن اتفاقاً ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی اور ان پر بھی جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ شاہ وجیہ الدین علوی کے خلف رشید شاہ عبداللہ گجراتی نے سلوک کی منزلوں میں ان کی دستگیری کی جن کی وجہ سے ایک قلیل عرصے میں وہ "کامل" ہو گئے۔ انھوں نے گجرات سے بیجاپور کا سفر کیا اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں دارالسرور بیجاپور پہنچے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔[4] وہ ابراہیم عادل شاہ کے مرشد اور "سکھ انجن" کے شاعر ابوالحسن کے ہمعصر تھے۔ انھوں نے ۳۰ جمادی الثانی ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی سمجھا جاتا ہے کہ ان کا مزار ابراہیم پور کے دروازے کے باہر ہے۔ عبدالغفور خاں رام پوری نے تاریخ دکن جلد سوم میں ان کی حالات زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

"مثنوی گلدستہ میں صنعتی اپنے والد کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ بڑے عالم فاضل اور نیک انسان تھے میں نے "ادب" اور "تمیز" ان ہی سے سیکھی ہے یہ ان ہی کی تربیت اور فیض کا طفیل ہے کہ میری "طبع" کا "چمن تازہ" ہوا ہے۔ جس شخص کو بھی ان کی صحبت نصیب ہوتی ہے وہ دنیا میں عزیز بن جاتا ہے۔

پدر مہ کمالت موں ہو نامدار ابتا علم کے فن میں سب کا۔گار

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۷۵۔

[2] نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں ان کا نام شاہ ابوالحسن حسینی تحریر کیا ہے۔ ص ۲۵۹

[3] [4] عبدالجبار ملکاپوری۔ تذکرہ اولیائے دکن۔ ص ۲۷۱

Marfat.com

خصوصاً یو پائیں ادب ہور تمیز　　اپنے فیض نس کی ہو جگ میں عزیز

معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد نہ صرف علم و فن میں مشہور تھے بلکہ ادب سے بھی انھیں لگاؤ تھا چنانچہ راجی خان سے کہتا ہے ؎

توں ویسے کا فرزند ہو کر ایتا ل　　سبب کیا نہ آتا ہے اس فن کے تال

جیسا کہ کہا جا چکا ہے صنعتی نے خود کو امام حنبل کا پیرو بتایا ہے یعنی وہ حنبلی تھا۔ اس نے خلفاء راشدین اور عبدالقادر جیلانی کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صنعتی کو عبدالقادر جیلانی سے خاص عقیدت و مودت تھی چنانچہ "مثنوی گلدستہ" میں ان کی مدح میں چھتیس ۳۶ مسلسل شعر کہے ہیں۔

"مثنوی گلدستہ" میں سبب تالیف بتاتے ہوئے صنعتی کہتا ہے کہ "چرخ آفات" نے مجھے "خزین" "مکدر" ہو گئی تھی۔ اور میں گوشہ نشیں ہو چکا تھا۔ ایک دن "پیر کامل" جنھیں "معارف" میں "دستگاہ" حاصل ہے اور جو مخدوم حسینی کے "خلف" ہیں میرے پاس تشریف لائے اور مجھے ایک کتاب لا کر دی اور اسے "دکھنی" میں "نظم" کرنے کی فرمائش کی۔ وہ بار بار اصرار کرتے رہے۔ ان کے علاوہ عمر خان اور "شجاعت مآب" راجی خان بھی تشریف لائے ان تمام حضرات کی تاکید اور فرمائش پر میں نے اس کتاب کو (جو غالباً فارسی میں تھی) دکھنی میں نظم کیا ہے۔ اور نٹیل مینو سکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں مثنوی گلدستہ کا جو نسخہ موجود ہے[1] اس کے صفحہ اوّل کی پیشانی پر "تصنیف من شیخ داؤد ابن شیخ حیدر" تحریر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ شیخ داؤد نامی شاعر نے فارسی میں نظم کیا ہو لیکن مثنوی میں اس کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں صنعتی خود کو مخدوم حسینی کے فرزند کا مرید بتاتا ہے گلدستہ میں اپنے شیخ طریقت کے بارے میں کہتا ہے ؎

(کہ) وہ پیر کامل حقایق پناہ　　معارف کا جس کوں اچھے دستگاہ

او مخدوم حسینی کا نامی حلف　　کروں جگ میں شہرت مرا چو طرف

... کی تاریخ پیدائش کی طرح اس کے سنہ وفات کا بھی علم نہیں ہے۔ ... کے حالات زندگی پر کسی ادبی تاریخ یا تذکرے سے روشنی نہیں پڑتی۔ محمد قاسم فرشتہ نے

---

[1] مثنوی گلدستہ۔ نمبر مخطوطہ ۵۳۸۔ اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری۔ حیدرآباد

Marfat.com

اپنی مشہور تاریخ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ۔۱۰۳۷ھ) کے عہد میں لکھی ہے[1]۔ اس میں جہاں اس نے اہم دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے وہاں ... کا نام نظر نہیں آتا جس سے ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ صنعتی کو اس وقت تک شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال یہ بات مسلّمہ ہے کہ صنعتی محمد عادل شاہ کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ قصہ بے نظیر میں اس نے بادشاہ کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

محمد شہہ داد گر دین پناہ — کہ ہر دم محمد جسے دست گاہ
براہیم کے بعد از ہوا نامدار — جگت میں محمد شہہ کامگار
سلف تجہ گہر وتے لیے آب و تاب — کہ دریا نے پایا ہے گوہر کے آب

"قصہ بے نظیر" ۱۰۵۵ھ/۱۶۴۵ء میں لکھی گئی تھی۔ نے قصہ بے نظیر میں سنہ تصنیف کی وضاحت کر دی ہے ؎

ہزار یک پنجاہ و پنج سال — ہی تب ہوا پُر جواہر یو گنج

کی دو مثنویاں۔ منظر عام پر آئی ہیں۔ "قصہ بے نظیر" اور دوسری مثنوی گلدستہ۔ وجہی کی "قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ اور سب رس ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے یعنی ان دونوں ادبی تخلیقات میں ستائیس برس کا زمانی فاصلہ ہے اسی طرح صنعتی کی مثنوی "قصہ بے نظیر" ۱۰۵۵ھ میں لکھی گئی تھی اور "مثنوی گلدستہ" ۱۰۷۷ھ میں یعنی پہلی مثنوی کے اکیس بائیس برس بعد۔ موخر الذکر مثنوی کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ مثنوی گل دستہ پیش کرنے سے پہلے شاعر عزلت گزیں ہو چکا تھا۔ اور یہ کہ بحیثیت شاعر اُسے بڑی شہرت حاصل ہو چکی تھی اور اسے بیجاپور کا ایک بلند پایہ شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ مثنوی گل دستہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نئیں شعر کے فن میں تجہ سار کوئی — تیرے سا رنئیں جگ میں تجہ یار کوئی
کہے کی اندیشے میں اس بین خموش — تمن طبع کا ہے ترنگ دھریو جوش

اس بیان سے نہیدہ بیگم کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ "گلدستہ" شاعر کا پہلا شعری کارنامہ ہے[2] ؎

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۱۷۹

[2] نہیدہ بیگم۔ ریاست میسور کی اردو مثنویاں، (مقالہ) ص ۱۶۲

Marfat.com

نصیرالدین ہاشمی نے "قصہ بے نظیر" کا نام "قصہ شمیم انصاری" بھی بتایا ہے[1] لیکن خود شاعر نے مثنوی کے نام پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ؎

یو قصہ عجب پاک ہے دل پذیر　　جو پاکاں کیے ہیں جسے بے نظیر

.....

قلم اب تو اے قصہ بے نظیر　　شتابی سوں لکھ مختصر دل پذیر

یہ مثنوی بارہ مقامات پر مشتمل ہے اور ہر مقام ایک نئی مہم کی داستان سناتا ہے اس مثنوی کا قصہ چوں کہ مذہبی نوعیت کا حامل ہے جسے شاعر "پاک" قصہ کہتا ہے اس لیے دوسرے مثنوی نگاروں کی طرح مختلف عنوانات سے اپنی مثنوی کو مزین کرنے کے بجائے صنعتی نے انھیں مقام سے موسوم کیا ہے تاکہ صوفیانہ اصطلاح کا اثر پوری مثنوی میں قائم رہے۔ یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے جسے صنعتی نے دلچسپ پیرایئے میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں صحابی رسول تمیم انصاری کی سرگزشت بیان کی گئی ہے کہ کس طرح ایک رات ایک دیو اُنھیں اٹھا لے گیا تھا اور کس طرح پرستان میں قیام کیا تھا اور کس طرح وہ پہلے دیوؤں جنوں اور شیطانوں کے ملک میں پہنچے اور پھر کس طرح پرستان میں قیام کیا تھا۔ اس کے بعد بھیانک صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں اور طلسماتی محلوں میں انھیں بڑے حیرت انگیز اور محیر العقل واقعات پیش آئے اور بالآخر تمام مہمات کو سر کرنے کے بعد تمیم انصاری حضرت خضر کی مدد سے مدینہ منورہ پہنچے۔ قصہ طویل ہونے کے باوجود مربوط و متوازن ہے اور واقعات میں کہیں الجھاؤ، بے ربطی یا تسلسل کی کمی کا احساس نہیں ہوتا اور دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ جہاں تک قصے کی اٹھان کا تعلق ہے۔ صنعتی کا یہ منظوم قصہ قدیم طرز کے فوق الفطرت اور مہماتی قصوں سے مختلف نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں قصہ در قصہ کی تکنیک کو بڑے سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ قصہ طویل ہونے کے باوجود کہیں غیر دلچسپ محسوس نہیں ہوتا۔ صنعتی نے ایک کامیاب قصہ گو کی طرح دلچسپی کو ابتدا سے اختتام تک بخوبی برقرار رکھا ہے تمیم انصاری کی یہ داستان "سندھ باد" کی مہمات کی یاد دلاتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سندھ باد کے قصے میں اختلافی عنصر کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور قصہ تمیم انصاری کی نوعیت

---

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ صفحہ ۲۰۱

Marfat.com

مذہبی ہے۔ صنعتی نے اپنے شاعرانہ تخیل کے بل بوتے پر اس مسلسل داستان میں ندرت، تحیر اور انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مذہبی روایات و تصورات کی کہیں نفی نہیں ہوئی ہے اسی لیے وہ دابۃ الارض اور دجال کے کردار کو نباہنے میں کامیاب ہوسکے ہیں صنعتی نے قصے کے درمیان مذہبی احکام اور عقائد کی توضیح کرکے انھیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔

قصہ بے نظیر اپنے ڈرامائی انداز کی وجہ سے بھی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ قصہ کی ابتدا انتہائی ڈرامائی فضا میں ہوئی ہے پوری مثنوی میں اپنے ڈرامائی مواقع میں جو قصے کو نیا موڑ دے کر دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ بقول سری رام شرمایہ مثنوی اپنے ڈرامائی انداز کی وجہ سے منفرد اور دلچسپ ہوگئی ہے۔ مہمات تمیم انصاری کے قصے مقبول خاص و عام تھے۔ کبیر نے سنہ ۱۰۹۰ھ میں ایک مثنوی "واقعہ تمیم انصاری" کے نام سے لکھی تھی جس کے دو نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ نثر میں سید محی الدین قادری جعفری ابن سید شاہ شمس الدین قادری گنگوہی نے اسے پیش کیا تھا۔ اس قصے کو غلام رسول غلامی نے بھی جو کھنبات کے باشندے تھے نظم کیا تھا۔ عبدالقادر سروری "قصہ بے نظیر" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

"اس قصے کا ماخذ جیسا کہ مصنف نے بتایا ہے کوئی خاص فارسی قصہ نہیں ہے"[2] لیکن ان کے خیال کی مثنوی میں صنعتی کے بیانات سے تردید ہوئی ہے صنعتی کے پیش نظر فارسی کا کوئی قصہ ضرور تھا اس لیے وہ کہتا ہے کہ میں نے فارسی کے بجائے دکنی میں قصہ نظم کیا ہے تاکہ وہ لوگ بھی جو اس زبان سے واقف نہیں مستفید ہوسکیں ؎

جسے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے　　سو دکھنی زبان کو آسان ہے

:::::::::

کہا اوس نے دکھنی میں آسان تر　　جو ظاہر دسیں اس میں کئی کئی ہنر

آگے چل کر کہتا ہے کہ اس قصے میں "اختلاف" تھا میں نے اس کی تصحیح کر دی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی کے سامنے جو فارسی قصہ موجود تھا وہ اس کی بیان کی ہوئی بعض روایات اور واقعات کو درست نہیں سمجھتا تھا اس لیے کہا ہے ؎

---

[1] سری راما شرما۔ دکھنی ہندی کا ساہتہ

[2] عبدالقادر سروری۔ مقدمہ قصہ بے نظیر ص ۱۱۔ ص ۲۳۰

Marfat.com

اتھا گرچہ قصّے میں اس اختلاف صحی کر کو بولیا ہوں میں بے خلاف
دیا اس رسالے کوں میں سجی کر سو ترتیب بارہ مقامات پر

کبیر قصّہ تمیم انصاری میں کہتا ہے کہ تمیم انصاری کا اصل قصّہ فارسی میں تھا میں نے اسے دکھنی میں منتقل کیا ہے ؎

تو قصّہ اتھا فارسی سوں اوّل جو دکھنی زباں سوں ہوا ہے بدل

کہتا ہے کہ شب قدر کے مبارک موقع پر میرے دل میں خیال آیا کہ دنیا ناپائیدار ہے اور انسانی زندگی بے ثبات اس لیے ایسا کام کرنا چاہیے جس سے کوئی یادگار اس دنیا میں ہمیشہ باقی رہے ؎

نہیں جگ میں جینا کسے پائیدار مگر او کہ جس تے رہے یادگار
رہیا نانوں باقی بڑا کام ہے جو یاں ہیں جو کئی جگ میں گمنام ہے

میں انھیں خیالات میں گم تھا کہ ہاتف نے کہا کہ تمیم انصاری کی سرگزشت بیان کر عشقیہ واردات یا رزمیہ واردات نظم کرنے کے بجائے تمیم انصاری کا قصّہ بیان کر اور اس قصّے میں بھی اپنی انفرادیت دکھا ؎

سو اتنے میں مُلہم نے مجہ دل بھتر کہا میں کہتا ہوں، سو یو نظم کر
نہ خیال محبوب کے خال پر پیسہ الف ہو دگال کے لعل پر

.....

نہ بر اسپ میدان و تیغ و تفنگ نہ برنیزہ و گرز و تیر و خدنگ

.....

جو اوّل تمیم انصاری اوپر کھڑیاں کیوں یہ قصّہ عجب سخت تر

.....

توں آ اس حکایت اوپر عزم کر نہ بند یا کہنے دُر سوتوں نظم کر

"قصّہ بے نظیر" میں رزمیہ مناظر بھی نظم کیے گئے ہیں۔ دیووں اور پریوں کی لڑائی مسلسل کئی اشعار میں بیان کی گئی ہے۔ کوہ الوند کے سلح پوشوں کی شکل و صورت اور ان کی معرکہ آرائی کا اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اُس نے جزئیات سے کام لیتے ہوئے ہیبت ناک محاربات کی بھرپور عکاسی کی ہے دیووں کے سردار کی یہ تصویر ملاحظہ ہو ؎

Marfat.com

اتھا زشت دیواں کا سردار ایک — کہ جل کر مرے جس کوں ابلیس دیک
بڑی شکل لہور قد منے کیا کہوں — لنبی بات ہوتی گگر چپ رہوں
مچھی کھائے بھن سور کی آنچ پر — سو پانی پیوے گھن کو سوراخ کر
لنبا ہوا جوڑا تھا چوں پہاڑ — پہاراں کوں ہاتاں تے دیوے اکھاڑ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضنعتی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس نے رزم اور بزم دونوں کی مرقع کشی میں اپنی استادی کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے وہ جہاں رزمیہ مناظر کی موثر تصویر کشی کرتا ہے وہیں سراپا نگاری باغ و گلزار کی مرقع کشی اور مناظر قدرت کی عکاسی اور واقعات کی ڈرامائی پیشکش پر بھی قادر ہے۔ قصہ بے تظیر میں اُس نے جو ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے اسکی مثالیں دکنی ادب میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ زور بیان، قوت اظہار، ڈرامائی و بیساختگی اور شعری محاسن نے اس مثنوی کو وقیع اور بلند پایہ بنایا ہے۔ مقام سوم میں صحرا کا یہ مرقع قابل دید ہے ؎

نہ واں قوت کو جھاڑ یک سایہ دار — نہ واں آب شیریں نہ واں مرغزار
اتھا سر لیر سخت دور و دراز — قیامت کے میدان سا جانگداز
دور رستہ درخت مغیلاں کھڑے — سو کئی لک ننھے ہوا کئی لک بڑے
اگر کئی دھرے پاؤں اس جھانوں پر — چبے خار تے چھانوں او تیز تر
سکل دشت جوں دشت الماس تھا — جھڑیا پک تے مرے رکت ماس تھا

.....

اچھتا دشت بے آب ایسا عجب — جو خضر آئے تو وہاں اچھے خشک لب

ضنعتی کو شاعری کی ساحری کا پورا پورا اندازہ تھا۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار سے شاعر کے ادبی تصورات کا اظہار ہوتا ہے مسلسل اکتالیس اشعار میں شاعری کی افادیت اور اس میں جو غیر معمولی قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے شاعری کی ہمہ گیری اور اس کی بے پناہ اثر آفرینی کے بارے میں، کہتا ہے ؎

سخن گنج ہے عالم الغیب کا — سخن موجزن ملک لاریب کا
سخن بادشاہ جہاں گیر ہے — سخن مس کے عالم کوں اکسیر ہے
جو کچھ ہے شہادت میں ہور غیب میں — سخن کے سماتا ہے آجیب میں

Marfat.com

جہاں کا بد ہور سخن جیو ہے　　سخن جیو ہے جیو میں پیو ہے

لیکن صنعتی کہتا ہے کہ شاعری ہر کس و ناکس کا کام نہیں" بر قطرہ لولوے شہوار" نہیں بنتا اور نہ ہر "گھن" سے "صاف جوہر" نکلتا ہے شعر فہمی کا مرتبہ بھی شعر گوئی سے کم نہیں کیوں کہ "گوہر" کو "گوہری" ہی "بوجھ" سکتا ہے ؎

سخن میں کا بھی کوئی کارے سخن　　سخندان سمجھتے ہیں قدر سخن

زیادہ ہے نزدیک اہل قیاس　　سخن بولنے تے سخن کا قیاس

نہ گوہر کوں بوجھے بجز گوہری　　نہ جوہر کوں سمجھے بجز جوہری

"قطب مشتری" میں وجہی نے جس طرح شاعری کے متعلق اپنے تنقیدی تصورات کا اظہار کیا تھا اسی طرح صنعتی نے بھی "قصۂ بے نظیر" میں اپنے ادبی خیالات کی ترجمانی کی ہے وہ کہتا ہے کہ شاعری ایک غیر معمولی اہمیت رکھنے والا فن ہے اور اس میں کمال حاصل کرنا آسان نہیں۔ شاعری کا فن ریاضت اور جگر کاری کا خواہاں ہوتا ہے۔ صنعتی شاعری کو عقل و خرد کا طرہ امتیاز قرار دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

نہ محبت بغیر یو گہر ہات آئے　　نہ چھیدے بغیر کان دُر سہائے

کدہی کوئی قیمت سخن کا نہ پائے　　یو یو بے بہا بے بہا ہات آئے

.....

جسے عقل کا بل توی تر اچھے　　سخن میں وہی سب پو سر دا اچھے

.....

اہے گرچہ کسوئی سے سخن　　خرد کا ہے صورت خردمند کن

یہ خیالات صنعتی کے طرز فکر، اس کی تخلیقی صلاحیت اور فن شعور کے مظہر ہیں۔ رفعت تخیل، شیرینی و شگفتگی اور اختصار و دلنشینی کو وہ شاعری کی بنیادی شرائط تصور کرتا ہے۔

صنعتی نے روایات، ماوق الفطرت عناصر اور جذبۂ عقیدت کو قصۂ بے نظیر میں بڑے سلیقے کے ساتھ ہم آمیز کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو ان واقعات کی صداقت پر شبہ نہ ہو اس مثنوی میں تاریخی حقیقت پسندی کا عنصر اس کے کرداروں کے مخصوص خدوخال میں نظر آتا ہے۔ حضرت خضر، حضرت علی، الیاس، حضرت عمر، دجال اور تمیم انصاری کی سیرت عام روایات سے مطابقت رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ قصۂ بے نظیر اپنے گوناگوں محاسن کی وجہ

Marfat.com

سے دکنی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور شاعر کے سُلجھے ہوئے فنی شعور کا ترجمان ہے۔ جب ہم صنعتی کا مقابلہ اس دور کے دوسرے شعراء سے کرتے ہیں تو فنی اہتمام، پختگی، قوت تخیل، نکتہ رسی، شاعرانہ خوبیوں اور فکری عنصر کے اعتبار سے صنعتی ایک قدآور شاعر نظر آتا ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی قصۂ بے نظیر ایک منفرد حیثیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ قصۂ بے نظیر کا طرز ادا بیجاپوری اسلوب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جدید طرز اور اسلوب کی ایک نئی منزل کی طرف پیش رفت کا اظہار ہے۔ صنعتی اپنی زبان اور طرز ادا پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے "سنسکرت کے بول" اس مثنوی میں "کم رکھے" ہیں اور ایک ایسی زبان استعمال کی ہے جو ہر کس و ناکس کے لیے آسان ہو اپنی زبان و پیرایۂ بیان پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

رکھیا سنسکرت کے اس میں بول — ادک بولنے تے رکھیا ہوں ابول
جسے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے — سو دکھنی زباں اس کو آسان ہے
سو اس میں سنسکرت کا مراد — کیا اس نے آسانگی کا سواد
کہتا اس نے دکھنی میں آسان کر — جو ظاہر دِسیں اس میں کئی کئی ہنر

سری رام شرما لکھتے ہیں کہ صنعتی نے قصداً سنسکرت سے دوری اختیار کر کے فارسی کی طرف قدم بڑھایا۔[1] عبدالقادر سروری نے صنعتی کے قصۂ بے نظیر کو مجلس اشاعت کی مخطوطات کی جانب سے ۱۳۵۷ھ میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ قصۂ بے نظیر کے بارے میں محمد حسن قدیم "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں رقمطراز ہیں کہ "یہ مثنوی طلسماتی فضا اور داستانوں کی طرز کی پہلی اردو مثنوی کہی جا سکتی ہے۔ جس کی بنیاد عشقیہ قصے کے بجائے مہمات اور حیرت انگیز واقعات پر ہے اور ان مہمات و مصائب پر ابو تمیم محض قوت ایمانی کے بل بوتے پر فتح حاصل کرتے ہیں گہری مذہبیت کے باوجود اس میں کھلے طور پر واعظانہ پیرایہ اختیار نہیں کیا گیا ہے واقعہ نگاری اور محاکات میں مقیمی نے اعلیٰ فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے[2]"۔ محمد حسن نے مثنوی قصۂ بے نظیر کو مقیمی کی شعری کاوش بتایا ہے حالانکہ اس کا شاعر صنعتی ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے

---

[1] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ صفحہ ۳۳۰

[2] [3] [4] محمد حسن قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ پانچواں باب۔ صفحہ ۱۰۰

Marfat.com

ہیں "فطری مناظر بڑی خوبی سے بیان ہوئے ہیں اور دیو جنات اور پریوں کے منطقوں کا بیان اور ان کی عجیب و غریب شکلوں کو جیتے جاگتے اندازوں میں پیش کیا گیا ہے البتہ کردار نگاری اور جذبات کے لحاظ سے مثنوی کمزور ہے"۔[1] ان اقتباسات سے قبل بھی محمد حسن نے مقیمی ہی کو قصہ بے نظیر کا شاعر تحریر کیا ہے۔[2]

صنعتی کی ایک اور مثنوی گلدستہ ہے جو ایک عشقیہ داستان ہے اس کا ہیرو ایک مصری شہزادہ ہے جو سیاحت کے شوق میں اپنے ملک سے روانہ ہوتا ہے اور مختلف حادثات کا شکار ہو کر مصیبتیں برداشت کرتا ہوا منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ بالآخر کامیاب و کامران اپنے وطن کا رخ کرتا ہے "مثنوی گلدستہ" کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے اور دوسرا اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری حیدر آباد کا مخزونہ ہے۔[3] نجیب اشرف کے یہاں بھی اس مثنوی کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری کا نسخہ مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔ جب سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے نوادرات، قیمتی کتابیں اور مخطوطات وغیرہ عوام کے لیے باہر لائے گئے تو انگریزی عربی اور فارسی کی کئی نادر کتابوں کے علاوہ بہت سے دکنی مخطوطات بھی منظر عام پر آئے ان ہی بیش بہا مخطوطات میں سے ایک قیمتی ادب پارہ صنعتی کی مثنوی گلدستہ بھی ہے۔ جس میں بعض اہم داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ مثنوی گلدستہ کے ان دونوں مخطوطوں کی موجودگی نے اس مثنوی کے باقاعدہ مطالعے میں سہولت پیدا کر دی ہے۔ اورنٹیل مینو سکرپٹ لائبریری حیدر آباد میں اس مثنوی کا جو نسخہ موجود ہے اس پر سیاہی سے "گلدستۂ عشق" اور نٹیل سے "مثنوی ملا صنعتی بزبان دکن" تحریر کیا گیا ہے۔ شمس اللہ قادری نے بھی اس مثنوی کا نام "گلدستہ عشق" لکھا ہے[4] جو درست نہیں۔ خود نے اس مثنوی کا نام اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

---

[1] محمد حسن۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ ص ۱۰۰

[2] " " " " " "

[3] " " " " " "

Marfat.com

تو گلدستہ کر نام اس کا میں رک دیا ہوں بدل یادگاری یو جگ

مثنوی کی ابتدا میں سرخ روشنائی سے بڑی بحریں جو دو اشعار لکھے گئے ہیں ان میں بھی مثنوی کا یہی نام بتایا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

گلدستہ خاص عالم دکا، کر قصے کا میں خوش نانوں رک

تحفہ اپی اپرویت نو جگ میں دھر یا عرفان کا

مثنوی گلدستہ کا شاعر اپنا تخلص صنعتی بتاتا ہے ؎

۱ تو کر صنعتی شاہ کے حق دعا

۲ بچن صنعتی یوں تو کر نا بیاں

۳ ارے صنعتی کر تو ختم کتاب

مثنوی گلدستہ میں صنعتی کی زبان قصہ بے نظیر سے زیادہ سلیس ہے طرز ادا میں بے ساختگی اور اثر آفرینی کے علاوہ انفرادیت بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں خوبصورت تشبیہوں اور برجستہ استعارات نے مثنوی کو پر لطف بنا دیا ہے زبان کے اعتبار سے مثنوی گلدستہ اس زمانے کی دوسری شعری تخلیقات میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے اُس کا سبب بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ میں نے مثنوی کو عام فہم بنانے کے لیے سنسکرت کے الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں۔ قصہ بے نظیر میں بھی "سنسکرت" کے "بول" "کم رکھنے" کا شاعر ذکر کرتا ہے اور فارسی پر دکنی کو اس کے عام فہم ہونے کی وجہ سے ترجیح دیتا ہے۔ قصے کی پیشکشی کا انداز منفرد نہ سہی اس کا اختتام بہر حال روایتی انداز کا حامل نہیں ہے۔ مثنوی گلدستہ کا مقصد محض ایک عشقیہ داستان بیان کرنا نہیں بلکہ قاری کی مذہبی معلومات میں اضافہ بھی کرنا ہے۔ شاعر کا یہ مقصد مثنوی کے آخری حصے میں ظاہر ہوتا ہے صنعتی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی مثنوی خشک اور بے کیف ہو کر رہ جائے اسے اس کا بھی احساس ہے کہ قاری اس قسم کی مقصدیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اس نے ابتدا میں قاری کو قصے کی دلکشیوں میں گم کر دیا ہے۔ جب قاری کی توجہ پوری طرح قصے پر مرکوز ہو جاتی ہے تو وہ اس کا رخ اپنے اصل موضوع کی طرف موڑ دیتا ہے۔ دکن کے اکثر شاعروں اور ادیبوں نے تبلیغ و تلقین کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر مختلف رسالے اور نظمیں لکھی ہیں ان میں زیادہ تعداد ایسی کاوشوں کی ہے جن میں مقصدیت ادبیت پر غالب آگئی ہے اس لئے ان کی ادبی اہمیت کم اور لسانی و تاریخی اہمیت زیادہ ہے "مثنوی گلدستہ" میں قصے کے اختتام تک قاری کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس دلچسپ قصے کی تان اخلاق آموزی اور مذہبی

Marfat.com

تلقین پر ٹوٹے گی۔ مثنوی میں آغاز سے انتہا تک شہزادہ بلعم کے مہمات ہماری توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ شہزادہ مختلف مشکلات سے گزر کر دختر مقصود تک پہنچتا ہے اور آخر کار اس کے سوالوں کا جواب دے کر مقصود سے اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ "گلدستہ" میں شہزادی کے سوالات کی نوعیت قصہ حاتم طائی کی طرح مافوق الفطرت عناصر کی رہین منت ہے۔ حسن بانو کے ہر سوال کے پیچھے ایک عظیم مہم پوشیدہ ہے۔ اس کے برخلاف دختر مقصود کا ہر سوال مذہبی معلومات پر مبنی ہے اس میں شہزادہ بلعم کو صحراؤں کی خاک نہیں چھاننی پڑتی ہے بلکہ علم کے میدان کی جادہ پیمائی کرنی پڑتی ہے۔ تفریح اور افادیت قصہ گوئی اور تعلیم و تبلیغ کا ایسا انوکھا اور موثر امتزاج دکن کی بہت کم مثنویوں میں ملتا ہے۔

"مثنوی گلدستہ" میں "قصہ بے نظیر" کے برخلاف صنعتی نے تاریخ تصنیف کا براہ راست انداز میں ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے محققین غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ مثنوی کے سن تصنیف کے بارے میں صنعتی کہتا ہے ؎

انا را اس کی تاریخ کہوں بیاں — رہو شاد سن کر سب ہی عاقلاں
سنو کان بھر سن اوّل ہجرتی — یو بدّ یا دیا دل لگت

۱۱۵۵

یو بدیا دیا دل لگت سے ۱۱۵۵ اعداد برآمد ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے حضرات کو اشتباہ ہوا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی بھی اس گتھی کو سلجھا نہ سکے تھے چنانچہ انھوں نے "دکن میں اردو" میں "مثنوی گلدستہ" کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اس کا اعتراف کرتے ہیں:

"دوسری مثنوی گلدستہ کی تصنیف کا سنہ واضح نہیں ہے"[1] "تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان" میں اس مثنوی کے متعلق دو سطریں تحریر کرنے کے بعد لکھا گیا ہے: "مثنوی کی تاریخ تصنیف کا شعر درج ذیل ہے جس سے ۱۶۴۵ء / ۱۰۵۵ھ برآمد ہوتے ہیں ؎

سنو کان بھر سن اوّل ہجر گی — یو بہد یا دیا دل لگت"[2]

مندرجہ بالا شعر کے آخری مصرعے سے ۱۰۵۵ نہیں ۱۱۵۷ اعداد حاصل ہوئے ہیں۔ حمید الدین شاہد نے نصیر الدین ہاشمی کے اس بیان پر تکیہ کیا ہے جو انھوں نے "کتب خانہ آصفیہ کے اردو

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۲

[2] حمید الدین شاہد۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ چھٹی جلد نواں باب۔ ص ۲۶۳

Marfat.com

مخطوطات" جلد اوّل میں صنعتی کی "مثنوی گلدستہ" کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ اور" تاریخ تصنیف کا شعر کے زیر عنوان یہی شعر نقل کر کے اس کے دوسرے مصرعے کے نیچے ۱۰۵۵ھ لکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کو اس سلسلے کے دوسرے شعر کا بغور مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے "یو ہدیا دیا دل لگت صنعتی" سے ۱۱۵۵ اعداد حاصل ہوتے ہیں جس سے اکثر اہلِ علم دھوکا کھا گئے ہیں لیکن اب شاعر کا بیان ملاحظہ ہو وہ کہتا ہے ؎

سنو کان بھر سن اوّل ہجرتی　　یو ہدیا دیا دل لگت

سچ دیکھنا ہے ایتا دھر نظر　　عدد حرف پر ہے بیان اس نثر

خود شاعر کہتا ہے کہ سمجھ سے کام لو اور بغور دیکھو تو "عدد" کے حرف سے اس مثنوی کے سنہ تصنیف کی حقیقت واضح ہو گی۔ عدد کے ۸، ۷ اعداد کو ۱۱۵۵ سے نکال دیا جائے تو ۱۰۷۷ برآمد ہوتے ہیں اور تجزیہ سے حاصل کی ہوئی یہی۔ تاریخ مثنوی گلدستہ کا صحیح سن تصنیف ہے جس پر ابھی تک کسی محقق نے غور نہیں کیا تھا۔ شمس اللہ قادری نے "قصہ فغفور چین" اور "گلدستہ عشق" کو ایک ہی مثنوی بتاتے ہوئے صنعتی کو اس مثنوی کا شاعر قرار دیا ہے لیکن وہ بھی اس کا سنِ تصنیف ۱۱۵۹ھ تحریر کرتے ہیں حالاں کہ اگر اس کو صنعتی کی مثنوی تسلیم کیا جائے تو وہ ۱۰۵۹ھ کی تصنیف نہیں ہو سکتی اور اگر تصنیف کو درست تصور کیا جائے تو اس کا شاعر صنعتی نہیں ہو سکتا۔ پہلی مثنوی قصہ بے نظیر (۱۰۵۵ھ) کے وقت اگر شاعر کی عمر ۲۵ سال بھی تصور کر لی جائے تو شاعر کا تقریباً ایک سو تیس سال بعد بقید حیات رہنا اور کبر سنی میں ایسی مثنوی کہنا قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

"علی گڑھ تاریخ ادب اردو" اور ڈاکٹر زور کی تصنیف" دکنی ادب کی تاریخ" میں، مثنوی گلدستہ کا ذکر نہیں ہے۔ غالباً اس سنہ سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کے پیش نظر جمیل جالبی بھی مثنوی گلدستہ کو صنعتی کی تصنیف قرار دیتے ہوئے پس و پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے :-

> "ایک مثنوی بلعم فغفور مصنفہ شیخ داؤد صنعتی مطبوعہ حیدری بمبئی ۱۲۹۱ھ ہماری نظر سے گزری جس کا سنِ تصنیف ۱۱۵۹ھ ہے اور جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ مخدوم حسینی کے نامی خلف نے اسے ایک کتاب لا کر دی اور کہا کہ اسے نظم دکھنی میں کر دو لیکن یہ وہ صنعتی نہیں ہو سکتا۔ جس کا ذکر اوپر آیا ہے"۔ [1]

---

[1] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۷۵

Marfat.com

ظاہر ہے کہ ۱۰۵۵ھ میں قصۂ بے نظیر لکھنے والے شاعر سے ایک سو چار سال بعد دوسری مثنوی لکھنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس ترجیح کی وجہ صرف یہی ہے کہ شاعر کے دوسرے شعر کی جو مثنوی کے سنِ تصنیف کے سلسلے میں کہا گیا ہے غور سے نہیں پڑھا گیا ہے اور شاعر کے مافی الضمیر تک رسائی حاصل نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ سب غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جمیل جالبی اسی کے پیش نظر گلدستہ کو صنعتی کی مثنوی تصور نہیں کرتے حالاں کہ اس مثنوی میں جگہ جگہ صنعتی نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ مثلاً

اتا صنعتی کوں ہے طاقت کہاں　　ترا وصف کہنے فصاحت کہاں
اتا صنعتی کر تو قصہ شروع　　ویسے پیر کے ہل سوں ہو کر رجوع

مثنوی گلدستہ صنعتی کے بیان کے اعتبار سے ذیقعدہ ۱۰۷۷ھ وقت چاشت مکمل ہوئی تھی۔

اتا شہر ذوالقعدہ ستراں تمام　　سٹیا مشتری خوش یہ کام
تب او وقت نیکا اٹھا چاشت کا　　ہوا حرف پورا عرض داشت کا

"قصہ بے نظیر" اور مثنوی گلدستہ" میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ جن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ یہ دونوں مثنویاں ایک ہی شاعر کا نتیجہ فکر ہیں:۔

۱ نظم کے آغاز میں اپنی ذہنی کشمکش کا ذکر۔
۲ ہاتف کی صدا اور رہبری۔
۳ برسنے باب کی ابتدا میں ساقی سے خطاب۔
۴ مثنوی کے آخر میں شاعر کے لیے دعائے خیر کی استدعا اور غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی التجا۔
۵ مثنوی کی تکنیک کے متعلق بعض امور میں اتفاق رائے۔ مثنوی میں غیر ضروری طوالت یا غیر معمولی اختصار سے پرہیز اور طول کے اعتبار سے مثنوی کو مناسب حدوں میں رکھنے کا رجحان۔

چنانچہ صنعتی کہتا ہے:

قصۂ بے نظیر

قلم اب تو اے قصۂ بے نظیر　　شتابی سوں لکھ مختصر دل پذیر
نہ کوتاہ مطول نہ نزدیک و دور　　کہ اوسط کو بولے ہیں خیر الامور

Marfat.com

مثنوی گلدستہ

کیا مختصر اس بدل اے عزیز　　مطول کو دیک خلق کرتا گریز
اوسی واسطے کر کے کوتاہ یہاں　　قلم کو دبا کھینچ نہ جولاں یہاں

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قصہ بے نظیر اور مثنوی گلدستہ دونوں ایک ہی شاعر یعنی صنعتی کی شعری کاوشیں ہیں۔

ملک خوشنود

ملک خوشنود عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ایک قطب شاہی غلام کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر ابھرتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ اس کی پرورش محمد قلی قطب شاہ کے محل میں ہوئی تھی اور ایک ہوشیار نوجوان ہونے کی وجہ سے اسے محمد قلی قطب شاہ کی شہزادی خدیجہ سلطان کے ہمراہ خانگی نوکر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غلطی سے محمد قطب شاہ کے بجائے محمد قلی شاہ تحریر کر دیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر زور نے تذکرہ مخطوطات جلد سوم میں ملک خوشنود کو سلطان محمد قطب شاہ کی دختر خدیجہ سلطان کا ملازم بتایا ہے جو درست ہے۔[2] جب محمد قطب شاہ کی شہزادی خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کا محمد عادل شاہ سے بیاہ ہوا تو گولکنڈے سے بیش قیمت سامان جہیز بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔ جس کو بحفاظت بیجاپور پہنچانے کا کام ملک خوشنود کے سپرد کیا گیا تھا۔ جس زمانے میں سلطانہ شہر بانو نے ہوش سنبھالا تھا وہ گولکنڈے کا عہد زریں تھا۔ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے اپنی ذاتی دلچسپی سے قطب شاہی پایۂ تخت کو علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بنا دیا تھا۔ شہر بانو کی پرورش ایک ایسے شاہی گھرانے میں ہوئی تھی جہاں فنون لطیفہ کی قدردانی اور علم و ادب کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس ماحول سے سلطانہ شہر بانو نے وہ سب کچھ حاصل کیا جس کی ایک باشعور اور فہیم شہزادی سے توقع کی جا سکتی تھی۔ شادی کے بعد جب وہ بیجاپور آئی تو دیکھا کہ اس کے خسر "جگت گرو" نے یہاں علم و دانش کی شمع فروزاں کر دی ہے اور ارباب سخن اور اہل کمال کی قدر و منزلت میں کمی نہیں کی جا رہی ہے۔ خود سلطان محمد عادل شاہ علم و ادب کا پرستار اور دانشوروں اور فنکاروں کا قدردان تھا۔ اس نے ملکہ کے معتمد

---

[1] ڈاکٹر زور۔ نوید و شہباد۔ ص ۴۷

[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ مخطوطات۔ جلد سوم۔ ص ۳۰۲

Marfat.com

خدمت گار کو جب ایک اچھا سخن گو پایا تو اسے "عرضِ ہنر" کا حکم دیا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور میں ایک غلام کی بادشاہوں نے جس طرح قدر افزائی اور پذیرائی کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہان قطبیہ اور عادل شاہی حکمران اس تصور کے حامل تھے کہ ؎

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

ان فرمان رواؤں نے جب ایک معمولی غلام میں شاعرانہ جوہر پائے تو اسے سرفراز و سرخرو کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

عبداللہ قطب شاہ نے اپنی بہن کے اسباب کی حفاظت اور دیکھ بھال کی خاطر اپنے غلام ملک خوشنود کو شہزادی کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا تھا۔ ملک خوشنود نے ایسی اچھی کارکردگی، ذہانت اور ایمانداری کا ثبوت دیا کہ خدیجہ سلطان نے اس کے حسنِ انتظام اور شائستہ خدمات سے خوش ہو کر اس کو ایک اعلیٰ خدمت پر مامور کر دیا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں اور ذکاوت کی وجہ سے ملک خوشنود نے بہت جلد ترقی کے زینے طے کر لیے اور ۱۰۷۵ھ میں جب وزیر اعظم خواص خاں، محمد عادل شاہ سے بغاوت پر آمادہ ہو گیا تو بادشاہ نے اپنے برادر نسبتی عبداللہ قطب شاہ سے مدد طلب کی۔ یہ اہم کام ملک خوشنود کے سپرد کیا گیا اور جب ملک خوشنود گولکنڈہ پہنچا تو عبداللہ قطب شاہ نے اس کا ایسا شاندار استقبال کیا کہ گولکنڈے میں شاید ہی کسی سفیر کا کیا گیا ہو۔ شاہی دربار میں داخل ہونے سے قبل عمائدین سلطنت اس کے استقبال کے لیے شہر سے باہر گئے اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ اسے دربار میں لایا گیا۔[2] ملک خوشنود نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں ایک بلند پایہ قصیدہ بھی سنایا تھا جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے خلعت و تحائف سے سرفراز کیا تھا اور اسے ایک معزز ہندو کے شاندار محل میں ٹھہرایا گیا تھا۔[3] جب ملک خوشنود حیدرآباد سے بیجاپور جانے لگا تو بادشاہ نے غواصی کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔[4] ڈاکٹر زور نے اپنے نیم تاریخی افسانوں کے مجموعے "سیر گولکنڈہ" میں ملک خوشنود کو ان سوز زدہ کمر غلاموں

---

[1] نصیر الدین ہاشمی دکن میں اردو۔ ص ۲۰۵

[2] نظام الدین احمد صاعدی۔ حدیقۃ السلاطین حصہ اوّل۔ بہ تصحیح و تحشی سید علی اصغر بلگرامی۔ ص ۱۳۸

[3] (۱) ڈاکٹر زور۔ سیر گولکنڈہ۔ ص ۴۵۔ ڈاکٹر زور نے اس شخص کا نام نارائن راؤ تحریر کیا ہے لیکن کسی تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی

[4] نظام الدین احمد صاعدی۔ حدیقۃ السلاطین حصہ اوّل۔ بہ تصحیح و تحشی سید علی اصغر بلگرامی۔

Marfat.com

میں سے ایک بتایا ہے جو خدیجہ سلطان کے جہیز میں شامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ملک خوشنود ایک حبشی غلام تھا۔ ڈاکٹر زور ملک خوشنود کو وجہی کا "فیض یافتہ" اور "شاگرد" تحریر کرتے ہیں[1]

ملکِ خوشنود کے حالاتِ زندگی کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں۔ ملک خوشنود کی مثنوی "جنت سنگار" میں مدح صحابہ سے اس کے سنّی عقائد کا اظہار ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ میں "چاریاروں" پر "ایمان" رکھتا ہوں ؎

کہ چاروں یار مل رہے مصطفےٰ سوں
صدق لیا یا ہوں میں بادل صفا سوں
ابوبکر وصدیق یار جانی
عمر تھے یار دوسرے بھوت امانی
شرم دھرتے تھے تیسرے یار عثمان
جو چوتھے یار علی شاہ سبحان
صفت یاروں کی میں کیا کر سکوں گا
ولے ایمان میں ان پر رکھوں گا

ملک خوشنود میر مومن کے بڑا معتقد تھا اور انھیں غوث وقطب، ولی، منجم، مجتہد، شاعر اور افلاطون زماں سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

شرف میں غوث ہے سارے جہاں کا
قطب ساتوں زمیں ہور آسماں کا

.....

منجم مجتہد شاعر سخن میں
کہ ہے ہشیار سارے علم وفن میں
فلاطوں بوعلی کی سیمبار کا
ہنر شاگرد کرے کیمبار کا
پڑیا تھا شور سب ساتوں گگن میں
کہ نادر ہے ولی ملک دکن میں

---

[1] ڈاکٹر زور۔ سیر گولکنڈہ۔ صـ۴۲

Marfat.com

خدا کا لطف سر اوپر تمام ہے
سدا خوشنود جم جیو سوں غلام ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک خوشنود زیارت روضہ حضرت علی سے مشرف ہوا تھا۔ منقبت حضرت علی میں وہ کہتا ہے ؎

گنبد جوں سور ہے حضرت علی کا
مراتب اونچ ہے حضرت علی کا

ممکن ہے کہ قیام گولکنڈا یا بیجاپور کی سکونت کے زمانے میں اس نے حجاز کا سفر اختیار کیا ہو کیوں کہ یہ سلاطین اہلِ بیت کے پرستار تھے۔ ایم۔اے نعیم اپنی کتاب "اکسٹرنل ریلیشن آف بیجاپور کنگ ڈم" میں لکھتے ہیں کہ ۱۶۶۱ء میں شیواجی نے انگریزوں سے خفا ہو کر کہ وہ بیجاپور کی مدد کر رہے ہیں۔ ریونگٹن (Revington) اور دوسرے انگریزوں کو گرفتار کر لیا تھا ان کو آزاد کرانے کے لیے انگریزوں نے بیجاپور کی ملکہ کی مدد چاہی تھی جو مکہ سے بیجاپور آ رہی تھیں[1]۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کے افراد مقامات مقدسہ کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے معتمد عہدیدار اور خدمت گار بھی جاتے ہوں گے۔ "بساتین السلاطین" میں مرزا ابراہیم زبیری لکھتے ہیں کہ ملکہ خدیجہ سلطان کے ہمراہ جو عبداللہ قطب شاہ کی بہن اور عادل شاہ کی ملکہ تھیں ابراہیم خاں اور وزیر سلطنت حج کے لیے روانہ ہو گیا تھا[2]۔ ۱۶۶۱ء سے قبل ملک خوشنود کے زمانہ حیات میں بھی ممکن ہے شاہی خاندان کے کسی فرد کے ہمراہ خوشنود نے بھی مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہو۔

ڈاکٹر زور ادارہ ادبیات اردو کی فہرست مخطوطات میں خوشنود کی مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ گولکنڈے میں لکھی گئی تھی لیکن مثنوی میں "مدح سلطان محمد عادل شاہ کی سرخی سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ خوشنود والیٔ بیجاپور کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

تو سلطان محمد شاہ غازی — جہاں کو شاہ سوں ہے سرفرازی
سخی عادل بہادر نوجواں ہے — قوی طالع لکھن ترکماں ہے
کہو ثانیٔ سکندر پاک جم ہے — جبیں شاہاں کی جس کے ڈر سو نم ہے

Marfat.com

دیکھت شمشیر ہور سن شہہ کے ہانکاں　　پہاڑاں پھوٹ کر ہوتے ہیں پھانکاں
کھڑک جب ہات پکڑے شاہ گیانی　　ڈروں بجلی گگن میں ہوئے پانی

ملک خوشنود کہتا ہے کہ مثنوی جنت سنگار میں نے بادشاہ کی فرمائش پر لکھی ہے ایک دن سلطان عادل نے مجھ سے کہا کہ تیرا قلم موشگافی کرتا ہے اور تمام ملک میں تیری شاعری کا چرچا ہے تیری "طبع" رتن کا کھان" ہے ؎

کہیا یک روز منج شاہ جہانگیر　　جوان کی ..... کا پاک اکیر
امولک تج دھریا ہے صاف صافی　　قلم ہے تیر کرتا موشگافی
نہر تازہ جو کرتا جیو کوں تازہ　　سنیا سب ملک میں یو گرم آوازہ
رتن کا کھان ہے کر طبع تیرا　　ہوس کرتا ہے نادر جیو میرا
کتاب اس کا عجب کر از نگاری　　اچھے دو جگ میں نادر یادگاری[1]

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیجاپور میں ان دنوں ملک خوشنود کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی ورنہ

(۱) سنیا سب ملک میں یو گرم آوازہ
(۲) قلم ہے تیر کرنا موشگافی

جیسے محاکمات محمد عادل شاہ کی زبان سے نہ نکلتے۔ خود ملک خوشنود مثنوی میں اپنے کمال فن کے بارے میں کہتا ہے ؎

خزانے راز کے کھولیا بچن سوں　　کیا عنبر فشانی لاکھ فن سوں
قلم روشن کیا گن کے چراغاں　　عطارد کی دیا سینہ چو داغاں
پرت اصلی میں سوں شکر لیا ہوں　　امولک چاشنی سب کوں دیا ہوں
ہر یک میٹھا بچن تازہ سو بولیا　　بساط اوپر نوا شطرنج کھولیا
کہوں نابات ساہر اک کہانی　　اچھے ہم عاشقاں میں خوش بیانی
جسے بے عقل جگ میں ارجمندی　　وہی منج شعر کا بوجھے بلندی[2]

---

[1] فہمیدہ بیگم۔ ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقاء (مقالہ) صفحہ ۱۵۴
[2] صفحہ ۱۵۵

Marfat.com

"حدیقۃ السلاطین" کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ملک خوشنود قصیدہ نگار بھی تھا لیکن اس کا دیوان تا حال دستیاب نہیں ہوا ہے۔ خوشنود کی ایک مثنوی "جنت سنگار" ہم تک پہنچ سکی ہے۔ جنت سنگار کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے اور اس کے شاعر کا نام کیٹلاگ میں غلط لکھا گیا ہے۔ اس مثنوی کے دو نسخے انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہیں۔ اس مثنوی میں امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا چربہ اتارا گیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی امیر خسرو کی مثنوی کا ترجمہ ہے[1]۔ مثنوی کی تاریخ تصنیف کی خود شاعر نے ایک شعر میں اس طرح وضاحت کر دی ہے ؎

ملک خوشنود موتی صاف رولیا
ایس کے نانوں کی تاریخ بولیا[2]۔

نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ "ملک خوشنود" سے ۱۰۵۶ھ مطابق ۱۶۴۶ء مثنوی کی تاریخ تصنیف قرار پاتی ہے۔ اس شعر میں انھوں نے شاعر کا تخلص "ملک خوشنود" تحریر کر کے اس سے جو اعداد نکالے ہیں وہ ۱۰۵۶ھ ہیں لیکن جمیل جالبی ملک خوشنود کے بجائے "ملک خشنود" بتاتے ہوئے اس سے ۱۰۵۰ھ اعداد برآمد ہوئے یعنی اس میں "و" کے چھ عدد گھٹ گئے ہیں کیوں کہ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کے کتب خانہ میں "جنت سنگار" کے جو نسخے موجود ہیں ان میں شاعر کا نام اور تخلص ملک خوشنود تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر اس مثنوی کا نام "ہشت بہشت" بتلاتے ہیں لیکن ملک خوشنود کے نام خشنود سے تاریخ ۱۰۵۰ھ برآمد کی ہے[3]۔ لیکن شعر نقل کرتے ہوئے وہ خشنود کو خوشنود لکھ گئے ہیں۔

اس مثنوی میں بہرام گور کی داستان بیان کی گئی ہے پہلے حمد اور پھر نعت کے بعد معراج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے مدح چار چار اور اس کے بعد مدح میر مومن اور پھر بادشاہ کی مدح میں شعر کہے ہیں۔ ابتدائی حصے میں صرف بادشاہ کی مدح اور خاتمے کے چند اشعار کو چھوڑ کر جنت سنگار امیر خسرو کی مثنوی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں "اس مثنوی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خوشنود نے ایک دوسری مثنوی "یوسف زلیخا" بھی نظم کی تھی۔

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو باب۔ ص ۲۸۳

[2] [3] ڈاکٹر محمد باقر۔ اردو سے قدیم دکن اور پنجاب میں۔ ص ۳۳

Marfat.com

مگر اب تک اس کا کوئی مخطوطہ دستیاب نہیں ہوا ہے[1] ڈاکٹر زور بھی "دکنی ادب کی تاریخ" میں رقمطراز ہیں کہ خوشنود نے امیر خسرو کی مثنویوں کا ترجمہ کیا تھا جن میں "یوسف زلیخا"، "بازار حسن" اور "ہشت بہشت" بہت مشہور ہوئی۔[2] اردو مثنوی کا ارتقا میں عبدالقادر سروری نے ملک خوشنود کی دو مثنویوں یوسف زلیخا اور ہشت بہشت کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر زور اور جمیل جالبی نے خوشنود کی شعری کاوشوں میں مثنوی "یوسف زلیخا" کو شامل کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ "ہشت بہشت" میں شاعر نے اس کا ذکر کیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی ملک خوشنود کی "ہشت بہشت" کو "یوسف زلیخا" تحریر کرتے ہیں[3] جو کہ درست نہیں کیوں کہ "یوسف زلیخا" اور "ہشت بہشت" کے قصوں میں کوئی مماثلت نہیں" دی مغل ایمپائر" کے مورخ جے۔ این۔ چودھری نے بھی ملک خوشنود کو "یوسف زلیخا" کا شاعر تحریر کیا ہے[4]۔ سری رام شرما نے بھی یوسف زلیخا کو ملک خوشنود کی مثنوی تحریر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ اب یہ ناپید ہو گئی ہے[5]۔ اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں ڈاکٹر محمد باقر رقمطراز ہیں:۔

"راقم نے برٹش میوزیم کے ہشت بہشت کے مخطوطے کو غور سے دیکھا ہے لیکن یوسف زلیخا کا کوئی ذکر نہیں ملا"[6] اما پنڈت راہل سانکر تیاین میں لکھتے ہیں کہ اس نے ہشت بہشت سے پہلے یوسف زلیخا لکھی تھی جو صحیح نہیں[7]۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ "جنت سنگار" محمد عادل شاہ والیِ بیجاپور کے حکم پر لکھی گئی تھی[8] شاعر کہتا ہے کہ امیر خسرو کی "ہشت بہشت" کا دکن میں ترجمہ کرنے کے لیے بادشاہ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی سو گئے جب حکم عادل شاہ منجکوں کہ جینا خسروی کا ماہ منجکوں

---

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو باب۔ ص ۲۸۴

[2] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۴۲

[3] نصیرالدین ہاشمی۔ شاہان دکن کی اردو شاعری (مضمون)، نولے ادب اکتوبر ۱۹۶۴ء ص ۶۲

[4] جے این چودھری۔ دی مغل ایمپائر۔ باب چودھوان۔ ص ۶۲۹

[5] سری رام شرما دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۲۴۴

[6] محمد باقر۔ اردوے قدیم دکن اور پنجاب میں۔ ص ۳۲

[7] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۴۲۔ [8] عبدالقادر سروری اردو مثنوی کا ارتقا ص ۶۵، ۶۶ دوسرا ایڈیشن

[9] پنڈت راہل سانکر تیاین۔ دکنی ہندی کا دبہ دھارا۔ ص ۲۳۹

Marfat.com

افسر صدیقی امروہوی نے خوشنود کی دو مثنویوں "سندر سنگار" اور "ہشت بہشت" کی نشاندہی کی ہے اور "ہشت بہشت" کا سن تصنیف ۱۰۵۶ھ بتایا ہے۔ اور "سندر سنگار" کا سنہ درج نہیں ہے[1] افسر امروہوی کا یہ بیان غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی "ہشت بہشت" کا جو ترجمہ خوشنود نے کیا تھا اس کا نام "جنت سنگار" ہے "سندر سنگار" نامی خوشنود کی کوئی مثنوی تا حال دریافت نہیں ہوئی ہے۔ جمیل جالبی نے اس مثنوی کا نام "جنت سنگار" بتایا ہے[2]۔ امیر خسرو کی مثنوی کا نام چونکہ "ہشت بہشت" ہے غالباً اسی لئے ڈاکٹر زور اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ نے اس مثنوی کا نام "ہشت بہشت" ہی تحریر کیا ہے لیکن مثنوی کے نام کے بارے میں خود شاعر کا بیان سب سے زیادہ مستند ہے۔ ملک خوشنود کہتا ہے ؎

کہانی آٹ بولیا ہوں سخن در — کہ جیوں ہے آٹ جنت آٹ کوثر
بہشت تیوں ہر یکیں کا اک نام ہے — ملک ہور حور کوثر سب تمام ہے
امو ملک بے بدل چوں زر نگار ہے — جم اس کا ناؤں سوں جنت سنگار ہے

اور جگہ مثنوی کے نام کے بارے میں شاعر کہتا ہے ؎

اگر عارف ہوس اس پر کرے گا — نظر جنت سنگار اوپر کرے گا

مثنوی جنت سنگار تین ہزار دو سو پچیس (۳۲۲۵) اشعار پر مشتمل ہے۔ خود شاعر کہتا ہے ؎

کہتا ہوں بہت کا نادر شمار یو — جو ہے دو سو پچیس ہوا تین ہزار یو

ڈاکٹر زور مثنوی "ہشت بہشت" کے اشعار میں تعداد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہشت بہشت" کا جو نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اس میں صرف ایک ہزار شعر ہی تحریر کئے ہوئے ملتے ہیں[3]۔ تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند" میں حمید الدین شاہد اس مثنوی کے اشعار کی تعداد کے بارے میں جو برٹش میوزیم کا مخزونہ ہے تحریر کرتے ہیں کہ اس میں دو ہزار سے بھی کم اشعار ہیں[4]۔ ڈاکٹر محمد باقر رقمطراز ہیں "راقم نے برٹش میوزیم کے مخطوطے کے اشعار کو شمار کیا ہے اور دیکھا ہے کہ

---

[1] افسر صدیقی امروہوی۔ بیاض مراثی۔ ص ۳۲
[2] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل۔ ص ۲۳۴
[3] ڈاکٹر زور (۱) اردو شہ پارے ص ۴۹ (ب) تذکرہ مخطوطات۔ جلد سوم ص ۳۰۳
[4] حمید الدین شاہد۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ص ۴۶۴

Marfat.com

ملک خوشنود کا بیان درست ہے۔"[1]

بقول ڈاکٹر زور اس مثنوی میں ملک خوشنود کا طرز ادا "نرالا" اور "پیچیدہ" ہے[2] "جنت سنگار" میں ملک خوشنود نے قصہ در قصہ کی ٹکنیک استعمال کی ہے اس منظوم داستان کا مرکزی کردار بہرام گور ہے جس کے گرد کئی اور کہانیوں کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ شاہ بہرام سات مختلف ممالک سے سات حسین و جمیل دوشیزاؤں کو بلوا کر سات مختلف محلوں یعنی محل گلناری، محل بنفشی، محل صندل، محل کافوری محل سبز اور محل مشکیں وغیرہ میں ان کے قیام کا انتظام کرواتا ہے اور ہر محل میں ایک رات بسر کرتا ہے۔ ہر معشوقہ بادشاہ کو ایک نئی اور دلچسپ داستان سناتی ہے سات دن کے بعد یہ داستان سرائی کی محفل اختتام کو پہنچتی ہے اور بہرام گور شکار پر جا کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔"

خوشنود کہتا ہے کہ جنت سنگار" میں آٹھ کہانیاں نظم کی گئی ہیں۔

کہانی آٹ بولیا ہوں سخن در — کہ جیوں ہے آٹ جنت آٹ کوثر

داستان ادب حیدر آباد" میں ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ بیجاپور کے انعامی مقابلے میں "گلزار جنت" (یعنی جنت سنگار) کو پہلا انعام ملا تھا۔[3] لیکن ڈاکٹر زور نے یہ اطلاع بغیر کسی تاریخی حوالے کے دی ہے اور اپنا ماخذ بتانے سے قاصر رہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک خوشنود میں مثنوی نگاری سے زیادہ قصیدہ نگاری کی صلاحیتیں موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ مدح محمد عادل شاہ یا حمد نعت اور منقبت میں جو زور بیان اور طرز ادا کی اثر آفرینی کا احساس ہوتا ہے وہ "جنت سنگار" میں قصہ گوئی کے دوران دکھائی نہیں دیتا۔ جمیل جالبی۔ امیر خسرو سے خوشنود کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ہشت بہشت کے انداز بیان، اختصار پسندی، واقعہ نگاری و تسلسل و ربط روانی اور فنی توازن کا وزن اٹھانا ملک خوشنود کی شاعرانہ صلاحیت سے باہر تھا۔[4] مثنوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن سے خوشنود کے طرز ادا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے نہ معلوم کیوں خوشنود

---

[1] محمد باقر۔ اردو ے قدیم، دکن اور پنجاب میں۔ ص ۳۳

[2] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۴۹

[3] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدر آباد۔ ص ۳۱

[4] جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ص ۲۵۵

Marfat.com

کے طرز ادا کو "نرالا" اور "پیچیدہ" کہا ہے خوشنود کی زبان اور اسکا انداز ترسیل وہی ہے جو اس عہد کے دوسرے دکنی شاعروں کی مثنویوں میں اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے یہ

اوّل کے دور میں یک بادشاہ تھا　　اتھا مہشور اوجوں سورما تھا
اتھا عاقل چترپرویت گیانی　　نہ دنیاں میں اس کا کوئی ثانی
گن اک جس سے دسے دانشوری کا　　اسے منصب دلاوے سروری کا
عجب خوبی کا دل میں رنگ رس تھا　　بزرگاں سات ملنے کا ہوس تھا
اتھے اس شاہ کے سب تین فرزند　　یکس تے ایک عاقل ہور خردمند
تو نگر علم تھے ہور مال دھن میں　　نہ تھے عاجز ہر یک محنت کے فن میں

ملک خوشنود کہتا ہے میں نے محمد عادل شاہ کے اس حکم کی تعمیل میں کہ "ہنر نادر" دکھا "جیو کو تازہ" کر میں نے یہ مثنوی لکھی ہے اپنی مثنوی کو سراہتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ خدا نے مجھے بہت زیادہ عقل عطا کی ہے، یا میرا قلم "عنبر فشانی" کرتا ہے، زندگی ناپائیدار ہے۔ "بقا" کی "بنیاد" کمزور ہے اس لیے میں نے یہ مضبوط عمارت (مثنوی) تعمیر کردی ہے۔

خزینا کر رکھیا ہوں دھیان میں سب
کہ جیو موتی ہے جیو کی کان میں سب
لگے موتی ابلنے شوق کی تو
دیے اکثر جواہر ذوق کی تو
خدا جج فام تو اک دیا ہے
قلم تو عنبر افشانی کیا ہے
بقا کا مست دیک بنیاد کمزور
بندیا میں یو عمارت بہوت در روز[1]

ملک خوشنود کی "جنت سنگار" ادارۂ ادبیات اردو کے ایک مخطوطے میں نامکمل تحریر کی ہوئی ملتی ہے جسے ڈاکٹر زور نے غلط فہمی کی بنا پر "بازار حسن" سے موسوم کیا ہے اور ۱۰۳۵ھ سے قبل کی مثنوی بتلاتے ہیں[2]۔ سری رام شرما نے ملک خوشنود کی تین شعری تخلیقات کا ذکر کیا ہے جو

[1] نصیرالدین ہاشمی۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ ص ۲۲۶
[2] ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات جلد سوم ص ۳۰۲

Marfat.com

یوسف زلیخا۔ ہشت بہشت اور بازار حسن ہیں۔ ڈاکٹر زور کے بیان نے سری رام شرما کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے[1] یہ مثنوی ایک شاعر مبتدی نے کلیات ولی کے حاشیے پر نقل کی ہے ڈاکٹر زور نے ملک خوشنود کی "جنت سنگار" کا نام "بازار حسن" لکھا ہے۔ اس تسامح کی وجہ جنت سنگار کے ناقص مخطوطہ مخزونہ برٹش میوزیم کا یہ شعر ہے جس سے انھیں غلط فہمی پیدا ہوئی ہے انھوں نے اسے "جنت سنگار" سے علیحدہ کوئی دوسری مثنوی تصور کر لیا ہے ؎

عجب ایک ٹھار میں گلزار دیکھیا
.. جوں حسن کا بازار دیکھیا

محمد حسن نے بھی اس سے غلط فہمی کی بنا پر ملک خوشنود کی دو مثنویوں یعنی ہشت بہشت اور بازار حسن کا ذکر کیا ہے[2]۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ملک خوشنود نے متعدد قصیدے اور غزلیں لکھیں جواب ناپید ہیں[3]۔ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کی ایک بیاض میں ملک خوشنود کی غزلیں موجود ہیں خوشنود بحیثیت غزل گو ایک قادر الکلام شاعر معلوم ہوتا ہے اس کے اشعار میں رنگینی گھلاوٹ روانی اور پختگی کی کمی نہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اچپل چتر سکی کوں ہمارا سلام ہے — جس کے ادھر میں شہد سے میٹھا کلام ہے
جیوں جیوں چکور ہوتے دیکھت چندر مکھی — منج تن میں اشتیاق جو تر مدام ہے
تجہ باج کیوں جیوں کہ جگت دیک مجہ کہیں — پیو باج جن جیسا اسے جینا حرام ہے
پل پل کوں دل منے میرے نس دن سوتوں بسے — جوں برہمن کے من میں سدا رام رام ہے
گھر پیارنوں رکھے تو خوشنود سات محل — قربان تجہ پہ میں یہ میرا چھیٹو نمام ہے

ملک خوشنود کا ایک مرثیہ کتب خانہ سالار جنگ کی ایک بیاض میں درج کیا ہوا ملتا ہے اس کا میر سعادت علی نے "عادل شاہی مرثیے" میں اور افسر امروہوی نے اپنی کتاب "بیاض مراثی"

---

[1] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۹۸
[2] ڈاکٹر زور۔ دکنی ادب کی تاریخ۔ ص ۴۲
[3] مخطوطہ نمبر ۲۴۵۔
[4] محمد حسن۔ قدیم اردو ادب کی تنقیدی۔ تاریخ۔ پانچواں باب۔ ص ۱۰۱

Marfat.com

ہیں شائع کر دیا ہے۔ جس کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

ماتم محرم کا انبر پھر جگ منے آیا عجب　　دھرتی گگن پاتال میں پھر آگ سلگایا عجب
توبیا قلم ترخی زباں کیوں کر لکھوں غم کا بیاں　　خم ہو رہے سات آسماں غم کا بدل چھایا عجب

ملک خوشنود نے بھی دکن کے دوسرے مرثیہ نگاروں کی طرح مظاہر قدرت کو غم حسین میں گریہ کناں اور سوگوار بنایا ہے وہ کہتا ہے ؎

جل جا سورج کالا ہوا چیج کر جالا ہوا　　گل گل چندر گالا ہوا مکھ پر کلنگ لایا عجب

.....

سارے محب زادی کرو سمدور تنا سوں بھرو　　باطن سنیاسی ہو پھرو ماتم خبر لیا عجب

آخر میں کہتا ہے ؎

شہ کا بندا خشنود ہے دیکھت چرن مقصود ہے
شاہد مرا معبود ہے جن جگ میں پنجایا عجب[1]

ادارہ ادبیات اردو کی ایک قدیم بیاض میں[2]۔ مرزا، شاہی، شاہ راجو اور روحی کے مراثی کے ساتھ خوشنود کا حزنیہ کلام بھی تحریر کیا گیا ہے اس مرثیے کے چند شعر یہ ہیں جن سے شاعر کی مودت اہل بیت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

جم درد کی اگن سوں جلتا ہے دل نبی کا　　ماتم حسین کا جم تس پر کرم ہوا ہے

ادارۂ ادبیات اردو کی ایک اور بیاض[3] میں عبداللہ قطب شاہ اور وجہی وغیرہ کے مرثیوں کے ساتھ ملک خوشنود کا مرثیہ بھی تحریر کیا گیا ہے جو چودہ اشعار پر مشتمل ہے ملک خوشنود نے مرثیے کی مقررہ ہیئت کو برتنے میں جدت سے کام لیا ہے یعنی دونوں مصرعوں کے درمیان "آہ" زائد کر دیا گیا ہے۔ اور ہر مصرعے کے آخر میں "اللہ" بڑھا دیا گیا ہے جس کا مقصد لحن سے مرثیہ خوانی کے دوران ماتمی لے کو تیز کرنا اور اثر آفرینی میں اضافہ کرنا ہے ؎

آہے فلک کیا کیا　آہ　آہے فلک کیا کیا　اللہ اللہ
فاطمہ کو غم دیا　آہ　آہے فلک کیا کیا　اللہ اللہ

---

[1] میر سعادت علی رضوی۔ عادل شاہ شاہی مرثیے۔ ص ۱۳۰

[2] بیاض نمبر ۲۲۰۔

[3] بیاض نمبر ۸۲۹

Marfat.com

یاامام یاامام لک لگ ہیں تجہ پر سلام اللہ
خوشنود ہے تیرا غلام آہ اپنے فلک کیا کیا اللہ [1]

اس مرثیہ کے علاوہ کتب خانہ سالار جنگ کی ایک بیاض میں بھی خوشنود کا ایک مرثیہ محفوظ رہ گیا ہے [2]

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ڈاکٹر زور نے خوشنود کے قصائد کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اب ناپید ہیں [3] مثنوی "جنت سنگار" میں خوشنود نے محمد عادل شاہ والیِ بیجاپور کی جو مدح کی ہے وہ موضوع کے اعتبار سے قصیدے کی تعریف میں آتی ہے لیکن اس کی علیٰحدہ حیثیت نہیں ہے بلکہ مثنوی کے درمیان یہ مدحیہ اشعار کہے گئے ہیں ؎

توں سلطان محمد شاہ غازی جہاں کوں شاہ سوں ہے سرفرازی
سخی عادل بہادر نوجواں ہے قوی طالع سلکھن ترکماں ہے
نبی کے لطف کا دل ہے خزینا انگوٹی نو فلک چندر نگینا [4]

ڈاکٹر جمیل جالبی ہجو کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ ہجو کہیں تو غزل کے کسی شعر میں ملتی ہے اور کہیں باقاعدہ موضوع کی شکل میں مثلاً ملک خوشنود نے ہارون نامی گھوڑے کی ہجو لکھی ہے جو ایک قدیم بیاض میں ہماری نظر سے گزری ہے [5]

اس ہجو کے چند شعر یہ ہیں ؎

ہاردن گھوڑا او لکھن کھیکال ہے یک بار کا
اس کی پری خصلت سنی سینا پھوئیا سے سار کا
رنگ میں حرامی بور ہے موں کا بڑا سر زور ہے
ڈمچی چھپانا چور ہے دل جوں بجر مردار کا

---

[1] مخطوط نمبر ۔۸۲۹ ۔ ورق ۱۳ ۔ ب ۔ ادارہ ادبیات اردو
[2] مخطوط نمبر ۔۷۱۸ ۔ کتب خانہ سالار جنگ
[3] نصیر الدین ہاشمی ۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔ ص ۲۲۶
[4] جمیل جالبی ۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ۔ ص

Marfat.com

مارے اگر چابک کبل دمچی کوں رکھنا ہے چکل
کھینچے تو نہیں آتی نکل ہے وقت استغفار کا

خوشنود تو گمبیر ہے تیرا نا کچھ تقصیر ہے
کھوٹے سوں کیا تدبیر ہے مس ہے گنہ اس سار کا

ڈاکٹر زور نے "مثنوی" نورنامہ" کے بارے میں یہ شک ظاہر کیا ہے کہ یہ نظم ملک خوشنود کی ہوگی۔[۲] انھیں اس نظم کے دو اشعار میں لفظ خوش کے استعمال نے شبہ میں مبتلا کر دیا ہے شعر یہ ہے ؎

سنوں کان دھر تم رہ کر با ادب — کہو نور کا خوش بیا بو عجب
نہ دھرنا ہے وہ خوش قرابت شریک — گزشتہ برابر ہے اس کے نزیک

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ پہلے شعر میں "خوش بیان" بطور ترکیب استعمال ہوا ہے جس سے مراد اچھا بیان ہے۔ دوسرے شعر کے لفظ "خوش قرابت" کے متعلق راقمۃ الحروف کا خیال ہے کہ یہ لفظ خوش نہیں "خویش" ہے اور خویش قرابت کے الفاظ شعر کو بامعنی بنا دیتے ہیں۔ جو اس "نورنامہ" میں ذات احدیت کے لیے "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" اور "وحدہ لاشریک" کی صفات کے اظہار کے لئے انھیں برتا گیا ہے۔ "نورنامہ" ملک خوشنود کی شعری کاوش نہیں بلکہ سید بلاقی کی یادگار ہے۔ بلاقی نے اس نورنامہ کے سنِ تصنیف کی وضاحت کر دی ہے جو ۱۰۴۲ھ ہے شاعر نے اس مثنوی میں متعدد مرتبہ اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ مثلاً

سو سید بلاقی نبی کا غلام — تقاضا یوں کہا لطف سوں تمام
ختم کر بلاقی بگو والسلام — کیا نورنامہ سو تمت تمام

ڈاکٹر زور کا اس "نورنامہ" کو خوشنود سے منسوب کرنا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ میر نے خوشنود کا یہ شعر جو انھیں دستیاب ہوا تھا۔ "نکات الشعراء" میں نقل کیا ہے ؎

سب رین جاگی سمر پر تو بھی سجن آیا نہیں
چپ چپ کے دیکھی باٹ میں درشن کو دکھایا نہیں ؎

۱؎ ڈاکٹر زور اور شہ پارے ص ۴۸
۲؎ ڈاکٹر زور۔ تذکرہ مخطوطات۔ جلد سوم۔ ص ۱۴۰
۳؎ میر تقی میر۔ نکات الشعراء (مرتب عبدالحق) ص ۱۲

Marfat.com

شفیق نے "چمنستان شعراء" میں خوشنود کا یہی شعر نقل کیا ہے[۳]

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ خوشنود نے ریختی میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس کا سرمایۂ کلام ہم تک پہنچ نہیں سکا۔ مختصر یہ کہ ملک خوشنود ایک قادر کلام شاعر ہے اور اس نے مثنوی، ریختی، غزل مرثیہ، ہجو اور قصیدے کی اصناف میں فکر سخن کر کے اپنے عہد کی زبان اور اس کے ادب کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ ملک خوشنود غلام ہونے کے باوجود ایک ذی علم انسان اور خوش گو شاعر تھا۔ مہاپنڈت راہول سانکرتیاین "دکنی ہندی کا دیہ" میں لکھتے ہیں کہ خوشنود کوئی معمولی غلام" نہیں تھا۔ زمانہ گزشتہ کے بادشاہ غریب بچوں کی پرورش کرتے ان کی اچھی تعلیم و تربیت سے دلچسپی لیتے تاکہ وہ وقت ضرورت سلطنت کے کاروبار سنبھال سکیں۔ ان سے بادشاہوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ ان کا شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور مستقبل میں وہ حکومت کے دعویدار نہیں بن سکتے تھے[۴]

کمال خاں رستمی

کمال خاں رستمی، اسمٰعیل خاں کا فرزند تھا[۵]۔ چاند حسین شیخ "خاور نامہ" کے دیباچے میں رستمی نام کا نام کمال الدین خاں بتاتے ہیں[۶]۔ اس کے آباو اجداد سات پشت سے عادل شاہی حکمرانوں کی ملازمت سے منسلک تھے[۷] اور ان کا پیشہ خطاطی تھا محمد عادل شاہ نے رستمی کو "خطاط خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ ڈاکٹر زور "اردو شہ پارے" میں رستمی کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"اس کے آباو اجداد چھ پشت سے بحیثیت خوشنویس کے یہاں ملازم تھے اسی لئے ان کو خطاط خاں کا خطاب دیا گیا تھا"[۸]

"نصیر الدین ہاشمی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ رستمی کے آباو اجداد عادل شاہی دربار کے خطاط اور خوشنویس تھے اس لئے انھیں "خطاط خاں" کا خطاب دیا جاتا تھا جو رستمی کو

---

[۱] لچھمی نرائن شفیق۔ چمنستان شعراء۔ ص ۵۵۰

[۲] مہاپنڈت راہل سانکرتیاین۔ دکنی ہندی کا دیہ دھارا۔ ص ۲۳۹

[۳] محمد صادق۔ اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ ص ۴۶

[۴] چاند حسین شیخ۔ دیباچہ خاور نامہ ص ۷

[۵] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۱۰

Marfat.com

بھی ورثے میں ملا تھا۔[1] اردو شہ پارے"۔ میں ڈاکٹر زور نے بلوم ہارٹ[2] کی طرح "خطاط خاں" کو رستمی کے والد اسماعیل خاں کا "نام" بتایا ہے جو درست نہیں۔ خطاط خاں" آبائی خطاب تھا جس سے بادشاہ نے رستمی کی بھی عزت افزائی کی تھی۔ رستمی کے بیان کے مطابق اس کے والد اسماعیل خاں، عادل شاہی دربار کے "دبیر" تھے جس سے ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسماعیل خان نے اپنے بیٹے کمال خان کو بھی علوم متداولہ کی بطور خاص تعلیم دی ہو کیوں کہ یہ شاہی خطاطوں اور خوش نویسوں کا خاندان تھا اور اسماعیل خان کو اپنے بیٹے کے مستقبل کا اندازہ تھا کہ وہ بھی شاہی دربار سے وابستہ ہوگا۔

رستمی سلطان محمد عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا وہ اپنے عہد کا باکمال شاعر اور نامور نثر نگار تھا۔ لیکن اب اس کی نثر کے نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔ وہ دکنی کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ بلوم ہارٹ نے رستمی کے "دکنی قصائد" اور غزلوں کا ذکر کیا ہے[3]۔ گارساں دتاسی نے کمال خان رستمی کا تخلص "رستمی" بتایا ہے[4]۔ جس کی مثنوی کے کئی اشعار سے تردید ہوتی ہے۔ شاعر کے صحیح نام اور تخلص کا مثنوی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے۔ "رستمی کہتا ہے

کیا ترجمہ دکن ہور دل پذیر — بولیا معجزہ یو کمال خاں دبیر
کیا رستمی اس وقت یو کتاب — بندیا بات کی گوہراں بے حساب

مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ رستمی اپنے عہد میں "کمال خاں دبیر" مشہور تھا چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

خلق کہتی ہے مجھ کمال خاں دبیر — تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو جو گولکنڈہ کے چھٹے حکمراں محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھیں۔ بڑی علم پرور اور ادب دوست ملکہ تھیں۔ بلوم ہارٹ نے خدیجہ سلطان کو محمد امین قطب شاہ ابن ابراہیم قطب شاہ کی دختر تحریر کیا ہے جو غلط ہے[5] بلوم ہارٹ کی طرح

---

[1] نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۲۱۰

[2] حمید الدین شاہد۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ نواں باب ص ۴۲۷

[3] جیمس فولر بلوم ہارٹ۔ کیٹلاگ آف دی ہندوستانی مینوسکرپٹس ان دی لائبریری آف دی انڈیا آفس ص ۱۶

[4] بحوالہ نصیر الدین ہاشمی۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ص ۲۳۲

[5] گارساں دتاسی۔ خطبات گارساں دتاسی پانچواں خطبہ ص ۱۳۶

Marfat.com

شمس اللہ قادری نے بھی خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کو ابراہیم قطب شاہ کی دختر بتاتے ہوئے تحریر کیا ہے:-

یہ بیگم امیر محمد امین ابن سلطان ابراہیم قطب شاہ کی دختر تھیں ۱۰۴۲ھ میں بہ عہد عبداللہ قطب شاہ ابوالمنصور سلطان محمد عادل شاہ کے ساتھ اس کا عقد ہوا تھا۔[۴] اس کتاب میں خود شمس اللہ قادری نے دوسرے مصنفین و مورخین کی طرح ابراہیم کا زمانہ ۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ بتایا ہے جو بالکل درست ہے اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۹۸۸ھ میں بھی خدیجہ سلطان کی ولادت ہوئی تھی تو شادی کے وقت ان کی عمر چون سال قرار پائی ہے قدیم زمانے میں جب صغر سنی کی شادیوں کا رواج عام تھا ایک شہزادی کا چون سال کی عمر میں بیاہا جانا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو نے اعلان کر دیا تھا کہ بیجاپور کے شعراء میں سے جو بھی ابن حسام کے خاورنامہ (فارسی) کا کامیاب منظوم ترجمہ پیش کرے گا اسے عزت و تکریم اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا جائے گا[۵]

رستمی کو ملکہ خدیجہ سلطان کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل تھا۔[۶] ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم جو بڑے صاحب کے نام سے موسوم تھیں بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں وہ اپنی فراست اور تدبر کی وجہ سے ریاست کے کاروبار میں دخیل رہیں۔ اس شہزادی کی گولکنڈے کی ادبی فضا میں نشوونما ہوئی تھی۔ شادی کے بعد سلطان محمد عادل شاہ کی رفیقۂ حیات بن کر بیجاپور پہنچیں تو دیکھا کہ یہاں امن و امان کا دور دورہ ہے۔ فنون لطیفہ اور شعر و ادب کی اس زمانے میں سرپرستی و قدردانی ہوتی تھی خدیجہ سلطان نے ایک ادب دوست ملکہ ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل نہیں کی بلکہ اپنی ذہانت و معاملہ فہمی کی وجہ سے بیجاپور کی سیاست میں اہم مقام حاصل کر لیا۔ جب ان کا فرزند علی عادل شاہ تخت نشین ہوا تو وہ سیاسی اور ادبی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر حج و زیارت کے لئے مقامات مقدسہ روانہ ہو گئیں[۷]

---

[۱] شمس اللہ قادری۔ اردو ادب قدیم ص ۸۳

[۲] جمیل الدین شاہد۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ نواں باب۔ ص ۴۶۶

[۳] نصیر الدین ہاشمی۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ ص ۲۳۴

[۴] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۴۳

Marfat.com

"خاورنامہ" کی تکمیل ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ہوئی تھی جیسا کہ خود شاعر کہتا ہے ؎

نبی کی جو ہجرت تھے
ہزار و پچاس اور نو کی تھی سال

"خاورنامہ" دکن کی غالباً سب سے طویل مثنوی ہے۔ یہ جو بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس سے رستمی کو قادرالکلامی اور پرگوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثنوی کے خاتمے پر رستمی وجہ تصنیف پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس فارسی عبارت سے رستمی کے نام اور اجداد کے پیشے سے متعلق معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔ "بسبب منظور کردن خاورنامہ دکھنی ..... آن بود کہ علیا خورشید نقاب قدر افزائے دیہیم عزت، مسند آرائے کشور عصمت زینت بخش حجلہائے مخدرات، مجلس آرائے حجرات طاہرات دارالمرتب و مناقب خدیجہ سلطان شہر بانو الملقب بڑی صاحب ..... کنیز کنج تن پاک ..... قطب فلک عز و جاہ سلطان محمد قطب شاہ ابن قطب شاہ است و خواہر نیکو سیر شاہ گیتی پناہ کسریٰ کلاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ ..... است و زوجہ سلیمان درگاہ جم قدر سکندر سپاہ ..... بخاطر رسید کہ خاورنامہ فارسی گر بزبان دکھنی منظوم شود بہتر است پس بفرمودند کہ ہر کہ این کتاب خاورنامہ را بزبان دکھنی منظوم کند او را بمراجم گونا شاہانہ ..... سرفراز گردانیم"[1]

آگے چل کر کہتا ہے کہ اس کا نام کمال خاں ابن اسمٰعیل خطاط خان دبیر ہے اور یہ کہ اس نے فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں غزلیات و قصائد کہے ہیں۔ رستمی اپنی شاعری کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

"خاورنامہ" کو دکنی ادب میں دو وجوہات کی بنا پر امتیاز حاصل ہے ایک تو یہ ہے کہ رستمی کی یہ مثنوی دکنی ادب کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ دوسرے یہ کہ دکن میں پہلی بار اتنی ضخیم رزمیہ نظم کی گئی ہے۔ نصرتی کا "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" حسن شوقی کا "فتح نامہ نظام شاہ جیسے رزمیہ کارنامے اس کے مقابلے میں بہت مختصر ہیں۔

رستمی کے خاورنامہ کا ایک واحد قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے[2]۔ ابن حسام کی فارسی مثنوی "خاورنامہ" بھی جس کا ترجمہ رستمی نے کیا تھا بہت کم یاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ

---

[1] چاند حسین شیخ۔ خاورنامہ۔ ص ۸۳۵، ص ۸۳۶

[2] بوم ہارٹ۔ کیٹلاگ آف دی ہندستانی مینوسکرپٹ۔ ص ۱۶

Marfat.com

برٹش میوزیم میں اور دو نسخے انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ رستمی نے خاور نامہ کے لئے بحر متقارب استعمال کی ہے۔ یہ بحر فارسی کی اکثر کلاسیکی رزمیہ مثنویوں میں استعمال کی گئی ہے۔ شاہ نامہ اور سکندر نامہ بھی اسی بحر میں ہیں اور یہ عروضی سانچہ رزمیہ مضامین کے لیے خاصا موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے راہول سانکرتیاین کا یہ خیال صداقت پر مبنی نہیں، کہ خاور نامہ میں رستمی نے فردوسی شاہ نامے کی "نقل" کی ہے[1]۔

فارسی خاور نامہ" ۸۳۰ھ میں مکمل ہوا تھا اور اسے ابن حسام نے فردوسی کے شاہ نامہ کے جواب میں پیش کیا تھا۔ ابن حسام "فردوسی ثانی" کہلاتا تھا۔ اس نے فردوسی کی تعریف کی ہے جو رستمی کے "خاور نامہ" میں بھی موجود ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سوا دو سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود ہندستان میں بھی لوگ اس قصے سے دلچسپی لیتے رہے اور اس کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی رہی ہوگی کہ "بڑے صاحب" عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو کو گولکنڈہ، بیجاپور کے اکثر حکمرانوں کی طرح حضرت علی سے عقیدت رہی ہو۔ "خاور نامہ" کے اختتام پر جو فارسی نثر تحریر کی گئی ہے اس میں خدیجہ سلطان کے لئے "خدیجہ سلطان شہر بانو المقلب بڑے صاحب ..... بصدق یقین و یقین و صدق خود را کہ کنیزک پنجتن پاک و حضرت بہترین انام پیشوائے عظام مقتدائے اکرام حضرت دوازدہ امام علیہ السلام الصلوۃ والسلام و حضرت فاطمہ زہرہ و خدیجہ الکبریٰ و چہاردہ معصوم پاک"..... کے الفاظ تحریر کئے گئے ہیں۔ اگر محض کسی رزمیہ نظم کو دکنی میں منتقل کروانا ملکہ کا مقصد ہوتا تو شاہ نامہ جیسے عظیم ادبی کارنامے کی طرف اس کی توجہ یقیناً ہوتی۔ "خاور نامہ" کے مخطوطے میں مثنوی کے اختتام پر جو فارسی نثر میں نوٹ قلمبند کیا گیا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ خدیجہ سلطان ہی کے ایما پر اس کو دکنی کے قالب میں ڈھالا گیا تھا۔

رستمی کا "خاور نامہ" اس بات کا اچھا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ فارسی زبان پر دسترس رکھتا ہے۔ اس نے جس خوش اسلوبی سے اور آسانی کے ساتھ ابن حسام کے مطالب کی دکنی میں تشریح کی ہے اس سے اس کی قدرت بیان اور فارسی زبان پر عبور کا اندازہ ہو تا ہے۔ رستمی

---

[1] مہاپنڈت راہول سانکرتیاین۔ دکنی ہندی کا دیہ دھارا ص ۲۴۸

Marfat.com

کہتا ہے کہ اپنے نام کو باقی رکھنے کے لئے کسی یادگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ فردوسی کا نام اس کے "شاہ نامہ" کی وجہ سے زندۂ جاوید ہو گیا ہے، اسی خیال کے تحت میں بھی "خاور نامہ" دکنی میں نظم کر رہا ہوں ؎

تو بہتر وہی ہے کہ جوں داستان — سنواروں اپس دل سے میں داستاں
کاڑوں رخت دنیا نے جب بھار میں — دنیا میں چھوڑو یادگار اسکوں میں
اسی نامے تے ناؤں حج ہوے بلند — ہووے خلق بھی اس سیتی بہرہ مند
جو ہر ذرہ ماٹی تے حج ہوئے غبار — دنیا میں اچھے مجکو یو یادگار
جو شاعر تھا فردوسی پاک زاد — اچھو حق کی رحمت سوں او بہوت شاد
دنیا میں ہوئی بات اس کے بلند — ہوا شعر تے بھی انے بہرہ مند

رستمی نے "خاور نامہ" میں گفتار جمع آسمان" کی سرخی کے تحت جو ستاروں اور برجوں وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رستمی علم فلکیات سے بھی واقف تھا۔ دوسری دکنی مثنویوں کے برخلاف "خاور نامہ" میں رستمی نے بادشاہ وقت کی مدح نہیں کی۔ حمد کے بعد نعت کے چند اشعار پر اکتفا کی گئی ہے جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ شاعر نے ابن حسام کی پیروی کی ہے اور مثنوی میں اسی کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے اور ان ہی سرخیوں سے "خاور نامہ" کو مزین کیا ہے جو اصل مثنوی میں موجود ہیں۔ "فی المناجات" کے آخر میں آل محمد سے اپنی مودت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیا و آخرت میں سرخروی کے لئے کتاب" اور "محمد آل محمد" سے توسل ضروری ہے ؎

اگر چور ہو ڈر تھے رہ پاک نہیں — تو اچھ شرع پر تجھ کوں کچھ باک نہیں
جو دنیا میں منگتا نہ ہوئے پاکمال — پکڑ دامن مصطفےٰ ہور آل
اپس کرتے کر بھار سگلا فضول — خدائی کتاب بس ہور آل رسول
جو منگتا گنہ تھے اچھے پاک توں — بخش سب گنہ تو گنہگار کوں
نکو بات تھے چھوڑ راہ صفا — پکڑ جیو سوں تو دامن مصطفےٰ
محمد صلواۃ کرتوں مدام — درود بھیج اس آل پر مستدام

"خاور نامہ" میں منظر نگاری کے پر اثر نمونے موجود ہیں "صفت شب است" میں رات کی مرقع کشی کرتے ہوئے رستمی نے مظاہر قدرت اور مناظر فطرت کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے

Marfat.com

اور برجستہ استعارے استعمال کئے ہیں آغاز داستان سے قبل شاعر نے "خاور نامہ" لکھنے کے محرکات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو اس داستان کو بیان کر سکے میں سخن کے گھوڑے پر سوار اس "بات" (راستے) کو طے کر رہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک خدیجہ سلطان نے "خاور نامہ" کا بہترین ترجمہ کرنے والے شاعر کو نہ صرف انعام واکرام اور شاہی نوازشات عنایت کرنے کی ترغیب دی تھی بلکہ مکہ مکرمہ کی زیارت سے مشرف کروانے کا اعلان بھی کیا تھا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

مکہ کی امید سوں کمر باندھیا ہوں　　نفا ہور زیاں تھے اپس ساندیا ہوں
اگر اپنے مقصود کو پاؤں گا　　سعادت سوں جا کے پھر جاؤں گا

"خاور نامہ" دختر جمشید شاہ، گل چہرہ، خواہر جمشید شاہ ہری رخ.....صلعال شاہ کی ملکہ گلزار احمد طہماس شاہ کی بہن ہرکوہ بلور وغیرہ۔ یہ سب کردار تخیلی ہیں۔ تاریخی نہیں۔ "خاور نامہ" جیسی رزمیہ مثنوی میں عشقیہ مثنویوں کے برخلاف اس کی گنجائش نہیں تھی کہ گل و بلبل کی داستانیں یہاں کی جائیں، یا نازنینوں کے حسن و جمال کی تصویریں کھینچ کر اپنے بیان کو رنگین اور دلچسپ بنایا جائے رستمی نے خاور نامہ میں جہاں بھی موقعہ ملا ہے سراپا نگاری کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ ایک تصویر ملاحظہ ہو ؎

آئی بہار او جوں کہ کھلیا بہار　　توں بولے گا کھلیا تو جوں لالہ زار
سنبل ہوئے پریشاں دیکھ موئے او　　ہوا گل خجل دیکھ کر روئے او
دیکھیا پھول اس مکھ پوں اپس دیکھیا　　خجل ہو گریبان ٹکرے کیا

.....

قلیں سرکینی جوں کہ نرگس دکھی　　جو اس آنکھ دیکھ آنکھ اس کی شکی
مگر آنکھ اس آنکھٹی حور تھی　　یا آدمیا کے دیدبا کا او نور تھی
قد اس سرو آزاد بندہ کیا　　لباس شہد کوں دیکھ خندہ کیا
ترک آنکھ کا اس کما گیہ تھا　　تو غمزے تھے اس شغف میں نہ تھا

.....

کیا تعریف اس تنگ ذہن کا کروں　　مجال بات کا تنگ ہوئے کر ڈروں

Marfat.com

لب اس میں چشمہ نوش تھا　　دو یاقوت جانوں گہر پوش تھا

مہ جبینوں کے حسن کی تعریف توصیف کرتے ہوئے رستمی نے برجستہ تشبیہات واستعارات استعمال کیے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دوسرے دکنی شعرا کی تشبیہات ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے ماخوذ ہیں اور ان میں ہندوستانی معاشرت کی روح جاری وساری دکھائی دیتی ہے رستمی کے "خاور نامہ" میں تشبیہات واستعارات کی بہتات ہے لیکن ان میں مقامی رنگ کا فقدان ہے اور ان کی فضا عجمی ہے یہ غالباً ابن حسام کی تقلید اور پیروی کا اثر ہے کہ رستمی نے فارسی شعرا کی طرح روایتی استعارات اور تشبیہات سے کام لیا ہے ان میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی۔

"خاور نامہ" ایک کامیاب رزمیہ مثنوی ہے اس میں میدان جنگ اور آلات حرب وضرب گھوڑے۔ مناظر جنگ اور محاربات کی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ ہتھیاروں کے بارے میں رستمی کہتا ہے ؎

بہت تیر لیتے انو بر سپر　　توں بوئے کا سپراں کوں واں آئے پر
خالی کہتے سر کش زتیر خدنگ　　نیزے لے کر او کھولے بازوئے جنگ
کئے نیزے لے کر او چنداں ستیز　　ہوے نیزے باتاں منے ریز ریز
وہاں تھے انو لیتے گوپال و گرز　　دکھائے مردی اپنی بہازوے برز
ہوئے کوٹنے تھے ترم یالہا　　سنگینی کئے ہت میں گویالہا

"خاور نامہ" میں جو رزمیہ مناظر اور معرکہ آرائی کے واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں جزئیات نگاری نے جان ڈال دی ہے طہماس سے حضرت علی کی جنگ کا یہ سماں ملاحظہ ہو ؎

عجب کیتے حیدر نامدار　　اُچائے اپنے سر اوپر ذالفقار
کھڑی ایک اس تیغ کوں مایہ دار　　تو بولے گا خورشید کوں سایہ دار
ہوا ڈر تھے طہماس کا مکھ جو زرد　　لیا یا مکھ اُپر او بی زریں سپر
مارے سر اُپر تیغ آہن گزار　　سپر سر اُپے اس ہوا جوں خیار
جوں اس شیر کی تیغ کاٹی سپر　　چرایاں بھی طہماس بدخواہ سر
گھوڑے کی عنین کوں پھرایا او تیز　　چلیا تازی کوں لے کر راہ گریز

رستمی کی شاعرانہ صلاحیت اور ذہانت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ چوبیس (۲۴)

Marfat.com

ہزار اشعار پر محیط اس طویل مثنوی میں نہ کہیں تسلسل مجروح ہوا ہے اور نہ اس طویل رزمیہ داستان میں خلا پیدا ہوا ہے۔ مثنوی کے اشعار ایک دوسرے سے پیوستہ نظر آتے ہیں اور قصہ انتہائی مربوط و مسلسل محسوس ہوتا ہے۔ واقعات کا ارتباط کہیں منقطع نہیں ہونے پاتا۔ رستمی کی اس رزمیہ مثنوی سے عادل شاہی عہد کے رزم و بزم کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی ہماری نظروں کے سامنے متحرک ہو جاتا ہے۔

رستمی نے کہیں کہیں اپنے عہد کی معاشرت کی بھی جھلک دکھائی ہے" خاور نامہ" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عادل شاہی دور کے ملبوسات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یم آستین، قبا اور پگڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔

دکنی ادب کا یہ دور فارسی ترجموں کی مقبولیت کا عہد ہے۔ عجمی اثرات کی پذیری تاریخ و تہذیب کا ایک فطری رجحان تھا۔ اس زمانے میں نہ صرف فارسی مثنویوں مثلاً " ہشت بہشت" اور" خاور نامہ" وغیرہ کو دکنی کا جامہ پہنایا گیا بلکہ فارسی اسالیب اور اصناف سخن سے وابستگی اور بحر و اوزان مستعار لینے کا میلان بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ فارسیت کا اثر ہندی بحروں اور طرز ادا پر غالب آنے لگا تھا۔ تلمیحات میں بھی ہندوستانی رنگ کے بجائے ایرانی اثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہی حال تشبیہات و استعارات کا ہے ان میں ہندستانی معاشرت اور ماحول کی عکاسی کا رجحان کم نظر آتا ہے ایک اور بات یہ تھی کہ رستمی نے چونکہ ابن حسام کے خاور نامہ" کو پیش نظر رکھا تھا اس لیے اس کی زبان پر بھی فارسی تراکیب اور طرز ادا کا اثر نمایاں ہے اور شعوری یا غیر شعوری شعوری طور پر دکنی ترجمے میں فارسیت اور عجمی اسلوب کا رنگ اختیار کیا گیا ہے مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کمر باند آیا یہ دریا کنار — دریا پر سنوار با او کشتی کا کار
رواں کت کشتی کو بر شہریم — کا ٹیا دل تھے او شادمانی و غم
یہی زن و طماس کی خواہرست — لجانا اسے بھار نئیں درخواست
ہمیں کوٹھ میں بیسنا تا بہ کئے — یہاں رنج ہی کھینچا تا بہ کئے
منجے راست ہیں سال بہ از ہزار — جو کرنا ہوں شاہی بساحل کنار
اسی کام تھے سب ڈوبیا نام ونگ — ہنوا، کشتی جانے یہ دریائے
ہنوا، کشتی جانے یہ دریائے — دریا ہور کشتی تھے کرتوں شناب

Marfat.com

دکنی شعرا کے برخلاف فارسی ترکیبیں رستمی کے یہاں "خاورنامہ" میں اکثر جگہ موجود ہیں مثلاً سے مصرع ملاحظہ ہو۔ گزر تنگ ہوا بر عتاب سہ پہر

آئی بہار جون تیغ آئینۂ تاب
عجب کہتے دیکھ شہر خنجر گزار
مبادا بوقت شتاب و رنگ
مارے نعرہ واں شاہ تازی نژاد
بغیر بازوے شاہ فریاد رس

"علی نامہ" کے کردار اصلی و حقیقی ہیں اس لیے ان کی اہمیت تاریخی بھی ہے لیکن "خاورنامہ" میں حضرت علی کے محاربات اور معرکہ آرائیاں تخیلی ہیں "خاورنامہ" میں حضرت علی کی جنگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے لیکن یہ ایک فرضی رزمیہ داستاں ہے جس کے ہیرو حضرت علی کے گرد قصے کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے ریاض کوٹھ، بندرگاہ سلیماں، شہر صم، قلعہ صور، قلعہ آہین کوہ بلور اور حصار ظلمات وغیرہ میں ہیرو کو نہ صرف انسانوں سے نبرد آزما بتایا گیا ہے بلکہ دیووں پریوں آدم خوردوں اور لشکر فیل گوشاں، لشکر کلاہاں اور لشکر جادوگراں کا بھی مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے مثنوی کا یہ حصہ داستان امیر حمزہ کی یاد دلاتا ہے۔ مافوق الفطرت عناصر سے اس داستان میں جگہ جگہ مدد لی گئی ہے۔ دیووں، پریوں اور طلسمات کی وجہ سے اس پوری رزمیہ نظم کی فضا داستانی بن گئی ہے۔ محمد صادق نے اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں خاورنامہ کو رومانی انداز کی مہماتی مثنوی تحریر کیا گیا ہے[1]۔ "خاورنامہ" میں تشبیہات و استعارات کی فراوانی زور بیان اور بیباکی، رستمی کی شاعرانہ عظمت کی شاہد ہے۔ رستمی کے "خاورنامہ" کو دکن کی بہترین رزمیہ مثنوی قرار دیتے ہیں[2]۔

"خاورنامہ" کو چاند حسین شیخ نے مرتب کر کے ترقی اردو بورڈ کراچی سے ۱۹۶۸ء میں شائع کر دیا ہے۔ مقدمہ میں مرتب نے تحقیقی امور یا مثنوی کی فنی خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے بجائے خاورنامہ کا قصہ بیان کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔

---

[1] محمد صادق۔ اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ ص ۱۲
[2] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۶۵

Marfat.com

بقول محمد صادق، بیجاپور کے دو قد آور اور بلند پایہ شاعر ہیں رستمی اور نصرتی۔[1]

شیخ حسن شوقی

شیخ حسن نام اور تخلص شوقی تھا۔[2] اس شاعر کا تعارف سب سے پہلے عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں کروایا تھا۔[3] اور ان کی ادبی کاوشوں کی بھی نشاندہی کی تھی۔ ان کے پیش نظر شاعر کا جو کل اثاثہ تھا وہ تین غزلیں اور دو مثنویاں تھیں، اس کے بعد چند اور غزلیں منظر عام پر آئیں۔[4] جمیل جالبی نے ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو سے "دیوان حسن شوقی"، کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ حسن شوقی حبیب اللہ کے مرید تھے ابن نشاطی نے "پھول بن"، میں حسن شوقی سے اپنے کمال فن کی داد چاہی تھی اور کہا تھا ؎

حسن شوقی اگر ہوتے تو فی الحال
ہزاروں بھیجتے رحمت اپرال

حسن سے پتہ چلتا ہے کہ حسن شوقی کوئی معمولی سخنور نہیں تھے اور ابن نشاطی جیسا بلند پایہ شاعر بھی معیار شعر کے سلسلے میں ان کا حوالہ دیتا ہے اور یہ کہ حسن شوقی کی وفات کے بعد بھی دکنی شاعروں نے اس نامور اور مسلم الثبوت شاعر کو فراموش نہیں کیا تھا اور دکن کی ادبی فضا اس کے چرچوں سے گونج رہی تھی۔ نصرتی جیسے بلند پایہ شاعر نے "علی نامہ"، کے ایک قصیدے میں شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے اور اپنی سجن سجنی سے موازنہ کرنے کے لئے اگر کسی ممتاز شاعر کا نام اس کے ذہن میں آیا ہے تو وہ حسن شوقی ہی نہیں ؎

دس پانچ بہت اس دھات سیں کہئے ہیں تو شوقی کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہئے تو اس بستار کا

غالباً حسن شوقی ایک سیلانی شخص تھے۔ وہ احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈے کے درباروں سے وابستہ رہے تھے۔[5] لیکن ان کی عمر کا زیادہ حصہ بیجاپور میں گزرا اس لیے ان کا شمار عادل

---

[1] گیان چند جین۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ ص ۴۶

[2] یوسف کوکن عمری۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ۔ ص

[3] عبدالحق رسالہ اردو۔ جولائی ۱۹۲۹ء۔ ص ۵۵۳

[4] (ا) سخاوت مرزا۔ حسن شوقی رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۵۴ء۔ ص ۴ (ب) حسینی شاہد۔ قدیم اردو جلد اول ص ۵۱۲، ۵۳۰

[5] ڈاکٹر زور اردو شہ پارے۔ ص ۱۰۳

Marfat.com

شاہی شعرار میں کیا جاتا ہے۔ حسن شوقی کو دکن کی مختلف سلطنتوں میں رہائش اختیار کرنے اور وہاں کے ادبی ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ حسن شوقی نے نظام شاہی سلطنت میں بھی بود و باش اختیار کی تھی ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں جب یہاں مغلوں نے اپنی حکومت کا پرچم لہرایا تو حسن شوقی نے عادل شاہی سلطنت میں پناہ ڈھونڈی ہوگی اور بیجاپور چلا آیا ہوگا۔ حسن شوقی نظام شاہی دربار سے متوسل تھا لیکن اب نہ وہ دربار رہا تھا اور نہ وہ قدردان سلاطین تھے۔ حسن شوقی کے نظام شاہی دربار سے وابستہ ہونے کا ثبوت "فتح نامہ نظام شاہ" سے بھی ملتا ہے جس میں انھوں نے جنگ تالی کوٹ کی فتح مندی و کامرانی کا سہرا اپنے مربی و محسن بادشاہ حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے اور اس کو اس مہم کی روح رواں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی کے گیت گائے ہیں۔ حسین نظام شاہ ایک بہادر اور جنگجو بادشاہ تھا۔ "کلچرل ٹرنڈس ان میڈیویل انڈیا" میں ہارون خان شروانی لکھتے ہیں کہ دکن کا پہلا کیری کیچر یا تصویر چہ ایک مخطوطے میں موجود ہے جس کا نام "تعریف حسین بادشاہ پادشاہ دکن" ہے یہ مخطوط بھارتیہ اتہاس سمشو دھامنڈل پونا میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطے میں ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء میں دریائے کرشنا کے شمال میں جو جنگ ہوئی تھی اس کا جزوی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لڑائی کو تسامح کی بنا پر جنگ تالی کوٹ کہا جاتا ہے جو غلط فہمی کا نتیجہ ہے[1] ہارون خان شروانی لکھتے ہیں کہ حسین شاہ چاروں بادشاہوں کی لیگ کا مرکزی کردار اور اصل طاقت تھا اور اسی کے ایثار پر فوج کام کر رہی تھی اس لئے نہ صرف شوقی نے فتح نامہ میں حسین نظام شاہ کی تعریف کی ہے بلکہ "تعریف حسین شاہ پادشاہ دکن" کا شاعر بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے[2]

حسن شوقی ایک سیاحت پسند انسان تھے۔ انھوں نے کسی ایک سلطنت میں قیام نہیں کیا۔ کبھی احمد نگر میں سلطان کی مدح کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی دھاک بٹھادی تو کبھی بیجاپور میں داد سخن لی۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ حسن شوقی محمد عادل شاہ کے عہد میں وارد گولکنڈہ ہوئے تھے[3] ہمسایہ ریاست بیجاپور میں اس وقت محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ

---

[1] عبدالحق۔ قدیم اردو۔ ص ۸۶

[2] ہارون خان شیروانی۔ کلچرل ٹرنڈرس ان میڈیویل انڈیا۔ ص ۶۰

[3] ڈاکٹر زور۔ داستان ادب حیدرآباد ص ۲۵

Marfat.com

۱۰۶۷ھ) سربرآرائے سلطنت تھا اور بیجاپور اس علم دوست تاجدار کی سرپرستی میں ادبی چرچوں سے معمور تھا۔ حسن شوقی ایک پختہ مشق شاعر اور سن رسیدہ انسان تھے اور زندگی کے گوناگوں تجربات سے انھوں نے اپنی جھولی بھر لی تھی۔ بیجاپور پہنچ کر انھوں نے دربار میں کس طرح رسائی حاصل کی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا سکتا یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حسن شوقی کی شہرت اور ان کے "فتح نامہ" کا چرچا ان سے پہلے بیجاپور دارالنور پہنچ چکا تھا کیوں کہ جنگ تالی کوٹ میں عادل شاہی حکمران نے بھی حصہ لیا تھا۔

حسن شوقی کے عادل شاہی دربار سے وابستہ ہونے کا ثبوت ان کی مثنوی "میزبانی نامہ" ہے جس میں انھوں نے سلطان عادل شاہ کی ایک شادی کی تقریب کا حال نظم کیا ہے۔ آخر میں اظہار مدعا اس طرح کرتے ہیں ؎

دل جامِ جم ہے شاہ کا شوقی نہ کر اظہار توں
شاہنشۂ عادل کنے حاجت نہیں گفتار کا

جیسا کہ کہا جا چکا شیخ حسن شوقی بیجاپور کے مشہور صوفی بزرگ مولانا حبیب اللہ بیجاپور کے مرید تھے۔[1] اور شاہ حبیب اللہ بیجاپوری، صبغۃ اللہ بروچی کے مرید تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں دفن ہوئے ہیں وہ ۱۰۰۰ھ کے آخر میں حرمین شریف کی زیارت کے لیے نکلے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے تین ہزار ہُن بطور تحفہ ان کے پاس بھیجے تھے۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ میں حبیب اللہ بیجاپوری کے کمالات اور روحانی تصرفات کا مفصل ذکر موجود ہے عبدالفتاح کی "راحت القلوب" اور مناقب حضرت شاہ حبیب اللہ[2] کے حوالے سے ان کے بعض حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی کرامات بیان کی گئی ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ نے نورس پور کے نام سے ایک نیا شہر آباد کیا تھا اور یہاں وہ اکثر مست ہاتھی لڑایا کرتا تھا ایک مرتبہ جب حبیب اللہ بیجاپوری ابراہیم عادل شاہ سے ملاقات کے لئے نورس پور آئے تو اچانک دو

---

[1] یوسف کوکن عمری۔ خانوادۂ قاضی بدرالدولہ۔ جلد اوّل صفحہ ۵۶۔ شاہ حبیب اللہ بیجاپور میں شب عیدالفطر کو ۹۷۰ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۰ شعبان ۱۰۴۷ھ کو آخر شب میں وفات پائی تھی۔ شاہ حبیب اللہ نے خود ہی اپنی تاریخ پیدائش اس طرح نکالی تھی۔ شدم توام سعادت بادلادت اور بتاریخ وفات باسعادت

[2] شاہ حبیب اللہ کے مرید عبدالقادر حبیب اللہی کی تصنیف۔

Marfat.com

مست ہاتھی ان کی پالکی کی طرف بڑھے لیکن ان پر حملہ کرنے کے بجائے اپنا سر جھکا دیا اور آگے بڑھ گئے۔[1] اپنے مرشد کے انتقال پر شیخ حسن شوقی نے ان کی تاریخ وفات "قطب آخرالزماں" سے نکالی تھی۔[2] اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محمد عادل شاہ کے ہمعصر تھے اور انھوں نے سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرو کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اپنی ایک طویل غزل میں جو تیرہ اشعار پر مشتمل ہے حسن شوقی نے عادل شاہ کو "شاہ جوان" کہا ہے ؎

اس شاہ جوان پر میں تن من فدا کروں گا
ایسا جو مست لائیں وہ من ترن کہاں ہے

اس کے بعد کے دو اشعار میں عادل شاہ سے دوری کا رنجیدگی کے انداز میں اس طرح ذکر کرتے ہیں ؎

عادل شاہ کے درس بن مینج یک گھڑی برس دو
ایسا جو مست لائیں وہ من ترن کہاں ہے
شادی درس بن مجہ یک ہے گھڑی برس یک
کیوں من تھرن رکھوں میں، او من تھرن کہاں ہے

ابن نشاطی کی "پھول بن" کا سنِ تصنیف ۱۰۶۶ھ ہے اس سے قبل حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا ورنہ ابن نشاطی ان کے غیر موجود ہونے پر اظہار افسوس نہ کرتے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن شوقی کا انتقال عہد محمد عادل شاہ میں ۱۰۴۱ھ اور ۱۰۶۶ھ کے درمیان ہوا تھا۔

"دیوان حسن شوقی" کے مقدمے جمیل جالبی نے حسن شوقی کے "فتح نامہ نظام شاہ" کے تعلق سے عبدالحق کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ فتح نامہ جنگ تالی کوٹ (۱۵۶۵ء/۹۷۲ھ) کے بعد لکھا گیا ہے اور یہ کہ اگر تالی کوٹ کے وقت حسن شوقی کی عمر پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ سال مان لی جائے تو ۱۰۴۱ھ میں جبکہ شاعر نے شاہ حبیب اللہ کی وفات پر "قطب آخرالزماں" سے ان کی تاریخ وفات نکالی تھی، ان کی عمر ۹۳، ۹۴ سال قرار پاتی ہے۔

---

[1] یوسف کوکن عمری۔ خانوادہ قاضی بدرالدولہ۔ جلد اوّل۔ ص ۶۴

[2] (ا) " " " " ص ۷ (ب) سخاوت مرزا۔ حسن شوقی" (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو، اپریل ۱۹۵۴ء ص ۱۳

Marfat.com

حسن شوقی کا "فتح نامہ نظام شاہ" چھ سو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جنگ تالی کوٹ (۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء) دکن کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ مصطفےٰ خاں اردستانی کی سیاسی تدبیر اور ان کی دور اندیشی اور کامیاب حکمت عملی کی بدولت دکن کے چار حکمران متحد ہو سکے تھے۔ اس جنگ میں ابراہیم قطب شاہ (گولکنڈہ)، علی عادل شاہ اوّل (بیجاپور) حسین نظام شاہ (احمد نگر) اور بریدشاہ (بیدر) کی متحدہ افواج نے سلطنت وجیانگر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا اور راجہ رام راج کو شکست اٹھا کر زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ عبدالحق نے اس مثنوی کے نام "فتح نامہ نظام شاہ" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چوں کہ رام راج کمزور ہو گیا تھا اور اس نے نظام شاہ کو بہت ذلیل کیا تھا، اس لئے انتقام لینے کے لیے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی بہادری دکھائی تھی[1]۔ جنگ تالی کوٹ کے واقعات کو محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حسن وجہانگیر" مصنفہ بشیر الدین احمد نے بھی اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ حسن شوقی نے تالی کوٹ کے واقعات جنگ پر مبنی یہ "فتح نامہ حسین نظام شاہ" والی احمد نگر کی خدمت میں پیش کیا تھا[2]۔ یہ "جنگ نامہ" مثنوی کے فارم میں لکھا گیا ہے۔ اور مختلف عنوانات قائم کر کے جنگ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ ابتدا میں راجہ رام کے خط اور حسین نظام شاہ سے اس کے مختلف مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے اس خط کے ردعمل کی اس طرح توضیح کی گئی ہے ؎

نہ بتلاؤں کچھ زورِ بازو کے تئیں
نگہ راکھ وزن ترازو کے تئیں
سو مشعل جلاؤں سر اندیب پر
اجالا کروں سب منگل دیپ پر

حسن شوقی کے "فتح نامہ نظام شاہ" کے بارے میں آر، سی، مجمدار "دی مغل ایمپائر" میں لکھتے ہیں کہ جنگ تالی کوٹ ۱۵۶۵ء میں وجیانگر میں حکمرانوں نے جو فتح پائی تھی اس پر ایک "ہیروائک پوئم" Heroic Poem حسن شوقی نے لکھی تھی[4]۔ "فتح نامہ نظام شاہ" تاریخی اعتبار سے اردو

---

[1] عبدالحق۔ قدیم اردو۔ ص ۷۵

[2] ملاحظہ ہو جلد دوم تاریخ فرشتہ

[3] جمیل جالبی۔ مقدمہ دیوان حسن شوقی۔ ص ۱۲

[4] آر، سی مجمدار۔ دی مغل ایمپائر۔ جلد ۷۔ ص ۶۲۹

Marfat.com

کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں روانی اور زور بیان موجود ہے حسن شوقی نے کہیں کہیں حسین نظام شاہ کے دربار، جنگی مناظر اور میدان کارزار کے ایسے پر اثر مرقع پیش کئے ہیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتے ہیں۔ اس کا مرکزی کردار حسین نظام شاہ اور راجہ رام راج ایک دوسرے کے بدترین دشمن اور مخالف ہیں اس طرح رام راج کا کردار مثنوی میں رقیب کے کردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ رام راج کی شخصیت اپنے سارے اہم خد وخال کے ساتھ ہمیشہ کے لئے فتح نامہ کے لئے بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوتی ہے وہ رزم آرائی کی منظر کشی کے لئے بہت موزوں ومناسب معلوم ہوتی ہے اور بحر کی اس روانی اور دھمک سے حسن شوقی نے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ فتح نامہ کا لب ولہجہ اور مجموعی آہنگ بھی اس کے موضوع سے بخوبی میل کھاتا ہے۔ فتح نامہ کی زبان پر فارسیت کا اثر نمایاں ہے اور بیجاپوری کے اسلوب سے جس پر سنسکرت سے اثر آفرینی کی چھاپ لگی ہوئی ہے ذرا سا مختلف محسوس ہوتا ہے یہ اظہار ترسیل گولکنڈے کی شعری تخلیقات کے اسالیب سے خاصا ہم آہنگ ہے۔ حسن شوقی افراد قصہ کی شخصیت کو متعارف کروانے۔ قصے کی کڑیاں جوڑنے اور رزم وبزم کے مناظر کی۔ اس پر اثر تصویر کشی میں ایک کامیاب مثنوی نگار ثابت ہوتے ہیں۔ مثنوی میں جہاں مکالمے آئے ہیں وہاں افراد قصہ کے طرز فکر اور شخصیت کی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ شوقی نے تاریخ سے انحراف نہیں کیا ہے۔ فتح نامہ کے بیانات کی دکن کی تاریخوں سے تصدیق ہوتی ہے لیکن مبالغہ آرائی اور زیب داستان" کے تقاضوں سے شاعر پوری طرح آزاد نظر نہیں آتا۔ یہ فتح نامہ شعر و تاریخ کا ایک خوشگوار اور دلچسپ امتزاج ہے اور اسی میں ان کی ادبی اہمیت کا راز مضمر ہے۔ شوقی رزم وبزم دونوں کی مرقع کشی پر قادر تھے۔

"میزبانی نامہ" بھی حسن شوقی کی توضیحی شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے اس کا موضوع سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ۔ ۱۰۶۷ھ) کی وہ شادی ہے جو اس نے نواب مظفر خان کی لڑکی سے کی تھی اور جسے سہواً "عبدالحق نے مصطفےٰ خان وزیر اعظم کی دختر بتایا ہے[1] اور اردو

---

[1] عبدالحق قدیم اردو۔ ص ۸۶۔ (ب) عبدالحق۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۵۲

Marfat.com

شہہ پارے" میں ڈاکٹر زور بھی ان کے ہم خیال نظر آتے ہیں[۲] اور انھوں نے اس مثنوی کا نام "منیر بانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" تحریر کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی بھی "دکن میں اُردو" میں اسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ دلہن کو مصطفےٰ خان کی صاحبزادی بتاتے ہوئے اس کا نام تاج جہاں بیگم تحریر کیا ہے جس کی واقعات مملکت بیجاپور سے تردید ہوتی ہے[۳] وہ بادشاہ کی ماموں زاد بہن تھی نہ کہ بیوی۔ جب ہم "میزبانی نامہ" میں "در بیان مہمان کردن سلطان محمد عادل شاہ راو دارند جہیز دختر نواب مصطفےٰ خان" کی سرخی دیکھتے ہیں تو کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ غالباً وہی مصطفےٰ خان ہیں جن کے بارے میں "بساتین السلاطین" میں ابراہیم زبیری نے محمد عادل شاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"اوّل صبح کے تاریخ چہارم ربیع الاوّل بود نہ استقبال مظفر خان کہ از مہم
بدنور فراغ یافتہ معاودت نمودہ بود تا خدیجہ پور سواری رفتہ ..... الخ[۳]

محمد نامہ" کے بیان کے مطابق یہ شادی ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء میں ہوئی تھی[۴] "میزبانی نامہ" دو سو چودہ اشعار پر مشتمل ہے اور اسے چار حصّوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حسب روایت حمد و نعت اور منقبت کی علٰحدہ سرخیاں قائم نہیں کی گئی ہیں بلکہ حمد کے صرف ایک مصرعے پر حسن شوقی نے اکتفا کی ہے اور آغاز مثنوی سے اصل مطلب کی طرف قاری کی توجہ مبذول کر دیتے ہیں۔ گیارہ اشعار میں محمد عادل شاہ کے اوصافِ حمیدہ، اس کی شجاعت و سخاوت اور علم و دانش کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

سُنیا ہیں کہ شہہ گھر بڑا کاج ہے
کہ جس کاج کا خلق محتاج ہے

کہہ کر اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ حسن شوقی نے جہاں محمد عادل شاہ کی دوسری خوبیاں بیان کی ہیں وہیں اس کی سخن فہمی اور سخن پروری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور کہتے ہیں:۔

---

[۱] ڈاکٹر زور۔ اردو شہ پارے۔ ص ۱۰۲

[۲] بشیر الدین۔ واقعات مملکت بیجاپور۔ جلد اوّل۔ ص ۲۶۵

[۳] ابراہیم زبیری۔ بساتین السلاطین۔ بستان ہفتم۔ ص ۴۳۴

[۴] نصیر الدین ہاشمی، علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ چوتھا باب (ب)، ص ۲۹۴

Marfat.com

بڑا گیان ونتا رتن پارکھی
رتن پارکھی ہور بچن پارکھی

سری رام شرما نے "دکنی ہندی کا ساہتیہ" میں مثنوی کے تاریخی شعور کو سراہا ہے[1]۔ "میزبانی نامہ" کی شاعرانہ اہمیت کے علاوہ اس کی تاریخی و ثقافتی حیثیت بھی اس کو دکن کی ایک اہم مثنوی بنا دیتی ہے۔ حسن شوقی نے محمد عادل شاہ کے عہد کی بیجاپوری ثقافت کی بڑی اچھی مرقع کشی کی ہے اور اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں شادی بیاہ کی رسومات کس اہتمام، مستعدی اور توجہ کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔ "محلات کی سجاوٹ"، فرش کی صفائی، حوض، فوارے، عطریات روشنی کے اہتمام، لباس و زیورات اور سامان عیش و عشرت کی بڑی متحرک اور گویا تصویریں اس مثنوی میں پیش کی گئی ہیں۔ شادی کی رسومات، "شہر گشت" کی تیاری اور پھر اس کی دھوم دھام سواریوں کی آن بان، سپاہیوں کا دبدبا، جلوس کی رونق، بادشاہ اور اس کے مقربوں کے زرق برق لباس اور طمطراق، آتشبازی کے پرنور نظارے، موسیقی کی دلفریبی، رقاصہ کی ہوش ربا ادائیں، کنیزوں کی خوش پوشاکی، زر و جواہر کی ریل پیل اور عادل شاہی محلات کے پورے ماحول کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے آخر میں دولھا کے لئے دعا پر اس "میزبانی نامہ" کو ختم کیا گیا ہے حسن شوقی کی ان تصویروں کو جب ہم بغور دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جس معاشرت کی شاعر نے اپنی مثنوی میں مرقع کشی کی ہے وہ دراصل وہی گنگا جمنی کلچر ہے جس میں ہندستانی تہذیب کی روح کھنچ آئی ہے، لباس و زیورات، سنگار، آداب، رسم و رواج، عادات و اطوار، طرز فکر رہن سہن اور پورے اوضاع معاشرت میں یہی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اپنے موضوع کے ساتھ حسن شوقی نے اس خوبی کے ساتھ انصاف کیا ہے کہ ان کا فن اس مثنوی میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ شادی کی تقاریب پر لکھی ہوئی اس مثنوی کی پوری فضا پر ایک طربیہ اثر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کا پرجوش لب و لہجہ، مناسب و موزوں لفظیات، محاکات اور بدلتی ہوئی تصویروں نے "میزبانی نامہ" کو ایک بھرپور "شادی نامہ" بنا دیا ہے۔ اپنی ثقافتی اہمیت کی وجہ سے قدیم ادبی سرمایے میں "میزبانی نامہ" ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک گزرے ہوئے عہد کی سماجی و ثقافتی زندگی کی آئینہ داری نے اس مثنوی کو اہم بنا دیا ہے۔

---

[1] سری رام شرما۔ دکنی ہندی کا ساہتیہ۔ ص ۱۹۹

Marfat.com

انگریزی ادب میں جس صنعت کو انومو ٹوفی سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی مثالیں "میر بانی نامہ" میں جگہ جگہ اپنی جھلک دکھائی دیتی ہیں۔ اس صنعت کے استعمال سے حسن شوقی نے اپنی مثنوی کی طربیہ فضا تیار کرنے میں خاصی مدد لی ہے مثلاً "شباشب"، "کڑکڑین"، "دھم دھاٹ"، "لکلکاٹ جھکاٹ" اور "کھٹ پٹ" وغیرہ الفاظ اپنے اندر آواز کا احساس رکھتے ہیں اور ان سے شاعر کی زبان پر قدرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ؎

سدا دار پر تجہ منگل کڑکڑ بن　　منگل کڑکڑبن چوں بدل کڑکڑ بن
طبل دھول جم جم کریں دھم دھماٹ　　پتا لال چادر کیرا لکلکاٹ

"میر بانی نامہ" میں تشبیہات و استعارات کی بھی کمی نہیں۔ نوجوان لڑکیوں اور کنیزوں کے سراپے بھی بڑے دلنشیں پیرایے میں پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان سے حسن شوقی کے جمالیاتی شعور اور حُسن و بیان و قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعریت و ادبیت کے اعتبار سے "میر بانی نامہ" کے بہت سے حصے قدیم ادب میں ایک منفرد شان کے حامل نظر آتے ہیں۔

حسن شوقی نے جہاں بیانیہ توضیح اور خارجی شاعری کے کامیاب نقش اپنی یادگار چھوڑے ہیں وہیں ان کے کلام میں مداخلت کا عنصر بھی اپنی گھلاوٹ اور اثر آفرینی اور رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو ۱۹۲۹ء میں حسن شوقی کی تین غزلیں متعارف کرائی تھیں جن کے مطلع یہ ہیں ؎

(۱) دلبر سکونی نین پر کھینچی ہے سو کا خوب تر
(۲) کھب کھب رہی ہے من میں تری زلف کی کھب کھب
(۳) تجہ نین کا ماتا ہے جو اس جام سیتی کام کیا

رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۴ء میں سخاوت مرزا نے حسن شوقی کی تین اور غزلوں کی نشاندہی کی تھی۔[1] اور پھر ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان سے جمیل جالبی نے دیوان حسن شوقی مرتب کر کے شائع کر دیا۔

حسن شوقی غزل میں ایک ایسا سرشار اور کامیاب عاشق نظر آتا ہے جو موت کے رنگا رنگ تجربات اور مادی عشق کی گوناگوں واردات سے آشنا ہے وہ بڑے پر لطف اور

---

[1] سخاوت مرزا۔ حسن شوقی (مضمون) مشمولہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۴ء ص ۱۴

Marfat.com

دلکش انداز میں ان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حسن شوقی کی غزلیہ شاعری میں مٹھاس و شگفتگی اور پختگی موجود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسن شوقی کا تغزل دکنی غزل گوئی کی اس روایت کی ابتداء ہے جس کا کمال ولی کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ حسن شوقی کی غزلیں اپنے مزاج اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اسی نقطہ عروج کا آغاز معلوم ہوتی ہیں۔ شوقی نے اپنی غزلوں کو دلنشیں استعاروں اور خوبصورت تشبیہوں سے سجایا ہے۔ یہ تشبیہات اس ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں جس میں شاعر کے شعور نے نشوونما پائی ہے۔ ؎

وسن ات سیام کنتے تھے ادھر اتے توہین اصلی
سو دھن ہنستی دسیا مجہ لو کنول کھلتے بھنور نکلے
جو یو یاقوت رمانی کہو کس جوہری کا ہے
خوش مانگ لا سنوارے موتی دسیں ہوتارے
جیون چاند سوں ستارے اوگھے ہیں سیام گھن میں
یا سین موتی ڈھال کا سو کا سو تا گا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تھوڑا رھیا جیوں ٹوٹ کر
یا دو ہیں سرخک نین اوسو کا سو دھاگا باندکر
چار اوپس کاموں میں لے بیٹھے ہیں یا دو جانور

حسن شوقی نے ایک پوری غزل میں جس کا مطلع ہے ؎

کیا چھنڈ سوں کھینچے ہیں دھن سو کا نین کو سحر کو
یا تجہ نین کے ترک نے کھنچا ہے خنجر منہ اوپر

میں جو ایک مسلسل اور موضوعاتی غزل ہے محبوب کی آنکھوں کی تعریف کی ہے اور آنکھوں کے لئے ہر شعر میں مختلف اچھوتی اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں۔ اس غزل کے تیرھا اشعار میں نئی نئی تشبیہات اور انوکھے استعارے شاعر کی ندرت فکر، اپج اور جدت طرازی کی ترجمانی کرتے ہیں حسن شوقی نے بعض دیگر دکنی شعراء کی طرح ریختہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے یعنی ایسی غزلیں بھی کہی ہیں جن میں فارسی مصرعوں کا قدیم اردو کے مصرعوں سے پیوند لگایا گیا ہے۔ مثلاً ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
بحمد اللہ ہ المنہ، شکر میں تے کنکر نکلے

Marfat.com

ایک غزل میں عادل شاہ سے اپنی محبت اور اس کے فراق کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

عادل شاہ کے درس بن منج یک گھڑی برس دو
برسوں سے کہہ رہی ہوں وہ من ہرن کہاں ہے
شاہی درس بن لجہ یک ہے گھڑی برس یک
کیوں من تھرن رکھوں میں اوھن تھرن کہاں ہے

اس میں ہندی روایت کے مطابق عورت متکلم اور مرد مخاطب ہے

حسن شوقی کے غزلوں میں نصیحت آموزی بھی ہے اور اخلاقی عنصر بھی اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں حسن شوقی کو ایک عجیب و غریب شاعر اس لئے لکھا ہے کہ کبھی وہ نظام شاہیوں کے دربار میں رہا تو کبھی عادل شاہیوں کے یہاں اور کبھی قطب شاہیوں نے اسے سرفراز کیا لیکن حسن شوقی کی شخصیت اور شاعری کی اس سے بڑی بوالعجبی یہ ہے کہ انھوں نے رزم و بزم دونوں میں اپنا شاعرانہ کمال دکھایا ہے اور ان کے کلام میں موضوعی اور معروضی دونوں رنگ موجود ہیں اور انھوں نے دونوں طرح کے موضوعات کے ساتھ اپنی شاعری میں انصاف کیا ہے۔ حسن شوقی کے کلام میں محاسن شعری کی اہمیت کا کا احساس بھی موجود ہے اور انھوں نے صنائع بدائع وغیرہ کی مدد سے اپنے کلام کے صوری و معنوی حسن میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے کہیں خوبصورت دلنشین تشبیہات و استعارات برتے ہیں تو کہیں حسن تعلیل صنعت تضاد اور مراعات النظیر کی دلکشی سے اپنے اشعار کو پرکشش اور قابل توجہ بنا دیا ہے۔

Marfat.com

ہماری مطبوعات

آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	73/-
ابوالکلام آزاد۔شخصیت،سیاست پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	21/-
ابوالکلام آزاد۔ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	58/-
اترپردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	120/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (دوسری طباعت)	احتشام حسین	70/-
اردو کے ابتدائی ادبی معرکے	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	22/-
(ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)		
اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	30/-
ترمیم واضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)		
اردو کی کہانی	احتشام حسین	21/-
اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	30/-
ارنیسٹ ہمنگوے (حیات وفن کا تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	8/40
(دوسری طباعت)		
امریکی ادب کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	زیر طبع
انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	15/-
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	9/-
اردو زبان کی تدریس	معین الدین	40/-
انشاء کاتر کی روزنامچہ	سید محمد نعیم الدین	4/50

Marfat.com